خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

جولائی 2018

عید مبارک

معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ

مدیراعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 47 • شمارہ 07 جولائی 2018 • زرسالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 70 روپے •
E-mail: jdpgroup@hotmail.com (021)35895313 ...

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

ہمہ رُخ

ازل سے زمانے پر ایک ابدی استغراق مسلط ہے۔ لمحے اس ابدی استغراق میں گزر رہے ہیں، ساعتیں تمام ہو رہی ہیں اور وقت ہے کہ بہہ رہا ہے۔ زندگی نے دنوں اور راتوں کی ایک اور میعاد پوری کرلی۔

ہاں، ایک سال اور تاریخ کے وجود نے نگل لیا ہے۔

قوموں نے تجربات و مشاہدات کا کچھ ذخیرہ اور اکٹھا کرلیا ہے۔

لمحوں کے بے شمار بلبلے میں وجود کے کھوئے سے پھل گئے ہیں مگر حیات کی تیز گامی برقرار ہے۔

میں ماضی کے راہ رو جو کرسٹوفر کولمبس کی دریافت عظیم امریکا میں نئے سال کے حاشیے پر کھڑا ہوں۔ منفعت اور خسارے کی فردِ حساب لیے۔ دنوں اور راتوں سے میری اب تک کی جو معاملت رہی ہے، اس میں منافع کم اور خسارہ زیادہ ہے۔ بلکہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ کیا میں اس خوش گمانی میں رہوں کہ نیا آنے والا سال تلافی کی کوئی صورت مجھے دکھائے گا؟ کیا میں اس سے کچھ امیدیں وابستہ کرلوں؟

لگتا یوں ہے کہ آنے والے دن بھی بہت واقعہ انگیز ہوں گے۔ یہ واقعات مہربان ہوں گے یا نامہربان؟ میں خود ہی جواب طلب ہوں اور خود ہی جواب دہ۔

سوچنا چاہیے کہ کیا کیوں ہے۔ ہر قوم پر یقین اور اعتماد کو ٹھیس کیوں لگتی ہے؟ اس قحط الرجال اور بے یقینی کی اس گرم بازاری کا کوئی تو سبب ہوگا۔ کیا انسان فطرتاً اچھے اور فطرتاً برے ہوتے ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی نے جو علم ارزاں کیا ہے، اس کی روشنی میں سماجی قدروں اور رشتوں کا مسئلہ کچھ یوں ہی ہے۔

میں جس سماج میں ہوں، خود غرضی اور خود مرادی اس کا دستور اور حق تلفی وہاں کا رواج ہے۔ ایک شخص اپنی خوشی کے لیے دوسروں کا دل چیر دیتا ہے۔ اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو مبتلائے فریب کرتا ہے اور ایک شخص پر کیا موقوف یہاں تو گروہ کے گروہ ایسے افعال میں ہمہ وقت و ہمہ رخ مصروف ہیں۔ شاید یہ میدان تیار ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں دوڑنے والے دوسروں کو پیچھے دھکیلتے، پاؤں تلے روندتے آگے بڑھیں۔ اب کون سلامت روی اختیار کرے۔ کیں وہ اب کوئی سلامت روی اختیار نہیں کرے گا۔ کوئی اپنا حق تلفی گوارا نہیں کرے گا۔

یہاں جو ہر اقلیت ہے وقوف ہے۔ "برے ہشیار" کا بھی کچھ زیادہ قصور نہیں، وہ اپنی برائی میں ایک تنہائی کا ہی ذمے دار ہے۔ باقی ذمے داری اس سماج کی تعمیری جس کی بنیاد ہی شر پر رکھی گئی ہے۔ اب یہاں جو ہے، وہ ہونا تھا۔

برف و باراں کی شام کو اگر کوئی خستہ حال مسافر کپکپاتا ہوا تمہارے مسکن کے پاس سے گزرے تو اسے پناہ دو، اپنا کمبل اسے اوڑھا دو، اس کی مدارات کرو اور میری جان اس کے لیے بھی تیار رہو کہ جب وہ واپس ہوگا تو تمہارے سینے میں چاقو اتار کے کل اسباب میزبانی کے کمبل میں لپیٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اسے آنے والی زمہریری شام کا خوف ستا رہا ہے اور آج شام جس کمبل نے اسے سردی سے پناہ دی ہے، وہ تمہارا ہے۔ اب اگر چلتے وقت وہ کچھ زادِ راہ اور یہ کمبل تم سے مانگتا ہے یا تم خود ہی یہ چیزیں اسے بخش دیتے ہو تو یہ احسان ہوگا۔

ایک مغربی دانشور کا کہنا ہے کہ انسانوں میں ابھی اتنی اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ احسان کا بوجھ سہار سکیں۔ وہ جو بولنا نہیں جانتا، اسے بولنا سکھاؤ، پر اس کی توقع کے ساتھ کہ جب وہ پہلی بار روانی سے بولے گا تو تمہیں گالی دے گا۔ جسے لکھنا نہیں آتا، اسے لکھنے کی مشق کراؤ، پر تم اس آدمی کے ساتھ کہ جب وہ اپنا نام لکھنا سیکھے گا تو سب سے پہلے تمہارے قتل کے محضر پر دستخط کرے گا۔

مگر یہ بددل ہونے کی بات نہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان سے مایوس ہو سکتا ہے لیکن انسانیت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ انسان صرف زمانے میں سانس لیتے ہیں اور انسانیت زمانوں میں زندہ ہے... تو اب کہ جب ہم نئے سال کے حاشیے پر کھڑے ہیں اور منفعت اور خسارے کی فردِ حساب ہمارے ہاتھوں میں ہے تو ہم انسانیت کے بارے میں سوچیں جو زمانوں میں زندہ اور زندہ رہے گی۔

☆☆☆

عزیزانِ من

السلام علیکم

جولائی 2018ء کا تازہ شمارہ عید کی خوشیاں لیے حاضر ہے۔ [illegible] مسلمانوں نے رمضان المبارک کے فیوض و برکات سے دامن بھرا [illegible] اور عید کا دن مجبوروں سے اور [illegible] کے لیے اہتمام کے طور پر عنایت کیا [illegible] معاشرتی حالات اور [illegible]

[illegible]

✽ عبدالجبار رومی انصاری [illegible] سرورق [illegible]

[illegible]

[illegible] اس کی جان کی [illegible] اوصاف [illegible] بہت اچھی [illegible]

[illegible] سسپنس کلاسک کی کہانی آخری کیل [illegible] آخری گھر [illegible] راحت نصیب ہی نہیں ہوئی [illegible]

"حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ [illegible] فرعون [illegible] من و سلویٰ [illegible] حضرت موسیٰ کو شکوے ہی کرتے تھے۔"

✽ چلیلی ہیر کی آمد جھنگ صدر سے "سرماہ استاف سسپنس ڈائجسٹ۔ 15 مئی کو ہی جون کا سسپنس ہمیں مل گیا۔ رمضان کریم شروع ہونے سے پہلے [illegible] سسپنس ڈائجسٹ [illegible] جون [illegible] عبداللہ [illegible] آغاز [illegible] مبارک باد [illegible] چلیلی [illegible] سسپنس کلاسک [illegible] آخری کیل [illegible] احمد صاحب [illegible] حضرت موسیٰ علیہ السلام [illegible] رضوانہ ساجد [illegible]"

✽ محمد رفاقت [illegible] سے محفل میں شریک ہیں "شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے جون ایلیا کی امید پڑھی [illegible] حضرت موسیٰ علیہ السلام [illegible] رضوانہ ساجد [illegible] آپ کو سسپنس پسند ہے اور سسپنس کو آپ کی دوستی۔"

محمد مجاہد ... نے تعریف ... ہیں ... پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے ... خوش آمدید) سسپنس کی قیمت میں پورے 10 روپے اضافے کے بعد اس بار ہے کہ اس کے اوراق میں کمی کر دی گئی ہے۔ یعنی یہ تو زیادتی ہے۔ (بے شک ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں مگر آسمان کی جانب گامزن مہنگائی نے ہر ایک کی کمر توڑ دی ہے۔ کاغذ کی قیمتوں میں اضافے کے سبب ایسا کرنا پڑا) ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی کافی دن سے پڑھنے کو نہیں مل رہی۔ خیریت تو ہے؟ منظر امام کافی پر فکر اور معاشرتی رویوں کو اجاگر کرتی کہانیاں لکھتے ہیں۔ سسپنس کے تمام لکھاری ماشاء اللہ بہت محنت اور جاں فشانی سے ہمارے لیے بامقصد اور اصلاحی کہانیاں لکھتے ہیں۔ میری طرف سے تمام لکھاریوں کو بہت شکریہ۔ مریم کے خان کی کہانیاں بھی غائب ہیں۔ [illegible] ہمارے کرپٹ سیاست دانوں اور جاگیرداروں [illegible] ایک بہترین تحریر تھی۔ [illegible] کے لیے ماموں کو موت کی آغوش میں [illegible] BSC [illegible] سسپنس سے محبت اپنی جگہ مگر تعلیم پر خصوصی توجہ پہلی ترجیح ہونی چاہیے)

محمد صفدر معاویہ کا خط ضلع خانیوال سے۔ [illegible] سسپنس [illegible] یاسین خان سے لیا۔ [illegible] کی مناسبت سے [illegible] آج کچ ثابت ہو رہی ہیں۔ [illegible] ایک ساتھ 32 صفحات کم کر دیے۔ [illegible] صرف کمانے کے چکر میں ہے۔ [illegible] کاشف زبیر [illegible] منظر امام [illegible] ساجد امجد [illegible] سسپنس [illegible] احمد اقبال [illegible] عید مبارک [illegible] (آپ سب کو ہماری جانب سے عید کی ڈھیروں مبارک باد)

زرین خان آفریدی، عبدالرحمن [illegible] کا انتظار [illegible] سسپنس [illegible] ہماری [illegible] رمضان کریم [illegible] سسپنس ڈائجسٹ [illegible]

[illegible] ریحان احسان [illegible] کراچی [illegible] بھی لاجواب رہیں۔ بہت بہت شکریہ اور سسپنس ڈائجسٹ میرے انتخاب کو اعزازی پوزیشن دینے کے لیے۔

رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”ارے واہ سسپنس کلاسک رہی خوب۔ آخر کار آپ نے سسپنس کلاسک کی ابتدا کر ہی دی۔ (کیوں نہ کرتے ... آپ کی فرمائش اور مرحوم مصنفین کو خراج تحسین ایک جگہ) اہل محفل اور دیگر قارئین کو چاہیے کہ وہ اپنے ... [illegible] فہرست میں اسما قادری کا نام دیکھا تو آنکھوں کے سامنے ایک شاندار محفل [illegible] ... آخری گھر بھی کافی اثر انگیز رہی تھی۔ [illegible] تیسری قبر بھی بڑی زوردار کہانی تھی۔ ازدواجی دلدل [illegible] علی اختر [illegible] اشرف تھوانی [illegible] (آپ خوش تو ہم خوش) [illegible] صفدر معاویہ، بابر عباس، ساجد انصاری اور وحدت صاحب کے اشعار دل کو بھا گئے۔ [illegible] ابھی نہیں چھاپتے“ (اب چھاپ دیا ... اب تو خوش)

اویس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے عرض کر رہے ہیں ”عرض ہے کہ سسپنس ڈائجسٹ بلاشبہ بہت ہاتوں ہاتھ لیا گیا۔ [illegible] یعنی 290 تقریباً۔ (آپ کی پسندیدگی اور محبت ایک طرف مگر قارئین کی جیب کی اجازت [illegible]) [illegible] رمضان شریف کا انتظار سال بھر ہوتا ہے جب آتا ہے تو پلک جھپکتے ہی اختتام ہو جاتا ہے۔ ہماری طرف سے سسپنس پڑھنے والے تمام دوستوں کو پرخلوص عید مبارک باد پیش ہے۔ سرورق پر ڈاکٹر صاحب کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ [illegible] منظر امام صاحب کی آخری گھر تھی۔ [illegible] تیسری قبر اور قاتل [illegible] ازدواجی دلدل بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ محفل شعروسخن میں [illegible] سسپنس [illegible] حضرت موسیٰ [illegible] اشرف تھوانی اور اسما قادری کی دونوں تحریریں آخری صفحات کا حق ادا کرنے میں حق بجانب تھیں۔ [illegible] عالم اسلام کو پیش ہے“ (خیر مبارک)

فضل عباس، بابر عباس، انگیاں روڈ، کھاریاں سے [illegible] سسپنس [illegible] رمضان [illegible] عید مبارک [illegible] سسپنس [illegible] سرورق [illegible] سسپنس کی قیمت [illegible] ماشاء اللہ [illegible]

آپ کی فرمائشوں پر عمل کیا جا رہا ہے اور سسپنس کا سلسلہ چل رہا ہے۔)

✽ محمد ہمایوں نقوی، مانسہرہ سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ [illegible]

✽ طارق خان، دولی محمد خیل سے لکھ رہے ہیں۔ "سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کے کانٹے پڑھے [illegible]

✽ محمد شعیب، کورنگی، کراچی سے "جون کا شمارہ چند دن انتظار کے بعد یعنی 15 کے بجائے 18 تاریخ کو ملا [illegible]

[illegible]

✽ محمد زبیر ساگر، اوکاڑہ سے "پیاری آپی عذرا رسول صاحبہ، آپ اور سسپنس کے پورے اسٹاف کے لیے دعاگو ہوں [illegible]

✽ خلیق ربانی انجم، چارسدہ سے لکھتے ہیں "جون 2018ء کا سسپنس [illegible] 18 [illegible]

[illegible]

کے پیچھے پڑنے والے میاں بیوی اور ایک دوسرے کی جان کے دشمن۔ کیسے کیسے زہریلے منصوبے، ایک سے بڑھ کر ایک موت کا پلان اور خود کو بچانے کی ترکیب بھی۔ دونوں کا کامیاب منصوبہ ایک ہار گیا اور ایک قسمت سے بچ گیا۔ [illegible] کہانی رک سی گئی ہے اور ایک دائرے میں گھومنے لگی ہے۔ [illegible] گھوم کر باہر نکلتی ہے تو ایک عجیب سا افسانوی رنگ طاری کر لیتی ہے۔ [illegible] بھروسا کرنا اور اس کا توڑنا [illegible] لیکن بھروسے کے بدلے ایک عذاب میں مبتلا کر دینا بہت بڑا گناہ ہے [illegible] معاشرے میں جہاں انصاف اور قانون کا وجود نہ ہو۔ [illegible] مجبور آدمی۔ [illegible] اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور بے گناہ کو بچا لیا گیا۔ آخری گیم، ایک مکار اور چالباز شخص [illegible] جس کا ساتھ دینے والے دو بھائی تھے [illegible] بھائی کی محبت کی عمدہ کہانی۔ کفارہ، [illegible] اسما قادری کے قلم نے جادو جگا دیا۔ ایک مجبور عورت اور اس کے عزم کی داستان۔ [illegible] اشعار کی محفل بھی اچھی رہی۔“

[illegible]

٭ناہید یوسف کی مہمانداری کراچی سے ”[illegible] جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے [illegible] ہم ان دنوں کراچی آئے ہوئے ہیں اپنے شوہر صاحب کے ساتھ، [illegible] اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے۔ [illegible]“

[illegible]

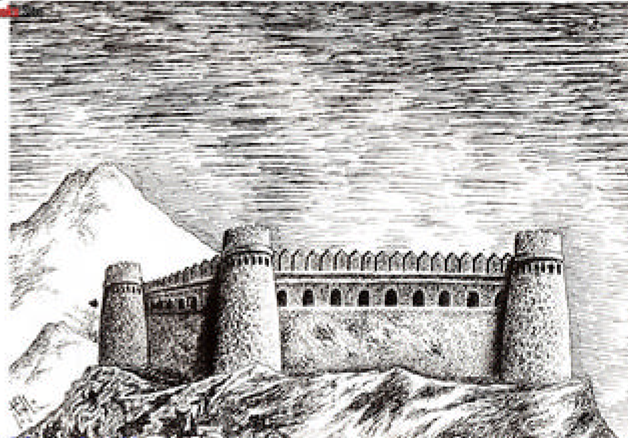
نااتفاقی

ڈاکٹر ساجد امجد

یہ تو سنتے چلے آئے ہیں اتفاق میں برکت اور نااتفاقی ہمیشہ زحمت کا باعث بنتی رہی ہے... بہر حال وہ دور بھی اتفاق سے نااتفاقی کا ایسا ہی دور تھا جس میں بہ ظاہر سب ایک دوسرے کے دوست مگر درحقیقت ایک دوسرے کی آستین میں سانپ بن کر بیٹھے تھے اور جب کسی کی گہری نگاہوں نے یہ سب بھانپ لیا تو کنڈلی مارے یہ ناگ پھن لہراتے باہر نکل آئے... برہان نظام شاہ، علی عادل شاہ اور سب سے بڑھ کر ایک عورت ہونے کے ناتے چاند بی بی نے جس حوصلے اور عزم کا راستہ اختیار کیا اس نے آنے والے لوگوں کے لیے تاریخ میں ایک یادگار باب رقم کر دیا ہے۔ محلاتی سازشیں اقتدار کی بنیاد کو ہلا دیتی ہیں اور جہاں لرزش جڑ پکڑ لے وہاں مضبوطی ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہی حال اس اتحاد و اتفاق کا بھی ہوا جو محض ذاتی مفاد کی خاطر حصول اقتدار کی جنگ لڑتے ہوئے آپس میں کرتے رہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات





...ہندوستان کی ریاست بیجاپور کے قصر شاہی میں رات اتر آئی تھی۔ موم شمعیں دریچوں سے جھانک جھانک کر رات کے آنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ محل کے تمام اضافی راستے بند کر دیے گئے تھے۔ فوجی دستے جگہ جگہ تعینات ہو گئے تھے۔ اسی محل کے ایک کمرۂ خاص میں حکمراں علی عادل شاہ کی بیوی چاند بی بی بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ بظاہر وہ راہداری میں نکل آتی لیکن محل میں پھیلا ہوا ہولناک سناٹا اسے پھر کمرے میں لے آیا۔

یہ بے قراری اس لیے تھی کہ علی عادل شاہ ابھی تک اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ رات آگئی ہو اور علی عادل شاہ کمرے میں نہ آیا ہو۔ اگر عین موقعے سے پہلے پہلے وہ شاہی کام نمٹا لیا کرتا تھا حتیٰ کہ اگر کوئی قاصد بھی آتا تو وہ اسے مہمان خانے میں بھیج دیتا کہ دن نکلنے کے بعد بات ہوگی۔ کوئی امیر بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ دن چھپنے کے بعد اس کے پاس کسی کام سے حاضر ہو۔

چاند بی بی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ''بیدر'' کی ریاست کی جانب سے کوئی سفارت آئی ہے۔ علی عادل شاہ اس سے مصروف گفتگو ہے۔ یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ تھا کہ آخر ایسی کیا بات چیت ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اچانک اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں احمد نگر سے پھر کوئی معرکہ تو درپیش نہیں ہو گیا۔ احمد نگر چاند بی بی کا میکا تھا



جہاں اس کا بھائی مرتضیٰ شاہ بحری قزاقی کر رہا تھا۔ بیدر اور احمد نگر میں دشمنی چلی آرہی تھی۔ علی عادل شاہ، بیدر کا اتحادی تھا لہٰذا یہ خطرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا کہ اس کے میکے اور سسرال میں جنگ نہ چھڑ جائے۔ یہ چاند بی بی کی بصیرت اور دور اندیشی تھی کہ اب تک یہ نوبت نہیں آئی تھی۔

وہ ان خیالوں میں بہت دور تک چلی گئی تھی کہ چوب داروں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ علی عادل اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی دستک ہوتی، اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ علی عادل شاہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چاند بی بی نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ ناگواری اور اداسی علی عادل شاہ کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ سر جھکائے اس کے ساتھ اندر آگیا۔ چاند بی بی کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کوئی سوال کرتی۔ وہ صرف اتنا کر سکی کہ اس کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے خفا ہو؟" علی عادل شاہ نے اس کی خاموشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ سے خفا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم تو صرف یہ سوچ رہے ہیں کہ ایسی کیا بات ہوئی کہ آپ افسردہ ہیں۔"

"سلطنت کے بکھیڑوں میں بہت سی الجھنیں ہو جاتی ہیں۔"

"ہمیں نہیں بتائیے گا۔"

"ضروری نہیں کہ ہر بات آپ کو بتائی جائے۔" علی عادل شاہ کے لہجے میں ایسی تلخی تھی جو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

علی عادل شاہ بستر پر دراز ہو گیا۔ چاند بی بی نے اب کسی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنے بستر پر چلی گئی۔

علی عادل شاہ کچھ دیر پہلے ہونے والے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ اسے امیر علی برید حاکم بیدر پر سخت غصہ تھا۔ وہ اس کا اتحادی تھا۔ علی عادل شاہ نے کئی معرکوں میں اس کی مدد کی تھی لیکن اب وہ اس کی اتنی سی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کئی مرتبہ کی کوششوں کے بعد ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا اور اب تو اس نے صاف انکار کہلا بھیجا تھا۔ وہ ہر مسئلے کو چاند بی بی کے سامنے رکھتا تھا۔ وہ اتنی زیرک تھی کہ کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیتی تھی لیکن یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ علی عادل شاہ نے کہیں سے سنا تھا کہ امیر علی برید کے پاس نہایت حسین و جمیل دو خواجہ سرا ہیں۔ علی عادل شاہ نہایت جمال دوست تھا۔ اسے خوب صورت خواجہ سراؤں اور غلاموں کو جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے جب سنا کہ امیر برید کے پاس دو خوب صورت خواجہ سرا ہیں تو اس نے اپنا ایک قاصد اس کے پاس روانہ کیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس دو نہایت ہی حسین اور خوب صورت خواجہ سرا ہیں۔ تم فوراً ان خواجہ سراؤں کو میرے پاس روانہ کر دو۔"

اس کا خیال تھا کہ مثبت جواب ملے گا لیکن اس نے مختلف بہانے کر کے قاصد کو واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد بھی ٹال مٹول سے کام لیتا رہا اور اس مرتبہ تو صاف انکار کر دیا۔

بے چینی اتنی بڑھی کہ علی عادل شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاند بی بی اس کی بے چینی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھنے کی کوشش کی لیکن یہ بات ایسی تھی کہ علی عادل شاہ نے کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا اور یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ وقت آنے پر اسے خود معلوم ہو جائے گا۔

صبح تک علی عادل شاہ طے کر چکا تھا کہ وہ ایک سفارت مرتضیٰ نظام شاہ بحری (چاند بی بی کا بھائی) کو احمد نگر کے پاس بھیجے گا اور اسے "بیدر" پر حملہ کرنے پر اکسائے گا۔



جب صبح ہوئی تو علی عادل شاہ نے اپنے ایک امیر کشور خاں کو طلب کیا۔ اصل بات پھر بھی چھپائی۔ اس سے صرف اتنا کہا کہ وہ مرتضیٰ شاہ کو صرف اتنا بتا دے کہ امیر برید سے ہمارا اتحاد ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ آزاد ہے کہ بیدر پر حملہ کر دے۔ ہم امیر برید کا ساتھ نہیں دیں گے۔

کشور خاں کو اس پیغام پر حیرانی ہوئی۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس طرح تو ہم اکیلے ہو جائیں گے۔"

"ہم کیوں اکیلے ہو جائیں گے؟"

"امیر بیدر سے ہمارا اتحاد ہے۔ مرتضیٰ نظام کو جونہی معلوم ہو گا کہ ہمارا اتحاد ختم ہو گیا، وہ نہ صرف بیدر پر حملہ آور ہو گا بلکہ بیجاپور کی طرف بھی بڑھے گا۔"

"اس کی یہ ہمت بھی نہیں ہو گی۔"

"وہ اپنے مطلب کے لیے رام راج سے اتحاد کرے گا جو ہمارا دشمن ہے۔"

"جب وہ وقت آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو جو آپ سے کہا جا رہا ہے وہ کریں۔"

یہ منطق کشور خاں کی سمجھ میں نہ آئی لیکن وہ اس حکم سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حکم کی تعمیل کی اور احمد نگر پہنچ گیا۔

مرتضیٰ نظام تو جیسے انتظار ہی میں بیٹھا تھا۔ اس نے نہ

عادل شاہ کی خدمت میں تحائف بھی روانہ کیے۔

کشور خاں واپس چلا آیا اور اس کے آتے ہی مرتضیٰ نظام نے بیدر پر حملہ آور ہونے کی تیاری شروع کر دی۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ مرتضیٰ نظام بیدر پر حملہ آور ہو گیا۔ اسے اب عادل شاہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے اس نے کسی اور طاقت کو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بیدر کا محاصرہ کر لیا۔

امیر برید کو جیسے ہی مرتضیٰ نظام کے حملہ آور ہونے کی خبر ملی، وہ علی عادل شاہ سے مدد کا طالب ہوا۔ بس یہی وہ وقت تھا جب علی عادل شاہ کو اپنے آدھے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔ اس نے امیر برید کو لکھ بھیجا۔

"میں دو ہزار سواروں سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ وہ دو غلام تم میری خدمت میں روانہ کرو جن کا میں نے مطالبہ کیا تھا۔"

امیر برید اب مجبور ہو گیا کہ اس کا مطالبہ مان لے۔ علی عادل شاہ نے دو ہزار سوار روانہ کر دیے۔ مرتضیٰ نظام نے جب علی عادل شاہ کی یہ عہد شکنی دیکھی تو خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

امیر برید نے دونوں خواجہ سراؤں کو اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

"میں ہرگز تمہیں خود سے جدا نہ کرتا لیکن مجھے اپنی سلطنت بھی عزیز ہے۔ اگر تم دونوں علی عادل شاہ کے پاس نہ گئے تو وہ حملہ آور ہو جائے گا۔ تمہاری وفاداری کا تقاضا ہے کہ تم میری سلطنت بچا لو۔ میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد تم دونوں کو کسی بہانے سے واپس بلا لوں گا۔"

دونوں خواجہ سرا مجبور تو ہو گئے لیکن نہایت ناگواری سے تیار ہوئے اور بیجاپور روانہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک خواجہ سرا نے اپنا خنجر اپنے ساتھ لے لیا اور ارادہ کر لیا کہ وہ موقع دیکھتے ہی علی عادل شاہ کا کام تمام کر دے گا۔

دونوں خواجہ سرا جب بیجاپور پہنچے اور حضور شاہ میں پیش ہوئے تو علی عادل شاہ ان کے حسن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کے حسن سے زیادہ اسے اپنی عقل پر ناز ہو رہا تھا کہ کس طرح اس نے امیر برید کو مجبور کر ہی دیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ وہ بڑی بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات ہوئی تو اتفاق سے اسی خواجہ سرا کو خلوت میں طلب کیا جو خنجر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس خواجہ سرا نے موقع دیکھتے ہی

رخصتی

ایک بچہ شادی میں رخصتی کے وقت اپنی ماں سے۔ "امی دلہن تو بہت روتی ہے۔ دولہا کیوں نہیں رو رہا؟"

ماں۔ "بیٹا! دلہن گیٹ تک روئے گی اس کے بعد دولہا قبر تک روئے گا۔"

☆☆☆

سسرال

ایک آدمی اپنی سسرال گیا۔ اس کی ساس نے پہلے دن اسے پالک کھلائی۔ دوسرے دن میتھی کھلائی۔ تیسرے دن اسے ساگ کھلا دیا۔ چوتھے دن اس سے پوچھا۔ "بیٹا! آج کیا کھاؤ گے؟"

آدمی نے جواب دیا۔ "مجھے کھیت دکھا دو میں چر آؤں گا۔"

☆☆☆

عزت

ہمیشہ ڈاکٹر کی عزت کرو۔ اس کی ذرا سی غلطی آپ پر مٹی ڈال سکتی ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، ضلع ہزارہ

خنجر علی عادل شاہ کے پیٹ میں اتار دیا اور صبح ہوتے ہی فرار ہو گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی اسی میں عافیت جانی کہ نکل جائے لیکن پکڑا گیا۔ سب کو یہی شبہ ہوا کہ یہی تھا جس نے قتل کیا ہے لہٰذا اسی وقت قتل کر دیا گیا۔

علی عادل شاہ کی تجہیز و تکفین کے بعد اس کی جانشینی کا مرحلہ تھا۔ علی عادل شاہ کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے بھائی کے بیٹے ابراہیم کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ علی عادل کی بے وقت موت نے اسے تخت شاہی پر بٹھا دیا حالانکہ اس کی عمر اس وقت محض دس برس کی تھی۔ یہ عمر ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ امور سلطنت چلا سکتا۔ چاند بی بی دور اندیش نے ایک نہایت زیرک اور ایماندار امیر کامل خاں دکنی کو اس کا اتالیق مقرر کر کے تمام امور سلطنت اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ پس پردہ وہ خود موجود تھی۔ کامل خاں دکنی پابند تھا کہ وہ ہر معاملے میں چاند بی بی سے مشورہ کرے۔ شہزادہ ابراہیم کی تعلیم و تربیت چاند بی بی کے ہاتھ میں تھی۔

کو شادی اس نے نکاح کر کے اور دیار میں لاتا اور تمام لوگوں کو بادشاہ کے حضور میں آنے کا سوچ رہا تھا۔
ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ کامل خان کا ظرف جواب دے گیا۔ اقتدار کا نشہ سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اس کے طور طریقوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ اپنی قوت پر اتنا نازاں ہوا کہ چاند بی بی کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔ چاند بی بی کو اپنی یہ بے عزتی برداشت نہ ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کامل خان کو اس کے عہدے سے ہٹا دے گی۔ اس سے پہلے کہ اس کی قوت میں اضافہ ہو وہ اس کی قوت کو مٹا دے گی۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا لیکن وہ بھی چاند بی بی تھی، کوئی عام خاتون نہیں تھی۔ اس نے ایک اور طاقتور امیر کشور خان سے رابطہ کیا اور اسے یہ پیغام بھیجا۔
"کامل خان دکنی اب منصبِ وکالت کے قابل نہیں رہا۔ میری خواہش ہے کہ یہ خدمت اب تم سنبھالو۔ جس طرح بھی ہو کامل خان کو ٹھکانے لگا دو۔ اس معاملے میں عجلت سے کام لینا۔ اگر ذرا بھی تاخیر ہوگئی تو پھر کامل خان کی قوت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔"
چاند بی بی نے کشور خان کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ کشور خان اور کامل خان دکنی کی پرانی دشمنی تھی۔ چاند بی بی کا پیغام ملتے ہی کشور خان کو تو جیسے کامل خان سے بدلہ لینے کی اجازت مل گئی۔ اس نے چار سو مسلح آدمیوں کو ساتھ لیا اور بیجاپور کے قصر کی طرف روانہ ہوا۔
کشور خان نے قلعے کے اندر پہنچ کر قلعے کا دروازہ اندر کی طرف سے بند کر لیا اور قلعہ دار کو قید کر لیا۔ کامل خان کو جب کشور خان کی آمد اور نیت کا علم ہوا تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے شاہی حرم کی طرف بھاگا۔ اس کا خیال تھا کہ چاند بی بی اس کی جان کی حفاظت کرے گی لیکن جب چند خادموں کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ چاند بی بی کے اشارے سے ہی ہو رہا ہے تو اس نے ارادہ بدل دیا۔ اب اسے اپنی جان بچانے کے لیے قلعے سے باہر نکلنا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ قلعے کے دروازے پر کشور خان نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ شاہی محل کے پیچھے قلعے کی دیوار پر چڑھ گیا اور پیچھے خندق میں کود گیا اور تیرتا ہوا پار اتر گیا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا کہ وہ کامل خان دکنی ہو سکتا ہے۔
مقام پانچ دروازہ امام تک گیا اور پھر درختوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا حصارِ شہر پر جا پہنچا۔ یہ حصار بارہ گز اونچا تھا۔ حصار سے نیچے اترنے کے لیے اس نے یہ اہتمام کیا کہ اپنی پگڑی، شال اور کمربند کو ایک دوسرے سے باندھ کر ایک کمند سی بنالی اور اس کا ایک سرا دیوار کے کنگرے سے باندھ کر نیچے اتر گیا اور اسی پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں اپنے گھر پہنچ گیا جو شہر سے باہر تھا۔
ادھر کشور خان نے کامل خان کو تلاش کرنا شروع کیا۔ کشور خان اور اس کے ساتھیوں کو یہ وہم بھی نہیں تھا کہ کامل خان ایسی برق رفتاری سے کام لے کر محل سے فرار ہو جائے گا۔ پہلے تو انہوں نے قلعے ہی میں تلاش کیا۔ آخر معلوم ہو گیا کہ وہ حصار سے نیچے اترا ہے اور یقیناً اپنے گھر گیا ہوگا۔ کشور خان نے ایک جماعت کو کامل خان کے گھر کی طرف بھیجا کہ اسے گرفتار کر کے لایا جائے۔
کامل خان کو معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی جماعت اسے گرفتار کرنے ضرور آئے گی۔ اس نے اپنی تمام دولت اور نقد رقم ساتھ لی اور سات آٹھ ساتھیوں کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ احمد نگر چلا جائے گا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی پہنچا ہوگا کہ کشور خان کے آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کے ساتھی اسے چھڑانے کی کوشش نہ کریں، اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور اس کے تمام مال و اسباب کو لوٹ کر چلتے بنے۔
کامل خان جیسے طاقتور امیر کا انجام یہ ہوگا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چاند بی بی نے کچھ ایسی مہارت سے چال چلی کہ کامل خان کی بازی الٹ گئی۔
کشور خان کی بھیجی ہوئی جماعت کامل خان کا کٹا ہوا سر لے کر پہنچی تو کشور خان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ اس نے فوراً یہ خبر چاند بی بی تک پہنچا دی۔
"یہ سر دشمن کا نہیں دوست کا ہے۔ اپنی خوشی کو بھی چھپاؤ اور اس "سر" کو بھی۔" چاند بی بی نے نہایت دانشمندی کا فیصلہ کیا۔ "جب تک ہو سکے اس خبر کو چھپاؤ۔ جن لوگوں پر کامل خان کے احسانات ہیں وہ اس کا بدلہ لینے ضرور اٹھیں گے اور ہماری سلطنت انتشار کا شکار ہو جائے گی۔"
"ملکہ عالیہ! کیا یہ خبر ایسی بھی ہے جسے چھپایا جا سکے؟"

"...چاہیے۔ اس کی خبر کسی کو معلوم نہ ہو۔ سر کو دفن کرا دو اور کامل خان کو تلاش کرتے رہو۔ یہ تاثر دو کہ کامل خان گرفتار نہیں ہو سکا۔ وہ ابھی تک مفرور ہے۔ کچھ لوگوں کو احمد نگر اور بیدر کی طرف بھی بھیجو تاکہ ان ریاستوں کے حکمران بھی یہی سمجھتے رہیں کہ کامل خان مقتول نہیں مفقود الخبر ہے۔"
کشور خان نے اس مشورے پر عمل کیا۔ اس کی جو جماعت کامل خان کا سر کاٹ کر لائی تھی، اسے بھی تنبیہ کر دی کہ وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ مختلف ریاستوں کی طرف اپنے نمائندے بھی بھیجے اور یہ ظاہر کیا کہ کامل خان کو تلاش کیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام امورِ سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چاند بی بی کے مشورے کے مطابق بڑی مستقل مزاجی سے اپنے فرائض انجام دینے لگا۔
☆☆☆
ایک گھڑ سوار احمد نگر کی حدود میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا منہ سیاہ نقاب میں ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ شہر میں داخل ہوا اور ایک حویلی کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گھوڑے سے اترتا، چند مسلح سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔
"اے، کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟"
"مجھے عمر خان سے ملنا ہے۔"
"اپنا نام بتاؤ۔"
"میں اپنا نام نہیں بتا سکتا۔"
"کہاں سے چلے آ رہے ہو؟"
"بیجاپور سے۔"
"جب نام نہیں بتاؤ گے تو ہم کیا بتائیں گے؟"
"ان سے کہنا تمہارا دوست آیا ہے۔"
"یہ کیا تعارف ہوا۔ دوست تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔"
"وہ مجھے دیکھے گا تو خود پہچان لے گا۔"
یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوار ہرگز مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے اسے حکم دیا کہ وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئے۔ سوار نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔
"ہم تمہاری تلاشی لیں گے۔"
"میری کمر میں ... ساتھ جائے گی۔ اس کے علاوہ میرے پاس ... اور ایک خنجر بھی موجود ہے۔"
"ہوں... اس کا مطلب ہے تم ..."
"میں اتنا طویل سفر کر کے آیا ہوں۔ بغیر ہتھیار کے نہیں آ سکتا تھا۔"
"تمہیں تلوار اور خنجر ہمارے حوالے کرنا ہوں گے۔"
"یہ کتنے خطرناک ... اندر سے پوچھ کر تمہیں واپس کر دیں گے۔"
"ایسا ہی ہوگا۔"
"عمر خان کو جا کر خبر کر دو۔ یہ ضرور کہنا کہ آپ کا دوست بیجاپور سے آیا ہے۔"
ان سپاہیوں میں سے ایک اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور وہ بے تحاشا آنے والے سے لپٹ گیا۔
"عمر خان! اپنے آدمیوں سے کہو میری تلوار اور خنجر واپس کر دیں۔"
"تم اندر تو آؤ۔ دونوں چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔"
وہ سوار عمر خان کے ہمراہ اندر چلا گیا۔
"اور سناؤ شہباز خان کیسے آنا ہوا۔ مجھے یقین ہے کوئی اہم خبر ہوگی جو تمہیں یہاں لے آئی۔"
"کامل خان دکنی قتل کرا دیا گیا۔"
"ارے نہیں، یہ کب اور کیسے ہو گیا؟"
"اس نے جان بچانے کے لیے احمد نگر کا قصد کیا تھا مگر راستے ہی میں مارا گیا۔"
"مگر کیوں... کس کے اشارے پر؟"
"اسے چاند بی بی نے کشور خان کے ذریعے ٹھکانے لگا دیا۔"
"مگر کیوں؟"
اس کے جواب میں شہباز خان نے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔
"کمال ہے یہ خبر اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچی۔"
"اس لیے کہ چاند بی بی نے اس خبر کو چھپانے کا حکم دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مرتضیٰ نظام شاہ تک یہ خبر پہنچے اور وہ اس کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔"
"اب جو بھی ہو، میں یہ خبر مرتضیٰ نظام شاہ تک ضرور پہنچاؤں گا بلکہ اپنے دوست کامل خان کا بدلہ لینے کے لیے اسے بیجاپور پر حملہ کرنے کی ترغیب بھی دوں گا۔"
"تمہیں ترغیب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ چاند بی بی اور مرتضیٰ نظام شاہ کے درمیان حالات پہلے ہی کشیدہ ہیں۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ چاند بی بی کامل خان کے قتل میں ملوث ہے تو وہ اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ چاند بی بی نے جو میری بے عزتی کی اس کا جواب یہی ہے کہ میں بیجاپور کی ہر خبر احمد نگر تک پہنچاؤں اور وہ تم ہو۔"
"شکریہ دوست...!"

نظام کے حضور حاضر ہو گیا۔ اسے محض خبر سنانی تھی لیکن اس خبر میں اپنی جانب سے ایسا اضافہ کر دیا کہ مرتضیٰ نظام کے ہوش اڑ گئے۔

"مجھے بیان کرتے ہوئے حجاب محسوس ہو رہا ہے لیکن کیا کروں، حقیقت یہی ہے جو مجھ تک پہنچی ہے۔"

"عمر خاں! جو کہنا ہے کہو، ہم سننے کو تیار ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے کامل خاں دکنی کو قتل کر دیا گیا ہے؟"

"عمر خاں! تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔"

"یہ خبر ہم تک پہنچی کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ اس کے قتل کو چھپایا گیا ہے اور اس خبر کو چھپانے کا حکم دینے والی آپ کی ہمشیرہ چاند بی بی ہیں۔"

"وہ کیوں چھپا رہی ہیں؟"

"اس لیے کہ کامل خاں کو آپ سے وفاداری کے جرم کی سزا دی گئی ہے۔ چاند بی بی کو یہ خوف تھا کہ آپ کامل خاں کے قتل کا بدلہ ضرور لیں گے۔"

"ہمیں تفصیل بتاؤ عمر خاں۔"

"چاند بی بی کو یہ گوارا نہیں ہے کہ احمد نگر پر آپ حکومت کریں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔"

"انہوں نے کامل خاں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی سپہ سالاری میں احمد نگر پر حملہ کرے۔ کامل خاں نے انکار کر دیا۔ چاند بی بی نے اسے اپنی بے عزتی تصور کیا اور کشور خاں کے ذریعے اسے قتل کرا دیا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ بیجاپور سے فرار ہو کر آپ کے پاس پناہ لینے احمد نگر آ رہا تھا کہ کشور خاں نے تعاقب کر کے اسے راستے ہی میں ٹھکانے لگا دیا۔"

"ہم کامل خاں کو پناہ دیتے یا نہ دیتے لیکن خدا کی قسم ہم اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔" مرتضیٰ نظام نے کہا۔

عمر خاں یہ چنگاری ڈال کر واپس آ گیا۔

اس کے جاتے ہی مرتضیٰ نظام نے سپہ سالاروں اور امرا کا اجلاس طلب کیا۔

"آپ لوگوں نے سن لیا ہوگا کہ بیجاپور کا کامل خاں دکنی قتل کر دیا گیا۔ یہ بیجاپور کا اندرونی معاملہ ہے لیکن کامل خاں ہماری وفاداری کے جرم میں قتل کیا گیا ہے۔ چاند بی بی نے اسے ہم پر حملہ کرنے کے لیے بھیجنا چاہا تھا۔ یہ حکم اس نے نہیں مانا۔ وہ قتل ہو گیا لیکن حکم ابھی باقی ہے۔ چاند بی بی

ملک دے بھی دیا ہوگا لہٰذا ہم چاہتے ہیں اس سے پہلے ہم بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔"

تمام باحیثیت افراد نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور حملے کی تیاری ہونے لگی۔

☆☆☆

کشور خاں کو اطلاع ملی تھی کہ مرتضیٰ نظام شاہ کا سر نوبت بہزاد ملک ترک پندرہ ہزار سواروں کا لشکر لے کر عادل شاہی سرحد کے بعض پرگنوں کو فتح کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ اس نے اس خبر سے پہلے چاند بی بی کو آگاہ کیا اور پھر ابراہیم عادل شاہ ثانی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ابراہیم کی عمر اس وقت دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی ذاتی صلاحیت اپنی عمر سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے اس اطلاع کو نہایت سکون سے سنا اور کہا۔

"ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کریں۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ ملک ترک سے مقابلے کے لیے لشکر روانہ کیا جائے۔"

اس حکم کی وصولی کے بعد کشور خاں نے سرمحل میں چاند بی بی سے ملاقات کی۔ اس کی اجازت کی ضرورت اس لیے تھی کہ مرتضیٰ نظام شاہ اس کا بھائی تھا۔ چاند بی بی کا مشورہ بھی یہی تھا کہ صلح کا ہاتھ بڑھانے سے بہتر ہے کہ دفاع کیا جائے۔ البتہ اس نے مسلمان ریاستوں کے حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی پر افسوس ضرور کیا۔

"جنوبی ہندوستان میں چار بڑی ریاستیں ہیں۔ ان میں سے تین مسلم ریاستیں ہیں صرف ایک بیجانگر ہندوؤں کے پاس ہے۔ اگر مسلم ریاستیں اتحاد کے ساتھ رہیں تو ہندو ریاست بھی مسلم ریاست میں تبدیل ہو جائے لیکن مسلم ریاستیں آپس میں دست و گریباں رہتی ہیں بلکہ اپنے ہم قوموں پر حملہ کرنے کے لیے ہندو راجا رام راج سے مدد مانگتے ہیں جبکہ ہندوؤں کا منصوبہ ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑواتے رہو۔ مرتضیٰ نظام بھی یہی نادانی کر رہا ہے اور میں مجبور ہوں کہ اپنا دفاع کروں۔"

چاند بی بی کی تقریر اتنی جذباتی تھی کہ کشور خاں آبدیدہ ہو گیا۔

"میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا اور بیجاپور کی حفاظت کروں گا۔"

"مرتضیٰ نظام یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ بیجاپور پر ایک کم عمر لڑکا حکومت کر رہا ہے۔ اسے یہ بتا دو کہ یہاں چاند بی بی اور

کشور خاں بھی ہیں۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

کشور خاں نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد عین الملک، آتش خاں اور دوسرے حبشی امراء اخلاص خاں اور دلاور خاں وغیرہ کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ بہزاد ملک ترک کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔

یہ ابراہیم عادل شاہ کے دور حکومت کی پہلی مہم تھی لہٰذا مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں۔ دکانداروں نے شہر کو...... ریشمی کپڑوں سے آراستہ کیا۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق مٹی کے برتنوں میں روپے بھر بھر کر لشکر پر نچھاور کیے گئے۔

نہایت دھوم دھام سے یہ لشکر روانہ ہوا۔

یہ تمام امراء شاہ درگ کے قریب پہنچے اور چند روز اس جگہ قیام کیا۔ طلایہ گردوں نے گھوم پھر کر معلوم کیا کہ نظام شاہی لشکر یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی چلنے کی تیاری ہوئی اور گرد اڑائے بغیر آہستہ روی کے ساتھ فاصلہ طے ہونے لگا۔

جب بہزاد ملک کو عادل شاہی لشکر کی آمد کا علم ہوا تو اس نے اپنی فوج کو منظم و مرتب کیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔

بہزاد ملک نے حملے میں پہل کی لیکن جلد ہی اسے عادل شاہی لشکر کی قوت کا اندازہ ہوگیا۔ جب تک اس کا لشکر تازہ دم رہا وہ مقابلہ کرتا رہا لیکن پھر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا اور محض چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد نظام شاہی لشکر اپنا مال و متاع چھوڑ کر فرار ہوگیا۔

جو امراء اس جنگ میں شریک تھے انہوں نے فتح نامہ بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ سارے شہر میں فتح کی خوشی منائی گئی۔ تمام چوکوں اور بازاروں میں شربت تقسیم کیا گیا۔ چاند بی بی نے کشور خاں کو حکم دیا کہ تمام امیروں کو خلعت عطا کیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔

اس فتح نامے کے ذریعے چاند بی بی کو معلوم ہوا کہ نظام شاہی مال و متاع میں چند ہاتھی بھی ہیں جو امراء کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہ ہاتھی چونکہ اس کے بھائی کی مملکت کے تھے لہٰذا وہ انہیں شاہی اصطبل میں محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کشور خاں کو حکم دیا کہ جو ہاتھی ہاتھ لگے ہیں، انہیں شاہی اصطبل میں داخل کرا دیا جائے۔

امرائے کبار کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ حکم چاند بی بی کی طرف سے دیا گیا ہے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ کشور خاں نے اپنی طرف سے یہ حکم جاری کیا ہے لہٰذا سب کے سب ہی تمام امراء جمع ہوئے اور کشور خاں کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے لگے۔

"یہی شخص کامل خاں کے قتل میں ملوث ہے اور اب ہمارے مال کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

"ہم اس کے ملازم نہیں ہیں کہ اس کا حکم مانتے پھریں۔"

"کشور خاں اپنی حیثیت کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

"یہ شخص اگر ہمارے سروں پر باقی رہا تو ہمیں اسی طرح ذلیل کرتا رہے گا۔"

"یہ شخص اس قابل نہیں کہ عہدے پر برقرار رہے۔ چاند بی بی کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جائے جس میں اس سے درخواست کی جائے کہ کشور خاں کو معزول کر کے مصطفیٰ خاں کو مقرر کیا جائے۔"

تمام تر بحث کے بعد اخلاص خاں نے جو بہت دیر سے خاموش تھا، اپنی رائے پیش کی۔

"بہزاد خاں ترک کی شکست کی خبر سن کر مرتضیٰ نظام ایک لشکر لے کر نکلا ہے تاکہ بیجاپور پر حملہ آور ہو لہٰذا فی الحال خاموش رہنا بہتر ہے۔ اچھا یہی ہے کہ مرتضیٰ نظام کے قضیے کو نمٹا کر خود پایہ تخت پر حاضر ہوں اور چاند بی بی کی رائے کے مطابق اس معاملے کو طے کیا جائے۔"

تمام امراء اس پر متفق ہوگئے۔

کشور خاں کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہوگیا کہ اس کی معزولی کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں اور اس کی جگہ مصطفیٰ خاں کی تعیناتی کی سازش تیار ہو رہی ہے۔ اسے کامل خاں دکنی یاد آگیا جس کے قتل کے بعد اسے یعنی کشور خاں کو اقتدار ملا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس شخص کو کیسے سمجھایا جائے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مصطفیٰ خاں کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو یہ سازش خود بخود دم توڑ جائے گی۔

یہ سوچنا آسان تھا لیکن اس پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔ مصطفیٰ خاں کو قتل کرانے کے لیے چاند بی بی کی رضامندی اور تحریری حکم نامہ ضروری تھا۔ مصطفیٰ خاں کے خلاف کوئی ایسا جواز بھی نہیں تھا جسے بہانہ بنا کر اس کے قتل کے احکام پر دستخط لے لیے جاتے۔ اس نے بہت سوچ کر سلطنت کے بہت سے کام جمع کر لیے جن پر چاند بی بی کے دستخط لینے تھے۔ مختلف درخواستیں تھیں اور چاند بی بی کی خدمت میں پیش کیا۔ ان درخواستوں میں ایک مصطفیٰ خاں کے قتل کا حکم نامہ بھی تھا۔ اس نے یہ سب درخواستیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ چاند بی بی اس پر نہایت بھروسا کرتی تھی۔ وہ ان درخواستوں پر بغیر پڑھے دستخط کرتی چلی گئی

پھر ثبت کر دے۔

کشور خاں کی مٹھی میں مصطفیٰ خاں کے قتل کا فرمان دبا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ یہ کام کس سے لینا ہے۔ اس نے یہ حکم نامہ اور ایک پیغام لفافے میں بند کر کے شاہی مہر کے ساتھ ایک امیر مرزا نور الدین کے پاس روانہ کر دیا۔

یہ حکم نامہ جب مرزا کے ملاحظے میں آیا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ابھر آئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ حیران بھی ہوا کہ یہ حکم نامہ اس کے پاس کیوں بھیجا گیا ہے کیونکہ مصطفیٰ خاں اس کا محسن تھا۔ پھر اس نے وہ لفافہ کھولا جو اس کے نام لکھا گیا تھا۔ اس میں یہ عبارت درج تھی۔

"مصطفیٰ خاں کو فوراً قتل کر دو۔ اس کے بعد مصطفیٰ خاں کی تمام جاگیر اور مال و دولت کا مالک تمہیں بنا دیا جائے گا۔"

مرزا نور الدین محمد مشہدی تھا اور ایک لڑائی میں گرفتار ہوا تھا۔ پھر مصطفیٰ خاں کی عنایت شاہی سے امراء کے گروہ میں داخل ہوگیا تھا۔ اس طرح مصطفیٰ خاں اس کا محسن تھا لیکن اس عبارت کو پڑھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مصطفیٰ خاں کی جاگیر اور مال و دولت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس نے تمام احسانات کو بالائے طاق رکھ کر مصطفیٰ خاں کے قتل کا ارادہ کر لیا۔ کشور خاں کو پیغام بھیجا کہ کام ہو جائے گا۔

مرزا نور الدین نے ایک شخص محمد امین کو اپنے پاس بلایا اور اس کے سامنے شاہی فرمان رکھ دیا۔ جب وہ اس فرمان کو پڑھ چکا تو اسے مرزا نور الدین نے شیشے میں اتارا۔

"مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مصطفیٰ خاں نے اہل دکن کو قتل کر کے کچھ غیروں کو ان لوگوں کی جگہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ نیز اس کی خواہش ہے کہ بغاوت اور سرکشی سے کام لے کر بہت سی جاگیروں پر قبضہ کر لے۔ اس وقت تمہارا یہ فرض ہے کہ تم شاہی فرمان کے مطابق عمل کرو اور مصطفیٰ خاں سے بالکل نہ ڈرو۔ یاد رکھو اس قتل پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا کیونکہ تم شاہی فرمان پر عمل کرو گے۔

"اگر تم کامیاب ہوگئے تو تمہیں انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اتنی دولت ملے گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کام تم کس طرح کرو گے یہ تم جانو اور ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ قتل نہ کرنے کی صورت میں عتاب شاہی کے

انعام و اکرام کا لالچ اس کے دل میں آ ہی چکا تھا۔ مرزا کا اس کر وہ ڈر بھی گیا۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی۔ اب اسے محض یہ سوچنا تھا کہ مصطفیٰ خاں کے قتل کی کیا ترکیب ہو۔

محمد امین شام کے وقت قلعے میں داخل ہوا اور مصطفیٰ خاں کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ میں ایک انتہائی ضروری فرمان لے کر حاضر ہوا ہوں۔ مصطفیٰ خاں نے محمد امین کی بات پر اعتبار کر لیا اور اسے ایک عمدہ اور آرام دہ مکان میں ٹھہرا دیا۔

محمد امین نے مصطفیٰ خاں کو کہلوایا کہ اب رات ہوگئی ہے، میں شاہی فرمان صبح کے وقت دیوان عام میں پڑھ کر سناؤں گا۔

رات کو جب سب لوگ سو گئے تو محمد امین نے قلعے کے محافظوں کو شاہی فرمان دکھا کر مصطفیٰ خاں کے قتل پر راضی کر لیا۔ صبح کو جب مصطفیٰ خاں اپنے گھر سے نکلا تو ان محافظوں نے اسے قتل کر دیا۔

جو لوگ اس قتل میں ملوث نہیں تھے، انہوں نے قاتلوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ محمد امین بھی پکڑا گیا لیکن وہ مطمئن تھا اور سمجھتا تھا کہ اس نے شاہی فرمان پر عمل کیا ہے۔

اس معاملے کی خبر چاند بی بی تک پہنچی تو وہ کسی شاہی فرمان سے بے خبر تھی۔ اس نے محمد امین کو طلب کیا۔ محمد امین نے پورا معاملہ صاف صاف بیان کر دیا کہ کس طرح کشور خاں نے شاہی فرمان مرزا نور الدین تک پہنچایا اور پھر کس نے اسے مصطفیٰ خاں کے قتل پر مامور کیا۔ اس کا کہنا اب بھی یہی تھا کہ اس نے حضور کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ وہ ہر طرح سے بے قصور ہے۔

چاند بی بی کو قطعی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کس وقت مصطفیٰ خاں کے قتل کے احکام جاری کیے۔ اس نے وضاحت کے لیے کشور خاں کو بلایا۔

"آپ کو مصطفیٰ خاں سے کیا دشمنی ہوگئی تھی کہ اس بے قصور کے قتل کے احکام جاری کروا دیے؟"

"ملکہ عالیہ! میری کیا مجال کہ میں احکام جاری کرتا۔ مجھے مصطفیٰ خاں کی ان سازشوں کا علم ہوگیا تھا جو وہ سلطنت کے خلاف کر رہے تھے۔ اگر وہ سازشیں کامیاب ہو جاتیں تو سلطنت بیجاپور کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ اس لیے میں نے اس کے قتل کی محض سفارش کی تھی۔ آپ اسے رد کر سکتی تھیں لیکن آپ نے قتل کے احکام جاری کر دیے۔ میں نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے جس طرح ہمیشہ کرتا رہا ہوں۔"

''میں نے وہ فرمان مرزا نورالدین کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔''

''وہ فرمان ہماری خدمت میں پیش کیا جائے۔''

کشور خان نے وہ ''فرمان'' منگوایا اور چاند بی بی کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دستخط اس کے تھے۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ کشور خان نے دھوکے سے اس پر دستخط کرا لیے تھے۔ غلطی اس کی تھی کہ اس نے بغیر پڑھے دستخط کر دیے تھے مگر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کشور خان نے اسے فریب دیا تھا اور اس کے بھروسے کا غلط فائدہ اٹھایا تھا۔

بیجاپور کے حالات ایسے نازک دور سے گزر رہے تھے کہ وہ کشور خان جیسے طاقتور امیر سے ٹکرا جاتی لیکن اس دن کے بعد سے اپنے جذبات کو چھپا نہ سکی اور کشور خان کو نہایت سخت الفاظ میں یاد کرنے لگی۔

اس نے ابھی تک کشور خان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا لیکن کشور خان خائف ہو گیا تھا۔ اس نے ایک منصوبے کے تحت یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ وہ عادل شاہ کے مرنے کے بعد بیجاپور کی وفادار نہیں رہی ہے اور اپنے بھائی مرتضیٰ نظام کو سلطنت کے اہم رازوں سے آگاہ کرتی رہتی ہے اور اسے عادل شاہی سرحدوں پر قبضہ کرنے کے لیے اکساتی رہتی ہے۔ اسی کے ورغلانے پر ہنود ملک ترک حملہ آور ہوا تھا۔

یہ ایسے سنگین الزامات تھے کہ جس نے بھی سنا انگشت بدنداں رہ گیا۔ مرتضیٰ نظام، چاند بی بی کا بھائی تھا اس لیے سب کو یقین بھی آ گیا۔

جب کشور خان نے یہ الزامات پھیلا کر بہت سے ہمنوا پیدا کر لیے تو اس نے آخری مہرے کے طور پر ابراہیم عادل کا انتخاب کیا اور چند امراء کے ساتھ اس کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کے سامنے بھی کشور خان نے ان الزامات کو دہرایا اور مشورہ دیا۔

''چاند بی بی احمد نگر میں اپنے بھائی مرتضیٰ کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اگر اس پر گرفت نہ کی گئی تو بیجاپور کی سلطنت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ چاند بی بی کو کچھ عرصے کے لیے ستارہ کے قلعے میں بند کر دیا جائے۔ جب نظام شاہی جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائے اور تسلی ہو جائے تو اسے شاہی محل میں واپس بلا لیا جائے گا۔''

نہیں رکھتا تھا۔ تمام کاروبار امراء سرانجام دے رہے تھے۔ وہ بھلا کیا اختلاف کرتا۔ اس نے اس مشورے کو حسن و خوبی تسلیم کر لیا۔

کشور خان نے چاند بی بی کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حرم سرا سے باہر آ کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔

چاند بی بی نے اس کے قاصد کے ذریعے کہلوایا۔

''تو ایک معمولی سا امیر تھا۔ میرے احسانات نے تجھے تارے سے مہتاب کر دیا۔ اب تو اتنا عظیم ہو گیا کہ بیجاپور کی مالکہ کو گرفتار کرنے کی باتیں کر رہا ہے۔ میرے شوہر سلطان عادل شاہ کے احسانات بھی بھول گیا۔''

''میں کسی احسان کو نہیں بھولا لیکن سلطنت کا مفاد مجھے عزیز ہے۔ میں ہرگز یہ گوارا نہیں کروں گا کہ آپ سلطنت کے راز اپنے بھائی تک پہنچائیں۔'' کشور خان نے جواب میں کہلوا دیا۔

اس کی طرف سے بھی جواب آ گیا۔

''ایک معمولی امیر مجھے گرفتار کرے یہ ممکن نہیں۔ قدیم خواجہ سرا میری حفاظت پر مامور ہیں۔ اگر تم نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو اس کے ذمے دار خود ہو گے۔''

کئی روز تک یہ کشمکش چلتی رہی۔ چاند بی بی کسی طرح حرم سرا سے باہر آنے کو تیار نہیں تھی۔ کشور خان نے جب یہ دیکھا تو اس نے خواجہ سراؤں اور عورتوں کو شاہی محل میں بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ چاند بی بی کو زبردستی اٹھا لائیں۔ یہ لوگ اندر گئے تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاتھا پائی سے کئی خواجہ سرا لہولہان ہو گئے لیکن بالآخر چاند بی بی کو جبراً شاہی محل سے نکال کر ایک پالکی میں بٹھا دیا گیا اور یوں وہ قلعہ ستارہ میں لے جا کر نظر بند کر دی گئی۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد اب اس کی یہ کوشش ہوئی کہ کسی طرح ان امراء کو اپنے حق میں ہموار کیا جائے جو اس کے خلاف ہو گئے تھے اور اس کی جگہ مصطفیٰ خان کو متعین کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ایک چھوٹے سالار میاں بدو کو جو اس کا مقرب خاص تھا، امرائے سرحد کا سپہ سالار مقرر کیا اور اسے ایک بہت بڑا لشکر ہاتھیوں اور گھوڑوں کے ساتھ دے کر شاہ درک کی طرف روانہ کیا اور اسے خاص ہدایت کی کہ جو امراء میرے خلاف ہو گئے تھے انہیں میرے حق میں کرنے کی کوشش کرے۔

میاں بدو نہایت جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے سرحد

کے خلاف سازش کرنے میں پیش پیش ہوں گے۔ اس کی نگاہ میں انکش خان اور عین الملک وہ اہم امیر تھے۔ میاں بدو نے ان کی طرف دوستی اور خیر خواہی کا ہاتھ بڑھایا اور کشور خان کی تعریفیں کرنا شروع کیں۔ انہیں یہ باور کرا دیا کہ کشور خان انہیں بہت پسند کرتا ہے۔

''کشور خان نے چلتے وقت مجھے خاص ہدایت کی تھی کہ انکش خان نہایت وفادار اور تجربہ کار امیر ہیں۔ تمہیں جو مشورہ دیں اس سے کام لینا۔''

یہی باتیں اس نے عین الملک سے کیں اور دونوں کو مزید وعدے وعید کر کے کشور خان کا بہی خواہ بنا لیا۔

اسی دوران کشور خان کی طرف سے میاں بدو کو پیغام ملا کہ امراء اپنی قوت پر بہت نازاں ہیں۔ میرا کوئی حکم ماننے کو تیار نہیں۔ بادشاہ کی اطاعت سے بھی کسی حد تک منحرف ہیں۔ جس طرح بھی ہو سکے تم انہیں قید کر لو اور شاہ درک کے قلعے میں نظر بند کر دو اور ان کے گھوڑے اور ہاتھی بارگاہ شاہی میں روانہ کر دو۔

اس پیغام میں میاں بدو کو اپنی ترقی نظر آئی۔ اگر یہ امراء راستے سے ہٹ گئے تو وہ سپہ سالاری کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس نے امید خان اور اخلاص خان کو اپنے گھر دعوت پر بلا کر گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

اتفاق یہ ہوا کہ یہ امراء بھی آپس میں یہی طے کر رہے تھے کہ میاں بدو کو دعوت کے بہانے گھر بلا کر قید کر لیا جائے اور پھر پایہ تخت پہنچ کر کشور خان کا خاتمہ کیا جائے۔

یہ منصوبہ طے ہوتے ہی اخلاص خان نے یہ مشہور کیا کہ بیجاپور میں اس کے گھر لڑکے کی ولادت ہوئی ہے۔ اس کے ساتھی امراء نے اس پر زور دینا شروع کیا کہ اس خوشی میں وہ ضیافت کا اہتمام کرے۔ میاں بدو بھی ان کے ارادے سے بے خبر اخلاص خان سے دعوت کا تقاضا کرنے لگا۔ اس نے میاں بدو کو بھی مدعو کیا۔ میاں بدو ان کے جال میں پھنس گیا۔

تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد دعوت کا دن مقرر کیا گیا۔ میاں بدو وہاں پہنچا تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ کھانے سے پہلے شراب کے دور چلے۔ میاں بدو جب نشے سے بے حال ہو گیا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔

میاں بدو کو گرفتار کرنے کے بعد ان لوگوں نے بیجاپور کا سفر اختیار کیا۔ اخلاص خان چونکہ خود بھی حبشی تھا لہٰذا تمام حبشی امراء اور سالار اسے چاہتے تھے وہ سب اس کے گرد

یہ ساری کارروائی اتنی عجلت میں ہوئی کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ دوسری طرف جب کشور خان کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اگرچہ ان حبشی امراء سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا تاہم ظاہری طور پر اس نے مقابلے کے لیے تیاری شروع کر دی۔

اخلاص خان اپنے دیگر حبشی سالار ساتھیوں کے ساتھ لشکر لے کر بڑی تیزی سے بیجاپور کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

جب کشور خان کو اس بات کا پورا اندازہ ہو گیا اور علم ہوا کہ اخلاص خان صرف ایک منزل پر بیجاپور سے دور رہ گیا تو اس نے خوفزدہ ہو کر مقابلے سے ہاتھ اٹھا لیے اور بادشاہ کو شکار کے بہانے شہر سے باہر لے گیا۔ بادشاہ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے سبب کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ لگا رہا۔

شہر کے نواح میں ایک باغ تھا جہاں اس نے بادشاہ کو اتار دیا۔

''حضور! آج گرمی بہت ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ آج شکار کا ارادہ ملتوی کیا جائے۔ حضور شہر میں تشریف لے جائیں۔ میں ذرا شاہ پور کے بازاروں میں گھوم پھر آؤں اور اس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

بادشاہ نے اس کی بات مان لی اور قلعے واپس چلا گیا۔

کشور خان چار سو سواروں اور بے شمار دولت کے ساتھ اپنے اہل و عیال بچوں سے علیحدہ ہو کر احمد نگر کی طرف چلا گیا۔

احمد نگر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد کشور خان حبشیوں کے سالار اخلاص خان کی گرفت سے تو بچ گیا لیکن یہاں پہنچتے ہی اس پر یہ انکشاف ہوا کہ یہاں کے لوگ بھی اسے ناپسند کرتے ہیں۔ کامل خان دکنی اور مصطفیٰ خان کے قتل کا ذمے دار اسی کو سمجھتے ہیں۔ یہاں کے حکمران بھی اس کے خلاف ہیں۔ اس کا یہاں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ وہ یہاں سے نکلا اور قطب شاہی سلطنت کے پایہ تخت گولکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ موت اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ ایک شخص احمد نگر سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ گولکنڈہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ شخص اس پر حملہ آور ہوا اور مصطفیٰ خان کا انتقام لینے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اخلاص خان اپنے دیگر سالاروں کے ساتھ بیجاپور پہنچا۔ بادشاہ نے اس کا استقبال کیا اور اسے خلعت فاخرہ سے نوازا اور ملکی و مالی سب امور اخلاص خان کے سپرد کر دیے۔

[illegible] تعمیل کی گئی۔

چاند بی بی ایک مرتبہ پھر شاہی حرم سرا میں آگئی۔

کچھ دنوں معاملات ٹھیک چلتے رہے لیکن پھر بدقسمتی کے سائے بیجاپور کے آسمان پر منڈلانے لگے۔ پہلے کامل خاں پھر کشور خاں اور اب اخلاص خاں اسی ڈگر پر چل پڑا۔ اس نے بھی رفتہ رفتہ چاند بی بی کے دل میں جگہ پیدا کرلی اور اس کے بل بوتے پر من مانی شروع کردی۔ اسے یہ وہم ہو گیا تھا کہ غیر ملکی امرا کی وجہ سے اس کا اقتدار خطرے میں ہے۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے سب سے پہلے افضل خاں شیرازی اور راسو پنڈت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد اپنے منصب کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے شیخ اللہ شیرازی، ابوالقاسم اور شاہ مرتضیٰ خاں کو بیجاپور سے نکال دیا۔ اس کے بعد اس نے دو بڑے سالاروں کو ساتھ ملا لیا۔ وہ امیر خاں اور دلاور خاں تھے اور ان کی مدد سے سلطنت کی مختلف مہمات کی انجام دہی میں مصروف ہو گیا۔ اس کی ان حرکتوں سے ایسی افراتفری پھیلی کہ اخلاص خاں بھی قابو نہ پا سکا۔

دوسری طرف کرناٹک کا راجا تکا دری بھی بیجاپور کے حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا اور وہ اپنے لشکر میں بڑی تیزی سے اضافہ کررہا تھا تاکہ کسی بھی مناسب موقع پر بیجاپور پر حملہ آور ہو کر اپنے لیے فوائد حاصل کرسکے۔

ان حالات میں جبکہ اخلاص خاں سب سیاہ و سفید کا مالک ہو چکا تھا اسے ایک سالار عین الملک سے خطرہ محسوس ہوا۔ عین الملک اس وقت بیجاپور سے باہر تھا چنانچہ اس کا خاتمہ کرنے کے لیے اخلاص خاں نے اسے بیجاپور طلب کیا۔ عین الملک کو بھی اس کے آدمیوں نے باخبر کردیا تھا کہ اخلاص خاں اس کی طرف سے اچھے ارادے نہیں رکھتا۔ وہ بیجاپور کے لیے روانہ ضرور ہوا لیکن پوری تیاری سے آیا۔

اخلاص خاں چند مقربین کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آیا۔

عین الملک نے جب دیکھا کہ اخلاص خاں کے ساتھ گنتی کے صرف چند لوگ ہیں تو اس نے فوراً حرکت میں آتے ہوئے اخلاص خاں سمیت سب کو گرفتار کرلیا۔ بازی ہی الٹ گئی۔ اخلاص خاں اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا، الٹا وہ خود گرفتار ہو گیا۔

اس نے اخلاص خاں اور اس کے ساتھیوں کو پابہ زنجیر کیا اور ہاتھیوں پر بٹھا کر بیجاپور کے حکمراں ابراہیم [illegible] معلوم ہوا کہ اخلاص خاں کی گرفتاری کی خبر بیجاپور تک پہنچ چکی ہے اور اس کا شدید ردعمل ہوا ہے۔ ایک سالار دستور خاں کو اس جرم میں قتل کردیا گیا ہے کہ وہ عین الملک سے ملا ہوا ہے۔ یہ سن کر عین الملک بہت پریشان ہوا۔ اس نے گرفتار شدہ امرا کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور فوراً واپس ہو گیا۔ اس موقع پر مقصود نامی ایک غلام نے ایک جماعت کے ساتھ ان لوگوں کا مقابلہ کیا۔ یہ لوگ ابھی شہر سے باہر بھی نہ نکلے تھے کہ مقصود خاں کے ہاتھ وہ ہاتھی لگ گئے جن پر اخلاص خاں اور اس کے ساتھیوں کو عین الملک نے پابہ زنجیر کرکے بٹھا رکھا تھا۔ مقصود خاں نے ان ہاتھیوں کو روک لیا اور شہر سے باہر نہ جانے دیا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے عین الملک اپنی جاگیر کی طرف بھاگ گیا۔

اخلاص خاں بیجاپور روانہ ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

عین الملک نے بہت سے امرا اور سالاروں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اخلاص خاں اور اس کے ساتھیوں کے خلاف حرکت میں آنے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ یہ خبریں سنتے ہی بیجاپور میں انتشار پھیل گیا۔



نظام شاہیوں کا سالار ہنجراو ملک بیجاپور کی سرحد کے قریب ہی اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کیے ہوئے تھا اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ جونہی مناسب موقع ملے گا، بیجاپور کے علاقوں پر حملہ آور ہو جائے گا۔ یہ موقع اسے مل گیا تھا۔ عین الملک اور اخلاص کی دشمنی نے اس کی امیدیں سرسبز کردی تھیں۔ وہ حرکت میں آیا اور سب سے پہلے قلعہ شاہ درک پر حملہ آور ہوا اور اسے اپنے قبضے میں کرلیا۔ اس کے بعد اس نے قلعہ گلبرگہ پر بھی قبضہ کرنے کا ارادہ کرلیا لیکن اس میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس قلعے کے تھانے دار محمد آغا نے بڑی بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ اس نے ہر طریقے سے دشمن کی مدافعت کی۔ اسے معلوم تھا کہ بیجاپور میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ اس لیے وہاں سے کسی قسم کی مدد ملنا مشکل ہے لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور نظام شاہیوں کو غالب نہ آنے دیا۔

نظام شاہ نے محمد آغا کو پھسلانے کی بہت کوشش کی۔ اسے آسودہ ترقی کی امیدیں دلائیں لیکن وہ تیار نہ ہوا کہ اپنے آقا سے غداری کرے۔ اس نے آنکھوں میں آنکھیں

''میرے آقا نے مجھ پر بھروسا کرکے یہ قلعہ میرے حوالے کیا ہے۔ میں اس کی عنایت سے بہت خوش ہوں۔ اگر آج میں بددیانتی سے کام لے کر یہ قلعہ آپ کے حوالے کردوں تو کل خدا اور خلق خدا کے سامنے میری جو ذلت ہوگی، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ سے اس قسم کی توقع نہ کی جائے اور مجھے اپنے آقا کا سچا وفادار سمجھا جائے۔''

محاصرے کو چار مہینے گزر گئے اور فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو محاصرہ ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔

''ہمیں محاصرے سے دست بردار ہو کر یہاں سے کوچ کر دینا چاہیے۔ اس وقت بیجاپور میں انتشار پھیلا ہوا ہے۔ اس محاصرے سے تو بہتر ہے کہ بیجاپور پہنچ کر کوئی ہنگامہ برپا کریں۔''

قلی قطب شاہ بھی ان لوگوں کے ساتھ آکر مل گیا تھا۔ اب طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ یہ تمام لوگ لشکریوں کی زبردست جمعیت کے ساتھ روانہ ہوئے اور بیجاپور کے پاس پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا۔

پایۂ تخت میں اس وقت صرف دو تین ہزار لشکر خاصہ کے سوار موجود تھے۔ دشمنوں نے اپنے خیمے نصب کردیے اور شہر کو فتح کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔

باقاعدہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن چھوٹی چھوٹی جھڑپیں جاری تھیں۔

اس نازک وقت میں ابراہیم عادل کو عین الملک کی یاد آئی۔ اس نے اسے اور آتش خاں کو مدد کے لیے طلب کیا۔ یہ دونوں خاص طور پر عین الملک، اخلاص خاں کی گرفتاری اور رہائی کے بعد سے ابراہیم عادل کی طرف سے خوف زدہ تھے انہوں نے اس دعوت کو اپنی معافی قرار دیا اور چھ ہزار سواروں کے ساتھ بیجاپور آگئے اور دروازہ اللہ پور کے قریب مقیم ہو گئے۔

عین الملک نے اخلاص خاں کو گرفتار کیا تھا اور چونکہ اخلاص خاں حبشی تھا لہٰذا تمام حبشی امرا اور جمعیت اس کے خلاف تھی۔ اس خطرے کو عین الملک نے بھی بھانپ لیا تھا لہٰذا وہ احمد نگر کے لشکر میں شامل برار کے امیر امرا سید مرتضیٰ سے مل گیا۔ اس کے ذریعے ساز باز کی کہ نظام شاہیوں کو حملے سے باز رکھے۔

قلی قطب شاہ اور ہنجراو ملک ترک نے صبح کے وقت قلعے پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ سید مرتضیٰ نے ایسا نہ کرنے

[illegible] رات قلعے کی اس شکستہ دیوار کو از سرنو تعمیر کرلیا جو بارش کی وجہ سے گر گئی تھی۔

بیجاپور میں سخت اندرونی انتشار تھا۔ سلطنت کے کئی امرا و اراکین حبشیوں سے ناراض تھے اور ان کی کسی بات پر اعتبار نہ کرتے تھے جس کی وجہ سے سلطنت کا کام بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ دشمن دروازے پر کھڑا تھا اور یہاں یہ خلفشار تھا۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حبشیوں کا ایک وفد چاند بی بی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

''ہم لوگ غلام ہیں اس لیے اراکین دربار اور اشراف ملک ہم سے آزردہ خاطر ہیں اور ہماری حکومت ناپسند کرتے ہیں۔ دشمن ہمارے سر پر کھڑا ہے اس لیے عادل شاہی خاندان کی بہتری اسی میں ہے کہ عنان حکومت اشراف اور عالی خاندان امراء کے سپرد کردی جائے تاکہ باہمی چپقلش اور فتنہ و فساد کا دروازہ بند ہو جائے۔''

چاند بی بی نے اس مشورے سے اتفاق کیا اور ایک نہایت بزرگ ہستی شاہ ابوالحسن کو میر جملہ مقرر کیا۔ شاہ ابوالحسن عہدہ سنبھالتے ہی دشمنوں کے دفع کی تدابیر میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے پہلی فرصت میں برار کے امیر امرا سید مرتضیٰ کے نام اپنے پرانے تعلقات کے پیش نظر خط لکھا۔

''ابراہیم عادل شاہ اپنی قوت، عسکری طاقت اور اقبال کے لحاظ سے دشمنوں سے بہت آگے ہے۔ اسے مغلوب کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ تم قطب شاہ اور ہنجراو ملک کو اچھی طرح سمجھا دو کہ بادشاہی لشکر فوج کو دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں میں ممالک محروسہ سے بے شمار لشکری پایہ تخت کے آس پاس جمع ہونے کے لیے یہاں چلے آئیں گے۔ برگی امراء جو علی عادل شاہ کے عہد حکومت میں خوف کی وجہ سے پایہ تخت میں آتے ہوئے گھبراتے تھے اور بیجانگر چلے گئے تھے، انہیں شاہی فرمان بھجوایا جا چکا ہے اور وہ اس طرف آنے ہی والے ہیں۔ ایسی صورت میں تمہارا یہاں رہنا تو کیا فرار ہونا بھی مشکل ہو جائے گا۔''

اس خط نے کام کر دکھایا۔ سید مرتضیٰ پہلے ہی قطب شاہ اور ہنجراو ملک سے کبیدہ خاطر تھا۔ اس خط نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور وہ دل ہی دل میں عادل شاہیوں کا طرفدار ہو گیا۔ وہ ایک دن لشکر سے نکلا اور عین الملک کے

"اپنے برابر کے لوگوں سے ناراض ہو کر اپنے آقا کے ولی نعمت کے ساتھ غداری اور نمک حرامی کرنا شرفا کا کام نہیں۔ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اپنے بادشاہ کی مخالفت کرو اور اس کے دشمنوں کے ملازمین میں داخل ہو جاؤ۔ اس وقت بیجاپور میں حبشیوں کے ہاتھ اقتدار نہیں رہا۔ اب شاہ ابوالحسن تمام سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ ان پر اعتماد کرو اور اپنے آقا کی اطاعت کا دم بھرو۔"

عین الملک اور آتش خان نے اس مشورے کو موزوں سمجھا۔ انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ بادشاہ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اظہار کیا۔ اسی طرح دوسرے امراء بھی شاہ ابوالحسن کی تعیناتی کی خبر سن کر بیجاپور میں جمع ہونے لگے۔ بری امراء بھی جوق در جوق آنے لگے۔

سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہوتے ہی سب سے پہلے بری امراء نے دشمن کو سیدھے راستے پر لانا شروع کیا۔ دشمن کو ایسا تباہ و برباد کیا کہ اس کے لشکر میں قحط پڑ گیا۔ دشمن نے قلعہ شاہ درگ کی طرح بیجاپور کے محاصرے سے بھی خفت اٹھائی اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن ابراہیم عادل شاہ صلح کے لیے تیار نہ ہوا۔ دشمن نے جب یہ حالات دیکھے تو مقابلے کی تاب نہ رہی۔ بیجاپور کا محاصرہ ختم کر کے واپسی کا ارادہ کر لیا۔

یہاں سے دونوں فریقوں کے راستے جدا ہو گئے۔ قطب شاہ اپنے لشکر کے ساتھ گلبرگہ کی طرف چلا گیا تاکہ وہاں فتح و شادمانی کے ڈنکے بجائے۔ بہزاد ملک اور سید مرتضیٰ نے دوبارہ شاہ درگ کی طرف جانے کی سوچی تاکہ اس علاقے کو فتح کر کے نظام شاہی سلطنت میں داخل کر لیں لیکن پھر راستے میں ارادہ تبدیل ہو گیا اور یہ لوگ احمد نگر کی طرف واپس لوٹ گئے۔

قطب شاہ البتہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔ اس نے اپنے ایک امیر کو ایک زبردست لشکر دے کر ابراہیم عادل شاہ کے ملک کے ایک حصے کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود گولکنڈہ واپس چلا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے اخلاص کے مشورے سے دلاور خان حبشی کو ایک لشکر کے ہمراہ دشمنوں کے مرکزی مقام گلبرگہ کی طرف روانہ کیا۔ دلاور خان نہایت تیزی کے ساتھ سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا حریف کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے دشمن کے سر پر پہنچ کر بازارِ جنگ گرم کر دیا۔ طرفین میں تلواریں چلنے لگیں۔ معمولی جنگ سے فرار ہو گیا۔ دلاور خان حبشی فتح یاب ہوا۔

اس کامیابی کے بعد دلاور خان کا سر غرور آسمانی سے باتیں کرنے لگا۔ اب وہ میر جملہ کے منصب پر فائز ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ کم ظرف تھا کہ اپنا ارادہ قلعہ دیک کے تھانیدار حیدر خان پر ظاہر بھی کر دیا۔ اسے آئندہ ترقی کے وعدوں سے اپنا ہم نوا بنایا اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جلد از جلد بیجاپور کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیجاپور پہنچ کر وہ شہر سے باہر ہی دروازہ اللہ پور میں قیام پذیر ہو گیا اور اپنے مخصوص مقربین کو اخلاص خان کے پاس بھیجا اور گزارش کی کہ وہ اسے میر جملہ بنانے میں اس کی مدد کرے۔ دلاور خان کو اس سے یہ توقع اس لیے تھی کہ اخلاص خان بھی حبشی تھا۔

اخلاص نے اس کے جواب میں یہ پیغام بھیجا۔

"مجھے جب بھی موقع ملا، میں بادشاہ سے تمہارے متعلق گفتگو کروں گا اور پھر اجازت لے کر بارگاہ سلطانی میں پیش کروں گا۔"

دلاور خان نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ اخلاص خان ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ اس نے از خود کوئی قدم اٹھانے کی ٹھانی۔ اپنے بیٹوں، سات سو سواروں اور چند ہاتھیوں کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ جلد از جلد [illegible] درگ میں پہنچا جہاں بادشاہ مقیم تھا۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی لیکن نیت اخلاص خان سے مقابلے کی تھی۔ اس نے قلعے میں اپنے بہی خواہوں اور ساتھیوں کو مناسب جگہوں پر متعین کر دیا۔



اخلاص خان اس وقت بستر استراحت پر تھا۔ اس کی آنکھ کھلی اور تمام حالات کا علم ہوا تو فوراً تین چار ہزار سواروں کا لشکر ساتھ لیا اور قلعے کی طرف روانہ ہوا۔ دلاور خان کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے قلعے کے دروازے بند کر لیے اور دشمن کی مدافعت کی تیاریاں کرنے لگا۔

طرفین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا کبھی دوسرے کا لیکن جانی نقصان اخلاص خان کا زیادہ ہوا۔ اسی کشمکش میں سورج ڈوب گیا۔ اخلاص خان نے بلبل خان کو قلعے کا محاصرہ کرنے پر مامور کیا اور خود گھر چلا آیا۔

بلبل خان نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور قلعے میں غلہ لے جانے کی راہیں مسدود کر دیں۔ اس نے کچھ ایسی ہمت و دلیری کا مظاہرہ کیا کہ خود دلاور خان اس کی بہادری کا قائل

جب اس محاصرے کو ایک ماہ گزر گیا تو دلاور خان کو غلّے کی قلت کا سامنا ہوا۔ اس نے چوری چھپے اپنا ایک آدمی بلبل خان کے پاس بھیجا اور اسے خوب صورت وعدوں سے بہلا پھسلا کر اپنا حلیف بنا لیا۔

بلبل خان کا حال یہ تھا کہ وہ پہلے مصطفیٰ خان کا ملازم تھا۔ اس کے قتل کے بعد اخلاص خان کی ملازمت میں چلا آیا تھا۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وفاداری تبدیل کر لے۔

اخلاص خان کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے بلبل خان کی جگہ ایک اور حبشی کو محاصرے پر مقرر کیا اور خود گھر میں بیٹھا رہا۔

اس کی یہ غفلت دیکھ کر محاصرے کے لشکر کے اور بہت سے سپاہیوں نے بلبل خان کا راستہ اپنایا اور وہ بھی اخلاص خان کا ساتھ چھوڑ کر دلاور خان سے جا ملے۔

دلاور خان کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اہل قلعہ کا لشکر بلبل خان کی قیادت میں قلعے سے باہر نکلتا اور محاصرین کو نقصان پہنچا کر دوبارہ قلعے میں چلا جاتا۔ رسد کے راستے بھی کھل گئے اور اہل قلعہ کو قدرے سکون میسر ہوا۔

بلبل خان نے اس موقع پر بڑی دانش مندی سے کام لیا۔ اس نے بہت سے امراء کو اخلاص خان کا ساتھ چھوڑنے پر رضامند کر لیا۔ یہ امیر اس کے کہنے میں آ کر اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے۔ اب اخلاص خان اکیلا رہ گیا تھا لیکن پھر بھی اس کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ اس نے بیجاپور سے چلے جانے کو اپنی توہین سمجھا اور اپنے گھر میں مقیم رہا۔ یہ اس کی سخت نادانی اور ضد تھی جس نے اسے نقصان پہنچایا۔ دلاور خان کا غلبہ اب پوری طرح ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے قابل اعتبار سپاہیوں کو اخلاص خان کے گھر بھیجا۔ ان سپاہیوں نے معمولی مزاحمت کے بعد اخلاص خان کو گرفتار کر لیا۔ ایک نہایت طاقتور امیر زنجیروں میں جکڑا دلاور خان کے سامنے کھڑا تھا۔

"میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا کہ تمہیں معاف کروں۔ بیجاپور جس بدنظمی کا شکار ہوا اس میں تمہارا قصور ہے۔ اس کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔"

"میرا مقدمہ بادشاہ کے حضور پیش کیا جائے یا ملکہ چاند بی بی میری بے گناہی یا گناہ گاری کا فیصلہ کریں گی۔ تم کون ہوتے ہو۔"

"یہ سب ان کی مرضی و منشا سے ہو رہا ہے۔"

"میں کیسے یقین کر لوں؟"

دیا سلائی ہے

ایک افسانہ نگار ایک رسالے کے ایڈیٹر کے پاس اپنا افسانہ لے کر گیا اور اسے بتایا کہ میں نے افسانے کو جس انجام تک پہنچایا ہے، یہ ذرا کمزور ہے۔ اسے بہتر انجام تک کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے؟ ایڈیٹر نے افسانہ پڑھ کر جواب دیا۔ "دیا سلائی ہے۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

"میں تمہیں داخلِ زنداں کرنے کا حکم دے چکا ہوں۔ وہاں پہنچتے ہی تمہیں یقین آ جائے گا۔"

"میں نے ماضی میں تم پر جو عنایات کی ہیں، کیا یہی اس کا صلہ ہے؟"

"میں نے اس کا صلہ دینے کے لیے ہی تمہیں خط لکھا تھا کہ مجھے میر جملہ بنوا دو لیکن تم شاید خود اسی فکر میں تھے۔ تم نے ٹال مٹول سے کام لیا ورنہ آج اس حال میں نہ کھڑے ہوتے۔"

"میں دل سے چاہتا تھا کہ تمہیں یہ منصب مل جائے۔ صرف وقت کے انتظار میں تھا۔"

"میں بھی وقت کے انتظار میں تھا۔ اب وہ وقت آ گیا کہ میں تمہیں داخلِ زنداں کر سکوں۔ تمام امراء میرے ساتھ ہیں۔ تمہیں کوئی بچانے نہیں آئے گا۔"

دلاور خان نے داروغۂ زنداں کو طلب کیا اور اخلاص خان کو اس کے حوالے کر دیا۔ زنداں کے دہشت ناک اندھیرے اس کے منتظر تھے۔ کامل خان دکنی، کشور خان، مصطفیٰ خان کی موت کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

وہ تاریک زنداں میں بیٹھا آنے والے وقت کا انتظار کرتا رہا حتیٰ کہ ایک دن وہ آیا کہ زنداں کا دروازہ کھلا اور دو جلاد نما شخص اندر داخل ہوئے۔ آخر دلاور خان کو اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا۔۔۔ اس نے دل میں سوچا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس کی رہائی کا پروانہ آ گیا لیکن ہوا کچھ اور۔ ان جلادوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کی دونوں آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دیں۔ اس کی چیخوں سے زنداں گونج رہا تھا۔

کچھ دنوں بعد وہ اسی زنداں میں مر گیا۔

اخلاص خان کے خاتمے کے بعد دلاور خان بالکل آزاد تھا۔ اس نے نہایت چالاکی سے اپنے رشتے داروں کو بادشاہ کے مصاحبین میں شامل کر دیا۔ اس کے چار بیٹے

تھے۔ اس نے ان چاروں کو بادشاہ کے قریب کر دیا کہ وقت پڑنے پر جب چاہیں بادشاہ کا خاتمہ کردیں۔ کمیل خاں کو بھی منہ بولا بیٹا بنا کر اسے بھی طبقۂ امراء میں شامل کرلیا۔ جن لوگوں سے اسے خطرہ ہو سکتا تھا ان سب کو خارج البلد کردیا۔ غیر ملکیوں اور اس کے ہم قوم حبشیوں کے سوا اب کوئی قلعے میں نہیں تھا۔ ابراہیم عادل شاہ اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننے پر مجبور تھا۔

شاہ ابوالحسن بھی جنھیں چاند بی بی نے میر جملہ بنایا تھا، دلاور خاں کے انتقام کا نشانہ بنے۔ انھیں معزول کر کے ایک قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں اور بعد میں شہید کرا دیا۔

سب سے زیادہ خطرہ چاند بی بی کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ اس کی قوت کو بھی پہلے سے کہیں کم کر دیا اور ایسا انتظام کیا کہ کوئی خیر خواہ ادھر اس کے پاس پھٹکنے نہ پائے۔

اب وہ خودمختار تھا۔ خوف کی فضا ایسی طاری کردی تھی کہ کوئی چوں بھی نہیں کرسکتا تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد چاند بی بی نے ایک ترکیب نکالی کہ وہ احمد نگر جائے اور وہاں کے تخت پر اس کے اپنے بھائی مرتضیٰ نظام سے مدد کی طالب ہو۔ اس نے یہ سوچ تو لیا تھا لیکن قلعے سے نکلنا اور احمد نگر تک پہنچنا دشوار تھا۔ دلاور خاں اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اسے بھی نہ نکلنے دیتا۔ پھر قدرت نے یہ سنہری موقع اسے دے دیا۔ مالابار کے راجاؤں نے عادل شاہی حکومت کو خراج دینا بند کر دیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے ان کی سرکوبی کے لیے دلاور خاں کو روانہ کیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی چاند بی بی اپنے چند محافظوں کے ساتھ احمد نگر روانہ ہوگئی۔ غالباً وہ کسی منصوبے کے تحت گئی تھی۔ اسی لیے وہ ابراہیم عادل کی بہن شہزادی خدیجہ سلطان کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کا بھائی مرتضیٰ نظام اپنی بہن سے نہایت اچھی طرح ملا۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ بیجاپور اور احمد نگر کی ریاستوں کے درمیان کوئی چپقلش ہے۔ ماحول سازگار دیکھ کر چاند بی بی نے بیجاپور کے بگڑتے ہوئے حالات کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس تذکرے میں دلاور خاں کا نام بار بار آ رہا تھا۔

"اگر بیجاپور اور احمد نگر میں تعلقات خوشگوار ہوں تو چھوٹی طاقتیں سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔ امراء جب ہمیں کمزور دیکھتے ہیں تو حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابراہیم عادل اپنی مجبوریوں کے تحت کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ یہی حال رہا تو بیجاپور کی حکومت کسی اور کے ہاتھ میں چلی جائے ہی۔ اور لڑنے والے بھی ہمارے اپنے ہی ہیں۔ ہم دونوں آپس میں لڑتے رہے تو کوئی تیسرا فائدہ اٹھانے لگا۔"

"یہ تو ابراہیم عادل کو سوچنا چاہیے۔ علی عادل شاہ نے بھی یہی نادانی کی تھی۔ یاد ہے وہ خواجہ سراؤں کے لیے اس نے امیر برید کی مدد کے لیے اپنا لشکر بھیجا تھا اور مجھے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔"

"اب ماضی کریدنے کا کیا فائدہ۔ اب نہ علی شاہ اس دنیا میں موجود ہے نہ امیر برید۔"

"ابراہیم بھی انہی درختوں کی آبیاری کر رہا ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ وہ امیروں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے ورنہ وہ بھی صلح کا خواہش مند ہے۔ میں اس سے چھپ کر نہیں اس سے کہہ کر آئی ہوں۔"

"یہ قدم وہ خود بھی اٹھا سکتا تھا۔"

"وہ مجھے صرف بچی نہیں ماں کا درجہ دیتا ہے۔ اس نے مجھے ضامن بنا کر بھیجا ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ ہماری دشمنیاں رشتے داری میں بدل جائیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میرے ساتھ جو خدیجہ سلطان آئی ہے، اسے آپ نے دیکھا؟ میں چاہتی ہوں تمہارے بیٹے میراں شاہ حسین سے اس کی شادی ہو جائے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟ شادی تو تمہاری بھی علی عادل شاہ سے ہوئی تھی اور اسی نیت سے ہوئی تھی۔ انجام کیا ہوا؟ کشیدگی تو پھر بھی برقرار ہے۔"

"ضروری تو نہیں کہ یہ شادی بھی میری شادی کی طرح ثابت ہو۔"

"اگر ایسا ہے بھی تو ابراہیم کو آنا چاہیے تھا۔"

"آپ کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔ ریت رسمیں بھی بھول گئے؟ آپ لڑکے والے ہیں۔ رشتہ تو آپ کو مانگنا چاہیے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ وہ آپ کا دیا ہوا رشتہ رد نہیں کرے گا۔ اپنی بہن کا رشتہ آپ کے بیٹے سے کرے گا۔"

"دیکھ لو، اگر اس نے انکار کیا تو یہ تذلیل میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔"

چاند بی بی کے کہنے سے اس نے ابراہیم عادل کو محبت آمیز خطوط روانہ کیے اور اپنے بیٹے میراں شاہ حسین کی شادی خدیجہ سلطان سے کرنے کی درخواست کی۔

ابراہیم نے یہ درخواست قبول کرلی۔ معزز امرا

کردی گئی۔

خدیجہ سلطان، میراں شاہ حسین کے محل میں داخل ہوگئی۔

اس شادی سے نمٹنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ کو بھی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چاند بی بی کی دانش مندی نے اس مرتبہ بھی اسے ایک راستہ دکھایا۔

"خدیجہ سلطان کی شادی نے احمد نگر سے ہمارے تعلقات کو بہتر بنا دیا ہے۔ اب آپ کو میں یہ مشورہ دوں گی کہ آپ محمد قلی قطب شاہ کی بہن سے شادی کرلیں۔ اس طرح قطب شاہیوں سے بھی ہمارے تعلقات اچھے ہو جائیں گے۔ کسی ایک سے بگڑی بھی تو دوسرا اس کی مدد کو آجائے گا۔ یاد ہے جب حمزہ ملک نے بیجاپور کا محاصرہ کیا تھا تو قلی قطب شاہ اس کی مدد کے لیے آیا تھا۔ یہ شادی دونوں کے اتحاد کو توڑ دے گی۔ اگر کبھی مرتضیٰ نظام کی نیت خراب بھی ہوئی تو قطب شاہ آپ کے خلاف محاذ آرا نہیں ہوگا۔"

ابراہیم عادل نے اپنے چیدہ چیدہ امیروں سے مشورہ کیا۔ دلاور خاں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ قلی قطب کے نام خطوط بھی لکھے گئے جن کا مثبت جواب آیا۔

ابراہیم عادل شاہ نے امرائے بیجاپور کی ایک جماعت کو اس مقصد کے لیے بھاگ نگر (حیدرآباد) کی طرف روانہ کیا۔ امرائے بیجاپور کا گروہ جب قطب شاہی حدود میں پہنچا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ شہر میں لایا گیا اور نہایت اعلیٰ درجے کے مکانات میں انہیں ٹھہرایا گیا۔

چند روز کی مہمانداری کے بعد شادی کی بات چیت شروع ہوئی۔ قطب شاہیوں نے ابراہیم کا پیغام قبول کرلیا اور نہایت مسرت سے شہزادی کا عقد کر دیا گیا۔

یہ خبر جب احمد نگر پہنچی تو وہاں کے سالار صلابت خاں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور مرتضیٰ نظام شاہ کی جانب سے لکھ دیا۔

"اس شادی کے لیے ہم سے مشورہ نہیں کیا گیا لہٰذا اعلیٰ حضرت مرتضیٰ نظام شاہ سخت برافروختہ ہیں اور آپ کے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

قلی قطب شاہ اپنے باپ کی نصیحت کے مطابق نظام شاہی کا بہت ادب کرتا تھا لہٰذا اس نے اپنی بہن کو رخصت کرنے میں تامل کیا۔ ابراہیم کو لکھ بھیجا کہ پہلے

ابراہیم نے یہ تفصیل سنی تو سخت غصہ آیا۔ اس نے فوراً اپنے لشکر کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب تمام لشکری اور امراء جمع ہو گئے تو وہ شہر سے روانہ ہوا۔

دلاور خاں کی رائے کے مطابق عالم خاں نے نظام شاہی سرحد میں قدم رکھا اور قلعہ دھیر کے نواح میں قیام پذیر ہوا۔ عادل شاہی لشکر نے قلعے کو فتح کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔

مرتضیٰ نظام شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس ہنگامے کا سبب

"لونک تمام ہے یانک حال ۔۔۔۔؟"
"میں حضور کا ایک ادنیٰ خیر خواہ غلام ہوں۔" صلابت خان نے کہا۔

"میں تیری بے اعتدالیوں اور نافرمانیوں سے تنگ آچکا ہوں لیکن پھر بھی میں تجھے گرفتار نہیں کرسکتا۔" صلابت خان نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔

"حضور! بس اتنا کریں کہ قید کے لیے قلعے کا تعین فرمادیں۔ میں خود اپنے آپ کو پابہ زنجیر کر کے اس قلعے میں قید ہو جاؤں گا۔"

مرتضیٰ نظام نے اسے قید کرنے کے لیے قلعہ دھاروڑ تجویز کیا۔

صلابت خان فوراً اپنے مکان پر پہنچا اور بادشاہ کی خواہش کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈالیں، پالکی میں سوار ہوا اور قلعہ دھاروڑ میں جا کر نظر بند ہو گیا۔ اس کی نظربندی کے بعد مرتضیٰ نظام نے پیشوائی کا منصب قاسم بیگ کو عطا کیا اور اسے ہدایت کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ابراہیم عادل سے صلح کرلی جائے۔

ابراہیم عادل شاہ نے جب دیکھا کہ مرتضیٰ نظام کا رویہ نہایت شریفانہ ہے، نیز قاسم بیگ نے بھی کئی پرخلوص خطوط ابراہیم کی خدمت میں روانہ کیے ہیں تو اس نے نظام شاہی سلطنت پر لشکر کشی کا خیال ترک کر دیا اور اپنی منکوحہ کو حاصل کرنے کے لیے قطب شاہی ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔ قطب شاہیوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ قلی قطب شاہ نے اس کی آمد کا مقصد معلوم ہوتے ہی اپنی بہن کو مع سامان جہیز اور دیگر گراں قدر تحفوں کے ابراہیم عادل کی خدمت میں پہنچا دیا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اپنے تمام امرا اور درباریوں کو ہمشیرہ قلی قطب شاہ کے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ اس کے بعد خود بھی روانہ ہوا اور اسے اپنے لشکر میں لے آیا۔

چار روز تک لشکر میں عیش و عشرت کا ہنگامہ برپا رہا۔ اس کے بعد بادشاہ نے قلعہ درک کا رخ کیا۔ یہاں شاہی خدمت گاروں نے جشن عروسی کا اہتمام کیا اور پورے ایک مہینے تک عیش و عشرت کی محافل گرم رہیں۔ اس کے بعد بادشاہ نے پایہ تخت کا رخ کیا۔

☆☆☆

صلابت خان نظر بند ہو چکا تھا۔ اس کے منصب پر قاسم بیگ فائز ہوا تھا۔ قاسم بیگ نہایت ہی نیک طبع اور اہل عقل سے محبت اور خوش سے نہیں آتا تھا۔ اس کی یہی شرافت اس کی کمزوری بن گئی۔ اکثر کم عقل اور پست مزاج لوگ سلطنت کے معاملات میں دخل دینے لگے اور صاحب اقتدار بن گئے۔ ان لوگوں نے امرا اور ارکین سلطنت پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ کچھ کو قید کیا، کچھ کو ملک بدر کر دیا۔ مرتضیٰ نظام کا حال یہ تھا کہ سلطنت کے کاموں میں قطعاً دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اس نے ان رذیلوں کو اور اوباش پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد نگر کے حالات روز بروز ابتر ہوتے گئے۔ خاندان نظام شاہی کی تمام رونق رخصت ہو گئی۔ سارا وقار خاک میں مل گیا۔

مرتضیٰ نظام کی دلچسپی سلطنت کے کاموں میں ویسے ہی کم ہو گئی تھی۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ وہ ایک فاحشہ عورت "فتو" پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ قصہ یوں ہوا کہ میر ہاشمی نامی ایک شخص نے اس فاحشہ عورت کو اپنے گھر میں ڈال لیا تھا۔ ایک روز مرتضیٰ نظام کی سواری ادھر سے گزر رہی تھی۔ دریچے سے ایک عورت نے جھانکا۔ مرتضیٰ کی نظر اس پر پڑی۔ کوئی ایسی گھڑی تھی کہ دیکھتے ہی دل میں اتر گئی۔ فوراً سواری رکوائی۔ پوچھا اس مکان میں کون رہتا ہے؟ آپ کے ساتھ والوں نے بتایا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا اس اچھی طرح پہچان کر لو۔ محل میں آیا تو بے قرار تھا۔ اس کی صورت آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک پہر گزارا ہو گا۔ جرار چلا کر اسے بلا دے۔ کیا خبر تھی شریف زادے کی بیوی ہو لیکن طبیعت تھی کہ اسی طرف مائل تھی۔ مجبور ہو کر اس مکان کے مالک کو بلا لیا۔

"تمہارے ساتھ کون عورت رہتی ہے؟"

وہ شخص کہہ سکتا تھا کہ وہ میری بیوی ہے لیکن وہ ڈر گیا۔ وہ سمجھا بادشاہ کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"حضور! وہ ایک فاحشہ عورت تھی۔ آپ کو بالکل ٹھیک معلوم ہوا ہے۔ میری اس سے ملاقات ہو گئی اور میں نے اسے گھر میں ڈال لیا۔ اب جو آپ حکم فرمائیں۔"

"تمہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔"

"چھوڑ دوں گا۔"

"اسے میرے پاس پہنچا دو۔"

"اگر وہ تیار نہ ہوئی؟"

"میرے آدمی تیرے ساتھ جائیں گے اور اسے لے کر آئیں گے۔"

...نظام نے اسے اپنے پاس بلوایا اور سے بے خبر ہو کر اس کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔

فتو نہایت چالاک عورت تھی۔ آتے ہی مرتضیٰ نظام کے حواس پر ایسا غلبہ حاصل کر لیا کہ اس کی مرضی کے بغیر وہ کوئی کام کرتا ہی نہیں تھا۔ چند ہی روز میں فتو کے تمام رشتے دار اہم عہدوں پر فائز ہو گئے۔ فتو کا بھائی اسمٰعیل مرتضیٰ نظام کا وکیل بن گیا۔ وکیل بنتے ہی اس نے طرح طرح کے ظلم و ستم شروع کر دیے۔

فتو کے رشتے داروں اور خود فتو کو یہ احساس ستانے لگا تھا کہ مرتضیٰ نظام کے بعد اس کا چچا میران حسین تخت پر بیٹھے گا۔ اگر کسی طرح اسے راستے سے ہٹا دیا جائے تو پھر آسانی سلطنت پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ کوششیں ہونے لگیں کہ باپ بیٹے میں اختلافات پیدا کر دیے جائیں۔

وہ مرتضیٰ نظام کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ جب فتو نے دیکھا کہ مرتضیٰ کا قرف بہکنے لگا ہے، نشہ پوری طرح اپنا کام کر چکا ہے تو فتو نے اپنا کام شروع کر دیا۔

"میں سوچتی ہوں اگر آپ بادشاہ نہ رہے تو میرا کیا بنے گا۔ کیا مجھے پھر اسی موذی کے پاس جانا پڑے گا جہاں سے آپ مجھے لائے ہیں؟"

"بلبل! نظام امیری بادشاہت کو کیا ہوا۔"

"دشمنوں کے منہ میں خاک۔ وہ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ آپ کو تخت سے اتار کر آپ کے بیٹے کو بادشاہ بنادیں۔"

"کس میں اتنی جرأت ہے جو یہ بات کہہ سکے۔"

"یہی تو میں سوچتی ہوں لیکن میرے بھائی اسمٰعیل نے تو مجھے یہی بتایا ہے۔"

"کہاں ہے اسمٰعیل ۔۔۔۔ ذرا اسے بلاؤ تو۔"

"وہ اس وقت تو اپنے گھر گیا ہوا ہے پھر کسی وقت بلالوں گی۔ آپ خود اس سے پوچھ لیجیے گا۔"

فتو نے سوچا تھا کہ بادشاہ نشے میں ہے۔ یہ بات سن کر نہ جانے اسمٰعیل کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ صبح جب نشہ اتر جائے گا تو اسمٰعیل کو پیش کر دے گی۔

ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس قصے کو جانے دیا۔

صبح ہوئی تو مرتضیٰ نظام کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ رات اس نے کوئی وحشت ناک خبر سنی تھی۔ جب فتو نے دیکھا کہ وہ کوئی ذکر ہی نہیں چھیڑ رہا اور اسمٰعیل کا نام تک اس کے ہونٹوں پر نہیں آرہا ہے تو اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

... اجازت کا خواہاں ہے۔"

"مجھ سے مل کر کیا کرے گا؟ جو احکامات دینے ہیں تم خود دے دو۔"

"آپ کو یاد نہیں۔ آپ نے پچھلی رات خود ہی تو اسے بلوانے کو کہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے مکان پر گیا ہوا تھا۔"

"ہم نے کیوں بلوایا تھا؟"

"یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ کون سے دشمن ہیں جو آپ کے اقتدار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔"

"او ہاں۔ یاد آیا۔ باریابی کی اجازت ہے۔ اسے فوراً بلواؤ۔"

اجازت ملنے کی دیر تھی کہ اسمٰعیل حاضر ہو گیا اور ہاتھ باندھ کر اذن گویائی کا منتظر ہو گیا۔

"تم صرف وکیل ہی نہیں ہمارے فتو کے بھائی بھی ہو اس لیے کھڑے رہنا تمہارے لیے مناسب نہیں۔ بیٹھ کر بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اسمٰعیل بیٹھ گیا۔

"حضور کے عتاب سے محفوظ رہوں تو کچھ عرض کروں۔"

"اجازت ہے۔"

"مجھے کچھ معتبر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے ۔۔۔" سنسنی پیدا کرنے کے لیے یہاں تک کہنے کے بعد وہ رک گیا۔

"کیا معلوم ہوا ہے؟"

"ارکین سلطنت نے یہ طے کیا ہے کہ آپ کو بادشاہت سے معزول کر کے شہزادہ میران حسین کو تخت نشین کیا جائے۔"

یہ سنتے ہی مرتضیٰ نظام کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ اپنے بیٹے کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

فتو نے ایک مرتبہ پھر مکاری دکھائی۔ بادشاہ کا ارادہ مزید پختہ کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کا واویلا شروع کر دیا۔

"بادشاہ سلامت! پہلے تحقیق تو کر لیں۔ کیا خبر یہ خبر جھوٹی ہو۔ اللہ قسم مجھے تو بڑا دکھ ہوگا اگر شہزادے حضور قتل ہو گئے۔ پھر یہ بھی سوچتی ہوں کہ اگر یہ خبر سچ ہوئی تو کیا ہوگا۔"

"بس اب کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ اسمٰعیل سے مخاطب ہوا۔ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس ناخلف کو گرفتار کر کے قتل کر دو۔ نہ وہ ہوگا نہ ارکین کے ارادے پورے ہوں گے۔"

اسمٰعیل تو دل سے چاہتا تھا کہ اسے یہ اختیار مل جائے

اسے ایسا روپوش کر دیا کہ باوجود کوشش کے اخلیل اسے گرفتار نہ کرسکا۔

مرتضیٰ نظام نے اب ایک اور چال چلی۔ اس نے قاسم بیگ کو طلب کیا اور بیٹے کی محبت کا دیوانہ وار اظہار کیا۔

"میں اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہوں اس لیے جلد از جلد شہزادے کو میرے حضور پیش کرو۔"

قاسم بیگ اس کی باتوں میں آگیا اور باپ کی محبت کا خیال کرتے ہوئے شہزادے کو قلعے سے نکالا اور پالکی میں بٹھا کر بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا۔

مرتضیٰ نظام پہلے تو بیٹے سے بڑی محبت اور مہربانی سے پیش آیا اور اسے بغداد نامی عمارت کے ایک حجرے میں ٹھہرایا مگر دوسرے روز اس نے شہزادے کو توشک اور لحاف میں لپیٹ کر حجرے کو نذر آتش کر دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

شہزادہ بہ مشکل توشک اور لحاف سے باہر نکلا۔ اس نے جب کمرے میں چاروں طرف دھواں ہی دھواں دیکھا تو پریشان ہو کر چیخنے لگا۔ تقی خاں جو اس کا نگراں مقرر ہوا تھا، اسے رحم آگیا۔ بادشاہ نے اسے سخت ہدایت کی تھی کہ دروازہ ہرگز نہ کھولے لیکن اس نے دروازہ کھول دیا اور اسے بحفاظت قاسم بیگ کے حوالے کر دیا۔

قاسم بیگ نے اسے فوراً دولت آباد روانہ کر دیا۔ دو تین دن بعد مرتضیٰ نظام شاہ حجرے میں آیا تو اسے توقع تھی کہ کمرے میں شہزادے کی ہڈیاں ملیں گی لیکن وہاں نہ ہڈیاں تھیں نہ شہزادہ۔ بادشاہ نے اس سے باز پرس کی۔ تقی خاں نے بہانہ بنایا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کی ہڈیاں بھی جل کر خاک ہو گئی ہیں۔"

بادشاہ کو یقین نہ آیا۔ اس نے سختی سے کام لیا تو تقی خاں نے خوفزدہ ہو کر سچ اگل دیا۔

"میں نے شہزادے کو قاسم بیگ اور محمد تقی کے حوالے کر دیا ہے۔"

مرتضیٰ نظام نے ان دونوں امیروں کو طلب کیا اور قلعے کے دروازے کے قریب ان سے دریافت کیا۔ ان دونوں نے شہزادے کی جان کے سامنے بادشاہ کے عتاب کی پروا نہ کی۔

"تقی خاں نے شہزادے کو ہمارے حوالے ضرور کیا تھا لیکن وہ فرار ہو گیا۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔"

سلطنت کی انجام دہی کا کام مرزا صادق کے سپرد کر دیا۔

اب اس کی کوشش ہوئی کہ مرزا محمد صادق شہزادے کا کھوج لگائے اور اسے قتل کر دے۔ اس نے بھی انکار کر دیا۔ اسے بھی قید ہونا پڑا۔ نظام شاہ نے سلطان حسین شیرازی کو "مرزا خاں" کے خطاب سے نوازا اور پیشوائی کے منصب پر سرفراز کیا۔

مرزا خاں بظاہر نظام شاہ کا وفادار بنا رہا لیکن اندر ہی اندر یہ کوشش بھی کرتا رہا کہ کسی طرح نظام شاہ کو تخت سے اتار کر شہزادہ میراں حسین کو تخت پر بٹھا دے۔ یہ کام بڑی راز داری کا تھا اور بڑی حد تک مشکل بھی اس لیے اسے عادل شاہی امراء و ارکان سلطنت کے مشورے کی ضرورت پڑی۔ مرزا خاں نے اپنا ایک قابل اعتماد قاصد دلاور خاں کے پاس روانہ کیا اور اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ چونکہ مرزا خاں کا پیغام خاندان نظام شاہی کی بقا سے وابستہ تھا اس لیے بادشاہ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اس پیغام کے جواب میں ابراہیم عادل شاہ نے احمد نگر کا سفر اختیار کیا۔ وہ آہستہ خرامی سے سفر طے کرتا ہوا احمد نگر کے قریب پہنچ گیا۔

نظام شاہ کو جب معلوم ہوا کہ ابراہیم عادل شاہ اس طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے مرزا خاں کو عادل شاہ کو روکنے کے لیے مقرر کیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ مرزا خاں کی دعوت پر ہی عادل شاہ اس طرف آرہے ہیں۔

مرزا خاں نے تمام امراء کو نظر بند کر دیا اور ان کی جگہ اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو مقرر کر کے نکلا اور ایک مقام "داتورہ" کے قریب مقیم ہوا۔

اس کے داتورہ میں مقیم ہوتے ہی بادشاہ کو شک ہو گیا تھا کہ اس کے مخبروں نے اطلاع دی کہ مرزا خاں تمام امیروں کے ہمراہ دولت آباد روانہ ہو گیا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ شہزادہ میراں حسین کو وہاں سے لا کر تخت پر بٹھا دے اور بعد ازاں احمد نگر کی طرف آئے۔

یہ سن کر مرتضیٰ نظام شاہ بہت پریشان ہوا۔ ارد گرد جو امیر تھے ان سے مشورہ کیا۔ سب نے ایک ہی مشورہ دیا۔

"اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ صلابت خاں کو رہا کر دیا جائے۔"

"اس کی رہائی سے کیا ہوگا؟"

"صلابت خاں کی حضور سے ملاقات کی خبریں سن کر تمام ناراض امراء مرزا حسین سے الگ ہو کر آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے۔"

بادشاہ نے یہ ارادہ کیا کہ وہ پالکی میں "بیجر" کی طرف روانہ ہو۔ امراء اور انتہائے راہ میں صلابت خاں سے ملاقات کرے۔ تقی خاں جو مرزا حسین سے ملا ہوا تھا، اس موقع پر رونا شروع کر دیا اور بادشاہ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

"حضور! اس سفر سے باز رہیں۔ حضور جوں ہی احمد نگر سے باہر نکلیں گے لشکر خاصہ کے سپاہی آپ کو گرفتار کر کے شہزادے کے سپرد کر دیں گے۔"

بادشاہ کو اس کی باتوں پر یقین آگیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ "بیجر" کی طرف نہیں جائے گا بلکہ قلعے میں رہ کر صلابت خاں کی آمد کا انتظار کرے گا۔

جب تمام لوگوں کو اس ارادے کی خبر ہوئی تو بہت مایوس ہوئے اور ایک ایک کر کے دولت آباد کی طرف جانے لگے۔

مرزا حسین دولت آباد پہنچ ہی چکا تھا۔ وہاں کے قلعے سے شہزادے کو نکالا اور سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا احمد نگر پہنچ گیا۔ تمام اہالیان قلعہ قلعے سے باہر نکل کر مرزا خاں سے مل گئے۔ شہزادہ میراں حسین اور مرزا خاں ایک جمعیت کے ساتھ ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے قلعے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد یہ لوگ عمارت بغداد میں جہاں بادشاہ رہتا تھا، داخل ہو گئے اور قتل و غارت گری شروع کر دی۔

شہزادہ میراں حسین باپ کے پاس پہنچ گیا اور اپنی تلوار کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ دی۔

"جی چاہتا ہے کہ تلوار تمہارے پیٹ میں اتنے زور سے بھونک دوں کہ پیٹ کے دوسری طرف نکل آئے۔"

نظام نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔ "اے مردود! اے عاق شدہ بیٹے! تیرا باپ اب چند روز کا مہمان ہے۔ تو اگر اس پر رحم کرے تو ٹھیک ورنہ جو تیرے جی میں آئے کر لے۔"

مرتضیٰ ان دنوں سخت بیمار تھا۔ موت کے کنارے پر تھا لیکن شہزادے نے اس پر رحم نہ کھایا اور حکم دیا کہ بادشاہ کو حمام میں لے جایا جائے۔ حمام کا دروازہ بند کر کے بھٹی میں انتہائی تیز آگ روشن کر دی جائے۔ حمام کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں اور اس تک پانی کی ایک بوند بھی نہ پہنچنے دی جائے۔

وہ اسی عالم میں حمام کے اندر مر گیا۔

ابراہیم عادل شاہ احمد نگر کے قریب ہی ٹھہرا ہوا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ مرزا خاں کی طرف سے پیغام ملتے ہی آگے بڑھے اور میراں حسین کو تخت نشین کروا دے لیکن اسے جوں ہی اطلاع ملی کہ بدبخت بیٹے نے بوڑھے باپ کو قتل کروا دیا ہے تو اس نے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا اور میراں حسین کو پیغام بھیجا۔

"میں لشکر لے کر اس طرف اس مقصد سے آیا تھا کہ حکومت کی باگ ڈور تمہارے سپرد کر دوں اور تمہارے باپ مرتضیٰ نظام کو کسی قلعے میں نظر بند کر دوں تاکہ تم پورے اطمینان کے ساتھ امور سلطنت انجام دے سکو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے خدا کا خوف دل سے نکال کر اپنے باپ کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو مرتضیٰ نظام کو میرے سپرد کر دیا ہوتا یا اس بے چارے کو اندھا کر کے اس کے خوف سے نجات حاصل کر لی ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اس مظلوم کا خون رنگ لائے گا اور تم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر اپنے اعمال کی سزا پاؤ گے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اس وقت میں تم سے کوئی باز پرس کرنا نہیں چاہتا اور معاملے کو خدا پر چھوڑتا ہوں تاکہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں تمہارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ پیغام بھیجنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ بیجاپور واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

مرتضیٰ نظام کے قتل اور میراں حسین کے تخت نشین ہونے کے بعد مرزا خاں سیاہ سفید کا مالک بن گیا۔ اس کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ میراں حسین کو معزول کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ سولہ سالہ میراں حسین نے بھی اس کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ شراب کے نشے میں لوگوں کے سامنے کھلے عام اسے دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ یہ باتیں مرزا خاں تک بھی پہنچتی تھیں۔ غرض دونوں ایک دوسرے کی تاک میں لگے رہے۔ مرزا خاں نے اسے معزول کرنے کی ٹھان لی اور میراں حسین نے اسے ٹھکانے لگانے کا تہیہ کر لیا۔

میراں حسین نے اپنے رضاعی بھائی آتش خاں کے گھر ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں مرزا خاں کو بھی مدعو کیا گیا۔ مرزا خاں ایسے بہت سے سرد و گرم دیکھ چکا تھا، اسے کچھ شک ہوا۔ اس نے اس دعوت میں شریک ہونا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی جگہ آقا میر شیروانی کو بھیجنے کا بندوبست کیا۔ آقا میر شیروانی اس کا رازدار تھا اور بادشاہ اسے اپنا وفادار سمجھتا تھا۔ اسی کے ذریعے بادشاہ کی طرف کی خبریں مرزا خاں تک پہنچتی تھیں۔ اسے یہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسے کس وقت پہنچنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

آقا میر اس وقت پہنچا جب میراں حسین کھانے سے

دسترخوان بچھایا۔ آقا میر نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور مرزا خان کی ہدایت کے مطابق قے کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور مکان سے باہر نکل آیا۔

اسمٰعیل خان کے مکان سے آکر قلعے کے باہر بادشاہ ایک باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مرزا خان اس کے پاس آیا اور عرض کیا۔ ''اس وقت آقا میر کی حالت تشویش ناک ہے۔ اگر حضور اس کی سابقہ خدمات کا خیال کرتے ہوئے عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے چلیں تو اس مرنے والے کا دل بڑا ہو جائے گا۔'' بادشاہ نے مرزا خان کی درخواست قبول کرلی اور دو تین ملازموں کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔

قلعے میں اس وقت جو لوگ موجود تھے، وہ تمام کے تمام مرزا خان کے حلیف تھے۔ مرزا خان نے قلعے کا دروازہ بند کروایا اور میراں حسین کو گرفتار کرلیا۔

اس کی گرفتاری کے بعد یہ فکر ہوئی کہ میراں حسین کی جگہ اب احمد نگر کا حکمراں کس کو بنایا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ چاند بی بی کے باپ حسین نظام کے دوسرے بیٹے برہان شاہ یعنی مرتضیٰ نظام کے بھائی کے بیٹوں میں سے کسی ایک کو احمد نگر کا حکمراں بنا دیا جائے۔

برہان شاہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام ابراہیم دوسرے کا اسمٰعیل تھا۔ مرزا خان نے اسمٰعیل کو احمد نگر کے تخت کا مالک بنا دیا۔ اسمٰعیل کی عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔

ایک مجلس منعقد کی گئی اور شہزادہ اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا کردی گئی۔ ابھی تخت نشینی کی یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی ہی تھی کہ قلعے کے دروازے کے سامنے شور سنائی دیا۔ مرزا خان نے چند افراد کو اس شور کا سبب دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ ان لوگوں نے واپس آکر بتایا کہ ایک صدی منصب دار جمال خان مہدوی مع دوسرے منصب داروں کے ساتھ قلعے کے دروازے پر کھڑا ہے۔

''اس کا مطالبہ کیا ہے؟'' مرزا خان نے دریافت کیا۔

''وہ کہتے ہیں کئی دنوں سے ہم نے اپنے بادشاہ میراں حسین کو نہیں دیکھا۔ وہ کس حال میں ہے ہم فکر مند ہیں۔ ہمیں اس کے حضور حاضر ہونے کی اجازت دی جائے۔''

میراں حسین اب بادشاہ کب رہا تھا.... اس کے حضور حاضری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس واقعے کو چھپایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ مرزا خان نے نہایت متکبرانہ انداز میں ...

''میراں حسین اس قابل نہیں تھا کہ اسے بادشاہ رکھا جاتا چنانچہ اسے معزول کر دیا گیا ہے اور اب ہم سب کا بادشاہ اسمٰعیل ہے۔ وہ ابھی باہر آکر تم سب کا سلام قبول کرتا ہے۔''

جمال خان اس پر بہت بگڑا۔ اس نے سارے شہر میں منادی کرادی۔

''مرزا خان اور دوسرے غریب امرا قلعے کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے میراں حسین کو قید کرلیا ہے اور کسی دوسرے شخص کو بادشاہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو اپنی حفاظت کرنی چاہیے اور بے جا اقتدار و تسلط سے چھٹکارا پانا چاہیے ورنہ یاد رکھو کہ اہل دکن کے بیوی بچے غلام اور لونڈی بن جائیں گے۔''

اس منادی نے کام کر دکھایا۔ لوگ فوراً مسلح ہو گئے اور غول کے غول قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ مرزا خان نے عاقبت نااندیشی سے کام لیا اور سپاہیوں کی ایک جماعت جمال خان کے ساتھ آنے والے لوگوں سے مقابلے کے لیے بھیجی۔ عوام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے سامنے اس جماعت کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چند افراد گنوا کر یہ جماعت قلعے کے اندر واپس آگئی۔ مرزا خان کو اب جمال خان کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ ایک بار پھر اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ کسی قسم کی صلح کی بات اٹھانے کے بجائے اپنے لوگوں سے خطاب کیا۔

''دکنیوں کا یہ تمام شور شرابا محض میراں حسین کے زندہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اسے فوراً قتل کردو تاکہ دکنی مایوس ہو کر لوٹ جائیں۔ جب میراں حسین نہیں ہوگا تو وہ کس کے لیے لڑیں گے۔ یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔''

کئی غریب (غیر ملکی) امیروں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک امیر نے آگے بڑھ کر میراں حسین کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔ یہ کٹا ہوا سر قلعے کے دروازے پر برج کے اوپر لٹکا دیا اور بلند آواز میں دکنیوں کو مخاطب کیا۔

''تم لوگوں کا شور شرابا میراں حسین کے لیے تھا۔ اس کا سر حاضر ہے۔ اب تم لوگوں کو چاہیے کہ اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلو جو اس وقت تخت نشین ہو چکا ہے۔''

''ہم کیسے مان لیں کہ یہ سر میراں حسین کا ہے۔ اسے نیچے پھینکو تاکہ ہم اسے پہچان کر واپس چلے جائیں گے۔''

جمال خان جانتا تھا کہ یہ سر میراں حسین کا ہے لیکن اس نے یہ ایک چال چلی تھی تاکہ اس کا سر اپنے قبضے میں کر کے مجمع کو مزید اشتعال دلایا جائے۔

مرزا خان کے ملازموں نے میراں حسین کا کٹا ہوا سر نیچے پھینک دیا۔ اپنے بادشاہ کی ایسی بے حرمتی دیکھ کر دکنیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ہر طرف واویلا مچ گیا۔ لوگ بے تحاشا قلعے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اسی دوران قلعے کے قریب سے ایک سو چھکڑے گھاس اور چارے سے لدے ہوئے گزرے۔ جمال خان کے حکم سے ان بیلوں کو گرفتار کرلیا گیا اور قلعے کے دروازے کے قریب کھڑا کرکے ان کو آگ لگا دی گئی۔ چاروں طرف آگ پھیل گئی اور قلعے کے دروازے جل کر خاک ہو گئے۔ چاروں طرف انگارے ہی انگارے تھے۔ نہ کوئی اندر جاسکتا تھا نہ باہر آسکتا تھا۔

اب مرزا خان کی پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ قلعے میں ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ قلعے میں آگ نہیں پھیلی تھی لیکن باہر نکلنے کی راہیں مسدود تھیں۔ اسے اپنی جان کی ایسی فکر تھی کہ اسمٰعیل نظام شاہ کو بھی بھول گیا تھا جو قلعے میں نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ نو سالہ بچے کی حقیقت ہی کیا تھی۔

اسی بھاگ دوڑ میں رات ہو گئی۔ دروازے پر لگی آگ کی شدت کم ہو گئی تھی۔ مرزا خان نے سپاہیوں اور امیروں کی ایک جماعت ساتھ لی اور قلعے سے باہر نکل آیا۔ ان سب لوگوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ ان میں سے بعض تو شہر ہی میں اور بعض مضافات شہر میں دکنیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

مرزا خان ''جنیر'' کی طرف بھاگ گیا۔ چند روز تک اس کا کچھ پتا نہ چلا۔

دکنی اور حبشی قلعے کے اندر داخل ہو گئے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ میراں حسین کی لاش سر بریدہ پڑی تھی۔ اسے دفن کیا اور اسمٰعیل نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا۔

ابھی چار روز بھی نہیں گزرے تھے کہ مرزا خان کو جنیر کے قریب سے گرفتار کرلیا گیا۔ جمال خان کے حکم سے پہلے تو اسے گدھے پر سوار کرکے چاروں طرف گھمایا گیا اور بعد میں اس کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔

احمد نگر کے شہروں اور قصبوں میں مسلسل خونریزی جاری تھی۔ اسمٰعیل شاہ تو بچہ تھا۔ سارا اقتدار جمال خان کے ہاتھ میں تھا اور وہ میراں حسین کے طرفداروں کو چن چن کر مار رہا تھا۔

جب ان امور کی خبریں بیجاپور پہنچیں تو ابراہیم عادل شاہ نے نظام شاہی خاندان کو بچانے کا ارادہ کیا۔ اس لیے کہ اس کی بہن وہاں بیاہی گئی تھی اور میراں حسین اس کا بھتیجا تو تھا۔ دوسرے یہ کہ چاند بی بی کا میکا تھا۔ نظام شاہی خاندان سے باہر کے کسی آدمی کے اقتدار کا سن کر وہ بھی بھڑک اٹھی تھی۔

احمد نگر میں ایسا انقلاب آیا تھا کہ شریف اور ذلیل میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ ملک کی حالت تباہی کے کنارے تک پہنچ گئی تھی۔ جمال خان پورے ملک پر قابض تھا۔

ابراہیم، دلاور خان کی رائے سے احمد نگر روانہ ہوا۔ بادشاہ نے بلبل خان اور فوج کے دوسرے افسروں کے نام طلبی کے احکامات جاری کیے اور انہیں تاکید کی اس سے پہلے کہ میں نظام شاہی حدود میں داخل ہوں..... تمام امرا اپنے لشکروں کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

☆☆☆

چاند بی بی اپنے کمرے میں تھی۔ کنیزیں اور باندیاں اس کے ارد گرد کچھ کھڑی کچھ بیٹھی تھیں۔ اس کا دل بہلانے کے لیے لطیفے سنائے جا رہے تھے، کہ کہانیاں کہی جارہی تھیں کہ ایک دم سے شور مچا۔ ابراہیم عادل شاہ حرم سرا میں داخل ہوا تھا اور اب اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام کنیزیں چڑیوں کی طرح اڑ گئیں۔ چاند بی بی اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آئی۔ اتنی دیر میں ابراہیم دروازے تک آچکا تھا۔ اس نے خواجہ سراؤں کی جماعت کو جو اس کی حفاظت کے لیے ساتھ تھے، وہیں چھوڑا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا آنا غیر معمولی تھا اس لیے چاند بی بی چوکنا ہو گئی تھی۔

''ابراہیم، میرے عزیز! کیسے آج چچی کی یاد کیسے آگئی؟''

''آپ کا کہنا بجا۔ سلطنت کے بکھیڑے اتنے ہیں کہ آپ کی یاد آتی ہے مگر آنا نہیں ہوتا۔''

''چشم ما روشن دل ما شاد۔ کہیے آپ کی چچی آپ کے لیے کیا کرسکتی ہے۔''

''چچی جان! اپنے چچا کے انتقال کے بعد ایک آپ ہی تو ہیں جن پر میں بھروسا کرسکتا ہوں۔ بہت سی باتیں آپ کے علم میں نہیں ہوں گی جنہیں بتانے حاضر ہوا ہوں۔''

''ہم گوش دل سے سن رہے ہیں۔''

''آپ کا احمد نگر ان دنوں عجیب مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ آپ کے برادر مرتضیٰ نظام کو قتل کرنے کے بعد جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی، اب تک جاری ہے۔ آپ کے دوسرے بھائی برہان نظام شاہ کے ایک بیٹے شہزادہ اسمٰعیل

دوران میران حسین بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ میرا ذاتی نقصان تھا لیکن اس کا جرم اتنا بڑا تھا کہ میں اس کی مدد کو پہنچ کر بھی لوٹ آیا تھا۔ اس نے اپنے باپ پر رحم نہ کھایا۔ اسے قید کر سکتا تھا لیکن اس نے اسے قتل کر دیا۔ اب اسمٰعیل نظام بھی اسی کشتی میں سوار ہے۔ ابھی بچہ ہے اس لیے جمال خاں کے رحم و کرم پر ہے۔ جمال خاں نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اب کوشش کرے گا کہ خاندان نظام کا خاتمہ کر دے۔''

''ابھی میرا دوسرا بھائی برہان نظام زندہ ہے۔ وہ قید میں تھا لیکن سنا ہے اب اس نے مرتضیٰ نظام کے قتل کے بعد رہائی حاصل کر لی ہے اور وہ اکبر کے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ ضرور آگے بڑھے گا۔''

''وہ اگر اکبر کی مدد سے آگے بڑھا تو شاہی ہند کا تسلط دکن میں لازمی ہو جائے گا اور میں یہ نہیں چاہتا۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''اسی کی اجازت آپ سے لینے آیا ہوں۔ میں احمد نگر کا رخ کر رہا ہوں تاکہ جمال خاں کے اقتدار کا خاتمہ کر سکوں اور کسی طرح برہان نظام کو وہاں پہنچا دوں۔''

''آپ پھر اپنے امیروں پر بھروسا کریں گے۔''

''میں اب کسی پر بھروسا نہیں کرتا۔ امیروں کو طلب ضرور کیا ہے لیکن میں خود ان کے ہمراہ جاؤں گا۔''

''لیکن ایک شرط پر۔'' چاند بی بی نے اس کی بات کاٹی۔

''وہ کیا بچی جان؟''

''اسمٰعیل شاہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''میری جنگ اسمٰعیل سے نہیں جمال خاں سے ہے۔''

''میں آپ کو اجازت دیتی ہوں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔''

ابراہیم نے اس اجازت کے بعد بلبل خاں اور فوج کے دوسرے افسروں کے نام کوچ کے احکام جاری کیے اور انہیں تاکید کی کہ اس سے پہلے کہ بادشاہ نظام شاہی حدود میں داخل ہو تمام امراء اپنے لشکروں کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

ان احکامات کے بعد وہ خود بھی روانہ ہو گیا۔ جب شاہی سواری قلعہ شاہ درگ کے قریب پہنچی تو بادشاہ نے دلاور خاں کے مشورے سے تقریباً ایک مہینے تک اس علاقے میں قیام کیا۔ اس دوران میں بلبل خاں کا لشکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہ ہوا۔ دلاور خاں نے سوچا

دوران اور زیادہ قوت حاصل کرے گا۔ اس نے ابراہیم عادل کو روانگی کا مشورہ دیا۔ ابراہیم عادل احمد نگر کی طرف روانہ ہوا۔

ابراہیم کی روانگی کے بعد اطلاع ملتے ہی جمال خاں بھی مقابلے کے لیے نکلا۔ ایک قصبے کے قریب دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔

اس سے پہلے کہ جنگ چھڑتی، برسات کی جھڑی لگ گئی۔ طرفین میں سے کسی نے بھی جنگ کی ابتدا نہ کی تھی کہ بیس دن اسی عالم میں گزر گئے۔ اسی دوران جمال خاں تک یہ خبر بھی پہنچ گئی کہ برہان نظام شاہ جو شہنشاہ اکبر کے پاس مقیم تھا دہلی کی فوج کے ساتھ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ وہ سخت پریشان ہوا اور مصلحت اسی میں سمجھی کہ کسی طرح ابراہیم سے صلح کر کے اسے یہاں سے رخصت کرے۔ اس نے چند آدمیوں کے توسط سے صلح کی درخواست کی۔

بلبل خاں جو مالابار کے راجاؤں سے خراج وصول کرنے نکلا ہوا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس لیے ابراہیم عادل کو اپنے لشکر کی کمزوری کا بھی احساس تھا لہٰذا اس نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی کہ صلح کر لی جائے۔ لیکن پھر بھی اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے اس نے صلح کے مذاکرات کو طول دیا اور پھر اس شرط پر صلح ہوئی کہ جمال خاں، ابراہیم کی بہن خدیجہ سلطان کو بادشاہ کے پاس روانہ کر دے گا۔

جمال خاں نے یہ شرط منظور کر لی اور فوراً خدیجہ سلطان کی پالکی مع 75 ہزار ہون ابراہیم کی خدمت میں روانہ کر دی۔

جس روز بادشاہ وہاں سے کوچ کرنے والا تھا، اسی روز بلبل خاں بھی اپنے لشکر کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا لیکن اب بلبل کا آنا بیکار تھا کیونکہ طرفین میں صلح ہو چکی تھی۔

دلاور خاں کو موقع مل گیا کہ وہ بلبل خاں کو بادشاہ کی نظروں میں ذلیل کرے۔ دلاور خاں نے بڑی نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور نہایت اہانت آمیز لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''جس بادشاہ کے حکم کے خلاف عمل کرنے کی آسمان کو بھی مجال نہیں ہے تم نے کس طرح بادشاہ کے فرمان کو ٹالا۔ جب بادشاہ نے تمہیں طلب کیا تھا، تمہیں چاہیے تھا کہ تمام کام چھوڑ کر فوراً شاہی بارگاہ میں حاضر ہوتے۔''

بلبل خاں جو بادشاہ کی مہربانیوں پر اتراتا تھا، اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''بادشاہ کے قدموں کی خاک کی قسم! میں نے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ میں نے اپنی مرضی سے مالابار میں قیام نہیں کیا۔ میری کیا بساط ہے جو میں شاہی فرمان کی تعمیل نہ کروں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مجھے شاہی فرمان ملا اس وقت میں کرناٹک میں تھا اور وہاں کے راجاؤں کو زیر کر کے خراج کی رقم وصول کرنے میں مصروف تھا۔ اگر میں خالی ہاتھ وہاں سے روانہ ہو جاتا یا وہ اس فرمان کے مضمون سے واقف ہو جاتے تو میری ساری محنت ضائع ہو جاتی اور آدھی رقم خزانے میں داخل نہ ہوتی۔ ان وجوہ کی بنا پر کچھ عرصے تک میرا وہاں قیام ناگزیر تھا مگر دلاور خاں تم اپنی کہو۔ تم نے کیوں بلاوجہ بادشاہ کو تلنگانہ کے سفر کی زحمت دی۔ جنگ تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مالابار کے لشکر کے بغیر کوئی مقصود ہاتھ نہ آئے گا۔ اگر تم پندرہ روز اور انتظار کر لیتے اور ہم سب مل کر نظام شاہی علاقے پر حملہ کرتے تو مجھے یقین ہے کہ احمد نگر کے بہت سے قلعے اور پرگنے عادل شاہی قبضے میں آ جاتے۔

''اگرچہ شاہی بارگاہ میں میرا اتنی دیر سے پہنچنا بغیر معقول وجہ کے نہیں ہے مگر پھر بھی اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے نیک دل آقا سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے قدیم نمک خوار غلام کی خطا معاف کر دے۔''

یہ جواب سن کر دلاور خاں کو غصہ تو بہت آیا لیکن بادشاہ کے سامنے کسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنا غصہ بلبل خاں پر بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے بلبل خاں کا ہاتھ پکڑا اور بادشاہ سے درخواست کی۔

''بلبل خاں حضور کے خاندان کا پرانا نمک خوار ہے اس لیے اس کی خطا معاف کی جائے۔''

بادشاہ نے دلاور خاں کی درخواست قبول کی اور بلبل خاں کو خلعت فاخرہ سے نوازا۔

جب شاہی مجلس برخاست ہوئی تو دلاور خاں بلبل کو اپنے ساتھ لایا۔ بہت خاطر تواضع کی اور کہا۔ ''میں نے اپنی زبان سے جو کہا اگر یہی میں تم سے سختی کے ساتھ پیش نہ آتا تو لوگ کہتے کہ میں اپنے بیٹے کی رعایت کرتا ہوں۔ اس لیے بادشاہ کے سامنے تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کی۔ تم کوئی خیال نہ کرو۔''

بلبل خاں سے معافی تلافی کر کے اسے مطمئن کر دیا تاکہ وہ کسی شک و شبہے میں مبتلا نہ ہو اور اس پر بھروسا کرتا رہے۔ احمق کو ہی کہا جاتا ہے جو بھروسا کر لیتا ہے۔

ابراہیم خاں سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا بیجاپور پہنچا۔

دلاور خاں بلبل خاں کی خوشامد میں لگا ہوا تھا لیکن اس کی عظمت و شہرت سے دل ہی دل میں بہت زیادہ خائف تھا لہٰذا کچھ بے بنیاد الزامات لگا کر اسے نظر بند کر دیا۔ اس پر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔

بادشاہ کو اس کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری مگر وہ دلاور خاں کے سامنے بے بس تھا۔

☆☆☆

برہان شاہ (اسمٰعیل شاہ کا والد) جو مرتضیٰ نظام شاہ کی قید سے فرار ہو کر شہنشاہ اکبر کی خدمت میں پہنچ گیا تھا، اسے جب احمد نگر کے حالات کا علم ہوا تو اس نے پہلے تو دہلی کی فوج لے کر دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا بعد ازاں اپنی رائے بدل دی اور اکبر اعظم سے عرض کیا۔

''میں اگر دہلی کی فوج کو اپنے ساتھ لے کر گیا تو احمد نگر کے امراء میرے خلاف ہو جائیں گے۔ وہ اسے دہلی کا دکن پر حملہ تصور کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں اکیلا ہی احمد نگر جاؤں اور امراء سے ساز باز کر کے اپنے موروثی ملک پر قبضہ کر لوں۔''

اکبر نے اس رائے سے اتفاق تو کیا لیکن ایک شرط بھی رکھ دی۔

''اگر تم اپنے ملک پر قبضہ کر لو تو پھر برار کا علاقہ ہمارے حوالے کر دینا۔''

برہان اس وقت اپنے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے ہر شرط منظور کرنے کو تیار تھا۔ یہ شرط بھی مان لی اور دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہنشاہ اکبر نے پرگنہ ہنڈیا برہان شاہ کو بطور جاگیر عنایت کی اور حاکم امیر راجا علی خاں کے نام اس مضمون کا ایک فرمان بھیجا کہ برہان شاہ کی مدد میں کوتاہی نہ کی جائے۔

برہان شاہ سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا دکن کی سرحد پر پہنچا اور قصبہ ہنڈیا میں قیام پذیر ہوا۔ اس نے نظام شاہی علاقے کے زمینداروں اور سرداروں کو قول نامے روانہ کیے اور انہیں اپنی اطاعت کی ترغیب دی۔ ان زمینداروں نے برہان شاہ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور

اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

برہان شاہ نے سب سے پہلے برہان پور اور اسیر کے حکمران علی خاں کے مشورے سے خواجہ نظام استر آبادی کو احمد نگر کے سرحدی امراء کے پاس بھیجا۔

خواجہ استر آبادی نے لباس تبدیل کر کے قلندروں کا سا حلیہ بنایا تا کہ احمد نگر کے امراء اور سرداران لشکر سے برہان شاہ کی مدد کا وعدہ لے۔ حلیہ اس لیے بدل لیا کہ پہچانا نہ جائے۔ خواجہ ان لوگوں کے پاس پہنچا اور اپنی آمد کا مقصد ظاہر کیا۔ احمد نگر کے امراء میں سے بعض نے برہان کی مدد کا وعدہ کیا۔ بعض نے انکار کر دیا۔

"جب نظام شاہی خاندان ہی کا ایک فرد تخت احمد نگر پر متمکن ہے تو ہم اس کا تختہ الٹنے کے لیے کسی اور کی مدد کیوں کریں؟"

جن امیروں نے مدد کا وعدہ کیا، ان میں جہانگیر خاں حبشی بھی تھا۔ وہ برار اور خاندیس کے قرب وجوار کے پرگنوں کا جاگیردار تھا اور جمال خاں کا جانی دشمن تھا۔

جہانگیر خاں، خواجہ نظام استر آبادی سے بے حد خوش اخلاقی سے پیش آیا اور اس کی بہت عزت کی۔ اس نے برہان نظام شاہ کے نام ایک خط لکھا اور اسے احمد نگر آنے کی دعوت دی۔ خواجہ استر آبادی کے چلے آنے کے بعد جہانگیر خاں نے اپنے ایک رشتے دار کو بہت سے قیمتی تحائف دے کر برہان نظام شاہ کے پاس بھیجا اور اسے جلد از جلد احمد نگر آنے کا پیغام دیا۔

اس کے وعدوں نے برہان شاہ کو اتنا خوش کر دیا کہ وہ بے احتیاطی کے ساتھ مختصر فوج کے چند سوار لے کر برار کی سرحد میں داخل ہوا اور جہانگیر خاں کی قیام گاہ کے قریب پہنچا۔ جہانگیر خاں نے وعدہ خلافی اور لڑائی کا ارادہ کیا۔ دونوں فریقین ایک دوسرے سے صف آرا ہوئے۔ برہان شاہ کو شکست ہوئی۔ برہان شاہ بے حال تباہ واپس بھاگتا آ گیا۔

برار پہنچ کر اس نے حاکم امیر راجا علی خاں کے نام ایک خط لکھ کر اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور جمال خاں کے ذریعے اپنے موروثی ملک پر قبضہ کرنے کے بارے میں اس سے مشورہ طلب کیا۔ راجا علی خاں کا جواب آیا۔

"اگر تم شہنشاہ اکبر سے عسکری مدد حاصل کرو گے تو دکن کے تمام فرماں روا تمہارے خلاف ہو جائیں گے اور جمال خاں کی مدد کریں گے۔ میرے پاس اتنی فوج نہیں ہے کہ میں جمال خاں سے جنگ کروں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ابراہیم عادل شاہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ تمہاری ضرور مدد کرے گا۔"

برہان نظام شاہ نے اس مشورے پر عمل کیا اور چند تیز رفتار قاصدوں کے ذریعے ابراہیم عادل شاہ کے نام خط روانہ کیا۔

مولف تاریخ فرشتہ یعنی محمد قاسم فرشتہ حال ہی میں ابراہیم عادل شاہ کی ملازمت میں آیا تھا۔ یہ قاصد فرشتہ کے مکان پر پہنچے کیونکہ ایک خط فرشتہ کے نام بھی تھا۔

"تمام راستے مسدود ہیں اور سارے راستوں پر دشمن کا قبضہ ہے اس لیے میں نے اپنے قاصدوں کو اس راستے سے روانہ کیا ہے۔ تم میرے وفادار، مخلص اور ہمدرد ہو۔ جس طرح بھی ممکن ہو یہ خط ابراہیم عادل شاہ کے ملاحظے کے لیے پیش کر دینا اور اس کا جواب جلد از جلد لے کر روانہ کرنا۔"

محمد قاسم فرشتہ ان قاصدوں کو لے کر دلاور خاں کے پاس پہنچا اور اس کے توسط سے ابراہیم عادل تک یہ خط پہنچا دیا۔ ابراہیم نے اس خط کو پڑھا اور اسی وقت برہان شاہ کی مدد کرنے کا عندیہ دے دیا۔ اس نے اسی وقت جواب لکھا اور قاصدوں کو روانہ کر دیا۔

بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے برہان نظام کی مدد کرنے اور جمال خاں کا قلع قمع کرنے کے لیے "شاہ درگ" کا سفر اختیار کیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے برار کے امراء اور شرفاء کے نام خطوط روانہ کیے۔

جب راجا علی خاں اور برہان نظام نے ابراہیم کی شاہ درگ آمد کا سنا تو ان دونوں نے ابراہیم کی خدمت میں تہنیتی خطوط روانہ کیے۔

"حضور کی آمد سے ہمیں جس قدر خوشی ہوئی ہے دشمنوں کو اس بات کا اتنا ہی غم ہے۔ حضور کی لشکر کشی سے جو فوری نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ برار کے امراء خصوصاً جہانگیر خاں حبشی اور اس کے ساتھی جلد از جلد ہم تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ احمد نگر سے چند قاصد آئے ہیں اور انہوں نے یہ اطلاع دی ہے کہ جمال خاں سفر کی تیاری کر چکا ہے اور اسمٰعیل شاہ کو ساتھ لے کر برار کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ اس وجہ سے امرائے برار اپنے علاقے کو چھوڑ کر حضور کی خدمت میں پہنچنے سے معذور ہیں۔ اگر آپ دو تین منزل اور آگے بڑھیں تو جمال خاں آپ کے ڈر سے احمد نگر سے نکلنے اور برار پر حملہ کرنے کا خیال ترک کر دے گا اور پھر امرائے برار آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔"

ابراہیم شاہ نے اس مشورے کو صائب سمجھا اور اس پر عمل کرتے ہوئے شاہ درگ سے رخصت ہوا اور برار کے سرحدی مقام دارا سنگ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے برہان نظام شاہ اور راجا علی خاں کو پیغام بھیجا کہ میں نے تمہاری دانست کے مطابق پیش قدمی کی ہے۔ اب تم لوگوں کا فرض ہے کہ فوراً برار کی سرحد پر پہنچ جاؤ اور امیروں کو بھی بلا لو۔ میں بھی جمال خاں کی سرزنش کے بعد تم سے آملوں گا۔"

جمال خاں بھی بچہ نہیں بیٹھا تھا۔ بہادر بھی تھا اور ذہین بھی۔ اس نے دشمن کی دونوں جماعتوں کی تباہی کا منصوبہ بنایا اور برار کے سپہ سالار سید احمد الملک کو خط لکھا۔

"آس پاس کے تمام فرماں روا مجھے تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر مردانگی کا یہ تقاضا ہے کہ تم امرائے برار کو سنبھالے رکھو اور انہیں برہان نظام شاہ کے ساتھ سازباز نہ کرنے دو نیز برہان کو برار میں داخل نہ ہونے دو۔ راجا علی خاں تمہاری مخالفت کرے گا تم اس کی پروا نہ کرنا۔ تم اس کے ساتھ باقاعدہ جنگ کر کے اسمٰعیل نظام شاہ کی وفاداری و خیر خواہی کا ثبوت دینا۔ اس کے بعد عنقریب ہی دلاور خاں سے صلح کر کے میں بھی تمہاری طرف آؤں گا۔"

جمال خاں نے اس توقع کے ساتھ کہ دلاور خاں اور ابراہیم کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، دلاور خاں کے نام ایک خط لکھا اور اس سے صلح کی درخواست کی۔ اس نے اس خط میں نہایت پرزور انداز بیان اختیار کیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد دلایا تھا کہ تم نے بلبل خاں کی آنکھیں نکلوا دی تھیں، اس باعث ابراہیم کے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں پاؤں کے کانٹے کی طرح نکال پھینکے گا اس لیے اس کے لیے لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن دلاور خاں نے صلح کی درخواست ٹھکرا دی۔

جمال خاں نے دلاور خاں کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد خزانے کے منہ کھول دیے اور روپے کی مدد سے ایک زبردست لشکر تیار کر لیا۔ اسمٰعیل کو ساتھ لیا اور جنگ کے ارادے سے برار کے سرحدی مقام دارا سنگ کی طرف روانہ ہوا جہاں ابراہیم ٹھہرا ہوا تھا۔

جمال خاں، عادل شاہی لشکر سے سات کوس کے فاصلے پر جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے صلح کی بات چیت کے لیے ایک مرتبہ پھر دلاور خاں کے پاس قاصد روانہ کیے۔ دلاور خاں نے اس مرتبہ بھی صلح کے سلسلے میں گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔

ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ دلاور خاں کے چند ساتھیوں نے اس تک یہ بے سروپا خبر پہنچائی کہ جمال خاں صلح کی طرف سے ناکامی کے بعد اتنا عاجز آ گیا ہے کہ اب فرار کے راستے ڈھونڈ رہا ہے اور یہ سوچ رہا ہے کہ اپنے ہم خیال ساتھیوں کا ایک گروہ لے کر میدان جنگ سے فرار ہو جائے اور ایک جنگل میں جا کر چھپ جائے۔

دلاور خاں نے کسی تحقیق کے بغیر اس خبر پر یقین کر لیا اور جمال خاں کا تعاقب کر کے گرفتار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ خبر بے بنیاد تھی لیکن حالات نے ایسا رخ اختیار کر لیا کہ سچ ثابت ہو گئی۔ ہوا یہ کہ جمال خاں کا ایک امیر اس سے ناراض ہو کر لشکر سے نکلا اور برہان نظام شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ جمال خاں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے سمجھا کہ اب اس کے تمام امیر اسی طرح ایک ایک کر کے دشمن سے جا ملیں گے۔ اسے اپنی جان کی بھی فکر ہوئی۔ اس نے فوراً اپنی قیام گاہ سے کوچ کیا اور ایک ایسی جگہ چلا گیا جو پانی اور پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔

دلاور خاں کے جاسوسوں نے اسے یہ اطلاع فراہم کر دی۔ وہ دلاور یہ سمجھا کہ پچھلی خبر صحیح تھی۔ جمال خاں نے بھاگنے کے ارادے سے کوچ کیا ہے۔

دلاور خاں ایسا سرشار ہوا کہ ابراہیم کو بتانا بھی ضروری نہ سمجھا اور بیس ہزار سواروں کو ساتھ لے کر جمال خاں کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے پاس سامان جنگ کافی ہے یا نہیں۔ جب وہ اپنے دشمن سے تین چار کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو اسے دور ہی سے خیمے دکھائی دیے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ خیمے کس کے ہیں۔ اس کے ساتھی بھی اسی کی طرح لاعلم تھے۔ اس نے صورت حال جاننے کے لیے مخبروں کو بھیجا۔ وہ جو خبر لائے اس نے دلاور خاں کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ مخبر یہ خبر لائے تھے کہ یہ نظام شاہی فوج کے خیمے ہیں۔ جمال خاں حفاظت کی غرض سے یہاں چلا آیا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ جمال خاں فرار نہیں ہوا ہے، محض جگہ بدل لی ہے۔

دلاور خاں سے ایک اور غلطی ہوئی۔ وہ چاہتا تو بآسانی واپس ہو سکتا تھا لیکن اس کے غرور نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ اسی جگہ لشکر انداز ہو گیا۔

اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جب وہ لشکر جو اس کے پیچھے روانہ ہوا تھا اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ دشمن سے جنگ کرے۔

لشکر سے پہلے بادشاہ کا ایک قاصد اس کے پاس پہنچ گیا۔ بادشاہ نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ چونکہ تم نے جنگ کی تیاری پوری طرح نہیں کی ہے اس لیے آج کے دن جنگ نہ کرنا۔ جب تم اچھی طرح تیاری کر لو تو دشمن سے بھڑنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو نقصان اٹھاؤ گے۔

اس کا غرور ایک مرتبہ پھر اس کے راستے میں حائل

"تم میری طرف سے بادشاہ سے کہنا کہ میں بہت جلد جمال خاں کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں لا رہا ہوں۔ زنداں کا انتخاب خود فرمالیں کہ اسے کہاں رکھنا ہے۔"

اس کے بعد جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ اپنے تحت جمال لشکر کو اس جگہ سے ہٹایا اور دشمن کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس نے پانچ چھ ہزار ترک سپاہیوں کو دشمن کے پیچھے متعین کردیا تاکہ نظام شاہی امراء اپنے ہاتھیوں اور خزانوں کو میدان جنگ سے باہر نہ لے جاسکیں۔

جمال خاں نے جب دیکھا کہ فرار کے تمام راستے بند ہیں تو اس نے بھی لڑائی کا ارادہ کیا اور دلاور خاں کے سامنے آگیا۔

طرفین میں زبردست لڑائی ہونے لگی۔ جب لڑائی اپنے عروج پر تھی تو عادل شاہی امراء عالم خاں اور عین الملک نے آپس میں ملاقات کی اور دلاور خاں کی شکست کو یقینی سمجھ کر راہ فرار اختیار کرنے کی صلاح کی۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ بادشاہ دلاور خاں سے بہت زیادہ ناراض ہے۔ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر جنگ شروع کی ہے، اب نتیجہ خود بھگتے گا۔ وہ میدان جنگ سے نکلے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔

ان امیروں کے چلے جانے کے بعد دلاور خاں بے سہارا ہوگیا۔ دونوں امیروں کے ماتحت لشکر بھی اسی وقت میدان چھوڑ گئے تھے۔

جمال خاں بھی دیکھ رہا تھا کہ دلاور خاں پر کیا بیت گئی۔ اس نے دو سو سواروں کی جمعیت لی اور دلاور خاں پر حملہ کردیا۔ اب دلاور خاں نے میدان میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور سات اشخاص کے ہمراہ فرار اختیار کی۔

دلاور خاں کو اپنے جاسوسوں کی زبانی معلوم ہوا کہ عالم خاں اور عین الملک فرار ہو کر بادشاہ کے پاس ورا سنگ کی طرف جا رہے ہیں تاکہ دلاور خاں کی تباہی و بربادی کا سامان کریں۔ یہ سنتے ہی اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار اتنی بڑھا دی کہ عین الملک اور عالم خاں کے پہنچنے سے پہلے ہی ورا سنگ پہنچ کر بادشاہ کے حضور حاضری دے دی۔ دشمن کے تعاقب کا خوف تھا اس لیے دلاور خاں نے بادشاہ کو ساتھ لیا اور شاہ درک کی طرف روانہ ہوگیا۔ تمام رات سفر کرنے کے بعد صبح کے وقت وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

جمال خاں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلد اور ایسی شاندار فتح نصیب ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ دلاور خاں فرار ہو کر ورا سنگ کی طرف گیا ہوگا جہاں بادشاہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بھی نکلی لے کر وہاں سے جاچکا تھا۔ جمال خاں وہیں ٹھہر گیا۔

بادشاہ کے شاہ درک پہنچ جانے کے بعد تمام عادل شاہی امراء اور فوجی سردار بھی شاہ درک میں جمع ہوگئے تھے۔

بادشاہ کے بھیجے ہوئے خطوط کام دکھا رہے تھے۔ برار کے امراء بادشاہی حکم کے مطابق برہان نظام شاہ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ راجا علی خاں حاکم اسیر بھی برہان نظام کا حلیف بن چکا تھا۔ یہ سب مل کر احمد نگر پر حملہ کرنے والے تھے۔ جمال خاں کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے ورا سنگ میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور برار کی طرف چل دیا۔ گویا جنگ پر آمادہ ہوا۔

اس خبر سے گھبرا کر راجا علی خاں نے ابراہیم عادل شاہ کو خطوط لکھے اور مدد کی درخواست کی۔ عادل شاہ چونکہ جمال خاں کے ہاتھوں شکست ہو چکی تھی لہٰذا شکست کے اس داغ کو دھونے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ ابراہیم عادل نے آٹھ ہزار ترکی سپاہیوں کو اپنے لشکر سے جدا کر کے جمال خاں کے تعاقب میں روانہ کردیا جو برار کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ترکی لشکر کو ہدایت کی۔



"جلد از جلد دشمن کے پاس پہنچ کر تمام راستوں کو مسدود کردو۔ کوئی ضرورت کی چیز مثلاً غلہ اور چارہ وغیرہ اس کے پاس پہنچنے نہ پائے۔ نیز دشمن کو اس انداز سے ترک کرو کہ برہان نظام اور راجا علی خاں بڑی آسانی سے غالب آسکیں۔"

اس لشکر کے چلے جانے کے بعد بادشاہ نے ایک دریا کے کنارے خیمے لگانے کا حکم دیا اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ یہاں چند روز قیام کرنے کے بعد آگے بڑھے گا۔ دلاور خاں نے اس کی مخالفت کی۔

"یہ جو آپ کر رہے ہیں جنگی حکمت عملی کے خلاف ہے۔ آپ کو یہاں سے فوراً روانہ ہونا چاہیے۔ آپ نہیں جاتے تو میں یہاں سے خود نکل جاؤں گا۔"

بادشاہ کو اس کی یہ گستاخی سخت ناگوار گزری۔ وہ اس کی گستاخیاں برداشت کرتا چلا آرہا تھا۔ دلاور خاں اتنی طاقت پکڑ چکا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔ تمام امراء اس کے تابع فرمان تھے۔ بادشاہ ان سے کوئی مدد نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ کسی مناسب وقت پر دلاور خاں سے خود نمٹ لے گا۔

دلاور خاں سمجھ رہا تھا کہ بات ٹل گئی لیکن بات ٹلی نہیں تھی۔

ابراہیم عادل کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا کہ کسی طرح دلاور خاں سے پیچھا چھڑایا جائے۔ وہ کسی امیر پر بھروسا نہیں کر سکتا تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی فکر میں تھا کہ اس کا ایک جلو غلام جو اس کی والدہ کی ملازمت میں رہ چکا تھا اور اب اس کے پاس تھا، حاضر ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ایک خیال اس کے دل میں بجلی کی طرح کوندا۔ "اس شخص کو لشکر میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔"

"مادھولال! تم میرا ایک کام کرو۔"

"حضور کے لیے جان بھی حاضر ہے۔"

"ایک خط میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اسے لے کر عین الملک کے پاس چلے جاؤ اور جو جواب وہ تمہیں دے، وہ مجھ تک پہنچادو۔"

"آپ مجھے اتنی عزت دے رہے ہیں۔ میں یہ کام ضرور کروں گا۔"

ابراہیم نے وہ خط مادھولال کے حوالے کردیا جس میں دلاور خاں سے بیزاری کی تفصیل بیان کی ہوئی تھی۔ اس نے خط کے جواب میں لکھا۔ "اگر حضور دلاور خاں سے اس قدر بیزار ہوگئے ہیں تو ہم جاں نثاروں کو حکم دیا جائے کہ اسے جلد از جلد ٹھکانے لگا دیا جائے۔"

یہ خط کتابت جاری رہی اور منصوبے بنتے رہے۔ معاملہ دلاور خاں جیسے طاقتور امیر کا تھا اس لیے نہایت احتیاط سے کام لیا جا رہا تھا۔ پھر مادھولال کے توسط سے بادشاہ اور عین الملک کے درمیان یہ طے ہوا کہ آدھی رات کے وقت جبکہ دلاور خاں سو رہا ہو، عین الملک لشکر میں چلا جائے۔ اس کے بعد عین الملک، آنکش خاں اور علی خاں کو ساتھ لے کر دلاور خاں پر حملہ کردے۔

طے والی رات بادشاہ اپنی قیام گاہ سے باہر نکلا اور ایک غلام کو حکم دیا کہ وہ خاصہ کا ایک گھوڑا لے آئے۔ یہ غلام گھوڑا لینے گیا۔ جلوداروں کے سردار نے گھوڑا دینے سے انکار کردیا۔ "دلاور خاں کے حکم کے بغیر گھوڑا نہیں دیا جاسکتا۔" غلام نے یہ سنتے ہی جلودار کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اب جلودار سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور اس نے فوراً کئی گھوڑے لا کر حاضر کردیے۔

بادشاہ اور اس کے کئی غلام ان گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ الیاس خاں سرنوبت نے جب بادشاہ کو سوار ہوتے دیکھا تو دوڑا ہوا آیا۔

"حضور اس وقت باہر جانے کا نہیں۔ آخر اس تیاری کی وجہ کیا؟"

"یہ موقع گفتگو کا نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔" الیاس خاں اپنے سپاہیوں کے ساتھ جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، بادشاہ کے ساتھ ہولیا۔ بادشاہ بڑے لشکر سے الگ ہو کر عین الملک کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔

بادشاہ کے سراپردہ سے باہر آتے ہی خاصہ کے سپاہی فوراً مسلح ہوگئے۔ یہ لوگ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان لوگوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

ابراہیم عادل عین الملک کے لشکر کے قریب پہنچا تھا کہ دلاور خاں کے مخبروں نے یہ خبر دلاور خاں تک پہنچادی۔ دلاور خاں اسی وقت جنگ کے ارادے سے تیار ہوا اور سورج نکلنے کے وقت تک بادشاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ دلاور خاں کو توقع تھی کہ لشکر خاصہ کے سپاہی اور دیگر امراء پہلے کی طرح بادشاہ کی اطاعت سے منحرف ہو کر اس کے ساتھ مل جائیں گے۔ کوئی اور ملے نہ ملے، عین الملک نے غداری کی۔ جب بادشاہ نے عین الملک کو حکم پہنچایا کہ وہ دلاور خاں کی مدافعت کرے۔ عین الملک بظاہر تو بادشاہ کے فرمان کی اطاعت کے لیے نکلا لیکن خفیہ طور پر دلاور خاں کے پاس یہ پیغام بھی بھجوادیا۔

"بادشاہ اچانک ہمارے پاس آگیا ہے اور ہم لوگ مجبوراً اس کی اطاعت کا دم بھر رہے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر بادشاہ کو اپنے ساتھ لو اور اپنی جگہ واپس جاؤ۔ ہماری طرف سے بے فکر رہو ہم تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔"

یہ پیغام ملتے ہی دلاور خاں نے اپنی فوج کو تو کچھ فاصلے پر چھوڑا اور خود پانچ سو سواروں کے ساتھ بادشاہ کے سامنے آیا اور عرض کیا۔

"آپ کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ رات کے وقت سراپردہ شاہی سے باہر نکلتے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ کسی نے آپ کے کان بھر دیے ہوں گے میرے خلاف۔ میں ان چھوٹی موٹی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ اس وقت یہی بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ واپس روانہ ہوں۔"

بادشاہ کے لیے اس کا یہ طرز تخاطب نہایت گستاخانہ تھا۔ وہ بلند آواز میں پکارا۔ "اس گستاخ کو کون سزا دینے کے لیے تیار ہے؟" یہ سنتے ہی اوزبک خاں نامی لشکر خاصہ کا ایک سپاہی آگے بڑھا۔ اس نے دلاور خاں پر تلوار کا ایک وار کیا اگرچہ یہ ضرب کاری نہیں تھی۔ دلاور خاں نے اپنا گھوڑا پیچھے ہٹالیا۔ اوزبک خاں نے تلوار کا ایک اور وار کرنا چاہا۔ اسی وقت دلاور خاں کا گھوڑا بدک گیا۔ دلاور کے لشکر کے ایک جماعت نے فوراً اپنا ہاتھی دلاور اور اوزبک کے درمیان لاکر

ظاہر کر دیا تاکہ دلاور خان کسی دوسرے گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ بس یہ موقع بہت تھا۔ بادشاہی رعب ایسا تھا کہ دلاور کے لشکر کا کوئی سپاہی اس کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا لہٰذا وہ بھاگ اٹھا۔ بادشاہ کے لشکر نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ کسی جگہ قیام کیے بغیر ہی احمد آباد بیدر پہنچ گیا۔

بادشاہ کو معلوم تھا کہ دلاور خان بیدر پہنچ کر خاموش نہیں بیٹھے گا بلکہ بیجاپور کے خلاف سازشوں کا جال بچھائے گا لیکن وہ اسی پر خوش تھا کہ اسے دلاور خان کی چیرہ دستیوں سے نجات مل گئی۔

☆☆☆

جمال خان کے تعاقب میں روانہ ہونے والا عادل شاہی لشکر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ جمال خان سخت پریشان تھا لیکن ابھی حواس اس کے قابو میں تھے۔ وہ راستہ طے کرتا ہوا ''روہنگیر'' گھاٹ پر پہنچا۔ برہان شاہ کے آدمیوں نے گھاٹ کا راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ جمال شاہ ایک دوسرے راستے سے برہان شاہ کی طرف بڑھا۔ یہ راستہ بہت ہی مشکل اور پیچیدہ تھا۔ یہاں پانی بھی بہت کم تھا اور ہوا انتہائی گرم تھی۔ سپاہیوں کا برا حال تھا۔ بہت سے تو یہ طے کر رہے تھے کہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس لوٹ جائیں۔ اسی اثنا میں یہ خبر ملی کہ تین کوس کے فاصلے پر ایک جگہ ہے جہاں پانی بکثرت ہے۔ جمال خان فوراً اسی راستے کی طرف بڑھا لیکن معلوم ہوا کہ برہان شاہ اور علی خان نے پہلے ہی اس مقام کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ جمال خان کے لشکریوں کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی۔ انہوں نے یہ رات پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہوئے جنگل میں گزاری۔ صبح ہوئی تو پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ انہیں اطلاع ملی کہ قریب ہی ایک نخلستان ہے اور وہاں پانی بکثرت ہے۔ یہ لوگ بھاگے بھاگے وہاں گئے۔ تھوڑا سا پانی ہاتھ لگا جو جانوروں اور انسانوں کے کام آیا۔

اب جمال خان تنگ آ چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ فیصلہ کن معرکے کے لیے آگے بڑھے گا۔ فتح ہو یا شکست سے بے پروا ہو کر آگے بڑھا اور وہ فاصلہ طے کر لیا جو اس کے اور برہان شاہ کے درمیان حائل تھا۔ اپنی قوت پر نازاں ہو کر مقابلے پر آ گیا۔

دونوں لشکروں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ جمال خان کے لشکر نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور دشمن کو پسپا کر دیا۔ قریب تھا کہ فتح حاصل ہوتی، اچانک ایک تیر جمال خان کے ماتھے پر لگا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔

حال دیکھ کر ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اسمٰعیل نظام کو لے کر بھاگ گئے۔

برہان شاہ نے فراریوں کا تعاقب کیا۔ بھاگنے والے یاقوت خان اور خداوند خان حبشی کو اس نے گرفتار کر لیا اور ان دونوں کے سر تن سے جدا کر دیے۔ کمیل خواجہ سرا اسمٰعیل نظام کو لے کر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اس نے جو یہ حال دیکھا تو اسمٰعیل نظام کو ایک قصبے میں چھوڑا اور خود بیجاپور کی طرف بھاگ گیا۔

اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ برہان شاہ کے امراء نے کمیل کا پیچھا چھوڑ دیا اور اسمٰعیل نظام کو اس کے باپ برہان نظام کے پاس لے آئے۔

ابراہیم دلاور خان کے قصے سے نمٹنے کے بعد برہان نظام کی مدد کے لیے برار کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اسے برہان کی فتح اور جمال خان کے قتل کی اطلاع ملی۔ اس نے اسی مقام سے برہان نظام شاہ کو تہنیت نامہ ارسال کیا اور خود بیجاپور کی طرف لوٹ گیا۔

☆☆☆



ابراہیم نظام شاہ نے دلاور خان کے بغیر سرزمین بیجاپور پر قدم رکھا تو سب سے پہلے اسے اپنے بھائی اسمٰعیل کی یاد آئی جسے دلاور خان حبشی کو اس نے بلگوان کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ دلاور خان کے خوف سے وہ اپنے بھائی کو رہا نہ کر سکا تھا۔ اب اس نے ایک خاص درباری کو شہزادہ اسمٰعیل (ابراہیم عادل کا بھائی) کے پاس بھیجا اور اسے یہ پیغام دیا۔

''میں اب تک تمہارے دیدار سے محروم ہوں۔ میں کچھ ایسا مجبور ہوا تھا کہ تمہیں نہ دیکھ سکا۔ تم اصل حالات سے پوری طرح باخبر ہو۔ اس لیے مجھے کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب اس وقت تم یہ کرو کہ اس قلعے میں عیش و عشرت سے زندگی گزارو۔ جب سلطنت کے چند اہم اور ضروری کام طے پا جائیں گے تو میں تمہیں اپنے پاس بلا لوں گا۔''

شہزادہ اسمٰعیل نے اپنے بھائی کی محبت کی پروا نہ کی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ دلاور خان درمیان سے ہٹ گیا ہے تو ہنگامہ پروری کی ترغیب سے بادشاہ کی مخالفت پر اتر آیا اور تاج و تخت کی تمنا انگڑائیاں لینے لگی۔ اس نے علم بغاوت بلند کیا اور کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا۔ ابراہیم کو جب ان حالات کا علم ہوا تو شہزادہ اسمٰعیل کے نام ایک نصیحت آمیز خط لکھا۔

''مجھے تمہاری مخالفانہ کارروائیوں کا علم ہوا ہے۔ تم اگر یہ روش چھوڑ دو تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ خداوند تعالیٰ جس کو سلطنت و تخت سے سرفراز

ہے کہ ملک دکن کا بہترین حصہ میرے قبضے میں ہے اور یہاں کے تمام باشندے اور امراء دل و جان سے میرے فرماں بردار ہیں۔ تم اپنے ارادے سے باز آ جاؤ۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں معرکہ آرائی میں تمہیں نقصان اٹھانا پڑے۔''

ابراہیم عادل نے یہ خط اپنے ایک قابل اعتماد امیر شاہ عالم کے ہاتھ روانہ کیا۔ شاہ عالم یہ خط لے کر بلگوان پہنچا۔ شہزادہ اسمٰعیل خط پڑھ کر بہت طیش میں آیا۔ اس نے شاہ عالم کو قید کر کے بادشاہ کو جنگ آمیز جواب لکھ بھیجا اور پھر بغاوت اور خروج کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے برہان نظام شاہ کے پاس ایک قاصد روانہ کیا اور اس سے مدد کا طالب ہوا۔ برہان نظام شاہ کے پاس سے مثبت جواب آیا۔

''اگر تمہارا کام مناسب اور ٹھیک طریقے سے انجام پائے تو تم بیجاپور کے بڑے بڑے امیروں کو آسودہ کر کے دل خوش کن وعدوں سے اپنا بناؤ خصوصاً عین الملک سے گہرے مراسم پیدا کرو۔ اگر یہ امیر تمہارا حلیف بن گیا تو دوسرے امراء بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔''

شہزادے نے اس سے اور آتش خان سے تعلقات پیدا کیے اور ان دونوں کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ عین الملک نہایت ہوشیار امیر تھا۔ اس نے کوئی فوری قدم اٹھانے سے گریز کیا اور یہ چاہا کہ معاملہ طول کھینچے اور اسمٰعیل بلگوان کو اپنا دارالسلطنت بنا کر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرے تاکہ ایک ہی سلطنت میں دو حکمرانوں کی حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شہزادے کو یہ پیغام بھیجا۔

''جب سلطنت کی تمام مہمات انجام پا جائیں گی تو میں چند امراء کے ساتھ آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

جب ابراہیم کو شاہ عالم کی بابت علم ہوا تو وہ بہت طیش میں آیا اور فوراً الیاس خان سر لوبت کو ایک زبردست فوج کے ساتھ قلعہ بلگوان کی طرف بھیجا۔

الیاس خان نے بلگوان پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ عین الملک اور شہزادے کے خفیہ تعلق سے بے خبر تھا۔ اس نے عین الملک کو بھی بلگوان کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ظاہری طور پر اس قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن چوری چھپے اہل قلعہ کو غلہ اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھیجتا رہا۔ بادشاہ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے عین الملک کی طلبی کا فرمان جاری کر دیا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ان دنوں سب سے اہم مسئلہ قلعہ

سے مشورہ کرتا ہے لہٰذا تم جلد سے جلد شاہی بارگاہ میں پہنچ جاؤ۔''

عین الملک نے نہایت خندہ پیشانی سے شاہی فرمان کا استقبال کیا اور جلد سے جلد پایہ تخت کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ بادشاہ مطمئن رہے۔

ابراہیم نے اپنا دربار دوبارہ سجانے پر آراستہ کیا۔ تمام امراء اور عسکری دائیں بائیں کھڑے ہوئے۔ شان و شوکت کا یہ عالم دیکھ کر عین الملک سہم گیا۔ اس نے تین جگہ زمین کو بوسہ دیا اور بعد ازاں شاہی خدمت میں حاضر ہوا اور تخت شاہی کو چوم کر بادشاہ کے حکم کے مطابق اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

عین الملک خوف زدہ تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا راز بادشاہ پر کھل گیا ہے اس لیے اس سے باز پرس کی جائے گی لیکن اس کے برخلاف اسے خلعت فاخرہ، کمربند، خنجر مرصع، اسپ تازی اور ایک چابک سے نوازا۔ اس کے بعد چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے اس کی جاگیر پر واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

عین الملک نے ابراہیم کے حسن سلوک کی پروا نہ کی۔ بادشاہ کی نرمی کو کمزوری سمجھا۔ اپنی جاگیر پر پہنچ کر بھی چوری چھپے شہزادہ اسمٰعیل کی مدد کرتا رہا۔

اس کے بعد اس نے ابراہیم کی کھلے عام مخالفت شروع کر دی۔ قرب و جوار کے حاکموں کو خطوط لکھے اور انہیں شہزادہ اسمٰعیل کی اطاعت کی ہدایت کی۔ اس نے احمد نگر کے نئے والی برہان نظام شاہ کو بھی نہایت زور دار خط لکھا۔ اس نے لکھا۔

''تمام قلعے اور قصبے شہزادہ اسمٰعیل کے قبضے میں آ گئے ہیں اور اس علاقے کے تمام امراء اور پایہ تخت کے سارے معزز اشخاص نے شہزادے کی وفاداری کا عہد کر لیا ہے۔ سب لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ شہزادے کے سر پر چتر شاہی رکھ کر بیجاپور کا سفر اختیار کیا جائے لیکن یہ عظیم اقدام آپ کی اعانت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کامیابی کے بعد ہم بطور شکرانہ شاہ درگ اور شولاپور کے قلعے اور تمام سرحدی پرگنے آپ کی نذر کریں گے۔''

برہان نظام شاہ کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس نے ابراہیم عادل شاہ کے تمام احسانات کو بالائے طاق رکھ کر شہزادے کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ بس پھر کیا تھا، اب کسی مصلحت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنا وہ لشکر واپس بلا لیا جو الیاس خان کی مدد کے لیے بلگوان بھیجا تھا۔ الیاس خان خوف زدہ ہو گیا اور ابراہیم سے اجازت لیے بغیر ہی

بیجاپور واپس آگیا۔ بادشاہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ الیاس خاں بھی دشمن سے مل گیا ہے۔ بادشاہ نے اسے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔

اب وقت تھا کہ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتا۔ اس نے آتش خاں کو جسے وہ اپنا منہ بولا بیٹا کہتا تھا، خط لکھ کر ہدایت کی کہ لشکر جمع کرے اور برہان نظام شاہ کے آنے کے بعد اس کی ہمراہی میں قلعہ پرندہ پر قبضہ کر لیا جائے۔

آتش خاں نے دس ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں کا ایک زبردست لشکر جمع کر لیا اور اپنی قوت کے نشے میں سرشار ہو کر برہان نظام کی آمد کا انتظار کیے بغیر پرندہ روانہ ہو گیا۔ پرندہ پہنچ کر شہزادے سے ملاقات کی اور برہان نظام کی آمد کی امید میں شہزادے کے سر پر چتر شاہی رکھ دیا۔

ابراہیم عادل کو جب یہ خبریں پہنچیں تو اس نے حمید خاں کو سرلشکر مقرر کیا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔ امرا اور منصب دار بھی اس کے ساتھ تھے۔

حمید خاں ابھی ایک مقام عساپور پہنچا تھا کہ عین الملک اور اس کے ساتھیوں نے اسے شہزادہ اسمٰعیل کی اطاعت کی دعوت دی۔ حمید خاں نے ویسا ہی کیا جیسا کہ ابراہیم عادل نے کہا تھا۔ حمید خاں نے دشمنی کا شائبہ تک نہ ہونے دیا۔ اس نے باغیوں کی بڑی عزت کی اور عین الملک کو کہلا بھیجا کہ میں تم لوگوں سے لڑائی کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میرا ارادہ شہزادہ اسمٰعیل کی اطاعت ہے۔ اگر شہزادہ، برہان نظام کی آمد سے پہلے ہی قلعے سے باہر نکل کر چتر شاہی کو اپنے سر پر سایہ فگن کرے تو میں اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اظہار اطاعت کروں۔

عین الملک اس کے فریب میں آگیا۔ برہان نظام شاہ قلعہ پرندہ کے قریب جو راستے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ حمید خاں کو باتوں میں الجھا کر کچھ وقت گزار سکتا تھا لیکن اس نے شہزادے کو ساتھ لیا اور قلعے سے باہر نکل آیا۔

ایک بڑے میدان میں عین الملک اور حمید خاں کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں اس نے عین الملک کو مزید مطمئن کر دیا۔

"میں ابراہیم کے حکم پر یہاں چلا تو آیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بھی تمہاری طرح اس کے خلاف ہو چکا ہوں۔ اب ہم دونوں مل کر شہزادہ اسمٰعیل کو تخت پر بٹھائیں گے۔"

"ہم دونوں ہی کیوں ۔۔۔ برہان نظام شاہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ قلعہ پرندہ تک پہنچ چکا ہے۔ بس پہنچنے ہی والا ہوگا۔"

اس بے وقوف نے یہ بھی بتا دیا کہ برہان نظام شاہ کتنے فاصلے پر ہے۔ اب حمید خاں کو جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ اس نے اپنے توپچیوں کو اشارہ کیا اور شہزادے کے لشکر پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ عین الملک نے فرار ہونا چاہا لیکن کپیل خاں خواجہ سرا کے حملے نے اس کے لشکر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ عین الملک زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔ کپیل خاں نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اس کے بعد کپیل خاں نے شہزادے کے لشکر کا رخ کیا۔ شہزادے نے آتش خاں کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا تاکہ ان دونوں کے ساتھ برہان نظام شاہ کی خدمت میں حاضر ہو۔ شہزادہ اسمٰعیل پر شراب کا نشہ طاری تھا۔ اس لیے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے وہ زمین پر گر گیا۔ کپیل خاں کے سپاہیوں نے فوراً اسے گرفتار کر لیا۔

شاہی ملازموں نے عین الملک کا سر بیجاپور روانہ کیا۔ بیجاپور میں اس کا سر دری سے باندھ کر لٹکا دیا گیا۔ تمام لوگ اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے آتے۔ ایک ہفتے تک یہی عالم رہا۔

شہزادہ اسمٰعیل کو سلحداروں کے سردار خان جی نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد تمام امرائے عادل شاہی بیجاپور پہنچے اور انہوں نے بارگاہ شاہی میں حاضری دی۔ اسی روز عین الملک کے سر کو ایک توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا گیا۔

برہان نظام شاہ عادل شاہیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے قلعہ پرندہ تک آگیا تھا کہ اس نے یہ تمام واقعات سنے تو سخت پریشان ہوا۔ اب اس کا وہاں رکنا یا آگے بڑھنا بے سود تھا۔ وہ احمد نگر واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

دلاور خاں اب تک احمد آباد بیدر میں تھا اور وہاں سازشوں کے جال بچھا رہا تھا۔ احمد نگر میں برہان نظام کی حکومت آچکی تھی۔ دلاور خاں کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ برہان نظام شاہ، شہزادہ اسمٰعیل کا حلیف بن کر اس کی تخت نشینی کے لیے قلعہ پرندہ تک گیا ہے۔ پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ اسمٰعیل کے قتل کے بعد وہ احمد نگر لوٹ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بیجاپور اور احمد نگر کے درمیان ٹھن گئی ہے۔ یہ معاملہ دب گیا ہے لیکن کسی وقت پھر اٹھے گا۔ اسی موقع پر برہان نظام کو حلیفوں کی سخت ضرورت ہوگی۔ یہی سوچ کر وہ احمد نگر پہنچ گیا اور برہان نظام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے اپنے حالات اور ارادوں سے آگاہ کیا۔ دشمن کا دشمن

ہی دوست ہی ہوتا ہے۔ برہان نظام نے دلاور خاں کی مدد کا وعدہ کر لیا اور اس نے اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ بیجاپور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر سکتا ہے۔ برہان نظام نے اسے منصب و جاگیر سے سرفراز کیا۔ اس جاگیر کی آمدنی سے وہ لشکر کی فراہمی میں مشغول ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ کو جب خبر ہوئی کہ دلاور خاں بیدر سے احمد نگر آ گیا ہے، برہان نظام نے اسے منصب و جاگیر سے نوازا ہے اور اب وہ بیجاپور پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے تو اسے سخت غصہ آیا۔ وہ پریشان تو نہیں ہوا تھا لیکن آزردہ ضرور ہوا۔ اسے دلاور خاں پر نہیں، برہان نظام پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کے دشمن کو نہ صرف پناہ دی بلکہ اس کی مدد پر آمادہ ہوا۔ اس نے اپنا غصہ ایک خط میں اتارا اور اس خط کو برہان نظام تک پہنچا دیا۔

"دوستانہ مراسم کا تقاضا یہ ہے کہ آپ دوست دشمن میں امتیاز کریں اور میرے دوستوں کو اپنا دوست اور میرے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں۔ آپ ہر معاملے میں میرا ساتھ دیں تاکہ باہمی رفاقت اور زیادہ ہو۔ مجھے انتہائی تعجب ہے کہ آپ نے میرے ایک نمک حرام ملازم دلاور خاں کو منصب اور جاگیر دی ہے۔ ساتھ ہی اسے ایک ممتاز عہدے پر متعین کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان تعلقات کا خیال رکھیں گے جو میرے اور آپ کے درمیان چلے آرہے ہیں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو میری دل شکنی کا باعث ہو۔"

یہ پیغام سن کر برہان شاہ سخت غصے میں آیا۔ اسے واقعی دوست اور دشمن میں امتیاز نہ رہا اور اس پیغام کے جواب میں نازیبا اور سخت باتیں کہیں۔

اس کی طرف سے نازیبا جواب آنے کے بعد ابراہیم عادل بھی محتاط ہو گیا اور اس نے ہر صورت میں برہان نظام کو اپنے سامنے زیر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ابراہیم عادل نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپنے ایک قاصد کو احمد نگر ...... بھیجا اور برہان نظام کو یہ پیغام دیا کہ بیجاپور کے تین سو ہاتھی احمد نگر والوں کی طرف ہیں لہٰذا وہ باہمی ہاتھی فوراً واپس کر دیے جائیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو بڑا نقصان اٹھائیں گے۔

دلاور خاں جیسا جری جس کی بہادری کی شہرت پورے دکن میں پھیلی ہوئی تھی، اس کے پاس آ گیا تھا۔ وہ اس پیغام کو کیا خاطر میں لاتا۔ اس کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اس کی ہوس ملک گیری پاؤں پھیلانے لگی۔ اب تک تو وہ محض یہ ارادہ کیے ہوئے تھا کہ دلاور خاں کی مدد کرے گا لیکن اب اس نے براہ راست بیجاپور پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے فوراً لشکر کی فراہمی کا حکم دیا۔ دلاور خاں اور اپنے دوسرے سالاروں کو ساتھ لے کر عادل شاہی علاقے میں داخل ہو گیا۔

عادل شاہ، برہان کو کوئی اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس نے پروا بھی نہیں کی۔ بیجاپور میں مقیم رہا جبکہ برہان نے دریائے بھیمرہ کے کنارے منگلبیڑہ کے مقام پر قیام کیا۔ وہ اس صورت حال سے سخت پریشان ہوا کہ ابراہیم عادل اس کے مقابلے کے لیے اب تک بیجاپور سے کیوں نہیں نکلا۔ اس نے دلاور خاں اور دوسرے امرا سے مشورہ کیا کہ اب کیا قدم اٹھایا جائے۔ دلاور خاں نے مشورہ دیا۔

"بیجاپور کے علاقوں میں جہاں تک ہم پہنچ چکے ہیں، یہاں ہی قیام کیا جائے اور یہاں ایک مستحکم قلعہ تعمیر کیا جائے تاکہ قلعے کو اپنی پشت پر رکھ کر نہ صرف ابراہیم عادل کا مقابلہ کیا جائے بلکہ اس کے علاقوں میں دور تک ترکتاز کرتے ہوئے اپنے لیے فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔"

برہان نظام نے یہ مشورہ مان لیا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ برہان شاہ نے تجربہ کار معماروں اور کاریگروں کو دریائے بھیمرہ کے پار ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ شاہی معماروں نے بڑی مستعدی سے کام شروع کیا اور قلعے کو جلد از جلد تیار کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

ابراہیم عادل نے مصلحتاً بیجاپور سے کوئی فوج نظام شاہی لشکر کی سرکوبی کے لیے روانہ نہ کی لہٰذا یہ لوگ بڑے اطمینان کے ساتھ قلعے کی تعمیر میں مصروف رہے البتہ ان پر نگاہ پوری طرح رکھی ہوئی تھی۔

قلعہ تعمیر ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ برسات کا موسم آ گیا اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں دریا کا پانی چڑھ کر قلعے اور لشکر کے درمیان حائل نہ ہو جائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر عادل شاہی فوج قلعے پر قبضہ نہ کر لے۔ برہان شاہ نے نامکمل قلعے پر دروازے لگانے اور حصار کو توپوں وغیرہ سے مستحکم کیا اور برسات کے دوران قلعے کو مکمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

دلاور خاں کے غرور نے ایک مرتبہ پھر اسے آواز دی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ابراہیم عادل اور اس کے سالار مقابلے پر آتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ اگر اس موقع پر وہ بیجاپور پہنچ کر اپنی کوتاہیوں کی معافی طلب کرے اور برہان شاہ سے مقابلے کے لیے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کرے تو وہ یقیناً مجھے معاف کر دے گا اور پھر میں پہلے کی طرح سیاہ و سفید

کا قلعہ فتح کرلیا تھا۔ [illegible]
اس نے عادل شاہ سے قول ہارنے کی درخواست کی تاکہ پورے اطمینان کے ساتھ وہ بیجاپور جائے۔

ابراہیم عادل تو پہلے ہی اس کی تلاش میں تھا اور چاہتا تھا کسی طرح وہ اس کے ہاتھ لگ جائے لہٰذا اس نے فوراً قول نامہ روانہ کردیا۔

دلاور خاں اس کے دام میں پھنس گیا اور بیجاپور پہنچ گیا لیکن اس کی بدقسمتی کہ یہاں اس کے حق میں حالات وہ نہیں تھے جس کی اسے امید تھی۔ وہ تو بڑی خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے بڑی برق رفتاری سے بیجاپور پہنچا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جونہی بیجاپور پہنچے گا شاندار انداز میں اس کا استقبال کیا جائے گا۔ پہلے کی طرح اسے لشکریوں کا سالار اعلیٰ بنا کر دوسرے سالاروں کو اس کا ماتحت کردیا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ وہ جیسے ہی بیجاپور میں داخل ہوا اسے گرفتار کرلیا گیا۔ وہ چلاتا رہ گیا کہ بادشاہ نے اسے قول دیا تھا لیکن کمیل خاں نے بادشاہ کا حکم نامہ دکھا دیا جس میں تحریر تھا کہ دلاور خاں کو گرفتار کرلیا جائے۔

اسے گرفتار کرکے ایک قلعے میں نظر بند کردیا گیا۔

اس کی گرفتاری کے بعد ابراہیم عادل شاہ نے دشمن کی طرف توجہ دی۔ اس نے اپنے سالاروں کو طلب کیا اور ان کے سامنے تمام صورت حال رکھی۔

”میرے عزیز ساتھیو! یہ بات آپ سب پہلے سے جانتے ہیں کہ برہان نظام نے ہماری مملکت کے اندر ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کردیا ہے تاکہ اس میں اپنی طاقت کو جمع کرکے ہمارے علاقے کے اندرونی حصوں تک پہنچے۔ ہم اب تک اس لیے خاموش رہے کہ شاید برہان نظام اپنے اقدام پر کسی وقت پچھتائے اور واپس لوٹ جائے۔ ہمارے خاموش رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برہان نظام کے ساتھ دلاور خاں ملا ہوا تھا اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ دلاور خاں ہی اسے یہاں تک لایا ہے لیکن اب تو دلاور خاں اس کے ساتھ نہیں بلکہ ہماری قید میں ہے۔ برہان نظام اب بھی قلعے کی تعمیر سے باز نہیں آیا بلکہ اب تو یہ خبریں آرہی ہیں کہ وہ قلعے کو زیر تعمیر چھوڑ کر ہماری جانب بڑھنے والا ہے۔

”اس خطرے سے تو ہم نمٹ ہی لیں گے۔ ایک اور خطرہ بھی ہمارے سر پر کھڑا ہوا ہے۔ وہ خطرہ ہے کرناٹک کے حکمراں راجا تلنگانہ وری کی طرف سے۔ مخبروں کے مطابق تلنگانہ وری اب اپنے دو لشکروں کے ساتھ ہمارے خلاف حرکت میں آنے کے در پے ہے۔ ایک لشکر کی کمانداری ہندیہ نائک کرے گا اور دوسرے کی کمانداری وسواس رائے کرے گا۔ ہندیہ نائک دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے سنگم کی طرف سے ہماری طرف بڑھے گا جبکہ وسواس رائے ورنگل کی طرف سے آنے والی شاہراہ سے ہمارے علاقوں میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔ میرے عزیزو! اس صورت حال میں اب تم لوگ بتاؤ ہمیں کس طرح اور کس ردعمل کا اظہار کرنا چاہیے۔“

تمام سالاروں نے آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے لیے صرف ایک دن کی مہلت طلب کی۔ ان سالاروں میں کمیل خاں، رومی خاں، الیاس خاں، حمید خاں کے علاوہ امرا بھی شامل تھے۔

اگلا دن گزرنے کے بعد قصر شاہی کے اسی وسیع کمرے میں موجود تھے جہاں ابراہیم عادل اجلاس طلب کیا کرتا تھا۔

کمیل خاں نے تمام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا۔

”ہم سب نے مل کر دونوں قوتوں سے نمٹنے کے لیے جو منصوبہ بندی کی ہے، اس کے مطابق ہمارا مقابلہ تین قوتوں سے ہے۔ ایک قوت برہان نظام، باقی دو قوتیں تلنگانہ وری کی ہیں لہٰذا ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں بھی تین لشکر تیار کرنا ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کردیں۔ ایک حصہ رومی خاں کی کمانداری میں دے دیا جائے۔ الیاس خاں کو اس کا نائب مقرر کرکے ان دونوں کو برہان نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ دوسرا حصہ میرے پاس ہوگا اور حمید خاں میرے ساتھ ہوں گے۔ ہم پہلے تو دونوں اکٹھے بیجاپور سے نکلیں گے لیکن راستے میں کسی معقول جگہ پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہوجائیں گے۔ حمید خاں وسواس رائے کا راستہ روکے گا تاکہ وہ پیش قدمی نہ کرسکے۔ میں اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ دریائے کرشنا کے سنگم کا رخ کروں گا۔ وہاں میں ہندیہ نائک سے ٹکراؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے بھاگنے پر مجبور کردوں گا۔ اس کے فرار کے بعد میں حمید خاں کی مدد کو پہنچ جاؤں گا۔ میں وسواس رائے کی پشت پر ہوں گا اور حمید خاں سامنے۔ اس طرح ہم اسے گھیر کر ماریں گے۔ اس کے بعد ہمارا مشترکہ لشکر برہان نظام کو اپنے علاقوں سے نکالنے میں کامیاب ہوجائے گا۔“

ابراہیم عادل نے اس منصوبہ بندی پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ سب وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کی

[illegible]

☆☆☆

ہندیہ نائک دریائے تنگ بھدرا کے اس مقام پر آیا جہاں دریائے کرشنا اس میں آکر گرتا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے دریائے تنگ بھدرا عبور کیا اور اس شاہراہ پر آگیا جو بیجاپور کی طرف جاتی تھی۔ اس نے اس شاہراہ پر دو میل کا سفر طے کرلیا تھا لیکن اس کی راہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بڑا خوش ہوا لیکن اس کی خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ اس کے سالار ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس لیے کہ سامنے کی طرف سے کمیل خاں اپنے لشکر کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔

ہندیہ نائک کچھ دیر کے لیے پریشان ضرور ہوا تھا لیکن یہ دیکھ کر مطمئن بھی ہوگیا کہ دشمن کے لشکر کی تعداد اس سے بہت کم ہے۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ وسواس رائے کا لشکر بس آتا ہی ہوگا۔ اسے کیا خبر تھی کہ حمید خاں وسواس رائے کا راستہ روکے کھڑا ہے۔

ہندیہ نائک خوشی میں اتنا بے قابو ہوا کہ وقت گزارنے کے بجائے فوراً حملے میں پہل کردی۔ دونوں لشکر گتھم گتھا ہوگئے۔ شروع میں ہندیہ نائک کا پلہ بھاری تھا لیکن کچھ ہی دیر میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مسلمانوں نے اس شدت سے حملہ کیا کہ میدان میں دشمن کی لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

ہندیہ نائک ایسا بددل ہوا کہ میدان جنگ سے بھاگ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے اپنے چھوٹے سالاروں کو اشارہ دیا۔ یہ اشارہ ملتے ہی ہندیہ نائک کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

کمیل خاں نے دریا کے کنارے تک اس کا پیچھا کیا اور پھر پلٹ آیا۔ اب اسے اس مقام پر پہنچنا تھا جہاں حمید خاں، وسواس رائے کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

اس نے برق رفتاری سے سفر طے کیا اور وسواس رائے کی پشت پر پہنچ گیا۔ حمید خاں اب تک دفاعی جنگ لڑ رہا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ کمیل خاں آگیا ہے تو جارحانہ حملے شروع کردیے۔ وسواس رائے اس دو طرفہ حملوں کی تاب نہ لاسکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

حمید خاں اور کمیل خاں نے اس بڑی کامیابی کے بعد فیصلہ کیا کہ اب ہمیں شمال میں احمد نگر کے علاقوں کی طرف کوچ کرنا چاہیے تاکہ الیاس خاں اور رومی خاں کی مدد کریں۔

☆☆☆

کمیل خاں اور حمید خاں جس وقت بیجاپور سے ہندیہ نائک اور وسواس رائے کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلے تھے، اسی وقت رومی خاں اور الیاس خاں بھی برہان نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے بیجاپور سے نکلے تھے۔

ان امیروں نے زیر تعمیر شدہ قلعے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور اپنا چھ ہزار کا لشکر دریا کی دوسری طرف اتارا اور حکم دیا کہ پار اترتے ہی لوٹ مار اور تباہی و بربادی کا ایسا بازار گرم کیا جائے کہ نظام شاہیوں کے لیے اطمینان کا سانس دوبھر ہوجائے۔ یہ گویا ایک طرح کی چھاپا مار جنگ تھی۔ مقصد یہی تھا کہ کمیل خاں کی آمد کا انتظار کیا جائے، اس کے بعد باقاعدہ جنگ کی جائے۔

عادل شاہیوں نے دشمن کو بہت پریشان کیا۔ برہان شاہ یہ صورت حال دیکھ کر بہت غصے میں آیا۔ اسے اپنے امیروں پر قطعی بھروسا نہ تھا۔ رات کے وقت وہ دشمن کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا اور صبح ہوتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ عادل شاہیوں نے جب دشمن کی فوج کو دیکھا تو وہ اس جگہ سے کوچ کرگئی اور دریا کو پار کرکے الیاس خاں کے پاس پہنچ گئی۔ اتفاق سے اسی وقت دریا میں طغیانی آگئی اور برہان شاہ دریا کو پار نہ کرسکا۔ اسی جانب سے توپوں کے ذریعے گولے داغے لیکن اس کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور وہ اپنی جگہ واپس آگیا۔

دو چار روز بعد دریا کی طغیانی کم ہوئی تو الیاس خاں اور رومی خاں نے اپنے لشکر سے چند ہزار سپاہی پھر دریا کے پار بھیجے۔ ان سپاہیوں نے پہلے کی طرح پھر چھاپا مار کارروائیاں شروع کردیں۔ آخرکار نوبت یہ آگئی کہ برہان شاہ کے لشکر میں قحط کے آثار پیدا ہونے لگے۔ برہان نے زیر تعمیر قلعے کو اسد خاں ترک کے حوالے کیا۔ بہادر اور جواں ہمت سپاہیوں کے ایک گروہ کو قلعے کے اندر چھوڑا اور خود نظام شاہی حدود میں آگیا تاکہ غلہ اور دیگر سامان ضرورت بآسانی حاصل کیا جاسکے۔

اسی دوران ان کے مخبروں نے یہ اطلاع دی کہ کمیل خاں اور حمید خاں مدد کے لیے آنے ہی والے ہیں۔ ابھی تک رومی خاں اور الیاس خاں دریا عبور کرکے احمد نگر کے علاقوں میں داخل ہونے میں کسی قدر پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ اس خبر کو سنتے ہی انہوں نے تہیہ کرلیا کہ دریا کو پار کرکے برہان نظام کے علاقوں پر لشکر کشی کردیں گے اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ دوسری طرف برہان نظام بھی ابراہیم عادل شاہ کے لشکر پر جان لیوا ضرب لگانے کے لیے اپنے سالاروں کو ایک جگہ جمع کرنے لگا۔ اس نے برار کے

امیرالامرا نورخاں کو جو بہادری میں اپنی مثال آپ تھا، کئی دوسرے امیروں اور لشکریوں کے ہمراہ عادل شاہی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے پاس بلالیا۔

اب یہ اتفاق تھا یا برہان شاہ کی بدقسمتی کہ جس دن نور خاں پہنچا اسی دن کمیل خاں اور حمید خاں بھی الیاس خاں اور رومی خاں سے آکر مل گئے۔

نورخاں کے آنے کے بعد برہان نظام کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے مقابلے کی تیاری کی اور اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ وسطی حصے میں وہ خود رہا، دائیں پہلو پر برار کا نورخاں اور بائیں حصے پر اپنے ایک سالار شجاعت خاں کی سرکردگی میں رکھا۔ اسی طرح عادل شاہیوں نے بھی اپنی صفوں کو ترتیب دیا۔

برہان شاہ نے اپنے لشکر کی تعداد کے زعم میں حملے کی ابتدا خود کی۔ جوابی کارروائی کرتے ہوئے کمیل خاں اور اس کے ساتھیوں نے بھی تاخیر نہیں کی۔ دونوں لشکر خوف ناک انداز میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس موقع پر برار کے امیرالامرا نورخاں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ برہان نظام کے ساتھ مل کر اپنی فتح مندی کو کامیاب بنائے لیکن کمیل خاں نے اس کی کسی چال کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ کمیل خاں نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ وہ جنگ کے دوران پیش قدمی کرتے ہوئے نورخاں کے مقابل ہو جائے گا اور اسے ہر صورت میں موت کے گھاٹ اتار دے گا لیکن اس سے پہلے کہ اس کی نوبت آتی اس کے ایک عام لشکری اعتماد خاں شوستری نے ایسا بے خطا تیر مارا کہ اس کی پیشانی میں چھید ہو گیا اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا۔

برہان نظام اپنے ساتھ برار کے نورخاں کو اس لیے لایا تھا کہ اس کی وجہ سے کامیابی یقینی ہو جائے گی لیکن یہاں تو جنگ شروع ہوتے ہی پانسا پلٹ گیا۔ نورخاں گھوڑے سے گر کر زمین پر پڑا ہوا تھا اور دوسرے گھوڑے اس کی لاش کو پامال کر رہے تھے۔ یہ حال دیکھ کر برہان نظام کے لشکر میں بددلی پھیل گئی۔ کمیل خاں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے حملوں میں پہلے کی نسبت زیادہ شدت پیدا کی۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ برہان نظام کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بچے کھچے لشکر کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عادل شاہیوں نے دشمن کے دو سو ہاتھی اپنے قبضے میں کر لیے۔

برہان نظام نے جب دیکھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا تب اپنے لشکر کے ساتھ ایک محفوظ جگہ اس نے پڑاؤ کرلیا۔ ساتھ ہی وہاں قیام کے دوران اسے ایک کمک بھی مل گئی جو اس کے مرکزی شہر سے آئی تھی۔ اس سامان میں خیمے اور خوراک کا سامان تھا۔ چنانچہ وہاں خیمے نصب کیے گئے اور برہان نظام نے وہاں عارضی دارالحکومت بنالیا۔ وہ یہاں رہ کر جائزہ لینا چاہتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

وہ دشمن کی فکر میں لگا ہوا تھا اور اس طرف سے بے خبر ہو گیا تھا کہ خود اس کے امیر اس ذلت آمیز شکست کے بعد اس کے خلاف ہو گئے ہیں اور اندر ہی اندر اسے معزول کر کے اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت پر بٹھانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اسے بالآخر اس سازش کا علم ہو گیا۔ اس نے کامل خاں وغیرہ کو سخت سزا دی۔ ان سزاؤں سے اس نے دیگر امرا کو بھی اپنے خلاف کرلیا۔ ان خلاف ہونے والوں میں مقرب شاہی یوسف خواجہ سرا بھی تھا جو حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھا۔ خواجہ سرا بادشاہ کے بہت نزدیک تھا اور اس پر بادشاہ کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ سالاروں نے اس سے رابطہ کیا۔

"برہان شاہ نے اپنے کاموں سے احمد نگر کی ذلت و رسوائی کا سامان کیا ہے۔ اگر اس کے پاس طاقت و حوصلہ نہ تھا تو اس نے کیوں بیجاپور سے جنگ مول لی؟ لہٰذا یہ اس قابل نہیں کہ احمد نگر کی حفاظت کر سکے۔ اسے قتل کر کے اس کی جگہ اس کے بیٹے کو حکمران بنانا چاہیے۔"

برہان نظام کو اس کی بھی خبر ہو گئی لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ یوسف خواجہ سرا ایسا کر سکتا ہے۔ وہ اسے آزمانے کے لیے نیند کا بہانہ کر کے خواب گاہ میں گیا۔ یوسف بھی خنجر ہاتھ میں لے کر پیچھے ہی آگیا۔ برہان شاہ نے اسے دیکھ لیا اور چھلانگ لگا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا لیکن برہان کو اس سے اتنی محبت تھی کہ اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا بلکہ اس واقعے سے ایسی چشم پوشی کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

یہ سازشیں سر اٹھاتیں اور نہ جانے کیا رنگ اختیار کرتیں کہ برہان کا ایک امیر راجا علی خاں آگے بڑھا اور تمام حالات بادشاہ کے آگے رکھ کر اس سے درخواست کی کہ وہ بیجاپور والوں سے صلح کر لے۔ اسی میں عافیت ہے۔

"مجھے تمہاری نصیحت پر اعتماد ہے لیکن کمیل خاں صلح کی بات چیت کو آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ ابراہیم عادل اس کے کہنے میں ہے لہٰذا وہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکے گا۔"

"بادشاہ سلامت ٹھیک ہے لیکن ہماری مملکت میں دو آدمی ایسے ہیں جن کے تعلقات بیجاپور والوں سے بہت اچھے ہیں۔ اگر انھیں کام میں لایا جائے تو کمیل پر دباؤ پڑ سکتا ہے۔ ایک مصطفیٰ خاں اور دوسرا اسعد السلام۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"بس ہمیں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔ ہم آج ہی ان دونوں کو بیجاپور روانہ کرتے ہیں۔"

یہ دونوں امیر بیجاپور گئے اور ابراہیم عادل کے حضور حاضر ہوئے۔ صلح کی بات چیت چلی تو پہلے تو ابراہیم نے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا لیکن جب بہت زور دیا گیا تو وہ اس شرط پر تیار ہوا کہ برہان نظام نے ہمارے علاقے میں جس قلعے کی تعمیر شروع کی تھی وہ اس قلعے کو مسمار کرے اور پھر واپس اپنے مرکزی شہر کی طرف چلا جائے۔

ان دونوں امیروں نے یہ شرط تسلیم کرلی اور ابراہیم عادل سے درخواست کی۔

"مناسب ہوگا اگر آپ اپنے کسی امیر کو ہمارے ساتھ کر دیں تاکہ اس کی موجودگی میں قلعہ مسمار کیا جائے۔ پھر کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔"

بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور شاہ نواز خاں شیرازی کو عادل شاہی امیروں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔

برہان نظام شاہ نے نواز خاں کا نہایت پرتپاک استقبال کیا۔ چند روز اسے اپنی مہمانی میں رکھا اور پھر اس کی موجودگی میں نو تعمیر ہونے والا قلعہ مسمار کیا گیا۔

قلعہ مسمار ہونے کے بعد شرط کے مطابق برہان نظام احمد نگر کی طرف چلا گیا۔

اس صلح کے بعد بظاہر یوں لگتا تھا کہ دونوں مملکتوں کے درمیان اب کوئی تنازع کھڑا نہیں ہوگا لیکن کچھ ہی دن گزرے تھے کہ برہان نظام نے ایک اور سازش میں خود کو ملوث کر لیا اور ایک مرتبہ پھر حالات وہیں جا کر کھڑے ہو گئے جہاں سے شروع ہوئے تھے۔

ابراہیم عادل شاہ کا بھائی اسمٰعیل جسے بغاوت کے الزام میں ابراہیم عادل نے قلعہ ہنگل میں قید کر دیا تھا کسی نہ کسی طرح آزادی حاصل کر کے ہنگل کے قلعے سے بھاگا اور برہان نظام کے پاس پہنچ گیا اور اس سے اپنے بھائی ابراہیم کے خلاف مدد طلب کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ بیجاپور پر قبضہ کرنے کے بعد نو لاکھ ہون، دو سو ہاتھی اور قلعہ شولاپور برہان شاہ کو دے دے گا۔

یہ سنتے ہی اس کے وہ تمام زخم تازہ ہو گئے جو بیجاپور والوں نے اس کے دل پر لگائے تھے۔ یہ انتقام لینے کا اچھا موقع تھا اور مدد کرنے کے صلے میں انعام اچھا مل رہا تھا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ وہ اپنا لشکر لے کر نکلا۔ اسمٰعیل کو بھی خبر کر دی کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ آرہا ہے۔ وہ اس کا قلعہ پرندہ کے قریب انتظار کرے۔

جب وہ قلعہ پرندہ کے قریب پہنچا تو ایک وحشت ناک خبر نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ اسے معلوم ہوا اسمٰعیل کا ٹکراؤ ابراہیم عادل کے کچھ دستوں کے ساتھ ہوا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اسمٰعیل عادل مارا گیا۔ برہان شاہ پریشان و خستہ حال واپس احمد نگر آ گیا۔

ابراہیم عادل شاہ کو خبر ہو گئی تھی کہ برہان نظام نے اس کے بھائی اسمٰعیل کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اور اپنا لشکر لے کر قلعہ پرندہ تک آ بھی گیا تھا چنانچہ اس نے سرحدی امیروں کو حکم دے دیا کہ وہ نظام شاہی مملکت میں داخل ہو کر تباہی و بربادی کا بازار گرم کریں۔

برہان نظام کو جب خبر ہوئی تو وہ مزید پریشان ہوا۔ جانتا تھا کہ اس میں اکیلے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر صلح کے لیے ہاتھ بڑھا سکتا تھا لیکن پھر ایک غلط قدم اٹھایا۔ اپنے ایلچی روانہ کر کے تلنگانہ وری کے پاس بھیجے اور یہ معاہدہ کیا کہ ابراہیم عادل کو گھیر کر مارا جائے۔ ایک طرف تلنگانہ وری عادل شاہی علاقے پر حملہ کرے اور وہاں کے قلعے پر قبضہ ہو جائے اور دوسری طرف سے برہان شاہ حملہ آور ہو کر قلعہ شولاپور کو قبضے میں لے لے۔

تلنگانہ وری ابھی ابراہیم عادل کے ہاتھوں شکست کو بھولا نہیں تھا۔ اسے یہ جو سہارا ملا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

برہان شاہ نے مرتضیٰ انجو کو سپہ سالار مقرر کیا اور اسے دوسرے امیروں کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ خود ان دنوں سخت علیل تھا اس لیے ان کے ساتھ نہ جاسکا لیکن یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد برار کے امرا کے ساتھ اس طرف آئے گا۔

اس معرکے میں بھی نظام شاہی لشکر کو شکست ہوئی۔ برہان شاہ کو جب اس شکست کی اطلاع ہوئی تو وہ سخت آزردہ ہوا۔ بیمار تو پہلے ہی تھا اب اس منحوس خبر نے اسے اس حد تک کمزور کر دیا کہ بستر سے لگ گیا۔ حکیموں نے جواب دے دیا۔ اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے بڑے بیٹے ابراہیم کو ولی عہد مقرر کر دیا اور وصیت کر دی۔

"برہان نظام کے بعد ابراہیم احمد نگر کا حکمران ہوگا۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی احمد نگر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ برہان نظام کے دو بڑے سالار تھے۔ ایک مرتضیٰ

خاں ایک، دوسرا اخلاص خاں۔ اخلاص خاں کی یہ خواہش تھی کہ اسمٰعیل ولی عہد مقرر ہو لہٰذا جب اسے ابراہیم کی ولی عہدی کی خبر ملی تو اسے بہت افسوس ہوا۔

دونوں سالاروں کے درمیان ٹکراؤ ہوا۔ اخلاص خاں پسپا ہو کر قلعہ پریندہ کی طرف بھاگ گیا۔ اسی دوران برہان شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا اور میاں منجو وکیل سلطنت کے عہدے پر فائز ہوا۔

☆☆☆

ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ہم نام احمد نگر کے نئے حکمران ابراہیم نظام کے نام تہنیت کا پیغام بھیجا جو اس بات کی علامت تھی کہ اس نے احمد نگر کے نئے حکمران کو تسلیم کر لیا ہے اور اب دونوں مملکتوں کے درمیان کوئی تنازع کھڑا نہیں ہوگا۔ کرناٹک کا راجا ہمیشہ اس تاک میں لگا رہتا تھا کہ کب دونوں مملکتیں نبرد آزما ہوں اور کب اسے بیجاپور پر حملہ کرنے کا موقع ملے۔

کرناٹک کے راجا نگناوری کو یہ موقع جلد ہی مل بھی گیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اخلاص خاں ابراہیم نظام کے حق میں نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے۔ واضح طور پر دو گروہ کام کر رہے ہیں۔ ایک گروہ کا سربراہ اخلاص خاں ہے، دوسرا گروہ میاں منجو کے زیر اثر کام کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر نگناوری نے اخلاص خاں سے رابطہ کیا اور اسے ابراہیم عادل سے جنگ کرنے پر اکسایا۔

"مہاراج! احمد نگر کے حالات اتنے بگاڑ دو کہ ابراہیم عادل دخل اندازی کرنے پر مجبور ہو جائے اور ہمیں موقع مل جائے کہ پہل اس نے کی تھی۔ میں تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔"

اخلاص خاں چونکہ حبشی تھا اس لیے اس نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ دکنیوں اور حبشیوں میں جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔ حبشی امراء نے اس علاقے کے عادل شاہی ایلچیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔

اس صورت حال کے پیش نظر ابراہیم عادل نے بذات خود ان نافرمان اور بدکردار امیروں کا قلع قمع کرنے کا ارادہ کیا اور ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ ہوا۔

احمد نگر میں آپس کے اختلافات نے پھر ایک تنازع کھڑا کر دیا۔ اخلاص خاں کی رائے تھی کہ لشکر جمع کر کے سرحد پر ہی ابراہیم عادل شاہ کے لشکر کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ میاں منجو کو یہ رائے پسند نہ آئی۔ اس کا کہنا تھا کہ مسلسل انتشار اور افراتفری کی وجہ سے ہماری فوج اور خزانہ تباہ ہو چکا ہے لہٰذا اس وقت ہمیں ابراہیم عادل سے صلح کر لینی چاہیے۔

اخلاص خاں اپنی رائے پر اڑا ہوا تھا۔ ابراہیم نظام بھی اخلاص خاں کا طرف دار تھا چنانچہ اخلاص خاں نے لشکر تیار کیا اور شاہ درک کے علاقے کی طرف پیش قدمی کی۔

ابراہیم عادل شاہ کوچ کرتا ہوا بھیمن علی نامی مقام پر پہنچا۔ یہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد شاہ درک کی طرف روانہ ہوا۔ ابراہیم عادل کا خیال تھا کہ اگر احمد نگر کے امیروں نے سلامت روی سے کام لیا اور لڑائی نہ کی تو ان کی خطاؤں کو معاف کر کے دوستانہ مراسم از سر نو پیدا کیے جائیں۔ اسی لیے وہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔ روزانہ صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ اس تاخیر کا یہ مقصد تھا کہ نظام شاہیوں کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل جائے۔

اسی طرح سست روی سے فاصلہ طے کرتا ہوا ابراہیم عادل شاہ، شاہ درک کے مقام پر پہنچ گیا۔ اخلاص خاں اور دیگر امراء نے بھی جو ابراہیم نظام شاہ پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے، جنگ کی تیاری کے بعد عادل شاہی سرحد کے قریب پہنچ گئے اور ان راجاؤں کو جو عادل شاہی حکومت کے اطاعت گزار تھے لوٹ مار پر اکسایا اور قصبوں و دیہاتوں کی بربادی پر اکسایا۔ اب ابراہیم عادل کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنے امیروں سے خطاب کیا۔

"ہم لاکھ نرمی سے کام لیتے ہیں لیکن حبشی اور دکنی غلاموں کی فطرت انہیں راہ راست پر آنے سے روکتی ہے لہٰذا اب یہ ضروری ہے کہ ہم لوگ ان مفسدوں کو راہ راست پر لانے کے لیے تلوار اٹھائیں۔ ان کے علاج کا اب کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ میں تمام سرداروں اور افسروں کو حکم دیتا ہوں کہ فوراً لشکر تیار کر کے دشمن کے مقابلے پر آ جائیں۔ تم بہر صورت یہ کوشش کرنا کہ جنگ کے بجائے صلح سے مقصد پورا ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھنا کہ اگر دشمن اپنی حد سے آگے بڑھے اور ہمارے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے پوری جواں مردی سے تباہ کر دینا۔"

اس نصیحت کے پیش نظر جب ابراہیم نظام شاہ اپنی سرحد پر پہنچا تو بیجاپور کے سالار حمید خاں نے جارحیت کے بجائے مدافعت کی صورت اختیار کی۔ اس کا ارادہ صرف یہ تھا کہ ابراہیم نظام کو وہیں روک دے جہاں وہ ہے۔ اس موقع پر ابراہیم نظام کے امیر میاں منجو نے حمید خاں کو پیغام بھجوایا۔

"ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ کم از کم آج کے دن معرکہ آرائی سے باز رہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس دوران



[illegible] واپس احمد نگر لے جائیں گے۔"

اس کے جواب میں حمید خاں سامنے سے ہٹ گیا اور ایک کوس کے فاصلے پر جا کر خیمہ زن ہو گیا۔

ابراہیم نظام شاہ نے اسے حمید خاں کی بزدلی سمجھا اور جنگ کا آغاز کر دیا۔ حمید خاں یہ سوچے ہوئے تھا کہ ایک دن کی مہلت مانگی گئی ہے۔ اس اچانک حملے نے اسے بوکھلا دیا۔ اس نے مقابلہ کیا لیکن وقتی طور پر اسے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر ایک قدرتی عمل تھا جس نے عادل شاہیوں کو فتح سے ہمکنار کر دیا۔

میدان جنگ میں بہت آتش بازی کی گئی تھی اس لیے دھوئیں کی وجہ سے زمین و آسمان تاریک ہو گئے تھے۔ ہوا کا رخ عادل شاہی فوج کی طرف تھا۔ شاہی میسرہ اس دھوئیں میں بری طرح گھر گیا۔ سپاہیوں کا اپنی جگہ ٹھہرنا مشکل ہو گیا لہٰذا وہ بھاگنے لگے۔ یہ دیکھ کر احمد نگر والوں نے بیجاپور والوں پر شدت سے حملہ کر دیا۔ ایک تو دھواں دوسرے یہ حملہ۔ عادل شاہی لشکر بالکل مغلوب ہو گیا اور میدان جنگ سے بھاگنے لگا۔ ابراہیم نظام شاہ جو اپنے تحفظ کی خاطر اپنی فوج کے پیچھے چھپا ہوا تھا، جب عادل شاہی لشکر کو منتشر دیکھا تو سامنے آ گیا اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ چند عادل شاہی امراء ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ابھی تک لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا اور کسی موقع کے انتظار میں تھے۔ ان کی نظر جب ابراہیم نظام شاہ پر پڑی تو آگے بڑھے۔ ابراہیم نظام کے ساتھیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"ہم لوگ تعداد میں پانچ سو سے زیادہ نہیں، ان امراء کے ساتھ ایک ہزار ہیں اور سب تازہ دم ہیں، بہتر ہے کہ ہم لوگ اس وقت ان سے جنگ نہ کریں۔"

ابراہیم نظام فتح کے نشے میں چور تھا۔ اس نے ساتھیوں کی بات نہ مانی۔ تلوار نیام سے نکالی اور حملہ آور ہو گیا۔ اسی وقت ایک تیر مخالف سمت سے چلا اور ابراہیم نظام کو آ لگا۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکا اور وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

دکنی اور حبشی امراء غارت گری میں مصروف تھے۔ انہوں نے جو اپنے بادشاہ کے قتل کی خبر سنی تو وہ بھی جیتی ہوئی بازی چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔

اس فتح عظیم کی خبر جونہی بیجاپور پہنچی، ابراہیم عادل شاہ کو بے حد خوشی ہوئی لیکن ابراہیم نظام شاہ کی موت کا افسوس بھی ہوا۔ اس نے اسی وقت اپنی فوج کے سرداروں کے نام یہ حکم جاری کیا کہ وہ اس بات کا پورا پورا خیال رکھیں کہ نظام شاہی ملک تباہ و برباد نہ ہو اور نہ ہی یہاں کی رعایا کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔ تمام ارکین دولت اور سرداران لشکر اس علاقے سے بیجاپور کی طرف چلے جائیں کیونکہ اب یہاں عادل شاہی لشکر کا قیام حریف کے لیے باعث پریشانی ہوگا۔

تمام ارکین سلطنت اور امرائے عادل شاہی شاہ درک میں ابراہیم کے گرد جمع ہوئے۔ بادشاہ نے ہر ایک کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اس کے بعد وہ بیجاپور واپس آ گیا۔

☆☆☆

ابراہیم نظام شاہ کے قتل ہوتے ہی میاں منجو اپنے لشکر سے نکلا اور اپنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ نہایت برق رفتاری سے احمد نگر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے مقتول بادشاہ ابراہیم نظام کے شیر خوار بیٹے کو جیر کے قلعے جوند میں نظر بند کرا دیا اور احمد نامی ایک لڑکے کو جس کا تعلق نظام شاہی خاندان سے بتایا جاتا تھا تخت پر بٹھا دیا۔ قلعے اور خزانے پر قبضہ کر لیا اور تمام معاملات اپنی گرفت میں کر لیے۔

بھاری بوجھ

ایک صاحب کو مذاق کرنے کی عادت تھی۔

ایک دن انہوں نے اپنے دوست کو خط لکھا کہ میں خیریت سے ہوں فکر مت کرنا۔ چند دن بعد ان صاحب کو ایک پارسل ملا جسے چھڑانے کے لیے کافی پیسے ادا کرنے پڑے۔ یہ پارسل اسی دوست نے بھیجا تھا۔ کھولنے پر پارسل سے ایک بھاری پتھر برآمد ہوا جس کے ساتھ ایک پرچی تھی۔ پرچی پر لکھا تھا۔ "تمہارے تندرست ہونے کی اطلاع سن کر میرے ذہن سے فکر کا اتنا بھاری بوجھ اتر گیا۔"

گدھا

ایک صاحب کتے کو زنجیر سے باندھ کر لے جا رہے تھے کہ ایک راہ گیر نے سوال کیا۔ "کیوں صاحب اس گدھے کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

انہوں نے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ گدھا نظر آتا ہے؟"

راہ گیر نے کہا۔ "معاف کیجیے، میں یہ سوال کتے سے کر رہا تھا۔"

ابراہیم کا بیٹا بہادر شاہ تھا اس کی حق تلفی ہوئی ہے۔

☆☆☆

ابھی بیجاپوری لشکر بیجاپور روانگی کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ مخبروں کی اطلاع آگئی۔ بیجاپور اور احمد نگر کے تنازع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کرناٹک کے راجا تلنگانہ وری نے بیجاپور کے سرحدی قلعے بنکاپور پر قبضہ کرلیا ہے۔ یہ وہ قلعہ تھا جس کے تحفظ کے لیے سہیل خاں اور رومی خاں گئے تھے۔ احمد نگر کے حالات کو دیکھتے ہوئے ابراہیم عادل نے انہیں حمید خاں کی مدد کے لیے بلایا تھا۔ سہیل خاں کی غیر موجودگی نے تلنگانہ وری کو یہ موقع دے دیا کہ وہ قلعے پر قابض ہو گیا۔

سہیل خاں نے اپنا قاصد بیجاپور کی طرف دوڑایا۔

اسے یہ خبر ابراہیم عادل تک پہنچانا تھی کہ کرناٹک کے راجا پر حملہ آور ہونے کی اجازت حاصل کرنی تھی۔

اجازت آنے تک انہوں نے اپنا لشکر ترتیب دیا اور اجازت آتے ہی وہ اپنے قلعے کو آزاد کرانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بہت کم ایسا ہوتا تھا مگر آج ایسا ہوا تھا کہ چاند بی بی نے ابراہیم عادل شاہ کو شاہی حرم سرا میں ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ ابراہیم یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ چاند بی بی اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہے۔ طرح طرح کے اندیشے اس کے دل میں پیدا ہو رہے تھے لیکن وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ نہ جائے۔ وہ پالکی میں سوار ہوا اور ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ ابراہیم نے پہلی نظر میں یہ دیکھا کہ چاند بی بی سخت فکر مند دکھائی دے رہی ہے۔ چاند بی بی نے اس کے پہنچتے ہی تمام ملازماؤں کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتی ہے جس کے لیے تخلیہ ضروری ہے۔ گفتگو میں پہل خود ابراہیم نے کی۔

"میں آپ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ یہ سلطنت میری نہیں آپ کی ہے۔ اگر میری جانب سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو سرزنش کیجیے۔"

"آپ نے غلط سمجھا۔ اپنی فکرمندی کا باعث میں خود ہوں یا احمد نگر کے حالات۔ میں نے احمد نگر کے حالات دیکھتے ہوئے ہی آپ کی بہن کی شادی اپنے بھتیجے سے کرا دی اور وہ بیوہ ہو گئی۔ اب حال یہ ہے کہ احمد نگر کے تخت پر اسے بٹھا دیا گیا ہے جو حکمرانی کا حق دار نہیں۔ ابراہیم نظام کا بیٹا بہادر شاہ جنیر کے قلعے میں نظر بند ہے۔ یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں احمد نگر کے حالات

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ یہ قدم نہ اٹھائیں۔ وہاں امراء کے دو گروہ کام کر رہے ہیں۔ آپ یقیناً ایک گروہ کی حمایت فرمائیں گی۔ دوسرا گروہ آپ کا دشمن ہو جائے گا۔ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ احمد شاہ کو تخت پر بٹھانے کا ذمے دار میاں منجو ہے جو نہایت طاقتور امیر ہے۔ اس سے آپ نہیں لڑ سکیں گی۔ اب آپ کا میکا بھی بیجاپور ہے اور سسرال بھی یہی ہے۔"

"احمد نگر میرے باپ کی سلطنت ہے۔ اسے میں امراء کے ہاتھوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے تو آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میں آج ہی احمد نگر کا رخ کر رہی ہوں۔"

"سہیل خاں سا سالار چند مہمات کے سلسلے میں بیجاپور سے باہر ہے۔ لشکر بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے آنے دیجیے پھر احمد نگر کو بھی دیکھ لیا جائے گا۔"

"مجھے لشکر کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف اس لیے احمد نگر جا رہی ہوں کہ میری موجودگی امراء کو من مانی کرنے سے روکے گی۔ ہاں، اگر کبھی ضرورت پڑی تو میں آپ کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتی ہوں۔ اس وقت تو فوج کے دستے مجھے احمد نگر تک لے جانے کے لیے کافی ہوں گے۔"

ابراہیم عادل نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ احمد نگر روانہ ہو گئی۔

وہ جب وہاں پہنچی تو حالات نہایت ابتر دیکھے۔ احمد نگر کی پوری طاقت دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک حصے کی کمانداری میاں منجو کر رہا تھا، دوسرے حصے کا سربراہ اخلاص خاں تھا اور دونوں میں سخت کشمکش جاری تھی۔ میاں منجو نئے حکمران احمد شاہ کے حق میں تھا اور اخلاص خاں، ابراہیم نظام کے شیر خوار لڑکے بہادر شاہ کے حق میں تھا۔ چاند بی بی بھی اسی دعوے سے احمد نگر آئی تھی۔

میاں منجو کی طاقت کو دیکھتے ہوئے اخلاص خاں نے بھی احمد شاہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔ چاند بی بی کے آتے ہی یہ تحقیق شروع ہوئی کہ احمد شاہ کا تعلق نظام شاہی خاندان سے ہے بھی یا نہیں۔ تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ یہ شخص خاندان نظام شاہی کا فرد نہیں۔

اس تحقیق کے بعد بھی میاں منجو کا اصرار ہوا کہ یہی احمد شاہ تاج و تخت کا مالک رہے گا جبکہ اخلاص خاں اور دوسرے امراء کو یہ ندامت ہوئی کہ انہوں نے احمد شاہ کو اپنا بادشاہ کیوں تسلیم کر لیا۔ انہوں نے چاہا کہ اسے معزول

اخلاص خاں اور دوسرے امراء نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میاں منجو کو شکست دے کر ہی احمد شاہ کو معزول کیا جا سکتا ہے۔ اخلاص خاں نے اپنے گروہ کو جمع کیا اور میاں منجو کے سامنے آگیا۔ میاں منجو نے احمد شاہ کو برج کے اوپر بٹھایا اور چتر شاہی اس کے سر پر سایہ فگن کر دیا۔ اس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ احمد نگر کا بادشاہ اب احمد شاہ ہی ہو گا۔ جس کے سر پر تاج رکھ دیا ہے اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ایک سالار میاں حسن کو سات سو سواروں کے ساتھ اخلاص خاں کے مقابلے پر بھیجا۔ میاں حسن اس مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور قلعے میں واپس آگیا۔ اخلاص خاں کے آدمیوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

اپنی قوت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے اپنے ایک معتبر آدمی کو دولت آباد کے حاکم کے پاس بھیجا اور اسے حکم دیا کہ آہنگ خاں اور حبشی خاں کو احمد نگر بھیج دے۔ یہ دونوں سالار برہان شاہ کے زمانے سے دولت آباد کے قلعے میں قید تھے۔ دولت آباد کے حاکم نے ان دونوں سالاروں کو واپس بھیج دیا۔ اسی دوران اخلاص خاں نے اپنے آدمی اس قلعے کی طرف بھیجے جہاں بہادر شاہ قید تھا کہ اسے رہا کرائے اور تخت نشین کرا دے لیکن وہاں کا قلعہ دار میاں منجو کا طرفدار تھا۔ اس نے بہادر شاہ کو رہا کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرف سے انکار ہونے پر حبشی امیروں نے ایک اور چال چلی اور ایک مجہول النسب لڑکے کو شاہی خاندان کا فرد قرار دے کر اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ملک میں اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔

یہ صورت حال میاں منجو کے لیے پریشان کن تھی۔ اس نے اخلاص خاں پر قابو پانے کے لیے عجیب و غریب فیصلہ کر ڈالا۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ احمد نگر کے کسی حکمران پر وقت پڑتا تھا تو وہ اردگرد کے کسی حکمران سے مدد طلب کرتا تھا یا ابراہیم عادل شاہ کو پکارتا تھا مگر میاں منجو نے اکبر بادشاہ کے بیٹے شہزادہ مراد کو نامہ لکھا اور اسے احمد نگر آنے کی دعوت دی۔ شہزادہ مراد کی نیت مدد کرنے کی نہیں تھی بلکہ وہ دکن فتح کرنے کے خیال سے چل پڑا۔

ابھی شہزادہ مراد احمد نگر پہنچا نہیں تھا کہ احمد نگر میں حالات نے کروٹ بدلی اور معاملات میاں منجو کے حق میں چلے گئے۔ اخلاص خاں کے گروہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ اخلاص خاں کے کچھ ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ کر میاں منجو

جب اس نے دیکھا کہ بڑی تعداد میں حبشیوں اور لشکری اخلاص خاں کا ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ آملے ہیں اور ایک بڑا لشکر اس کے پاس جمع ہو گیا ہے تو وہ اس لشکر کو لے کر قلعے سے باہر نکلا اور اخلاص خاں سے ٹکرا گیا۔ اس کی طاقت اب اتنی ہو گئی تھی کہ ایک معمولی سے ٹکراؤ کے بعد ہی اس نے اخلاص خاں کو شکست دے دی اور اس نے جس شخص کو بادشاہ بنایا تھا اسے گرفتار کر لیا۔ اب اس نے مخالف گروہ پر پوری طرح قابو پا لیا تھا۔ اسے اس کے مقصد میں کامیابی مل چکی تھی۔ اب شہزادہ مراد کو اپنے سر پر مسلط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی لیکن خط لکھا جا چکا تھا۔ مخبروں نے جب یہ اطلاع دی کہ شہزادہ تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ احمد نگر کے قریب پہنچ چکا ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ خود اس گڑھے میں گر چکا تھا جو اس نے دوسروں کے لیے کھودا تھا۔ اس نے اسی گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اپنے سالاروں سے مشورہ کیا۔ وہ اپنے ہی ملک پر دوسروں کو حملے کی دعوت دے چکا تھا۔ اب اس کا علاج ڈھونڈ رہا تھا۔ سالاروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ قلعے کی حفاظت اپنے کسی سالار کے سپرد کرے اور خود لشکر کی فراہمی کے لیے ابراہیم عادل اور قطب شاہ سے مدد کا طالب ہو۔ میاں منجو نے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک سالار انصار خاں کو قلعے کا محافظ مقرر کیا اور بادشاہ احمد شاہ کو ساتھ لے کر قلعے سے نکل گیا۔ چاند بی بی اس وقت قلعے ہی میں تھی۔ اس نے چاند بی بی سے بھی گفتگو کی لیکن وہ اس کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوئی۔ اس نے اسے قلعے ہی میں چھوڑا اور خود تیزی سے سفر کرتا ہوا بیجاپور کی سرحد پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے اس نے کچھ قاصد ابراہیم عادل کی طرف روانہ کیے اور احمد نگر کی مدد کرنے کی التجا کی اور کچھ قاصد قطب شاہی سلطنت کی طرف روانہ کیے۔

☆☆☆

چاند بی بی قلعے کی محافظ بن کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن جانتی تھی کہ اصل محافظ تو انصار خاں ہے جسے میاں منجو قلعہ سپرد کر گیا ہے۔ اگر دشمن حملہ آور ہو گیا تو انصار خاں اس کی ایک نہیں سنے گا اور قلعہ دشمن کے سپرد کر دے گا۔ وہ میاں منجو کا آدمی ہے لہٰذا کسی وقت بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ میاں منجو تو اپنی جان بچا کر نکل گیا ہے۔ اسے یہ دکھ ہو گا کہ احمد نگر کسی اور کے قبضے میں چلا گیا لیکن مجھے تو ہو گا کیونکہ یہ میرے باپ کی سلطنت ہے۔ میں انصار خاں کی موجودگی

میں اس مملکت کو بچانے کے لیے آزاد نہیں ہوں۔ تم میرا نہیں انصار خاں کا بچہ گا۔ قلعے کے دروازے میرے حکم سے نہیں انصار خاں کے حکم سے کھلیں گے۔ جب تک انصار خاں زندہ ہے وہ اپنی مرضی کے فیصلے نہیں کر سکتی۔ تو کیا انصار خاں کو راستے سے ہٹا دیا جائے؟ یہ خیال آتے ہی وہ کسی ایسے آدمی کے بارے میں سوچنے لگی جو نہایت رازداری سے انصار خاں کو ٹھکانے لگا دے۔ بہت سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں محمد خاں کا نام گونجا۔ یہ شخص مرتضیٰ نظام شاہ کے دایہ زاد حبیب اللہ کا بیٹا تھا۔ چاند بی بی نے محمد خاں سے رابطہ کیا اور اسے طلب کر لیا۔

محمد خاں کا خاندان شروع ہی سے احمد نگر کے شاہی خاندان کا تابع اور فرماں بردار چلا آرہا تھا۔ وہ فوراً خدمت میں حاضر ہو گیا۔

"محمد خاں! تمہارے خاندان سے جو ہمارا رابطہ ہے اسی کے پیش نظر میں نے تمہیں بلایا ہے۔ کیا تم احمد نگر کی بھلائی کے لیے میرا ایک کام کر سکتے ہو؟"

"میری بہن! رابطہ کا اظہار بھی کرتی ہو مجھ پر بھروسا بھی کرتی ہو اور کام کے لیے میری اجازت بھی طلب کرتی ہو۔ آپ تو مجھے یہ حکم دیں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور بس...... میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری جان بھی احمد نگر اور آپ پر قربان ہے۔"

"مجھے یہی امید تھی لیکن کام بتانے سے پہلے کچھ باتیں بتانا ضروری ہیں۔"

"فرمایئے۔"

"تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ میاں منجو انصار خاں کو قلعے کا محافظ بنا کر خود قلعے سے چلا گیا ہے۔ اب اگر شہزادہ مراد حملہ آور ہوتا ہے تو یہ شخص قلعے کی مدافعت نہیں کرے گا اور نہ ہی میاں منجو کے سوا کسی کا حکم مانے گا۔ قلعہ فتح ہو گیا تو الزام مجھ پر آئے گا اسی لیے میں چاہتی ہوں......"

"انصار خاں کو قتل کر دیا جائے۔" محمد خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہی تھا اور یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔"

"میں حاضر ہوں۔"

"ہاں، ایک بات اور...... یہ بات کسی کو نہیں معلوم۔ صرف تمہارے سامنے انکشاف کر رہی ہوں۔ میں نے کچھ لوگوں کو قاصد بنا کر بیجاپور بھیجا ہے۔ وہ ابراہیم عادل شاہ سے استدعا کریں گے کہ وہ احمد نگر والوں کی مدد کرے اور مغلوں سے ان کی جان چھڑائے۔ میں چاہتی ہوں اس مدد کے آنے سے قبل انصار خاں اس دنیا میں نہ رہے تاکہ قلعہ پوری طرح میرے ہاتھ میں ہو۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ آج کا دن شام میں تبدیل نہیں ہوگا کہ انصار خاں کے قتل کی خبر آپ کو مل جائے گی۔" محمد خاں نے اجازت مانگی اور چاند بی بی سے رخصت ہو گیا۔

محمد خاں نے سوچنے کا وقت بھی نہیں لیا۔ چاند بی بی کے پاس سے اٹھ کر سیدھا قلعہ دار انصار خاں کی طرف گیا اور موقع پاتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ خبر جیسے ہی چاند بی بی تک پہنچی، اس نے مقتول ابراہیم نظام شاہ کے بیٹے بہادر شاہ کے نام کا غائبانہ خطبہ پڑھوا دیا۔

یہ خطبہ پڑھا ضرور گیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دشمن نے دروازہ کھٹکھٹایا اور احمد نگر میں داخل ہو گیا۔

یہ حالات میاں منجو تک بھی پہنچ رہے تھے اور اخلاص خاں تک بھی جو اس وقت دولت آباد میں مقیم تھا۔ میاں منجو تو لشکر جمع کرنے میں مشغول تھا لیکن اخلاص خاں نے جواں مردی کا ثبوت دیا اور دولت آباد سے دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر احمد نگر روانہ ہوا۔ شہزادہ مراد نے چھ ہزار تجربہ کار سواروں کو اس کے مقابلے پر روانہ کیا۔

گنگا کے کنارے دونوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں دکنیوں کو شکست ہوئی اور مغل کامیاب ہوئے۔

اس شکست کو دیکھتے ہوئے چاند بی بی نے آہنگ خاں کو پیغام بھیجا کہ جلد از جلد سواروں کا لشکر لے کر قلعے کی حفاظت کے لیے پہنچے۔

وہ اس وقت میاں منجو کو بھی پیغام بھیج سکتی تھی لیکن وہ اس سے ناراض تھی۔ میاں منجو کی حالت یہ تھی کہ عادل شاہی سرحد کے قریب لشکر جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی بہرحال آہنگ خاں نے چاند بی بی کی پکار سنی اور احمد نگر کی طرف روانہ ہوا (وہ اس وقت سرحد کے قریب کہیں پڑاؤ کیے ہوئے تھا) مغل لشکر قلعے کو محصور کیے ہوئے تھا۔ آہنگ خاں قلعے میں پہنچتا کیسے؟ اس نے احمد نگر کے قریب پہنچ کر مخبروں کو شہر میں بھیجا کہ ایسی جگہ تلاش کر کے آئیں جہاں مغل سپاہی نہ ہوں۔

مخبر نے آکر خبر دی۔

"حصار کی مشرقی جانب دشمن کے خیمے موجود نہیں اور دشمن حصار کی اس جانب سے بالکل غافل ہے۔" یہ سن کر آہنگ خاں بہت خوش ہوا اور جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں سے کوچ کر کے قلعے کی طرف بڑھا۔

آہنگ خاں کی بدقسمتی کہ اس کے مخبر کے روانہ ہوتے



کہ مشرقی حصہ بالکل خالی ہے تو اس نے نئے احکامات جاری کر دیے۔ صلاح مشورے کے بعد وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین لشکر متعین کر دیے۔ خان خاناں کے ماتحت دو سو سوار رکھے گئے۔ ذرا فاصلے پر دولت خاں کو چار سو سواروں کے ساتھ رکھا گیا اور اس سے ذرا فاصلے پر دولت خاں کے بیٹے کو چار سو سواروں کے ساتھ بٹھا دیا۔ مشرقی سمت جو اب تک خالی تھی وہاں بارہ سو لشکری متعین ہو گئے۔

آہنگ خاں اس صورت حال سے قطعی بے خبر تھا لہٰذا لشکر کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا اور صرف تین ہزار لشکریوں کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے اسے شہر پناہ میں داخل ہونا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی صورت حال اس کے سامنے آگئی۔ اب حملہ آور ہونے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ حملہ کرتے وقت وہ اس لیے بھی مطمئن تھا کہ یہاں صرف دو سو سوار اسے نظر آئے۔ یہ دراصل وہ مقام تھا جہاں خان خاناں متعین تھا۔ خان خاناں آہنگ خاں کے تین ہزار کے لشکر کو دیکھ کر عبادت خانے کی چھت پر چڑھ گیا اور حریف پر تیر پھینکنے لگا۔

آہنگ خاں اس صورت حال سے بھی بے خبر تھا جو اب سامنے آئی۔ دولت خاں جو قریب ہی متعین تھا وہ بھی اپنے چار سو لشکریوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دولت خاں کا بیٹا شیر خاں بھی حرکت میں آیا اور چھ سو کا لشکر لے آیا۔ آہنگ خاں کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

اب چاند بی بی کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ اس نے جسے اپنی مدد کے لیے بلایا تھا وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ چاند بی بی نے اپنے بھتیجے کو آواز دی۔ ابراہیم عادل پہلے ہی وعدہ کر چکا تھا کہ جب بھی اسے آواز دی جائے گی وہ لبیک کہے گا۔ اس نے اسی وقت اپنے سالار سہیل خاں کو طلب کیا۔

"میں احمد نگر کے حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اسی امید میں تھا کہ حالات پلٹا کھائیں گے۔ کوئی نہ کوئی صورت چاند بی بی کے حق میں نکل آئے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آج پھر یہ قاصد آئے ہیں اور چاند بی بی نے ہم سے مدد طلب کی ہے۔ میں اس مہم پر تمہیں بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کے فیصلے سے متفق ہوں۔"

"تو پھر آنے والی شب کو تم ایک لشکر لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

گیا اور وہ شاہ درگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میاں منجو تو اسی انتظار میں تھا اور سرحد پر ہی بیٹھا تھا وہ بھی سہیل خاں کے ساتھ آکر مل گیا۔

محمد قلی قطب شاہ کی طرف سے مہدی قلی ترکمان بھی تلنگانہ کے پانچ چھ ہزار سپاہی لے کر آگیا اور سہیل خاں کے لشکر کے قریب ہی خیمہ زن ہو گیا۔

مغلوں کو بھی یہ اطلاع مل گئی کہ دکنی لشکر متحد ہو گئے ہیں۔ شہزادے نے اپنے امیروں سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں مشورہ کیا۔ بہت بحث و مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جب تک دکنی لشکر یہاں پہنچیں ہمیں قیام کرکے حصار کی دیوار کو مسمار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے...... شہزادے کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے نقب لگانے کا حکم دے دیا۔ اہل قلعہ کو اس ارادے سے بے خبر رکھنے کے لیے آنے جانے کا راستہ بند کر دیا گیا اور نقب لگانے کا کام پوری مستعدی سے شروع کر دیا گیا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو ان نقبوں میں بارود کا ڈھیر اور چونے سے انہیں مضبوط کر دیا گیا۔ دوسرے دن ان نقبوں میں آگ لگائی جانی تھی کہ ایک معجزہ ہو گیا۔ خواجہ محمد خاں شیرازی جو مغلوں کے لشکر میں تھا، اس کو اہل قلعہ کی حالت پر بہت ترس آیا۔ وہ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اہل قلعہ کے پاس گیا اور انہیں تمام حالات سے باخبر کر دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ کس کس مقام پر نقبیں لگائی گئی ہیں۔ چاند بی بی کے حکم سے اہل قلعہ زمین کھودنے اور شیرازی کے بتائے ہوئے حصۂ دیوار میں شگاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دن نکلنے تک دو نقبوں کا سراغ لگا لیا گیا۔

شہزادہ مراد نے قلعے کے گرد مسلح فوج متعین کر دی۔ مغلوں کا ارادہ تھا کہ جونہی دیوار میں شگاف پیدا ہو وہ قلعے کے اندر داخل ہو جائیں۔

اہل قلعہ سب سے بڑی نقب کو کھود کر اس کا بارود نکال رہے تھے۔ اسی دوران مغلوں نے اس نقب کو آگ لگا دی۔ قلعے کی دیوار پچاس گز تک ٹکڑے ہو کر ٹوٹ گئی۔ جو لوگ نقب کے قریب کام کر رہے تھے، ان کے پرخچے اڑ گئے۔ چاروں طرف کہرام مچ گیا۔ بڑے بڑے امیر اس افتاد سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

چاند بی بی نے اطلاع ملتے ہی بہادری کا ثبوت دیا۔ پردے کو بالائے طاق رکھا اور مسلح ہو کر باہر نکل آئی اور وہاں پہنچی جہاں دیوار میں شگاف ہوا تھا۔ وہ امیر جو بھاگ کھڑے

مغل فوج اس انتظار میں تھی کہ دوسری نقبوں کو بھی آگ لگے تو وہ حملہ کریں جبکہ دوسری نقبوں کا بارود پہلے ہی نکال لیا گیا تھا۔

بس یہ وقت بہت تھا۔ اہل قلعہ نے موقع پا کر توپوں، بندوقوں اور دوسرے آلات سے اس شگاف کو مستحکم کر دیا۔

مغلوں نے جب دیکھا کہ دوسری نقبوں کو آگ نہیں لگ رہی ہے تو انہوں نے اس شگاف پر حملہ کر دیا جو پہلی نقب کے پھٹنے سے پیدا ہوا تھا۔ اہل قلعہ نے مغل لشکر پر آتشیں گولوں کی بارش کر دی۔ یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ مغل لشکر کھلے میدان میں تھا اس لیے اس کا بے انتہا نقصان ہوا۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اس قدر نقصان کے بعد شہزادہ مراد کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

جنگ تھمی تو اہل قلعہ کو موقع مل گیا۔ مستند معماروں نے رات بھر میں گرنے والی دیوار کو پھر سے برابر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک قاصد سہیل خاں کی طرف روانہ کیا۔

"احمد نگر کی حالت بہت بری ہو رہی ہے۔ فی الفور احمد نگر والوں کی مدد کو پہنچو۔"

یہ قاصد روانہ ہوا ہی تھا کہ مغلوں کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اسے پکڑ کر خان خاناں کے پاس لے گئے۔

"کیا لے کر جا رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے؟"

"چاند بی بی کا خط ہے جو انہوں نے سہیل خاں کے نام لکھا تھا۔"

"یقیناً یہ لکھا ہو گا کہ ہماری مدد کو پہنچو۔"

"شاید یہی لکھا ہو۔ میں نے خط پڑھا نہیں۔"

"ہمیں دکھاؤ۔"

قاصد نے وہ خط خان خاناں کے سامنے رکھ دیا۔ اس خط کے مضمون سے واقف ہونے کے بعد خان خاناں نے بھی ایک خط تحریر کیا۔

"ہم کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ جلد آؤ تاکہ یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو۔" یہ خط بھی قاصد کے حوالے کر دیا گیا۔

سہیل خاں کو جس وقت یہ خطوط ملے، اسی وقت وہ اپنی قیام گاہ سے نکل کھڑا ہوا۔

مغلوں کے لشکر میں قحط کے آثار پیدا ہو چلے تھے لہٰذا جب انہوں نے سہیل خاں کی آمد کی خبر سنی تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت یہی بہتر ہے کہ چاند بی بی سے اس شرط پر صلح کر لی جائے کہ برار کا علاقہ مغلوں کو دے دیا جائے۔

چاند بی بی نے انکار کر دیا لیکن بالآخر یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ موجودہ حالات میں جنگ کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اس شرط پر صلح کر لی گئی۔

شہزادہ مراد اپنے لشکر کو لے کر دولت آباد کے راستے سے برار کی طرف روانہ ہو گیا۔

دو تین روز بعد سہیل خاں، احمد نگر پہنچ گیا۔ یہاں میاں منجھو بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے حسب سابق احمد شاہ کو احمد نگر کے تخت پر بٹھانے کا ارادہ کیا۔ آہنگ خاں نے احمد شاہ کو قلعے سے باہر نکال دیا۔ میاں منجھو کو بھی قلعے میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔

اس موقع پر ممکن ہے کوئی فتنہ کھڑا ہوتا کہ ابراہیم عادل نے اپنے مشہور امیر مرتضیٰ خاں دکنی کو چار ہزار سواروں کے ساتھ احمد نگر بھیجا اور میاں منجھو کو پیغام دیا۔

"اس فتنہ انگیز زمانے میں جنگ و جدال کا ارادہ کرنا ملک کی تباہی کا راستہ ہے۔ تم جلد از جلد سہیل خاں کے ہمراہ بیجاپور پہنچو تاکہ باہمی غور و فکر کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے۔"

میاں منجھو نے حکم کی تعمیل کی اور بیجاپور پہنچ گیا۔

ابراہیم عادل کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ احمد شاہ نظام شاہی نسل سے نہیں ہے۔ اس نے احمد شاہ کو اپنے امراء میں داخل کر لیا۔ میاں منجھو کو بھی امراء کی صف میں کر لیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں احمد نگر سے دور رہیں اور چاند بی بی کے لیے کوئی مستقل خطرہ نہ ہو۔

چاند بی بی نے بہادر شاہ کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا اور اس کی کم سنی کی وجہ سے اس کے دادا محمد خاں کو پیشوائی کے منصب پر فائز کیا۔

احمد نگر کی بدبختی نے پھر ایک راستہ ڈھونڈ لیا۔ محمد خاں نے کچھ عرصے بعد ہی پر پرزے نکالے۔ اپنے رشتے داروں اور بہی خواہوں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر کے انہیں قوی بنایا۔ ان کے بل بوتے پر خود بھی خود مختارانہ انداز میں کام کرنے لگا۔ یہ وہ کام کرنے لگا جس سے چاند بی بی کے اقتدار میں کمی واقع ہو۔ آہنگ خاں اور شمشیر خاں جیسے نامی گرامی امراء کو نظر بند کر دیا۔ دوسرے امراء نے جب یہ حال دیکھا تو وہ اپنے بچاؤ کی خاطر ادھر ادھر بھاگ گئے۔

چاند بی بی نے ایک مرتبہ پھر اپنی سسرال کو آواز دی اور عادل شاہ کو پیغام بھیجا۔

"اس پر آشوب زمانے میں جبکہ ایک طاقتور دشمن ہماری تباہی و بربادی کے لیے مستعد ہے، ہمارے ملک کے

امراء نا عاقبت اندیشی کا ثبوت دے رہے ہیں اور ہر طرف ایک ہنگامہ برپا کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے اس طرف توجہ نہ دی تو ملک کا باقی حصہ بھی مغلوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔"

ابراہیم عادل شاہ نے دوسری بار چاند بی بی کی مدد کا وعدہ کیا اور اپنے سپہ سالار سہیل خاں کو حکم دیا کہ احمد نگر جائے اور چاند بی بی کی خواہش کے مطابق عمل کرے۔

سہیل خاں نے اڑان بھری اور ایک لشکر لے کر احمد نگر پہنچ گیا۔ محمد خاں اس کے حملے کی تاب کیسے لا سکتا تھا۔ وہ بھاگ کر قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔ چاند بی بی قلعے سے باہر آ گئی تھی۔

سہیل خاں نے اس سے مشورے کے بعد قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ محاصرے کی طوالت اور شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قلعے کے اندر ضروریات زندگی کا سامان بھی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے محمد خاں نے اسی غلطی کو دہرایا جو اس سے پہلے میاں منجھو سے سرزد ہوئی تھی۔ اس نے اکبری امیر خان خاناں سے مدد طلب کی۔

یہ وہی محمد خاں تھا جس کے ذریعے چاند بی بی نے قلعہ دار انصار خاں کو قتل کرایا تھا اور اب بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اسی وفاداری کا مظاہرہ کرے گا لیکن اقتدار کی بھوک کبھی نہیں مرتی۔ اس نے احسانات کا بدلہ اس طرح چکایا کہ خان خاناں کو مدد کے لیے پکارا مگر یہ بھول گیا کہ چاند بی بی قلعے سے گئی ہے، اس کے وفادار اب بھی یہاں موجود ہیں۔ یہی وفادار حرکت میں آئے اور محمد خاں کو گرفتار کر کے چاند بی بی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چاند بی بی نے اسے معزول کر دیا اور آہنگ خاں کی نظر بندی ختم کر کے اسے محمد خاں کی جگہ منصب پیشوائی پر فائز کیا۔

سہیل خاں کو خلعت فاخرہ سے سرفراز کر کے واپسی کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

سہیل خاں احمد نگر سے روانہ ہو کر دریائے گنگا کے کنارے راجاپور کے نواح میں پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ مغلوں نے وعدہ خلافی کر کے قصبہ پاتری کو بھی جو برار میں شامل نہیں ہے، اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ اس نے پیش قدمی روک دی اور ابراہیم شاہ کے نام ایک خط روانہ کیا جس میں یہ تمام حالات درج کیے۔

چاند بی بی اور آہنگ خاں کو بھی اس کا علم ہو چکا تھا لہٰذا انہوں نے بھی اپنے قاصد بیجاپور بھیجے اور عادل شاہ سے اصرار کیا کہ وہ قصبہ پاتری سے مغلوں کو نکال باہر کرے۔

ابراہیم عادل شاہ کے پاس جب یہ عریضہ پہنچا تو اس نے سہیل خاں کو مغلوں سے معرکہ آرائی کرنے کا حکم دیا۔ قطب شاہ نے بھی ایک لشکر بھیج دیا۔ احمد نگر سے بھی سات ہزار سواروں کا ایک لشکر برار کی طرف روانہ ہوا۔

سہیل خاں نے قصبہ سون پت میں پہنچ کر قیام کیا اور لشکر کی ترتیب و تنظیم کی طرف توجہ دی۔

مغل سالار خان خاناں نے دریائے گنگا کے کنارے دکنی فوج کے سامنے خیمے لگائے لیکن پندرہ روز اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور پھر اچھی طرح سوچ سمجھ کر وہ دکنیوں کے سامنے آ گیا۔ معمولی سی جنگ کے بعد قطب شاہی اور نظام شاہی لشکر اس مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور میدان جنگ سے فرار ہو گئے لیکن سہیل خاں ڈٹا رہا اور بہادری سے لڑا۔ اس کے لشکر نے ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ سارے لشکر کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ مغل یہ صورت حال دیکھ کر ایسے پریشان ہوئے کہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور شاہ پور پہنچ گئے جہاں شہزادہ مراد پناہ گزیں تھا۔

حالات ایسے دگرگوں ہو گئے تھے کہ شہزادہ مراد کے امراء اسے دکن کی حدود سے باہر نکال لے گئے لیکن خان خاناں ایک قلیل جماعت کے ساتھ اسی جگہ مقیم رہا۔

خان خاناں اور سہیل خاں ایک دوسرے سے بہت کم فاصلے پر تھے لیکن دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ یہ پراسرار لاعلمی ختم ہوئی تو دونوں نے اپنی اپنی حفاظت کا بندوبست کیا اور صبح ہوتے ہی مقابلے پر آ گئے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ سہیل خاں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ شاہ درگ کی طرف فرار ہو گیا۔

☆☆☆

آہنگ خاں کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہتی تھی کہ محمد خاں نے جو اسے نظر بند کیا تھا، اس میں چاند بی بی کا ہاتھ تھا۔ اب جو سہیل خاں کو شکست ہوئی تو اس کا جذبۂ انتقام جاگ اٹھا۔ اس نے چاہا کہ بہادر شاہ کو اپنے قبضے میں کر کے چاند بی بی کو کسی قلعے میں نظر بند کر دیا جائے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر عمل کرتا، چاند بی بی کو خبر ہو گئی۔ اس نے بہادر شاہ کی حفاظت کا بندوبست کیا اور آہنگ خاں کو قلعے میں آنے جانے سے روک دیا۔

ابراہیم عادل شاہ ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا۔ اس نے اپنے امیروں کو احمد نگر بھیجا کہ اس فتنے کو ختم کرائے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ شہزادہ مراد اور

تم دیکھ رہے ہو قلعہ فتح ہونے کے قریب ہے اور ہم بے بس ہیں۔ یہ سب امرا کی نااتفاقی سے ہوا ہے۔ میں کب تک ابراہیم عادل کو آواز دیتی رہوں جبکہ ہم آپس ہی میں متفق نہیں۔ اکبر بادشاہ خود دکن کی طرف آیا ہے۔ اب قلعے کو فتح ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

جیتا خاں نے جواب میں کہا۔ ''آپ تک جو ہوا اس کا غم کرنا بے کار ہے۔ یہ فرمائیے اب کیا قدم اٹھانا ہے۔ جو آپ کا حکم ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔''

''میری یہ رائے ہے کہ میں قلعہ شہزادہ دانیال کے سپرد کر کے اپنی عزت اور جان بچانی چاہیے۔ اس کے بعد جنیر کی راہ لینی چاہیے اور وہاں پہنچ کر خدا وند تعالیٰ سے مدد کا انتظار کرنا چاہیے۔''

یہ سنا تھا کہ جیتا خاں نے چیخ چیخ کر اہلِ قلعہ کو جمع کر لیا۔ ''چاند بی بی نے شہزادہ دانیال سے ساز باز کر لی ہے اور قلعہ اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

نااتفاقی کے تابوت میں آخری کیل اس کے سالار نے ٹھونک دی۔ اس نے چاند بی بی کی مصلحت کو غداری کے رنگ میں پیش کر کے اہلِ قلعہ کو مشتعل کر دیا۔ وہ حرم سرا میں داخل ہو گئے۔ چاند بی بی قلعے سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ ابھی ہتھیار بھی نہیں باندھے تھے کہ مقابلہ کرتی، ''اہلوں'' نے اسے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔

قلعوں میں رکھی بارود ایک دھماکے سے پھٹی اور قلعے کی دیوار گر گئی۔ اب چاند بی بی نہیں رہی تھی کہ اپنی سسرال کو آواز دیتی۔

مغل اندر آ گئے۔ شہزادہ دانیال نے دکنیوں کو گرفتار کر لیا اور خزانے پر قبضہ کر لیا۔ کم سن بہادر شاہ کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس برہان پور بھیج دیا۔ اسے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ تک یہ تمام واقعات پہنچے تو وہ ایک سرد آہ بھر کے خاموش ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ احمد نگر کو بچا لے لیکن اب تو اس کی اپنی خود مختاری خطرے میں تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دکن کی خود مختاری مغلوں کے ہاتھوں پامال ہونے والی ہے۔

آپس کی نااتفاقی ہی رنگ دکھاتی ہے۔

خاناں کو اکبر کے پاس بھیج دیا اور اس کی جگہ ابوالفضل کو دکن کا سپہ سالار مقرر کیا۔

آہنگ خاں کو جب معلوم ہوا کہ خان خاناں دکن سے چلا گیا ہے تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت میں اضافہ کرنا چاہا۔ دریائے گنگا زوروں پر تھا اور مغلوں کی غیر موجودگی اسے فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ وہ ایک قریبی قصبے ''بیڑ'' کی طرف بڑھا کہ وہاں پہنچ اور مغلوں کا یہ علاقہ ان سے چھین لے۔

وہاں کے حاکم شیر خواجہ نے آہنگ خاں کا مقابلہ کیا لیکن زخمی ہو کر قلعہ بیڑ میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو گیا۔ شہزادہ مراد اس کی مدد کو کیسے آتا کہ شاہ پور میں بیمار پڑا ہوا تھا اور پھر اس کے انتقال کی خبر آ گئی۔

ادھر حاکم بیڑ شیر خواجہ نے اکبر کو خط کے ذریعے دکنیوں کے حملے سے آگاہ کیا اور شیخ ابوالفضل کی شکایت لکھی کہ یہ سب اس کی غفلت کی وجہ سے ہوا۔

اکبر کو اب احساس ہوا کہ دکن کی سپہ سالاری کے لیے خان خاناں سے موزوں شخص کوئی اور نہیں۔ اس نے خان خاناں کو دوبارہ بحال کر کے دکن کی طرف روانہ کر دیا اور اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ دانیال کو اس کے ساتھ روانہ کیا۔

یہ دونوں روانہ ہوئے تھے اور ابھی دکن کی سرحد پر ہی تھے کہ ابوالفضل کی درخواست پر خود اکبر آگرہ سے دکن کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر اس کے سارے ارمان بیچے پھول کی طرح کھل اٹھے۔ اسے معلوم ہوا کہ آہنگ خاں اور چاند بی بی کے درمیان دشمنی ہوئی ہے تو اس کے منصوبے ہی بگھار ہو گئے۔ اس نے خود تو قلعہ اسیر کا محاصرہ کر لیا اور خان خاناں کو احمد نگر کی طرف روانہ کیا۔ شہزادہ دانیال بھی اس کے ساتھ تھا۔

آہنگ خاں پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ قلعے کے باہر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے مغلوں کے ارادے سے خوف زدہ ہو کر عجیب غداری کا کام کیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ چاند بی بی سے مدد طلب کر کے جنگ کرتا، اس نے اپنے تمام سامان کو آگ لگائی اور خود جنیر کی طرف بھاگ گیا۔

مغل امیروں نے کسی مزاحمت کے بغیر قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ۔ طبقات اکبری۔ منتخب التواریخ۔ مغلیہ دورِ حکومت

چور مچائے شور

تنویر ریاض

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے... ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری جیسی مثالیں ہر دور میں کچھ لوگوں پر پوری اترتی رہی ہیں... وہ ایک ایسا ہی بدنام چور تھا جو جس تھالی میں کھا رہا تھا بڑی بے باکی سے اسی میں سوراخ کر رہا تھا مگر... آخر کب تک... ایک دن نہ صرف سوراخ بلکہ اس کے فرار کا ہر رستہ بند ہو گیا کیونکہ... بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی... ایک نہ ایک دن تو شامت آنی ہی تھی۔

بہت پیار سے چال چلنے والے ایک شاطر کی بدحالی کا دلفریب قصہ



میرا اڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جب وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تو مجھے بھی اپنے دفاع پر مجبور ہونا پڑا۔ پہلے اس نے مجھے گھونسا مارنا چاہا۔ میں تیزی سے گھوما۔ میں نے پہلے ہی اپنا بایاں ہاتھ چہرے کے آگے کر لیا تھا۔

دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑی اور اس کا بازو موڑنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا بازو پیچھے کرتا یا اپنی پوزیشن تبدیل کرتا، میں نے اپنی کلائی تیزی سے اوپر کی جس سے اس کی کہنی کے جوڑ پر زور پڑا اور اس کا پنجہ اتر

چلا رہا تھا۔

میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ میری کوئی بات نہیں سن رہا تھا اور زمین پر بیٹھ کر مسلسل روئے جا رہا تھا جبکہ میں پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اس سے لڑنا نہیں چاہتا لیکن وہ اپنی طاقت کے زعم میں مجھ سے بھڑ گیا۔ میں نے اس کی قمیص کی جیب سے سیل فون نکالا اور ایمبولینس کے لیے فون کرنے لگا۔ گو کہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ اسے ایمرجنسی روم لے کر جاؤں لیکن مجبوری تھی کیونکہ وہ اس حالت میں نہیں تھا کہ خود گاڑی چلا سکے۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب مجھے کسی کا پیچھا کرنے کے لیے کہا گیا اور میں خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میں مطلوبہ شخص کو فاسٹ فوڈ جوائنٹ کی پارکنگ لاٹ میں تلاش کروں۔ وہ واقعی وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا اور انگلی سے اپنی کار کی چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی جبکہ اسے کار سے اتر کر فاسٹ فوڈ ریسٹوران میں آنا تھا لیکن وہ مجھے چکما دے کر چلا گیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔

جب میں نے اپنے باس اور ڈون رک انویسٹی گیشن کے پارٹنر رک کو یہ بات بتائی تو اس نے الٹا مجھے ہی سارا الزام ٹھہرایا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے تمہیں ملازمت کیوں دی۔ لوگ تمہیں ایک میل دور سے دیکھ لیتے ہیں۔ تم ایک عام آدمی بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ مجھے مجبوراً کہنا پڑ رہا ہے کہ تم ہمیں بہت مہنگے پڑ رہے ہو۔"

یہ اتنی پرانی بات نہیں تھی کہ میں اسے بھول جاتا لہٰذا میں نے سوچا کہ آج کا واقعہ زیادہ سنگین نوعیت کا ہے اور اگر میں دفتر واپس گیا تو بہت باتیں سننے کو ملیں گی لہٰذا جب ایمبولینس اس شخص کو لے کر چلی گئی تو میں نے بھی گاڑی کا رخ ٹاپ ٹاپ کی طرف کر دیا جو میرا دوسرا گھر تھا۔ یہ بات نہیں کہ میں بہت زیادہ پینے والا شخص ہوں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ رات کے کھانے کے بعد صرف ایک گلاس سرخ مشروب سے شغل کر لیتا ہوں۔ ٹاپ ٹاپ میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ وہاں کی پرکشش بارٹینڈر لوئس تھی۔ اس کا رنگ گندمی اور بال سیاہ تھے کیونکہ اس کا باپ فرانسیسی اور ماں عرب تھی۔ اسی لیے اس کی شخصیت میں دونوں قوموں کی خصوصیات نظر آتی تھیں۔ اس جیسی اسمارٹ عورت کے لیے یہ کام

وہ اپنے نوعمر بیٹے کی پرورش نہیں کر سکتی۔ اس لیے اسے آمدنی میں اضافے کے لیے یہ جز وقتی ملازمت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ دوپہر کی شفٹ میں کام کرتی تھی۔ لہٰذا میں ان لوگوں کے بے ہودہ جملوں کا عادی ہو گیا تھا جو اپنے دن تاریک کمروں میں گزارتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مشروب کے گھونٹ لیتے اور ٹیلی وژن دیکھ کر بے ہودہ انداز میں چلاتے ہیں۔ وہاں آنے والے مستقل گاہکوں نے مجھے نظرانداز کرنا شروع کر دیا تھا البتہ ان میں سے کچھ کا رویہ اب بھی جارحانہ تھا۔

نئے آنے والے عام طور پر دو طرح کا ردعمل ظاہر کرتے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے میری سروس پر شکریہ ادا کرتے یا پھر میرا مذاق اڑاتے۔ میں اپنے بارے میں "بے ایکس" کے الفاظ کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ مجھے اس وقت بھی برا نہیں لگا جب ایک شخص نے مجھے ایک بازو والا آوارہ گرد کہہ کر بلایا۔ اس روز میں نے بغیر آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر نظرانداز کر دیا کہ شاید اس کے دماغ میں کوئی کیڑا کلبلا رہا ہے۔

ایسے لوگوں سے نمٹنا بہت مشکل تھا جو مجھے جنگ سے واپس آیا ہوا سابق فوجی سمجھتے تھے۔ میری خواہش ہوتی کہ ان کے لیے کچھ کر سکوں اور انہیں بڑی حیرت ہوتی اگر یہ معلوم ہوتا کہ میں کس طرح اپنے ایک بازو سے محروم ہو گیا تھا۔ میں ٹرین سے پھسل کر گرا اور میرا بازو اس کے پہیوں کے نیچے آ گیا۔ اس وقت میں بارہ سال کا تھا۔ میں نے اپنے بے وقوف دوستوں کے ساتھ اچھل کر سوار ہونے کی کوشش کی تھی۔ جب میں ٹرین سے گرا تو میرا دایاں بازو کہنی سے دو انچ اوپر کٹ گیا۔ میرے اعصاب کو بھی نقصان پہنچا اور بازو کا بچا ہوا حصہ بے ہنگم طریقے سے لٹکا ہوا نظر آنے لگا۔ بعض اوقات میں اسے حرکت دیتا تو یوں لگتا کہ وہ میرے نہیں بلکہ اپنے دماغ سے کام کر رہا ہے۔

مجھے اپنے آپ کو قائل کرنے میں ایک سال لگ گیا کہ دایاں بازو ضائع ہونے کے بعد اپنے اندر تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ میں نے پہلے ہی کچھ مشقیں شروع کر دی تھیں۔ میں اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرتا تھا۔ میرے لیے چھوٹے چھوٹے کام جیسے دانتوں میں برش کرنا بھی مشکل، پیچیدہ اور بعض صورتوں میں خطرناک ہو گئے۔ مثال کے طور پر پتلون کی زپ کھولنا بند کرنا۔ میں نے تیرہ سال کی عمر میں اسکول سے آنے کے بعد جم جانا شروع کر دیا۔ میں

پر زور دے رہا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں عام لوگوں سے زیادہ وزن اٹھانے لگا۔ جب سترہ سال کا ہوا تو اپنے خالی ہاتھ سے سیب اور پھلوں سے بھرے ہوئے ڈبے توڑنے لگا۔ گو کہ میرے دائیں بازو نے بھولا ختم کر دیا تھا لیکن وہ میرے لیے ایک کند اوزار کے مانند تھا جس کا مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بھی لڑکی کسی ایسے مرد کے ساتھ ڈیٹ پر جانا پسند نہیں کرے گی جس کا ایک ہاتھ نہ ہو لہٰذا میں نے کبھی مہذب بننے یا کسی کو چھونے کی کوشش نہیں کی لیکن لوئس مجھ سے جس طرح پیش آتی تھی، اس پر میں اس کا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔

اس نے میرے سامنے فالسے کا شربت لا کر رکھا اور میرے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے بولی۔ "آج میرے دوست کا کیا حال ہے؟"

"بہتر ہے۔ میں ایک کام میں پھنسا ہوا ہوں۔ مجھے ایک بے وفا شوہر کا تعاقب کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کا پیچھا کرتے ہوئے تین دن ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ میں ایسے کاموں سے تنگ آ چکا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ ایجنسی جا کر ڈون اور رک سے بات کروں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ان لوگوں سے کیوں چپکے ہوئے ہو؟ تمہارے پاس تعلیم اور تجربہ ہے۔ تم اپنی طرز کی اپنی ایجنسی کھول سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے... اور تم میری سیکریٹری بن سکتی ہو پھر تمہیں اپنی خوب صورت ٹانگیں دکھانے کے لیے اسکرٹ پہننا پڑے گا۔"

"مجھے خطرہ ہے کہ میری خوب صورت ٹانگوں پر ابھری ہوئی رگیں نظر آ جائیں گی۔ البتہ ہم اپنی ایجنسی کا نام تمہارے لیے "ہاتھ" رکھ سکتے ہیں۔"

ایک احمق شخص بار کے سرے پر کھڑا ہوا لوئس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لہٰذا وہ وہاں سے چلی گئی۔ لوئس پہلی عورت تھی جس سے میں نے محبت کی۔ گو کہ میرے دوسری عورتوں سے بھی تعلقات رہے لیکن محبت کسی سے نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے میں ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ حساس ہو گیا تھا۔ کالج کے زمانے میں بھی ایسا ہی تھا۔ میں وہاں کالج بھی گیا تھا اور کرمنل جسٹس میرا مضمون تھا۔ پتا نہیں میں نے یہ مضمون کیوں منتخب کیا تھا کہ مجھے پولیس میں ملازمت نہیں مل سکتی۔ میں نے لڑکیوں سے ڈیٹنگ بھی کی۔ زیادہ تر لڑکیوں سے

اس نے اپنی دیوار پر سیاہ فام ہیروز کے پوسٹر لگا رکھے تھے۔ ہیروز جب میں کلاس میں جانے کے لیے صبح کو بیدار ہوتا تو صرف اپنے آپ کو ایک انسان سمجھتا لیکن اس کی سوچ مختلف تھی۔ وہ خود کو سفید فام معاشرے میں سیاہ فام سمجھتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ نہیں سمجھتا کہ اپنے محدود نظریات کی وجہ سے وہ غیر ضروری طور پر حساس ہوتا جا رہا ہے۔

اس نے کہا۔ "میرے دوست! یہ معاملہ صرف اپنی حفاظت کا ہے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ رنگ مختلف ہونے کے باوجود ہم سب بھائی ہیں لیکن ایک روز پولیس والے نے مجھے اپنے باپ کی بی ایم ڈبلیو چلاتے ہوئے دیکھ لیا اور مجھے صرف سیاہ فام ہونے کی بنا پر روک لیا۔ اس واقعے سے مجھے بہت تکلیف پہنچی لہٰذا مجھے یہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔"

میں نے اپنا جوس ختم کیا اور لوئس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج رات ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میری ڈیوٹی سات بجے تک ہے لیکن میں گھر جا کر لباس تبدیل کرنا چاہوں گی۔ تم مجھے آٹھ بجے لینے کے لیے آ جانا۔"

☆☆☆

جب میں واپس آیا تو ڈون ایجنسی میں اکیلا تھا۔ لہٰذا میں اس کے دفتر میں چلا گیا اور اسے آج ہونے والی لڑائی کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ نہ تو وہ شخص اور نہ ہی پولیس میرے بارے میں جانتی ہے۔

"لیکن تم نے ایمبولینس کو بھی فون کیا تھا؟"

"ہاں لیکن میں نے اسی کا فون استعمال کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں اس کیس سے الگ کر کے کسی اور کی ڈیوٹی لگا دیتے ہیں۔"

رک اور ڈون ابھی تک ستر کی دہائی کے کرداروں جیسی حرکتیں کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اکیلے میں اچھا سپاہی اور برا سپاہی والا کھیل کھیلنے لگے۔ ڈون ہمیشہ اچھا سپاہی بنتا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح کے کام تمہارے لیے مناسب ہیں۔ تم اس مچھلی کی طرح لگتے ہو جو پانی سے باہر آ گئی ہو۔" وہ ہمیشہ اس طرح کی مثالیں دیا کرتا تھا۔ "میں نے تمہارے لیے ایک دوسرا کام دیکھا ہے۔" اس نے فائلوں کے ڈھیر میں سے ایک فائل نکالی اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولا۔ "ہم بیت ہاؤس کی بات کر رہے

ہیں جو ویسٹ ووڈ پر اسٹور کی بہت بڑی دکان ہے۔ وہ سی ڈی، ڈی وی ڈی اور کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ تم اس کیس فائل کو دیکھو۔"

میں نے فولڈر کھولا اور کھنکی کے دیے ہوئے نوٹس پڑھنے لگا۔ ان کے ویسٹ ووڈ اسٹور میں سرقے کا مسئلہ تھا۔ یہ اصطلاح اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب چیزیں غائب ہو رہی ہوں۔ ہیٹ اسٹور کی انتظامیہ اس کا الزام ان لوگوں کو دے رہی تھی جو دکانوں سے چیزیں چراتے ہیں۔ اس کی روک تھام کے لیے انہیں سیکیورٹی گارڈز کی ضرورت تھی۔ میں نے فائل ڈون کی میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ سراغ رسانی نہیں ہے۔ تم سیکیورٹی کے کسی آدمی کو بھیج دو۔ میں سیکیورٹی گارڈ نہیں سراغ رساں ہوں۔"

"درست ۔۔۔" ڈون نے کہا۔ "لیکن تم وہ کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر رہے۔ میں ہیٹ ہاؤس کی انتظامیہ سے بات کرتا ہوں۔ تم سیکیورٹی گارڈ کے روپ میں سراغ رسانی ہی کرو گے۔ تمہیں سادہ لباس پہن کر اسٹور میں گشت کرنا ہوگا۔ تم یہ ظاہر کرو گے کہ اسٹور کی سیکیورٹی پر مامور ہو لیکن درحقیقت تمہیں مشتبہ لوگوں پر نظر رکھنا اور چوروں کو پکڑنا ہوگا۔ یہ بھی ایک طرح سے سراغ رسانی ہی ہے۔"

یہ آئیڈیا مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ میں تصور میں اپنے آپ کو روتے ہوئے نوعمر چوروں کو کالر سے پکڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

ڈون نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شکر کرو کہ اس وقت کرک یہاں نہیں ہے۔"

☆☆☆

میں لوئس کو اس کے پسندیدہ ریستوران موسو اینڈ فرینک گرل میں لے گیا جو بنیادی طور پر سیاحوں کے لیے تھا لیکن اب اس نے ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کھانے کے بعد ہم اس کے چھوٹے سے فلیٹ پر چلے گئے جو ووڈی کے باہر واقع تھا۔ لوئس کا نوعمر بیٹا نہ جانے کیوں مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ پہلے میں سوچا کرتا کہ شاید اسے اپنے باپ کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن جب میں نے ایک دفعہ اسے اپنی جیب کے نوٹ گنتے ہوئے دیکھا تو فیصلہ کر لیا کہ اس کی نفرت کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھا۔

تھوڑی دیر ڈرنک کرنے کے بعد وہ مجھے اپنے بستر

پڑتے ہیں۔ تم دونوں ہی ... بہت کچھ بتاتی رہتی تھی۔ شاید اس کی وجہ میری معذوری تھی لیکن اس نے مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ میں نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے خوشی ہوگی اگر یہ وقت مستقل ہو جائے۔"

"ہم اس دور سے گزر چکے ہیں۔" اس نے کہا۔

"میں شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جب تک رابرٹ کہیں چلا نہ جائے۔ اگلے سال اس کا اسکول ختم ہو جائے گا اور تمہیں کرو میں چاہ رہی ہوں کہ وہ کالج میں چلا جائے۔"

"اس طرح وہ تم سے بہت دور چلا جائے گا۔"

"تم مجھے کسی ایک کی طرف داری پر مجبور نہ کرو۔ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ میرا بیٹا ہے۔ تم ہار جاؤ گے۔"

اسی وقت ہم نے بیرونی دروازہ ... زور سے بند ہونے کی آواز سنی۔ ایک منٹ بعد وہ بیڈ روم کے دروازے میں کھڑا گھور رہا تھا۔ اس نے گستاخانہ لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میری ماں کے کمرے سے نکلو اور اپنی کار ڈرائیو وے سے ہٹاؤ۔ مجھے اپنی گاڑی گیراج میں کھڑی کرنی ہے۔"



لوئس چلائی۔ "رابرٹ ۔۔۔!"

"اسے کچھ مت کہو۔ میں چلا جاتا ہوں۔" میں نے کہا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ہیٹ ہاؤس میں میرا پہلا دن اتنا ہی برا گزرا جیسا کہ میں نے تصور کیا تھا۔ میں اسٹور کھلنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور اسٹور منیجر جیسن سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ سنجیدہ، کھلے دل اور منہ پھٹ انسان تھا۔ اس نے فوراً ہی مجھے اسٹور کے قاعدے قانون بتانا شروع کر دیے۔

"تم میرے دوسرے ملازمین کی طرح جانے اور کھانے کا وقفہ کرو گے۔ مجھے بتا دیا گیا ہے اس لیے ایک آدمی کی ضرورت نہیں۔ میرے اعتراض کے باوجود انتظامیہ نے ملازمت دی ہے۔ اس کے باوجود تمہیں میرے قوانین پر عمل کرنا ہوگا۔ پہلا اصول یہ ہے کہ تم چوروں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دو۔ مجھے ان کے رونے اور گڑگڑانے کی پروا نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ بوڑھی خواتین، نوعمر بچے یا بے گھر آوارہ گرد ہوں۔ انہیں سزا ملنی چاہیے۔ اصول نمبر دو، کوئی شخص بھی ہم پر ہاتھ ڈالنے کا دعویٰ نہ کرے۔ تمہیں انکار کرنا ہوگا کہ

ہوں۔ اب تم ان کا سامنا کرو اور خدا کے واسطے انہیں ہاتھ نہ لگانا۔ جب تک وہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔" اس نے میرے بازو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر انہیں پکڑنا بھی پڑے تو کوئی تکلیف مت دینا۔"

اسٹور میں گشت کرنے کے علاوہ میں ہیلز فلور کے اوپر بنے ہوئے آدم آئینے اور منیجر کے دفتر میں رکھے ہوئے ٹی وی کے ذریعے بھی گاہکوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ یہ مانیٹر اسٹور میں لگے ہوئے کئی کلوز سرکٹ ٹی وی کیمروں سے منسلک تھا۔ اس کے علاوہ مجھے وہ جڑے ہوئے مختلف دروازوں کی سہولت بھی حاصل تھی جن کی مدد سے منسلک بغلی راستوں کے کونوں میں جایا جا سکتا تھا۔ اتنے بھرپور انتظامات کے ہوتے ہوئے اسٹور سے چیزوں کا چوری ہونا ایک معما تھا۔

اس روز میں نے صرف ایک شاپ لفٹر کو پکڑا۔ وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ جب میں اسے بریک روم میں اس کی چھوٹی سی میز کے پاس لے کر آیا جسے میں اپنی دفتری میز کے طور پر استعمال کر رہا تھا تو وہ مسلسل رونے جاری تھی اور گڑگڑا کر التجا کر رہی تھی۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا اور جیسن اسٹور میں نہیں تھا کیونکہ اسے شام کو آ کر اسٹور بند کرنا ہوتا تھا۔ اس وقت وہ دوپہر کے فوراً بعد گھر چلا گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کو ہلکی سی ڈانٹ ڈپٹ اور ڈرا دھمکا کر چھوڑ دیا جائے۔ میں نے اسے اور اس کے لیے بریک روم کی وینڈنگ مشین سے سوڈے کی بوتلیں نکالیں اور اسے سمجھانے لگا کہ اگر اسے چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دیا تو اس کے مستقبل پر اس کا اثر پڑے گا۔ پھر میں نے اسے پڑھنے اور اقرار کرنے کے لیے ایک معاہدہ دیا کہ وہ آئندہ کبھی چوری نہیں کرے گی۔ یہ میری اپنی اختراع تھی اور اسے بڑی ہوشیاری سے تیار کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ چوری ایک جرم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے کاروبار کو جو نقصان ہوتا ہے، اسے وہ ملازمین کی تنخواہیں بڑھا کر اور اپنے ملازمین کو کم کر کے پورا کرتے ہیں۔ اس طرح میں چوری کر کے دوسرے لوگوں اور اسٹور کے ملازمین کا نقصان کر رہی ہوں۔ میں حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی کسی دکان سے چوری نہیں کروں گی۔" اس کے نیچے لڑکی کے نام اور اس کے گھر کے پتے کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی۔

اس کاغذ کو پڑھتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ابھی تک اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لیام مجھے ... کی ... کر رہا ہو۔ اس نے اپنا نام اور فون نمبر لکھا پھر دستخط کرنے کے بعد میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہاں میں سمجھ گئی۔ کیا اب گھر جا سکتی ہوں؟"

"ایک منٹ۔" میں نے شناختی کارڈ سے اس کے دستخط ملائے اور گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ آنسرنگ مشین سے اس کے نام اور نمبر کی تصدیق ہو گئی۔ میں نے اس کا شناختی کارڈ واپس کیا اور اسے لے کر اسٹور سے باہر آ گیا جہاں پارکنگ لاٹ میں اس کے دوست اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس کی کار میں سوار ہو گئی اور مجھے دیکھ کر چلائی۔ "جہنم میں جاؤ کمینے۔" تب مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی۔ وہ اتنی معصوم نہیں تھی جتنی نظر آ رہی تھی۔

دوسرے دن جیسن کو جب معلوم ہوا کہ میں نے شاپ لفٹر کو پولیس کے حوالے نہیں کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے غصے سے میرے چہرے کے سامنے انگلی لہراتے اور چلاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے کل ہی اس بارے میں بات کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام چوروں کو پولیس کے حوالے کیا جائے۔ یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ چوری کرنا جرم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جو بھی ہمارے یہاں چوری کرے، اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو میں تمہارے مالکان کو فون کرتا ہوں کہ وہ تمہاری جگہ کسی ایسے شخص کو بھیجیں جو ہمارے کہنے پر عمل کر سکے۔ کیا تم میری بات سمجھ گئے؟"

"ہاں۔"

"ہاں کیا ۔۔۔؟"

اسے میرا ہاں کہنا برا لگا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ میں جی جناب، کہوں لیکن اس روز میں نے آدھی آستین کی قمیص پہن رکھی تھی اور وہ میرے بازوؤں کے مسلز دیکھ رہا تھا جنہیں میں نے جان بوجھ کر پھلا اور سکیڑ رہا تھا۔ میں نے بہت پہلے یہ تکنیک ایجاد کی تھی۔ وہ منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی دفتر سے باہر نکل گیا۔

ہیٹ ہاؤس نے حال ہی میں ونائل ریکارڈز کا ذخیرہ کرنا شروع کیا تھا۔ اس طرح کے ریکارڈ سی ڈی اور ڈیجیٹل ڈاؤن لوڈ سے پہلے کے زمانے میں سنے جاتے تھے۔ مجھے یہ ریکارڈز اس لیے بھی پسند تھے کہ اس طرح مجھے البم کے کور پر آرٹ ورک دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ میں ونائل کے ریکارڈز کے ایک بکس کو ٹٹول رہا تھا کہ میں نے

سے بہت محو ہو کر ... دیکھ رہا تھا
جس کے ساتھ سفید کیس اور فاسٹک رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ شاید میں اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا اگر وہ اپنا بریف کیس کھلے بریف کر اس کی چنی نہ کھول رہا ہوتا۔ وہ کیمرے کے نزدیک نہیں تھا لیکن اوپر لگے ہوئے آئینے میں اس کی نقل و حرکت نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے بریف کیس میں ڈی وی ڈی رکھ رہا تھا۔ زیادہ تر سی ڈی اور ڈی وی ڈی کے پیکٹ پر سنسر ٹیپ لگا ہوتا ہے اور اگر کیشیئر اس ٹیپ کو ناکارہ نہ بنائے تو مرکزی دروازے سے گزرتے ہوئے بزر بج جائے گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بریف کیس والا اس بزر سے بچ کر کیسے نکلے گا۔

جب اس نے بریف کیس بند کیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا لیکن نہ جانے کس طرح میرا پاؤں پھسلا اور میں زمین پر گر پڑا لیکن میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اتنی دیر میں وہ دروازے تک پہنچ چکا تھا اور بزر بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اسے سڑک پر پکڑ لیا۔ اس کی بی ایم ڈبلیو کنورٹیبل فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بریف کیس پسنجر سیٹ پر پھینکا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں نے چلا کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے کار تیزی سے آگے بڑھائی اور ایک منی وین سے ٹکرا دی۔

دونوں گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ ان کے انجن بند ہو گئے تھے اور سڑک پر پانی کے ساتھ تیل بھی بہہ رہا تھا۔ فضا میں پیٹرول کی بو پھیل گئی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ فائر ڈپارٹمنٹ کو فون کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ سڑک پر پھیلا ہوا تیل آگ پکڑ لے۔ بریف کیس کار کے فرش پر گر گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ دونوں ڈرائیوروں میں سے کسی کو چوٹ نہیں آئی تھی لیکن منی وین کی پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوجوان عورت کا سر دروازے سے ٹکرایا تھا جس سے اس کی ایک آنکھ پر معمولی زخم آیا تھا۔ میں نے اپنے سیل فون سے پولیس اور ایمبولینس کو فون کیا۔ جب اس شخص نے اپنا بریف کیس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ میرا تعلق اسٹور سیکیورٹی سے ہے۔ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر رونے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے گزشتہ روز والی لڑکی یاد آ گئی جس نے رونے کی اداکاری کر کے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔

ثبوت کرنے کے لیے ...
کی رپورٹ درج کروانے کے لیے اس کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پولیس والوں سے نمٹ لے اسٹور آئے اور میں اس کا بریف کیس لے کر واپس بریک روم میں آ گیا۔ اس نے چار ڈی وی ڈیز چرائی تھیں اور وہ سب جون وائن کی فلموں کی تھیں۔ شاید اسے انہیں فروخت کر کے کچھ ڈالر مل جاتے۔ اس کے علاوہ اس کے بریف کیس میں چوہوں کی ایک پلاسٹک سرجن ڈاکٹر رونگن کے بھی بہت سارے پمفلٹ پڑے ہوئے تھے اور میں نے یہی نام اس کے ڈرائیونگ لائسنس میں بھی پڑھا تھا۔ ایک پمفلٹ پر اس کی تصویر بھی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اسٹور سے چیزیں چرانے والا ایک ڈاکٹر تھا۔ بظاہر یہ ایک اتفاقی مسئلہ معلوم ہو رہا تھا۔ ایسا شخص ڈی وی ڈی کی چوری کیوں کرے گا۔ پکڑے جانے پر اس کی پریشانی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اگر بات پھیل جاتی تو اس کی ساکھ کو نقصان پہنچتا۔

دوسری طرف مجھے بھی تنبیہ کر دی گئی تھی کہ اسٹور میں چوری کرنے والے کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ میری ملازمت ختم ہو سکتی تھی اور میں یہ خطرہ کسی صورت نہیں لے سکتا تھا کیونکہ مجھے ذاتی اخراجات کے ... کے کرائے اور بلوں کی ادائیگی کے لیے بھی رقم درکار تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اپنی پولیس والوں کے پاس جا کر شکایت کرتا جو کار کے حادثے کی اطلاع ملنے پر وہاں آئے تھے۔ اس کے بجائے میں نے بریف کیس کو جیسن کی میز کے پیچھے رکھ دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ جیسن دوپہر کو سونے کے لیے گھر جا چکا تھا۔ اس نے یہ وتیرہ بنا لیا تھا کہ شام کو اسٹور خود بند کرتا حالانکہ کوئی بھی شفٹ سپروائزر یہ کام کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے لیے ایک پرچہ چھوڑ دیا جس میں بریف کیس کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ وضاحت بھی کر دی کہ ٹریفک حادثے کا جائزہ لینے والے پولیس آفیسر ڈاکٹر رونگن کی چوری کا کیس لے کر کاغذی کارروائی نہیں بڑھانا چاہتے تھے۔ اس لیے جب وہ اپنا بریف کیس لینے آئے تو جیسن پولیس کو فون کرے۔ بہرحال ڈاکٹر رونگن اس روز واپس نہیں آیا۔

☆☆☆

جب میں شام کو گھر واپس جا رہا تھا تو میرے سیل فون پر لوئس کا فون آیا۔ وہ مجھے ڈنر پر مدعو کر رہی

کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ کھانا تیار کر رہی تھی۔ میں نے بیرونی دروازے سے داخل ہوتے ہی کھانے کی خوشبو سونگھ لی تھی۔ اب میں ڈور نوب گھمانے یا دروازے پر دستک دینے کا محتاج نہیں تھا کیونکہ وہ ایک روز پہلے گھر کی ایک اضافی چابی مجھے دے چکی تھی لیکن اس روز میں نے پہلی بار اس کا استعمال کیا جس پر مجھے بعد میں افسوس بھی ہوا جب میں نے لوئس اور رابرٹ کو کچن میں کسی بات پر بحث کرتے ہوئے سنا۔

''میں اس کے ساتھ ڈنر کرنا نہیں چاہتا بلکہ میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ میرے گھر آئے۔''

''میرا گھر ہے۔'' لوئس نے چیخ کر کہا۔ ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہمارا گھر ہے۔ بہرحال وہ میرا مہمان ہے اور ڈنر کے لیے آ رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ تم دونوں کے درمیان کیا مسئلہ ہے اور میں یہ امید کرتی ہوں کہ تم ہمارے ساتھ کھانا کھانے کے علاوہ اپنا رویہ بھی بہتر رکھو گے۔''

میں نے رابرٹ کا جواب نہیں سنا اور باہر جا کر دروازہ بجایا۔ ایک منٹ بعد لوئس دروازے پر آئی اور مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ''تم نے گھنٹی کیوں نہیں بجائی؟''

''اوہ ہاں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ خوشبو کیسی ہے؟''

''اندر آؤ..... ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

کھانے کے دوران لوئس مسلسل کوشش کرتی رہی کہ رابرٹ ہماری گفتگو میں شامل ہو جائے لیکن وہ خاموش بیٹھا اپنی پلیٹ میں کانٹے سے کھانے کو ادھر ادھر کرتا رہا۔ اس دوران اس نے کوئی بات نہیں کی جبکہ میں اور لوئس اپنے اپنے کام کے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے رہے۔ میں نے اسے ڈاکٹر کے بریف کیس کا قصہ سنایا اور جب میں نے اپنی بات ختم کی تو رابرٹ پہلی بار بول پڑا۔

''تمہارے پاس یہ کہنا تھا کہ شاپ لفٹر کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے بجائے تم نے اسے جانے دیا۔ لگتا ہے وہ آدمی بہت امیر تھا اور تم ایسے لوگوں سے بہت جلدی مرعوب ہو جاتے ہو۔ اسے چوری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ مزید کہا۔

''کاش میں کل صبح ہیڈ آفس جا سکتا جب تم باس کے سامنے وضاحت پیش کر رہے ہو گے۔ تمہیں اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا ہوگی۔''

رابرٹ نے [illegible]
اس کی پلیٹ میں کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ ''یہ لڑکا بھی مجھ سے بہت نفرت کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔

لوئس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ صرف پریشان ہے۔ اسے اپنا باپ یاد آتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں کسی اور کو اس کی جگہ دینے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کیا کہوں۔ لہٰذا ایک بار پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن میں بھی اپنا کھانا ختم نہ کر سکا۔ شاید میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رابرٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسرے روز صبح مجھے واقعی جیسن کے سامنے گڑگڑانا پڑ گیا۔

''تمہارا شاپ لفٹر کل واپس پلٹ کر نہیں آیا۔'' جیسن نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس اس کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ پولیس کے پاس شکایت درج کرواتے وقت یہ معلومات انہیں فراہم کر دیں۔''

''یہ کام کل ہی ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے بریف کیس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی پولیس اسٹیشن جاؤ اور اس کا خیال رکھنا۔ اس بار کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔ میری تمہارے باس رک سے گفتگو ہوئی ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر مجھے تم سے مزید پریشانی ہوئی تو وہ تمہیں فارغ کر دے گا۔''

میں نے پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں رک کو فون کیا تاکہ جیسن کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کر سکوں اور رک کا جواب سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اس کنٹریکٹ کو کھونے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر تم نے ویسٹ وڈ کی برانچ میں اچھی کارکردگی دکھائی تو وہ ہمیں لاس اینجلز کے تمام اسٹورز کی سیکیورٹی دے دیں گے جس میں پاس دینا کا سب سے بڑا اسٹور بھی شامل ہے۔ میں نے پہلے ہی فون پر کہا تھا کہ تمہیں یہ ذمے داری نہ دی جائے۔''

''میں اس اسٹور میں کام کرنے والا واحد شخص نہیں ہوں۔ تم نے ایجنگ شفٹ میں سیکیورٹی کی ذمے داری کسے دی ہے؟''

"کیوں؟ رات میں بھی اسٹور سے چیزیں چوری ہوتی تھیں۔"
"جیسن کو شام میں سیکیورٹی نہیں چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ خود رات میں نگرانی کر سکتا ہے۔"
"یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"
"ہاں۔ میں نے بھی اس سے اس معاملے پر ایک گھنٹے سے زیادہ بحث کی تھی۔ بہرحال اب یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ تمہیں ایک مہینے کے اندر اسٹور کے نقصان کو نمایاں حد تک کم کرنا ہے ورنہ ہمارے ہاتھ سے یہ کنٹریکٹ نکل جائے گا اور تم بھی اس ملازمت سے فارغ ہو جاؤ گے۔"
پولیس اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ جب میں واپس آیا تو جیسن دوپہر میں سونے کے لیے گھر جا چکا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ بقیہ دن سکون سے گزرے گا۔ میں بریک روم میں چلا گیا۔ وینڈنگ مشین سے سوڈے کی ایک بوتل خریدی اور اسے لے کر منیجر کے کمرے میں چلا گیا تا کہ سوڈا پینے کے دوران مانیٹر پر نظر رکھ سکوں۔ فلور پر بہت زیادہ لوگ نہیں تھے اور میری شفٹ ختم ہونے میں صرف آدھا گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ اس لیے میں اپنے آپ کو کافی بہتر اور پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اچانک میں نے مانیٹر پر دیکھا کہ ایک لڑکا اپنی کمر کے پیچھے لٹکے ہوئے تھیلے میں سی ڈی ڈال رہا تھا۔ اس نے ہُڈ والی نیلے رنگ کی سویٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں سیلز فلور کی جانب لپکا اور دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے بیگ کو سینسر سے گزارا اور فوراً ہی کاؤنٹر کے پیچھے لگا ہوا بزر بجنے لگا۔ دونوں کاؤنٹر کلرک چلانے لگے اور اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے بھی جواب میں چلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے دیکھ لیا ہے۔"
جب تک میں اس کے قریب نہیں پہنچا وہ لڑکا اپنی جگہ کھڑا رہا پھر اس نے اپنا ہُڈ ہٹایا۔ مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا اور باہر کی جانب چل دیا۔ وہ رابرٹ تھا۔ میں اس کے پیچھے گیا تو وہ فٹ پاتھ پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔
"ہے... ڈیڈی میں۔" اس نے آواز لگائی۔ "میں یہاں ہوں۔"
"تم نے کیا سوچ کر یہ حرکت کی؟" میں نے غصے سے کہا اور اس کا بیگ پکڑ لیا۔
"اب کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔
"دیکھو رابرٹ! یہ پاگل پن ہے۔ کیا تم جیل جانا چاہتے ہو؟"
"مجھے یوں ہی جانے دو گے تو تمہاری نوکری بھی جائے گی اور اگر پولیس کے حوالے کرتے ہو تو میری ماں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر میں جیل چلا گیا تو اس کا اثر میرے مستقبل پر پڑے گا۔ میری پڑھائی ختم ہو جائے گی اور مجھے کوئی نوکری بھی نہیں دے گا۔ اس کی ساری ذمے داری تم پر آئے گی اور وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تم اس کے دوست ضرور ہو لیکن میں اس کا بیٹا ہوں اور خونی رشتہ سب سے مضبوط ہوتا ہے۔"
میں دم بخود کھڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ پہلے سوچا کہ اسے جانے دوں اور جیسن سے کہہ دوں گا کہ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا لیکن اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ دونوں کاؤنٹر کلرک اور دیگر ملازمین ہمیں دیکھ رہے تھے اور وہ یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں شاپ لفٹر کو پکڑنے اور اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اس سے باتیں کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے رابرٹ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ دیکھی میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔
"تم مجھ سے کیوں نفرت کرتے ہو؟ میری وجہ سے تمہارے والدین میں طلاق نہیں ہوئی بلکہ ان کے درمیان بہت پہلے علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس وقت تو میں تمہاری ماں سے ملا بھی نہیں تھا۔"
"تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔"
"نہیں۔ میں صرف سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ میں تمہاری ماں کو چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔ میں تمہارے باپ کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کر رہا اور نہ ہی میں نے تمہارے ساتھ باپ جیسا رویہ رکھا۔ میں صرف تمہارا دوست بننا چاہتا ہوں۔"
"کوشش کرو لیکن میں تمہیں اپنا باپ یا دوست نہیں بنانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری اور میری ماں کی زندگی سے چلے جاؤ۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"
میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کہوں۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیا اور اس میں سے سی ڈی نکالنے کے لیے کھولنے لگا لیکن وہ اس طرح ڈیزائن کی گئی تھی کہ اسے کھولنے کے لیے دونوں ہاتھ استعمال کرنا پڑتے۔ میری ناکامی پر وہ ہنسنے لگا لہٰذا میں نے بیگ اپنے کندھے پر لٹکایا اور واپس جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے لیکن میں کچھ خریدنے کا سامان چوری کرنے آؤں گا۔ اگر اس وقت تک تمہاری ملازمت باقی رہ گئی تو... کیونکہ جب تمہارے باس کو معلوم ہو گا کہ تم نے ایک اور چور کو جانے کا موقع دے دیا تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"
وہ مسکرایا اور کھڑکی سے جھانکتے ہوئے لوگوں کو ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میں اندر گیا اور رابرٹ کے تھیلے میں سے سی ڈی نکال کر ٹرالی میں رکھ دیں۔ وہاں سے اسٹور کا کوئی ملازم انہیں شیلف میں رکھ دیتا۔ میرے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے کوٹ اٹھایا اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔
رابرٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسرے روز جیسن نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور میرے سامنے ہی رک کا نمبر ملا کر فون مجھے پکڑا دیا۔ رک نے مجھے ڈھیروں باتیں سنائیں اور ملازمت سے برطرف کر دیا۔ میں اپنی کار میں سوار ہو کر ساحل سمندر چلا گیا اور دن کا بقیہ حصہ ساحل پر بیٹھ کر سمندری لہروں کو دیکھتے میں گزار دیا۔
☆☆☆
لوئس نے مجھے ہفتے کی شب ڈنر پر مدعو کیا۔ پروگرام کے مطابق میں نے دوپہر کی شفٹ ختم ہونے پر اسے اپارٹمنٹ سے پک اپ کیا اور ہم ڈنر کے لیے اس کے منتخب کردہ ریستوران میں چلے گئے۔ لوئس نے اس روز رنگین پھول دار اسکرٹ اور آسمانی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔ میں اسے رابرٹ کی چوری کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کیا۔ تاہم گفتگو کا وہ حصہ گول کر گیا جو میرے اور رابرٹ کے درمیان ہوئی تھی۔
"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے؟" میں نے کہا۔
"میں نے اس بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس نفرت کی وجہ اس کا باپ ہے۔ وہ بچپن سے ہی اسے اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا۔ میرے لیے طلاق لینے کا فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن جب وہ مجھے چھوڑ کر سان ڈیاگو چلا گیا تو میں کیا کرتی۔ اس سے رابرٹ کو بہت تکلیف ہوئی۔"
"رابرٹ اب بھی اپنے باپ سے ملتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"
"ہاں۔ مہینے میں دو بار ویک اینڈ پر۔ اس تک

لیکن..."
لوئس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "رابرٹ ناراض ہے۔ اسے ہمیشہ یہ تکلیف دہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا باپ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ پہلے وہ مجھے اس کا ذمے دار سمجھتا تھا لیکن پھر جاسمین اور میں نے اسے سمجھایا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے اس کے باپ کو گھر چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا مگر ابھی اس کے دماغ میں کوئی بات ہے تو اسے نکال دینا چاہیے۔ میں اس کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ رہتی ہوں لیکن وہ اپنے باپ پر غصہ نہیں کرتا۔ کافی عرصے تک وہ اپنے ٹیچرز سے بدتمیزی کرتا رہا اور کئی بار اسے سزا ملی بلکہ ایک مرتبہ تو اسے اسکول سے نکالنے کی نوبت آ گئی تھی جب اس نے اپنے ٹیچر پر ہاتھ اٹھایا تھا۔"
"اس کا مطلب ہے کہ وہ ہر ایک سے نفرت کرتا ہے؟"
"یہ بھی سمجھ لو... بہرحال اب وہ پڑھائی میں دلچسپی لے رہا ہے بلکہ گزشتہ برس تو اس کے بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس میں یہ تبدیلی کب آئی؟"
"میں نہیں جانتا۔"
"جب ہم دونوں نے ملنا شروع کیا۔ تم پہلے آدمی ہو جس کے ساتھ میں ایک سے زیادہ مرتبہ ڈیٹ پر گئی۔"
"واقعی؟"
لوئس میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ "ہاں... پہلے اور آخری۔ بہرحال تم میرے معیار پر پورا اترتے ہو اور اس کے باپ کی جگہ لے سکتے ہو لیکن رابرٹ تم سے نفرت کرتا رہے گا جب تک وہ اپنے باپ سے ناراض ہے۔"
"بہت خوب۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میرے لیے یہ مایوس کن ہے۔"
کھانے کے بعد میں نے لوئس کو اس کے گھر پر چھوڑا۔ اگلے ویک اینڈ پر رابرٹ اپنے باپ سے ملنے جا رہا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں ایک ساتھ رات گزار سکتے تھے۔ میں نے لوئس کی ہنڈا کار ڈرائیو وے میں کھڑی دیکھی تو مجھے ایک خیال سوجھا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ تم ایک ہفتے کے لیے مجھ سے کار بدل لو۔ میں بیٹ ہاؤس کے منیجر کو چیک کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری کار پہچانتا ہے۔"
"کیا تم اس کا تعاقب کرو گے؟"
"کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

ہر چیز صاف اور نکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں ہیڈ ہاؤس سے ایک بلاک کے فاصلے پر لوئس کی کار کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا دور بین لگائے اسٹور کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پچھلے روز میں نے گاڑی سڑک سے آدھے بلاک کے فاصلے پر کھڑی کی اور جب جیسن دوسرے ملازمین کے ساتھ اسٹور بند کر کے باہر آیا تو میں سیٹ کے پیچھے جھک گیا تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ اس کے بعد میں نے ایک بلاک بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ فاصلے پر گاڑی پارک کرنا شروع کر دی۔ جیسن کی ایک عادت سے مجھے تجسس ہوا۔ میں نے پہلی رات ہی نوٹ کیا تھا کہ ہیڈ ہاؤس کو مقفل کرنے اور اپنی کار تک جانے کے بعد وہ بلاک کے گرد ایک چکر لگاتا ہے اور اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے کار کی رفتار کم کر لیتا ہے۔ میں نے اس کا تعاقب نہیں کیا لیکن اس منظر کو دیکھنے کے بعد مجھے تجسس ہوا کہ کیا وہ بعد میں بھی یہ عمل دہرائے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہر رات کو اسٹور کے دروازے کو مقفل کرتا اور دوسرے ملازمین کے جانے کے بعد اپنی کار میں بلاک کے گرد ایک چکر لگاتا۔

میں نے اس کی نگرانی جمعرات کی رات سے شروع کی تھی اور اب جمعہ آگیا تھا۔ اب بھی بارش کی وجہ سے ہلکی سی کہر تھی اور سڑک گیلی ہو رہی تھی۔ اسی بوندا باندی میں جیسن اور دوسرے لوگ باہر آئے اور اسٹور کے ملازمین اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے لیکن جیسن گزشتہ رات کی طرح اپنی کار تک گیا اور بلاک کے گرد چکر لگایا البتہ اس بار اس نے اسٹور کے بیرونی دروازے کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی پھر وہ اسٹور کے دروازے کا تالا کھول کر اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی دو منٹ بعد ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں گتے کا ایک ڈبا اٹھایا ہوا تھا۔ اس نے کار کی ڈکی کھول کر وہ ڈبا اس میں رکھ دیا اور دوبارہ اسٹور میں چلا گیا۔ میں نے نائن الیون کو فون کیا اور چلتا ہوا اس کی کار کے پاس آکر کھڑا ہو گیا جب وہ دوسرا ڈبا لے کر آیا تو میں اس کی کار کے عقبی حصے پر جھکا ہوا تھا۔

”میں نے سب دیکھ لیا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ بالکل بھی نہیں گھبرایا اور پرسکون لہجے میں بولا۔ ”تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان ڈبوں میں صفائی کا سامان ہے جو میں ریسٹ روم کی صفائی کے لیے گھر سے لایا تھا۔ وہ بہت گندے ہو رہے تھے اور اسٹور میں کچھ ختم ہو گیا تھا۔“

دیا۔ پھر وہ اس طرح جھکا جیسے ڈبا رکھنے کے لیے جگہ بنا رہا ہو لیکن میں اسے جاٹر کھولنے والی سلاخ نکالتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے وہ سلاخ میرے سر کی طرف گھمائی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس طرح جھٹکا کہ اس کا انگوٹھا چٹخ گیا۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور لوہے کی سلاخ زمین پر گر گئی۔ میں نے اسے لات مار کر دور کر دیا لیکن اس نے لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی کار وہیں چھوڑ کر پیدل ہی چل پڑا۔ وہ ایک بلاک سے بھی کم فاصلے پر تھا کہ دو پولیس کاریں وہاں آکر رک گئیں۔

میری نہ صرف یہ کہ ملازمت بحال ہو گئی بلکہ میں نے ایجنسی کے ساتھ اپنی ملازمت کی شرائط بھی دوبارہ طے کیں۔ ہیڈ ہاؤس سے سامان غائب ہونے کی وجہ خود جیسن تھا۔ ہر شام جب وہ اسٹور بند کرتا تو اس پر لازم تھا کہ وہ الارم کمپنی کو فون کرے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے پاس اسٹور سے نکلنے اور دروازوں کو مقفل کرنے کے لیے تین منٹ ہوتے تھے۔ اس کے بعد الارم چالو ہو جاتا۔ جس دن اسے سامان چوری کرنا ہوتا تو وہ دوسرے لوگوں پر یہی ظاہر کرتا کہ وہ الارم کمپنی کو فون کر رہا ہے جبکہ درحقیقت وہ اپنی گرل فرینڈ کو فون کر رہا ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اسٹور واپس آتا۔ چوری کا سامان گاڑی کی ڈکی میں ... کے بعد وہ اسٹور کو تالا لگا کر گھر چلا جاتا۔ وہ بھی سیکیورٹی کیمروں کی زد میں نہیں آیا کیونکہ وہ ہمیشہ جانے سے پہلے انہیں بند کر دیتا تھا۔

رک اور ڈون نے خود مجھ سے کام پر آنے کی درخواست کی۔ ہیڈ ہاؤس کی انتظامیہ کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پورے علاقے کے اسٹوروں کی سیکیورٹی کا ٹھیکا ڈون رک کو دے دیا اور مجھے اس کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس طرح میری تنخواہ بھی بڑھ گئی بلکہ ہر اسٹور کی آمدنی سے کمیشن بھی ملتا ہے۔ مجھے بہت زیادہ سفر کرنا پڑ رہا ہے اور جب لوئس کے پاس وقت ہو تو وہ بھی میرے ساتھ ہوتی ہے۔ چند روز قبل میں لنکن اسٹور کے معائنے کے لیے گیا تو لوئس اور رابرٹ بھی میرے ساتھ تھے۔ رابرٹ یونیورسٹی آف ایری زونا دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس روز میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ اب وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتا۔ اسے یقین آگیا ہے کہ میں واقعی بدل گیا ہوں۔

●●

پھر اس کا نام ڈون ہے۔ میری عمر اس وقت پچاس سال ہے اور میں گزشتہ دس سال سے ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ شام پانچ بجے میں دفتر چھوڑ دیتا ہوں لیکن کبھی اگر کوئی اہم کام پڑ جائے تو سات آٹھ بھی بج جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں فون کر کے اپنی بیوی کو یہ ضرور بتا دیتا ہوں کہ دفتر

یہ ایک ایسی ہی شام تھی جب مجھے دیر تک کام کرنا پڑا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے پارکنگ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سڑک پار کرتے ہی جیسے ہی میں نے فٹ پاتھ پر قدم رکھا میرے داہنے پاؤں کو کسی دبیز نرم چیز سے ٹھوکر لگی۔ جب میں نے اس چیز

فریب آرزو

ابوالفرح ہمایوں

فریب کی صورتیں ہزار... مگر مقصد صرف ایک ہی ہوتا ہے... دھوکا اور صرف دھوکا... وہ بھی ایک ایسی ہی آرزو دل میں بسا بیٹھا تھا جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ وہ اپنے ایام جوانی کو اپنی مٹھی میں قید رکھنا چاہتا تھا اور وہ فریب اتنا دلفریب تھا کہ اسے تمام عمر اپنے جال میں ہی مقید رکھا حتیٰ کہ زندگی کی رعنائیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

بے بنیاد حقیقتوں کے مکر و فریب اور ڈھلتی عمر کی خوفناک بے بسی



…ایک کے بعد میں نے تیزی کے ساتھ پرس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں دس پاؤنڈ کے ایک سو نوٹ اور سو پاؤنڈ کے پچاس نوٹ موجود تھے اور پھر فوراً ہی میری نظر ایک وزیٹنگ کارڈ پر پڑی۔ کارڈ پر نام اور پتا درج تھا۔ ''مسٹر رابرٹ اسمتھ، کوئین میشن سے فیر۔'' آگے فون نمبر بھی موجود تھا۔ کلب پہنچ کر میں نے فون نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ایک نرم و لطیف آواز آئی۔ ''میں رابرٹ اسمتھ بول رہا ہوں۔ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

میں نے اسے پرس کے بارے میں بتایا اور کہا کہ کل میں آپ کی امانت بھجوا دوں گا۔ لیکن جواب میں رابرٹ نے التجا کی کہ میں ابھی آکر اس سے مل لوں۔ شاید وہ براہِ راست میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ محبت آمیز درخواست... ٹھکرا نہ سکا اور اس کے گھر کی جانب چل پڑا۔ رابرٹ نے میرا استقبال انتہائی پرتپاک انداز میں کیا اور سیدھا ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ یہ کمرا نفاست اور خوش ذوقی کا مظہر تھا اور اس بات کا آئینہ دار تھا کہ مالک مکان کس قدر پاک اور اعلیٰ وارفع خیالات رکھتا ہے۔

میں نے رابرٹ کی شکل و صورت اور شخصیت کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ درمیانہ قامت اور قدرے فربہ جسامت کا عام آدمی تھا۔ کلین شیو، گنجے اور ہلکے بھوری مائل بال، عمر تقریباً ساٹھ برس ہوگی۔ مجموعی طور پر تو اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سا جادو یا مقناطیسیت پوشیدہ تھی۔ چہرے پر تحمل، رحم دلی، تجربہ، دور اندیشی اور عقلمندی کے جذبات بیک وقت عیاں ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں ایسی ذہانت اور متانت چھائی ہوئی تھی جو اعلیٰ حسب نسب کے تجربہ کار اور ذہین افراد میں پائی جاتی ہے۔

مجھے اپنے چہرے کا اس قدر بغور جائزہ لیتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور پھر وہ آہستہ سے گویا ہوا۔ ''میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ اگر اجازت دو تو شروع کروں؟''

اور میرے حسین تصورات کا محل دھڑام سے نیچے آن گرا۔ ناگواری کا ایک شدید احساس میرے دل میں ابھرا۔ ''کیا یہ شخص اندر سے اتنا ہی بودا ہے؟ ایک عمر رسیدہ اور ناکارہ آدمی... جس کے پاس اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ اجنبیوں کو پکڑ پکڑ کر اپنی گزشتہ زندگی کا کوئی احمقانہ اور فرسودہ واقعہ سنایا کرے۔'' میں خود اپنے آپ سے شرمندہ ہے۔ آپ کی کہانی پھر سہی۔''

رابرٹ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''صرف ایک منٹ۔'' اس نے پرس کو ہاتھ میں لے کر میرے سامنے لہرایا۔ ''یہ پہلا اتفاق نہیں ہے کہ مجھ سے کوئی پرس گم ہوگیا ہو۔ میں اب تک تین پرس گم کر چکا ہوں۔ لیکن تم وہ پہلے شخص ہو جس نے میری چیز مجھے لوٹائی ہے۔ کیا تم جاننا چاہو گے کہ اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟'' اور پھر فوراً ہی اس نے ایک دوسرا غیر متعلق سا سوال داغ دیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، میری عمر کیا ہوگی؟''

اس سوال سے مجھ پر ایک بجلی سی گر پڑی۔ میں یوں دم بخود سا رہ گیا، گویا کسی نے یکدم میرا تمام خون نچوڑ لیا ہو۔ ضرور اس بوڑھے کے جسم میں کوئی بدروح سرایت کر گئی ہے۔ خوف و دہشت کی ایک لہر میرے ہوش و حواس پر چھا گئی۔

میں نے بہ مشکل اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے تمہاری عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔''

''میری عمر اس وقت ایک سو تیس سال ہے۔''

رابرٹ نے میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' اور پھر میری ذہنی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا، اب تم گھر جاؤ... لیکن کیا کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا پسند کرو گے؟'' میرے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار دیکھ کر وہ تیزی سے بولا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑے گا۔ میرے سینے میں بہت سے راز دفن ہیں اور میں جو کہانی تمہیں سنانے والا ہوں، وہ ایک لاجواب اور ناقابلِ یقین کہانی ہے۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''آؤ، میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔''

میرے منہ سے اطمینان کا سانس خارج ہوا۔ 'کل فون پر معذرت کرلوں گا۔' میں نے دل میں سوچا اور رابرٹ کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔

''میں عموماً آٹھ بجے کھانا کھاتا ہوں لیکن بہتر ہے کہ تم سات بجے تک آجاؤ۔ کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔'' رابرٹ نے کہا۔

نہ جانے کیوں میں رابرٹ کی دعوت مسترد نہ کرسکا اور دوسرے دن میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی جانب اٹھ گئے۔ شاید کھانے کے لالچ نے میرے خوف پر قابو پالیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے تسلیم کیا کہ واقعی یہ ایک لاجواب دعوت تھی۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد رابرٹ

کے بعد بتاؤں گا کہ اس کہانی کو سنانے کے لیے میں نے تمہارا انتخاب کیوں کیا۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے یا مجھ پر کوئی سحر طاری تھا۔ رابرٹ نے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور میری خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔ ''آج سے ٹھیک ایک سو تیس سال قبل میں پیدا ہوا۔ عمر عزیز کے ساٹھ سال تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ چالیس سال کی عمر میں، میں نے شادی کرلی۔ ہماری شادی بے حد کامیاب رہی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں کو ہی بچے پسند نہیں تھے۔ ہم دونوں دنیا کے جھمیلوں سے آزاد تھے لہٰذا خوب سیر و تفریح رہتی۔ اس دوران مجھے اپنے شوق کی تکمیل بھی مقصود ہوتی۔ میرا شوق کتابیں جمع کرنا ہے مگر کسی خاص موضوع پر نہیں۔ میرا معیارِ انتخاب صرف عجیب و غریب، خوفناک اور ہولناک قسم کی تصویریں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کی جلد کسی جانور کی کھال یا کسی درخت کی چھال وغیرہ کی ہو تو وہ بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ سولہویں صدی میں چمڑے کی جلد کی بنی ہوئی کتابیں کافی تعداد میں نظر آنے لگی تھیں جو رفتہ رفتہ ناپید ہوگئیں۔ یہ جلدیں بے انتہا خوب صورت اور بعض بھی خوفناک نقش و نگار سے مزین ہوتی تھیں۔ مجھے جو کتاب ملی، وہ بھی ایسی ہی ایک نادر چیز تھی۔ اس کے گرد پوش پر کسی جانور کی انتہائی باریک کھال منڈھی ہوئی تھی۔ یہ کتاب 1519ء میں شائع ہوئی اور اس پر کوئی نام یا عنوان نہیں تھا۔ اندرونی اوراق میں 'ایک ساحرہ کی کارگزاری' لکھا ہوا نظر آیا۔ مزید تشریح کے طور پر تحریر تھا۔۔۔ 'سفید اور کالے جادو کے واقعات، جن کو پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔' میرا اگرچہ ان فضول باتوں پر اعتقاد نہیں تھا لیکن پھر بھی میں پڑھتا چلا گیا۔ یوں تو بہت سی باتیں دلچسپی اور خوف سے بھرپور تھیں لیکن آگے چل کر جو صفحہ میرے ہاتھ لگا اس کی تحریر نہایت دلکش تھی۔ 'دورِ شباب یقینی طور پر واپس۔ وہ لوگ جو باہر ہیں طب بھی نہ پاسکے۔ کھوئی ہوئی جوانی دوبارہ حاصل کیجیے۔' جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت میری عمر ساٹھ سال ہوچکی تھی اور ظاہر ہے مجھے اس نسخے میں بے پناہ کشش محسوس ہوئی۔ میرے اعصاب تن گئے اور میں نے اس نسخے کو ازبر کرلیا۔ وہ فارمولا مجھے آج بھی یاد ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں گا نہیں۔'' وہ میری طرف دیکھ کر

''کافی دیر گزر چکی ہے۔ میرے خیال میں کافی کا ایک اور دور ہوجائے۔'' وہ جلدی کافی بنا کر لے آیا۔ شاید وہ ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کا عادی تھا۔ ''اور اب جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، اسے سن کر شاید تمہیں میرے دماغ کے خلل کا شبہ ہونے لگے لیکن میری گزارش ہے کہ خاموشی اور توجہ سے میری بات سنتے رہو۔ اس فارمولے کو تیار کرنے میں مجھے چھ ماہ لگ گئے۔ کئی اجزا اور ادویات منگوانی پڑیں اور ان کا تناسب بنانے میں بھی کافی عرق ریزی کرنی پڑی۔ کشید کیا ہوا یہ عرق صرف بارہ اونس تھا۔ رات کو سوتے وقت میں نے پورا گلاس نوش کرلیا۔ میں نے اپنی بیوی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن یہ میری سنگین کوتاہی تھی جس کا خمیازہ مجھے برسوں بھگتنا پڑا۔ دوا نے میرے حلق میں ایک تیز جلن پیدا کردی اور پیٹ کے اندر جا کر بھی خوب طوفان مچایا۔ یوں لگ رہا تھا گویا آنتیں بار بار کٹ رہی ہوں۔ میں درد کی شدت سے بے حال ہو رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد یہ قیامت خیزی گزر گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد مجھے گہری نیند آگئی۔ دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی کہ میرے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جوانی اور شباب کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا اور میری شکل پر وہی نحوست برس رہی تھی جو گزشتہ کئی سالوں سے چلی آرہی تھی۔ میں نے اپنی ضعیف الاعتقادی پر ہزار بار لعنت بھیجی اور جادوگروں اور نیم حکیموں کو خوب برا بھلا کہا۔ دفتر جانے کے لیے غسل کیا اور دوسرا سوٹ پہن لیا۔ جلدی میں ضروری کاغذات پہلے والے سوٹ میں ہی رہ گئے۔ میں عموماً ٹیکسی میں دفتر جایا کرتا ہوں لیکن اس روز ہوا اس قدر خوشگوار اور چل رہی تھی کہ میں نے پیدل ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں چند ہی قدم گیا تھا کہ مجھے شدید چکر آگیا اور میں سڑک پر گر پڑا۔

''اب میں ان واقعات کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں جو میری بے ہوشی کے دوران پیش آئے۔ خیال رہے کہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں، وہ صرف میرے زورِ تخیل کا نتیجہ ہیں۔ مجھے فوراً سینٹ جارج اسپتال لے جایا گیا۔ شناختی کاغذات موجود نہ ہونے کی صورت میں اسپتال والوں نے پولیس کو اطلاع دے دی اور پولیس کا ایک سپاہی میری حفاظت پر مامور کردیا گیا۔ یہ تین بجے رات کا وقت تھا۔ نرس اپنے معمول کے راؤنڈ پر تھی کہ اچانک ایک عجیب

نے تیزی سے میرے بستر کا رخ کیا اور دیکھا کہ کپڑوں کے اندر پھنسا ہوا کوئی ننھا سا جسم ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ وہ چیخ کہیں سے برآمد ہوئی تھی جسے سن کر وہ دم بخود رہ گئی۔ نرس نے تیزی سے تمام کپڑے ہٹائے اور ایک نوزائیدہ بچے کو برآمد کرلیا۔ اس بستر پر جو عمر رسیدہ شخص پہلے سے موجود تھا وہ اب غائب تھا۔ دراصل یہ بچہ وہی بوڑھا آدمی تھا جو شباب حاصل کرنے کی حرص میں دوبارہ بچہ بن گیا تھا۔

''آگے کے حالات کا تم خود بھی اندازہ لگا سکتے ہو۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ اخبار والوں نے عجیب و غریب کہانیاں گھڑیں اور عوام میں تجسس کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن یہ راز کوئی نہ جان سکا کہ اس بستر پر جو بوڑھا لایا گیا تھا، وہ کہاں چلا گیا اور یہ نوزائیدہ بچہ کہاں سے نازل ہو گیا۔ حقیقت میرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ واقعی عام زندگی میں ایسا ہونا ممکن نہیں، مگر یہ تجربہ ہو چکا تھا۔

''کئی دن تک اسپتال میں ایک حشر کا سا منظر برپا رہا... لیکن آہستہ آہستہ لوگ اس واقعے کو فراموش کرتے چلے گئے۔ اب ذرا اس بات پر بھی غور کرو کہ اس دوران میری بیوی پر کیا گزری ہوگی۔ خوف، دہشت، امید اور ناامیدی کی کیفیت نے اس کے رات دن کا چین و سکون چھین لیا تھا لیکن اس کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان حالات میں بھی اس کے ہوش و حواس قائم رہے اور اس نے مختلف اقدامات کے ذریعے پولیس اور عدالت میں ثابت کر دیا کہ وہی گم شدہ شخص اس کا شوہر تھا جو شاید اس دنیا کو چھوڑ گیا تھا۔ دوسرا اہم قدم جو اس نے اٹھایا وہ یہ تھا کہ فوراً اس نامعلوم اور نوزائیدہ بچے کو گود لے لیا اور اپنے شوہر کے نام پر اس کا نام رابرٹ اسمتھ جونیئر رکھ دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ بچہ اپنے بارے میں کچھ جانتا تھا؟ کیا اسے معلوم تھا کہ وہ کون ہے اور رابرٹ اسمتھ سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ نہیں ۔۔۔ لڑکے کو یقیناً کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ رابرٹ اسمتھ کو ان باتوں کا احساس اس وقت ہونا شروع ہوا جب وہ چودہ سال کی عمر کو پہنچا اور سولہ سال کی عمر میں حافظے کی بازیابی مکمل ہو چکی تھی۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کا ایک ایک لمحہ یاد آ گیا۔''

رابرٹ اسمتھ نے دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں مزید بتایا۔ ''میری بیوی جسے اب میں ''ممی'' کہنے لگا تھا نے دوسری شادی نہیں کی۔ عدالت کے ذریعے اس نے میرے واجبات وصول کر لیے۔ میری انشورنس کی خطیر رقم

شعار شخص تھا اور میں نے کافی رقم پس انداز کر رکھی تھی۔ میری یہ دور اندیشی رابرٹ اسمتھ جونیئر کے لیے کافی مفید ثابت ہوئی۔ اب وہ ایک امیر آدمی تھا اور اسے ہر طرح کی سہولت حاصل تھی۔

''جب میری عمر چالیس سال ہوئی تو میری ''ماں'' کا انتقال ہو گیا۔ وہ میرے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئی تھی کہ میں تمام عمر عیش و آرام کے ساتھ گزار سکتا تھا اور ۔۔۔۔ میرے عزیز دوست اب میں تمہیں یہ کہانی سنانے کا اصل مقصد بیان کرتا ہوں۔ میرے خیال میں زندگی کا اصل لطف ساٹھ سال کی عمر تک ہی محدود ہے۔ چنانچہ چند ماہ قبل میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے تجدید شباب کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ میں نے تمام دوائیں منگوا کر ان کا عرق کشید کر لیا ہے اور اب میں عمل کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھا ہوں۔ ان دنوں ذرا اس مسئلے پر غور و فکر کر رہا ہوں کہ پچھلی بار جب میں نے یہ دوا استعمال کی تھی تو اپنے مستقبل کا تحفظ نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے نہایت مشکل ۔۔۔ زندگی گزارنی پڑی۔ اب میں وہی غلطی دہرانا نہیں چاہتا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی ایمان دار اور راست باز انسان کو تلاش کروں۔ وہ ایمان دار شخص میری تمام دولت رابرٹ اسمتھ دی تھرڈ کے نام پر کسی بینک میں جمع کرا دے اور اٹھارہ سال کی عمر تک میری سرپرستی کی ذمے داری برداشت کرے۔ سن بلوغت کو پہنچتے ہی وہ سب کچھ میرے حوالے کر کے الگ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس راست باز انسان کو تلاش کرنے کے لیے میں نے ایک حکمت عملی تیار کی۔ اسی حکمت عملی کے تحت تمہیں وہ پرس ملا اور مجھے وہ عظیم شخص مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔''

''مسٹر رابرٹ! کیا تم خود اعتمادی کے نشے میں غلط انتخاب تو نہیں کر گئے؟'' ایک طویل اور دلچسپ کہانی سننے کے بعد میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

رابرٹ نے میری جانب یوں بے چارگی سے دیکھا گویا میری عقل پر ماتم کر رہا ہو۔ ''تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ بٹوے والی رقم تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن ایک خطیر رقم کے لیے کسی کے بھی دل میں بے ایمانی آسکتی ہے۔'' مجھے اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر وہ پھر بول اٹھا۔ ''تمہارا خیال کافی حد تک درست ہے لیکن دنیا میں کچھ ایسے اصول پرست اور ایمان دار لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں دنیا کی تمام دولت بھی نہیں خرید سکتی ۔۔۔۔ اور مسٹر گورڈن! میں بلا جھجک



میں ۔۔۔ ایک ہیں۔'' اس نے بے حد احترام سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''ایک سو تین سالہ زندگی اور تجربے کی بنیاد پر میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں دل سے پسند کرلیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ زندگی بھر ہم دونوں اچھے دوست بن کر رہیں۔'' میں خوش ہوا اور ابھی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ رابرٹ نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے بچے ہیں؟''

میں خوش دلی سے مسکرایا۔ ''تین چار دنوں میں ہمارے پہلے بچے کی آمد آمد ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں جلد گھر جانے کے لیے بے چین ہوں۔''

''اوہ۔ یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے۔'' رابرٹ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ''گویا اب مجھے تیسری بار پیدا ہونے کے لیے جلدی کرنی پڑے گی۔'' گویا اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس بار ہمارے یہاں پیدا ہوگا۔ ''اب وہ بچے، یعنی کہ وہ بھائی یا وہ بھائی بہن ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوں گے۔ میں عاجزی کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنا بیٹا بنالو۔ میں تمہیں اچھا خاصا معاوضہ دوں گا۔''

میرا دماغ کھولنے لگا۔ معاوضے کی بات کر کے گویا اس نے میرے خلوص اور دوستی کے جذبے کی توہین کی تھی۔ غصے کی شدت سے میرا حلق خشک ہونے لگا اور میں صرف تھوک نگل کر رہ گیا۔

رابرٹ میرے جذبات سے بے خبر اپنی کہے جارہا تھا۔ ''اب تمہیں اگلے مرحلے کے بارے میں سمجھاتا ہوں۔ تم بحیثیت ایک دوست کے مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے اور وہیں قیام کرنے کی پیشکش کرو گے۔ رات کو میں وہ شباب آور دوا استعمال کرلوں گا اور اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں میری تیسری زندگی شروع ہو جائے گی۔ تم اپنی بیوی کو تمام بات بتا کر اس سے اجازت لے لو۔ اگلی زندگی میں وہ میری ماں ہوگی اور میرے لیے قابل احترام بھی۔ میری پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے جو رقم تم مناسب سمجھتے ہو وہ تم تمہیں فی الفور ادا کردوں گا، اس کے ساتھ پچاس ہزار پاؤنڈ تمہارا انعام۔ تمہارے بچے کے تمام اخراجات بھی میرے ذمے۔ جب میری عمر اٹھارہ سال ہو جائے گی تو تم میری تمام دولت میرے حوالے کردو گے اور خود علیحدہ ہو جاؤ گے۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولنی چاہی لیکن رابرٹ نے فوراً ہی میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ابھی تم گھر جاؤ اور اپنی بیوی سے مشورہ کرلو۔ کل صبح فون کرکے اس

میں خاموشی سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔ بیوی میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میں نے جب اسے رابرٹ کی داستان سنائی اور اس کی خواہش سے آگاہ کیا تو میری امید کے برعکس، وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر تالیاں بجانے لگی۔ یقیناً وہ یہ تجربہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی کہ اچھا بھلا ساٹھ سالہ بوڑھا کیسے دوبارہ بچہ بن جاتا ہے۔ اس نے فوراً مجھے رابرٹ کی پیشکش منظور کر لینے پر مجبور کردیا اور خوشی سے بے قابو انداز میں بولی۔

''ڈارلنگ ہمارے بیٹے ڈیوڈ کو بھی ایک ساتھی مل جائے گا اور دونوں کو تنہائی محسوس نہیں ہوگی۔'' گویا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ ایک بیٹے کی ماں بننے جارہی ہے اور اس نے نام بھی طے کرلیا تھا۔ ''ہماری مالی مشکلات بھی ختم ہو جائیں گی۔''

رقم کا معاملہ میرے لیے بھی پرکشش تھا۔ میں نے صبح ہوتے ہی رابرٹ کو اثبات میں جواب دے دیا اور شام کو اسے اپنے ہمراہ گھر لے آیا۔ رات کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا اور پھر رابرٹ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تیسرے دن سہ پہر چار بجے وہ معجزہ رونما ہو گیا اور ٹھیک دو گھنٹے بعد ہمارا فرزند ارجمند ڈیوڈ بھی آن دھمکا۔ دونوں واقعی جڑواں بھائی لگتے تھے۔ ہر چیز میں اس قدر مماثلت تھی کہ میں تو کیا ۔۔۔ ان کی ماں بھی ان کی پہچان میں غلطی کر جاتی تھی۔

اسی مشابہت اور مماثلت نے میرا سارا منصوبہ چوپٹ کر کے رکھ دیا۔ سوچ بچار میں وقت گزرتا چلا گیا اور میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ میرا اپنا بیٹا کون ہے اور پرایا کون۔ آج میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ رابرٹ کا قصہ پاک کر کے اس کی تمام دولت اپنے قبضے میں کرلوں گا۔ رابرٹ اسمتھ نے اپنی ایک سو تین سالہ زندگی میں جو تجربہ حاصل کیا تھا وہ یقیناً اچھا خاصا ہوگا لیکن وہ مجھے پہچاننے میں غلطی کر گیا۔

میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ کہیں غلطی سے اپنے ہی بیٹے کو ہلاک نہ کر ڈالوں کہ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ''جب رابرٹ سولہ سال کی عمر کو پہنچے گا تب اس کی یادداشت بھی واپس آجائے گی اور میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ سب سے پہلے تو میں زبردستی اس سے وہ شباب آور نسخہ حاصل کروں گا اور پھر سوچوں گا کہ اب کیا کرنا چاہیے کیونکہ تجدید شباب میرا بھی حق ہے۔''

رنگ آسماں

اے آر راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار۔۔۔ جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا۔۔۔ لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن۔۔۔ عشق تو پھر عشق ہوتا ہے۔۔۔ کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے۔۔۔ اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ۔۔۔ وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود۔۔۔ خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی سچائیوں کے بھرپور
اثر اشاروں میں ابھرتی دلچسپ داستان





گزشتہ افسانے کا خلاصہ

[illegible]

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ناگرہ کے آسمان پر جنگ کے سیاہ بادل مزید گہرے ہونے لگے تھے۔

راجا پرتاپ کمار کے خط کا جواب ابھی تک نہیں پہنچا تھا لیکن ریاست ترچپال پور سے نواب شہباز خان کا خط ضرور آگیا جسے فوراً راجا پرتاپ کمار کو پیش کر دیا گیا۔ وہ اس خط کے مضمون اور نواب شہباز کی باتوں سے پورے طور پر

راجا پرتاپ کمار نے فوراً یہ خط اپنے مشیر سترام داس کو دکھایا اور مشورہ طلب کیا۔

"سترام داس اس خط کو غور سے پڑھو۔۔۔ کیا یہ ہمارے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتا؟ ہمیں اس کا کیا جواب دینا چاہیے ترچپال کے نواب صاحب کو۔۔۔؟"

سترام داس نے ایک نظر راجا پرتاپ پر ڈالی اور اس نے فوراً ہی راجا کے چہرے سے حیرت، بیک وقت اطمینان اور جوش کی سی کیفیات تاڑ لیں۔ اس نے وہ خط غور سے پڑھا اور بولا۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترچپال پور کے نواب کا خط آپ کے خیالات اور ان خدشات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے، جب اس فرنگی ٹولے کی یہاں آپ سے ایک اہم نشست کے سلسلے میں آمد ہوئی تھی۔ آپ کے چہرے کی طمانیت بتاتی ہے کہ آپ خود بھی یہی چاہتے تھے کہ کوئی ثالث کی تینوں ریاستیں متحد ہو کر فرنگیوں کی کسی بھی جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ دوسری جانب آپ کے چہرے کا جوش یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ اس کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار بھی ہیں۔" اتنا کہہ کر سترام داس کچھ سوچتے ہوئے انداز میں ذرا چپ ہو رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی اس نے مطلب کی بات کہنی ہے۔

راجا پرتاپ کمار اپنے کھاگ مشیر کی بات پر مسکرایا تھا۔ بولا۔

"ہمیں خوشی ہے کہ ترچپال اور پالن پور کی ریاستیں بھی فرنگیوں کے ان غاصبانہ عزائم سے واقف ہیں۔ تو کیا ہمیں اب نواب شہباز خان کو اپنے مثبت جواب سے ترنت آگاہ کر دینا چاہیے؟"

"جی ہاں!" سترام داس نے کہا۔ "لیکن۔۔۔ ایک شرط کے ساتھ۔۔۔"

"کیسی۔۔۔ شرط۔۔۔؟" راجا پرتاپ۔۔۔ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"نواب۔۔۔ شہباز اور۔۔۔ مہاراجا مہندر سنگھ کو پابند کرنا ہوگا کہ وہ اپنی افواج مع بڑے اسلحے (توپیں وغیرہ) کے ناگرہ بھیجیں کیونکہ ہماری ریاست کی حدود ان کی داخلی سمتوں پر جڑتی ہیں۔ اس لیے فرنگیوں کی جنگی جارحیت کا سب سے پہلے ہمیں سامنا کرنا پڑے گا۔ دوسری ضرورت ہوگی کہ ان متحدہ افواج کے سپہ سالار درجۂ اول میں ہمارے لوگ ہوں، باقی دوم ان کا، کیونکہ جغرافیائی اہمیت اور

دونوں ریاستوں کے جوابات سے ترنت آگاہ کیا جائے۔ بہ صورت دیگر ہم اپنی حکمت عملی ترتیب دینے میں حق بجانب ہوں گے، جو فرنگیوں کے ساتھ جنگ اور صلح دونوں صورتوں میں ہو سکتی ہے۔"

راجا پرتاپ کمار اپنے مشیر کی بات پر اش اش کر اٹھا۔ اس نے فوراً اپنا جوابی پیغام نواب شہباز خان کو بھجوا دیا جس میں نواب شہباز اور مہاراجا مہندر سنگھ، دونوں سے مثبت جواب طلب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دیوان خاص کا رخ کیا۔ وہاں جا کر وہ ایک آرام دہ نشست پر آنکھیں موند کے بیٹھ گیا اور رینا کے متعلق سوچنے لگا۔

اسے ایک طرف جہاں رینا سے مل کر خوشی ہوئی تھی، وہیں اب وہ متفکر بھی نظر آنے لگا تھا۔ رینا اور اس کے ساتھیوں کو وہ دوبارہ راج محل لانے کے محرکات و اسباب پر غور کر رہا تھا۔

جب وہ رینا سے ملا تھا تو اس کا دل بے اختیار اسے راج محل لے آنے کو مچل رہا تھا لیکن پھر یہاں حالات کو دیکھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ جب وہ اس معاملے میں خود کو زیادہ بے بس اور بے قرار محسوس کرتا تو اس کے دل و دماغ میں روایتی راجاؤں جیسی ہٹ دھرمی عود کر آنے لگتی کہ وہ ریاست کا ایک مطلق العنان راجا ہے۔ کون تھا جو اس کے آگے بولنے کی جرأت کرتا لیکن اب تو۔۔۔ ایک گمبھیر مسئلہ اور بھی آن کھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف رینا نے خود راج محل آنے سے انکار کر دیا تھا تو دوسری طرف ریاست پر فرنگیوں کی طرف سے ممکنہ یلغار کا بھی خطرہ موجود تھا۔

اس یلغار کا راجا پرتاپ کو اسی وقت یقین ہو گیا تھا جب راج محل سے جنرل مانکل شا نے اپنے حسین فوجی بھی واپس بلا لیے تھے۔ اب کوئی فرنگی راج محل میں تو کیا ریاست ناگرہ میں بھی موجود نہ تھا۔ حالانکہ جہنم واصل لیفٹیننٹ بروجر کا نائب جان پارکر، رادھا اور شاہ زمان کے پیچھے لگا ہوا تھا مگر جنرل شا کا حکم نامہ ملتے ہی وہ اپنے ساتھیوں سمیت راج محل اور ریاست ناگرہ سے کوچ کر گیا تھا۔

یوں راجا پرتاپ کمار کو دو محاذوں کا سامنا تھا۔ ایک میدانِ جنگ تھا تو دوسرا رامِ الفت۔۔۔ اس نے دونوں راستوں پر ہی قدم رکھ دیا تھا۔

اس نیلی آنکھوں والی معصوم اور حسین صورت فرنگن دوشیزہ رینا کے متعلق سوچتے سوچتے اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

اس نے اپنی دونوں بہن بھائی
کے رویے سے یہ بات صاف محسوس کی تھی کہ وہ ... اس کی
تائید وحمایت میں پیش پیش تھے۔ اس نے فوراً ایک ترکیب
سوچی اور اپنے ایک رازدار ملازم کو اچھی طرح سمجھا کر
راکاشی وادی کی طرف روانہ کردیا۔ یہ ملازم دو گھوڑوں کی
"ڈاک گاڑی" میں سوار تھا جس کے پیچھے ایک اضافی
گھوڑا بندھا ہوا دوڑ رہا تھا۔

اس ملازم کو یہ ڈاک گاڑی ریتا کے پاس چھوڑ کر اور دونوں بہن بھائی کو ایک پیغام دے کر اضافی گھوڑے پر واپس لوٹ آنا تھا۔ موسم کو دیکھتے ہوئے راجا پرتاب نے ریتا، اس کے ساتھیوں کے لیے کچھ گرم کپڑے بھی ڈاک گاڑی میں رکھوا دیے تھے۔

یہ ملازم راکاشی بستی پہنچا اور بستی والوں نے (ریتا کے خطاب کے بعد راکاشی والوں نے اب خود کو دنیا کی نظروں سے چھپانا چھوڑ دیا تھا اور معذوری کے باوجود اب عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے لگے تھے) اسے ریتا کے جھونپڑے تک پہنچا دیا۔

اس وقت دور برف پوش چوٹیوں پر شام کی سرمئی ملگجاہٹ اترنے لگی تھی اور دھند بڑھتی ہوئی پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔

اس قاصد نما ملازم نے ریتا سے ملاقات کی پھر اس نے رابرٹ اور گارشیا کو راجا پرتاب کا پیغام دیا کہ جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہو وہ اس ڈاک گاڑی میں راج محل آسکتے ہیں، ان پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ کہہ کر وہ لوٹ گیا۔

رابرٹ اور گارشیا نے ایک بار پھر ریتا کو گھیر لیا۔ شوکی بھی وہیں تھا۔ وہ بھی اب رابرٹ کے مستقل ناصحانہ رویے پر ضدی اور ڈھیٹ ہوگیا تھا۔ بے شک وہ ریتا کی وجہ سے تھوڑا بہت خیال کرلیتا تھا لیکن اب وہ رابرٹ کی کسی بھی الٹی سیدھی بات پر چپ نہیں رہتا تھا۔

جیسے ہی اس گھڑسوار قاصد نے واپسی کی راہ پکڑی، اس نے ان دونوں بہن بھائی کے چہروں سے ہویدا ہوتی بے چینی کو فوراً بھانپ لیا۔ اس نے ان دونوں کو بار بار تیز اور دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے پایا تھا۔ ریتا سوچ میں کھو گئی۔ رابرٹ اور گارشیا شاید تنہائی چاہتے تھے۔ مطلب، شوکی باہر چلا جائے... جب ان کی دال نہیں گلی تو اچانک رابرٹ نے ریتا کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔

تم بھی آجاؤ۔"

"نہیں ... میرا دل نہیں چاہ رہا باہر جانے کو ... باہر ٹھنڈ بھی پڑ رہی ہے۔" ریتا نے کھینچتے ہوئے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ شوکی نے کن انکھیوں سے گارشیا کو رابرٹ کی طرف دیکھتے پایا۔ اس نے بھائی کو کوئی مخصوص اشارہ کیا تھا۔

رابرٹ نے کچھ نہیں کہا تب ہی گارشیا شوکی کی طرف متوجہ ہوئی اور نہایت لگاوٹ بھرے لہجے میں بولی۔

"شوکی پلیز ... میرے ساتھ ذرا باہر چلو، مجھے نجانے کیوں یہاں گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔" اب تو شوکی کو ان کی چالبازی کا یقین ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر ان دونوں بہن بھائی نے اسے کیا بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔

"اپنے بھائی کو لے جاؤ، مس ریتا کا کہنا درست ہے۔ باہر سردی پڑ رہی ہے اور مجھے بالکل خوشگوار محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے دیکھا کہ گارشیا کا منہ بن گیا مگر رابرٹ کا تو غصے سے چہرہ ہی سرخ ہوگیا۔ وہ ایک دم جارحانہ انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے سخت لہجے میں اس سے بولا۔

"یہ تمہاری ڈیوٹی ہے، جاؤ میری سسٹر کو ذرا باہر لے جاؤ۔"

"میری ڈیوٹی صرف مس ریتا کے حکم کی پابند ہے۔" شوکی نے اس بار ریتا کی ہدایت کے مطابق کوئی تکرار یا تلخی دکھائے بغیر آرام سے جواب دیا تھا اگرچہ یہ بھی لاجواب کر دینے والا ہی ایک انداز تھا۔

ایسے میں گارشیا نے فوراً مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مداخلت کی اور ریتا سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

"پلیز ... ریتا سسٹر! شوکی سے کہہ دو نا میں بھائی کو ضرور لے جاتی مگر اسے ٹھنڈ سے الرجی ہو جاتی ہے دمہ ہونے لگتا ہے بے چارے کو ... شاید یہاں کے جنگلاتی اور نباتاتی ماحول کا اثر ہے۔"

"لیکن ... ابھی تو تھوڑی دیر پہلے مسٹر رابرٹ مس ریتا کے ساتھ باہر جانے پر بضد تھے؟"

شوکی استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اوہو ... شوکی! تم تو بلاوجہ بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتے ہو۔" گارشیا زچ ہو کر بولی۔

"برادر رابرٹ تو ... ریتا کو اکیلا اور اداس سا دیکھ کر ایسا کہہ رہے تھے۔"

چلو بابا! گارشیا کا یہ داؤ ٹھیک بیٹھا کیونکہ اگلے ہی

بغیر پاس بیٹھے شوکی کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی اور بہت دھیرے سے بولی۔

"کیا واقعی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ... تو میں چلی جاتی ہوں۔"

شوکی نے دانت بھینچ لیے۔ ناچار کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں، میں ہی چلا جاتا ہوں، ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے ......" پھر وہ بیزاری اور کچھ ناگواری نظروں سے گارشیا کی طرف دیکھ کر دانت پیسنے کے انداز میں بولا۔

"چلو ...!"

گارشیا کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ تھی۔ شوکی سر جھٹکتا ہوا جھونپڑے سے باہر آگیا۔

باہر واقعی سردی تھی۔ راج محل سے بھیجے گئے گرم کپڑے کام آ رہے تھے۔ گارشیا نے سمور کا لیدر کوٹ، مفلر اور لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ شوکی نے بھی لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ گارشیا سے کئی قدم پیچھے تھا۔

"کہاں مرنا ہے تم نے ..." بالآخر شوکی نے چڑ کر اس سے پوچھا۔ گارشیا اسے لوٹ کر دیکھتی تھی، برا منائے بغیر عجیب مسکان سے ترکی بہ ترکی بولی۔

"تمہاری بانہوں میں ..."

"زیادہ رومینٹک ہونے کی ضرورت نہیں ..." شوکی نے رکھائی سے کہا۔

"بتاؤ مجھے کہاں جانا ہے؟"

"اس طرف ..." گارشیا نے اس کے قریب آکر بڑے لبھانے والے انداز میں ایک پہاڑی پتھر کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو مرو ادھر بھی ... اور سنو ... مجھ سے ذرا فاصلے پر ہی رہنا۔ آج کل میں بہت غصے میں ہوں۔" شوکی نے اکتا کر کہا اور پہاڑی پتھر کی طرف چل پڑا۔

گارشیا اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس پہاڑی پتھر کے عقب میں جنگل نظر آتا تھا، جہاں سرشام ہی رات کے اندھیاروں کا گمان ہوتا تھا۔

شوکی اس بڑے سے پہاڑی پتھر کے پاس آکر رک گیا۔ اچانک وہ بدکا۔ کسی نے پیچھے سے اس کی کمر کے گرد اپنی مرمریں بانہیں حمائل کردی تھیں۔ وہ مڑا تو گارشیا اس سے والہانہ انداز میں لپٹی جارہی تھی۔

"کیوں اتنی نفرت کرتے ہو مجھ سے تم؟ میں تم سے

کرو مجھے۔ بے شک شادی نہ کرو مجھ سے مگر میرے قریب تو رہا کرو۔ شاید میں بھی تمہارا دل جیتنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

گارشیا کی اس حرکت پر شوکی کو غصہ تو بے حد آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اس کی بانہوں کا حصار بڑی بے دردی سے توڑا اور اسے تھوڑا خود سے پرے دھکا دے دیا۔ گارشیا چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گئی۔

"گارشیا! میں نے تمہیں وارن کیا تھا کہ میرے قریب مت آنا۔ میں تم سے نفرت نہیں کرتا مگر محبت بھی مجھے تم سے کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی۔" شوکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اب تک میں نہیں بولا تھا مگر اب تمہاری اور تمہارے اس مغرور بھائی کی حرکتوں کی وجہ سے کھلے عام اعتراف کرتا ہوں کہ ... ہاں ... مجھے صرف اور صرف ... ریتا سے محبت ہے اور وہی میری پہلی اور آخری محبت ہے، سمجھیں تم ...؟ اب تمہارے اندر ذرا بھی غیرت اور شرم ہوگی نا ... تو تم میرا پیچھا چھوڑ دوگی۔"

شوکی کے منہ سے آج پہلی بار یہ اعتراف سن کر گارشیا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ شوکی کے یہ جملے گارشیا کے لیے واقعی "فیصلہ کن" ثابت ہوئے۔ اس کا تھوڑی دیر پہلے مسکراتا ہوا حسین چہرہ اب ایک زخمی ناگن کی صورت میں نظر آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بے شک بھیگی ہوئی تھیں مگر اب ان میں جیسے خون سا رستا محسوس ہونے لگا تھا۔ چہرہ بھی اسی رنگ میں نظر آنے لگا تھا۔ تب ہی وہ اسی انداز و لہجے میں شوکی سے بولی۔

"شوکت ... اگر یہ بات ہے تو سن لو ... میں بھی تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ تم نے مجھ پر ریتا کو ترجیح دی ہے نا ... تو ٹھیک ہے پھر ... میں بھی جب تک زندہ ہوں، ریتا کو تم بھی حاصل نہیں کرسکو گے۔"

یہ تہدید کرنے کے بعد وہ غصے اور طیش سے پاؤں پٹختی ہوئی واپس جھونپڑے کی طرف لوٹ گئی۔

شوکی چند ثانیے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر وہ بھی جھونپڑے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

امیہ اور شاہ زمان سخت بے چینی کا شکار تھے، اس کا سبب علی ریحان تھا۔ وہ ان کی واپسی یا اس کی طرف سے کسی خیریت کی اطلاع کے بغیر ہی گھر سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔

"لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطلاع کیوں نہیں آئی؟"
اریبہ متفکر لہجے میں بولی۔ وہ اور شاہ زمان اس وقت اوپری منزل کے ایک کمرے میں باہر گلی کی طرف کھلنے والے جھروکے کے قریب فرشی نشستوں پر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ باہر سرد شام اتر رہی تھی۔ ماحول پر سکوت طاری تھا۔

نیچے بڑے سے صحن میں ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ شاہ زمان نے یہ گھوڑا راجا پرتاپ کمار سے خصوصی درخواست کے بعد ہی حاصل کیا تھا اور راجا پرتاپ کمار نے اپنے شاہی اصطبل خانے سے انسانی ہمدردی کے ناتے اسے گھوڑا دلوا دیا تھا۔

"اللہ کے حکم اور فضل سے علی یقیناً خیریت سے ہی ہوگا۔" شاہ زمان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ وہ — نہ صرف بالکل خیریت سے ہوگا بلکہ اپنے مشن میں بھی کامیاب رہا ہوگا۔"

"زمان — کیا ہم نے یہاں اتنا عرصہ رہتے ہوئے اپنا مشن پورا کرلیا ہے؟" اریبہ نے کسی قدر سوچ کر زمان سے پوچھا تو وہ اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"کیوں نہیں — تم نے اپنی جان کئی بار خطرات میں ڈال کر ہی اس مہم کو اب تک کامیابی سے ہمکنار کررکھا ہے۔ جس کے نتیجے میں علی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب کوچ کرسکا تو دوسری طرف لیفٹیننٹ بروجر کا خاتمہ ہوا۔ میں نے تو سنا ہے کہ راجا پرتاپ نے راج محل میں تعینات باقی فرنگیوں کو بھی نہ صرف بھگا دیا ہے بلکہ — اس نے گزشتہ دنوں آئے ہوئے فرنگیوں کے ایک بڑے ٹولے کو بھی خبردار کردیا ہے کہ وہ کوہ شالی کی طرف جارحیت کا اب سوچیں بھی نہیں۔"

"اوہ — کیا واقعی ایسا ہے؟ تمہیں کیسے پتا چلا؟" اریبہ نے یکدم خوش ہوکر کہا۔

"تم کیا سمجھتی ہو جان کہ راج محل سے نکلنے کے بعد میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں؟" شاہ زمان نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری ان کٹھن حالات میں قربانیوں کے نتائج کا تو پتا لگانا ہی تھا۔ نئے راجا (پرتاپ کمار) کی یہ اچھی عادت ہے کہ وہ ایسی باتوں کو صرف اپنے محل تک محدود نہیں رکھتا۔ عام لوگوں تک بھی اس کی رسائی ہوجاتی ہے۔ ادھر ادھر بازار آوارہ گردی کرتے ہوئے میں عام لوگوں

اریبہ کے حسین چہرے پر سکون سا پھیل گیا اور شاہ زمان اسے خوش اور مطمئن دیکھ کر مسکرا دیا۔

اچانک نیچے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز ابھری۔ دونوں چونک پڑے۔

"یہ کون ہے؟" اریبہ ایک دم زمان کی طرف دیکھ کر بولی اور وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر یک لخت اٹھا اور جھروکے سے ہوکر باہر کھلنے والے دریچے کی طرف بڑھا۔ نیچے جھانکا تو ایک گھڑسوار شخص کو دیکھا۔

"کون ہے؟" اریبہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر شاہ زمان نے وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے اسے دریچے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ بولا۔

"کوئی گھڑسوار ہے۔ شاید راج محل سے آیا ہے۔"

"اوہ — لیکن انہیں کیا معلوم کہ ہم یہاں ہیں؟" اریبہ نے پریشانی سے کہا۔

"یہی الجھن مجھے بھی ہے۔ تم ٹھہرو، میں نیچے جاکر پوچھتا ہوں۔" شاہ زمان نے کہا اور چلا گیا۔

نیچے آکر اس نے دروازہ کھولا اور غور سے گھڑسوار کی طرف دیکھا۔

"کون ہو بھائی؟ کس سے ملنا ہے؟" شاہ زمان نے پوچھا۔ باہر گلی میں سناٹا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ گھڑسوار نیچے اترا اور بغور شاہ زمان پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پوچھا۔

"یہ مکان شالی کا ہے؟"

شاہ زمان بری طرح چونکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے؟ شالی کے ذکر پر وہ پریشان سا ہوگیا تھا۔

"ہاں، یہ شالی کا ہی مکان ہے، مگر تم کون ہو —؟"

اچانک اریبہ کی آواز ابھری۔ وہ شاہ زمان کے عقب سے نمودار ہوئی تھی۔ ان دونوں کا یہی خیال تھا کہ کہیں یہ گھڑسوار شالی کا ہی کوئی رشتے دار نہ ہو۔

"تم شاید اریبہ ہو اور — یہ تمہارا ساتھی شاہ زمان ہے۔" گھڑسوار نے غور سے اریبہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو دونوں ہی بک بک سے رہ گئے۔

"مجھے اندر آنا چاہیے۔ میں تریپال پور سے آیا ہوں، تمہارے ساتھی علی ریحان کا ایک پیغام لے کر —" اس کے یہ بتانے کی دیر تھی کہ دونوں نے بے اختیار سکون کی سانس لی اور فوراً اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ پھر اسے لے

اوپر اس کے لیے گرما گرم قہوہ لے آئی۔

"شکریہ — میرا نام محمد شفیع ہے۔" قہوے کی چسکی لے کر اس نے کہا اور پھر ساری بات انہیں بتادی۔ اریبہ اور شاہ زمان یہ سن کر دم بخود سے رہ گئے۔ انہیں خوشی تھی کہ ان کی مہمات کامیابی سے ہمکنار ہورہی تھیں۔ تاہم شاہ زمان نے پوچھا۔

"لیکن تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ —"

"بہت آسانی سے —" محمد شفیع مسکرا کر بولا۔ "مجھے علی نے سب بتا رکھا تھا کہ میں کیسے اور کن حالات میں تم سے ملاقات کرسکتا ہوں۔ اس نے مجھے تمہارے حلیے وغیرہ سے بھی اچھی طرح آگاہ کردیا تھا۔ میں نواب شہباز خان کا خط لے کر ہی آیا تھا، وہیں مجھے پتا چلا کہ بھوت اور اس کی بیوی میتا کو راج محل سے رخصت کردیا گیا ہے۔ علی کو یقین تھا کہ تم دونوں شالی کے مکان کا ہی رخ کرو گے۔ میں یہاں کا پتا پوچھتے ہوئے پہنچ گیا۔"

محمد شفیع نے اپنی کتھا ختم کی اور قہوے کی پیالی بھی — پھر آخر میں بولا۔ "کوہ شالی پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے ہیں۔ علی نے تم دونوں کو فوراً تریپال پہنچنے کا کہا ہے۔ سب سے زیادہ جنگ کا خطرہ ناگرہ کو ہے، کیونکہ یہ ریاست، کوہ شالی کے دو بڑے داخلی راستوں پر ہے۔ اسی لیے جلدی یہاں سے نکل چلو — مجھے تمہیں ساتھ لانے کا ہی حکم ملا ہے۔"

وہ بات ختم کرکے خاموش ہوگیا۔ شاہ زمان اور اریبہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے تاہم یہی طے پایا کہ صبح تڑکے یہاں (ناگرہ) سے تینوں کوچ کرجائیں گے۔

اگلے دن اریبہ منہ اندھیرے ہی اٹھ گئی۔ وضو کرکے اس نے نماز فجر ادا کی اور مسافروں کی طرح ناشتا بنانے لگی۔ ساتھ ہی اس نے زاد راہ کے لیے بھی تھوڑا بہت اضافی بنالیا تھا۔

اس کے بعد اس نے شاہ زمان اور مہمان محمد شفیع کو بھی جگادیا۔ سب نے ناشتا کیا اور خاموشی سے اپنے گھوڑوں پر روانہ ہوگئے۔

محمد شفیع اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور شاہ زمان دوسرے گھوڑے پر تھا، جبکہ اریبہ اس کے پیچھے بیٹھی تھی۔

کوہ شالی کی حدود عبور کرتے ہی انہوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگادی۔

کہیں رکتے، کبھی چلتے کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ

نواب شہباز خان اور ان کا بیٹا اقبال خان بھی ان کے بے چینی سے منتظر تھے۔ بالخصوص نواب صاحب ان تینوں سے ہی متاثر تھے۔ اب جبکہ علی نے خاور حیات (شہید) کا مشن بھی اپنے ذمے لینے کی بھرپور حامی بھری تھی تو جب سے نواب صاحب اور بھی ان کے قدردان ہوگئے تھے۔

نواب صاحب اور ان کے بیٹے اقبال خان نے اریبہ اور شاہ زمان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ علی اور شاہ زمان تو ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ اریبہ نے سکون کی سانس لی تھی۔ وہ بھی بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ "علی بھائی" کہتے ہوئے اس کی جانب سلام کرنے بڑھی تھی۔ علی نے پیار سے "بہنا" کہہ کر اسے اپنے ساتھ لگایا تھا اور اس کے سر پر دست شفقت بھی پھیرا تھا۔ نواب صاحب نے بھی اسے بیٹی شفقت دی اور شاہ زمان بالخصوص اریبہ کو خراج تحسین بھی پیش کیا۔

علی اور شاہ زمان نے کھلے دل کے ساتھ اریبہ کی بہادری کی تعریف کی تھی۔ اس کی کتھا سننے کے بعد نواب صاحب بھی اس بہادر عورت سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے تھے۔

اسی دن ان کی آمد کی خوشی میں پری محل میں زبردست دعوت کا اہتمام ہوا اور غریبوں میں بھی کھانا تقسیم کیا گیا۔

علی نے چند دنوں میں ہی یہاں رہتے ہوئے محسوس کرلیا تھا کہ نواب شہباز خان بڑے سخی دل اور غریب نواز انسان تھے۔ ان کی ریاست میں ناگرہ کے مقابلے میں زیادہ خوش حالی تھی لیکن یہ حقیقت بھی علی کے علم میں آئی تھی، بلکہ اس کا تجربہ بھی ہوا تھا کہ — نواب صاحب اپنے چھوٹے بھائی سراج خان کی وجہ سے کچھ پریشان اور فکرمند رہتے تھے۔ وہ دل کے ہمدرد انسان تھے ورنہ جتنا ان کا اثرورسوخ تھا ریاست میں اگر وہ اپنی نوابوں والی روایتی حیثیت اور طاقت کا استعمال کرتے تو سراج خان جیسے بدطینت انسان کو بہت پہلے ہی ریاست سے کوچ کرنا پڑجاتا۔

وہ اس کی "حرکتوں" کو نظرانداز کیے ہوئے تھے لیکن علی ریحان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس پر بھی نواب صاحب کو بے حد غصہ آیا تھا۔ اس بار انہوں نے باہم صلح مشورے سے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کے ساتھ تادیب کرنے کا پختہ ارادہ کررکھا تھا لیکن موجودہ حالات کی پیچیدگی ہوئی تشویش ہواؤں کا رخ دیکھتے ہوئے نواب شہباز زراسوچ میں پڑگئے تھے۔ تاہم علی نے وا اتفاق

فرنگیوں کا بچھو بنا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ اندر ہو رہا تھا اس کی غداری کے مترادف ہوگا۔

کیونکہ یہ حقیقت دوسرے لوگوں تک خود سراج خان کی زبانی پہنچ چکی تھی کہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا اور قبائلی ریاستی امور میں وہ ان کی مداخلت بے جا کو جائز قرار دیتے ہوئے درون خانہ ان کے ہاتھوں کو مضبوط کر رہا تھا۔

نواب شہباز خان... بلاشبہ علی بریمان کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتے تھے اگر موجودہ گھمبیر مسئلہ اچانک نہ ابھرتا تو وہ بلا تاخیر سراج کے خلاف کارروائی کرتے تاہم انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بلا کر سختی سے تادیب کریں گے اور جہاں تک ممکن ہوا وہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔ تاہم انہوں نے فوری طور پر اپنے بھائی سراج خان کو اپنے علاقے تک محدود رہنے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔

ہوا یوں کھانا وغیرہ کھانے کے بعد قہوہ پی رہے تھے اور سر جوڑ کر آئندہ کی حکمت عملی پر غور کر رہے تھے۔ اس بار علی، شاہ زمان اور اریبہ کو بیک وقت دو اہم مہمات کا سامنا تھا۔ پہلی مہم خاور حیات شہید کی تھی جس کی موت کے بعد وہ ادھوری رہ گئی تھی۔ دوسری مہم فرنگیوں کی طرف سے متوقع حملے کا منہ توڑ جواب دینا تھا۔

"اس مہم کو میں نے سر کرنے کے لیے پہلے ہی بیڑا اٹھا رکھا ہے۔" علی نے پرعزم لہجے میں کہا تو شاہ زمان بولا۔

"علی! تم ایک بار وہی ابھر ہو تمہاری یہاں ضرورت زیادہ ہے۔ یہ پاک دھرتی اس جہاز کی تباہی میرے ذمے لگا دو... میں انشاء اللہ اس مہم کو بہت جلد کامیابی سے ہمکنار کر کے یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"مجھے کیوں نظر انداز کر دیا تم نے شاہ زمان؟" اریبہ نے شکوہ لہجے میں شاہ زمان کی طرف شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس خطرناک مہم میں اکیلے نہیں جاؤ گے، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

علی پریشان سا ہو گیا لیکن اسے شاہ زمان کی بات سے اختلاف بھی نہ تھا، وہ جنگی حکمت عملی کے تحت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا نہ صرف یہ بلکہ اس کی بات کو نواب شہباز اور اس کے بیٹے اقبال نے بھی درست قرار دیا تھا۔

علی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بالآخر یہی طے پایا کہ... شاہ زمان اور اریبہ ہی اس مہم کے لیے مناسب تھے کیونکہ انہوں نے راج محل والی مہم کو بھی بڑی جانفشانی اور

اس کے علاوہ... قاصد بھی بھیجا نے نواب شہباز کو آگرہ کے راجا پرتاب کمار کا بھی پیغام دے دیا تھا۔

یوں وقت کی نزاکت اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے تینوں ریاستوں کے والیان نے ایک دوسرے کے ساتھ پیغامات وغیرہ کی ترسیل کو ممکن بنانے کے لیے... مشترکہ طور پر قاصد گھڑ سواروں کا ایک تیز رفتار دستہ تیار کیا تھا۔ نیز اسی پالیسی کے تحت... جنگی مخبروں کا بھی ایک گروپ بنا کر دلی روانہ کر دیا گیا تھا، جو غاصب فرنگیوں کی جارحیت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ان کی طرف سے "گرین سگنل" ملتے ہی کوہ شمالی کی اتحادی افواج فوراً حرکت میں آ جاتیں۔ تاہم ابھی اپنے اپنے طور پر مذکورہ تینوں ریاستوں نے اپنی افواج کو جنگ کے لیے تیار کر رکھا تھا۔

تاہم دلی سے خبریں آنے لگی تھیں کہ فرنگی بڑی مکاری اور خاموشی کے ساتھ جنگی حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف ہے۔ البتہ ابھی تک کوئی حتمی صورت حال واضح نہیں ہو سکی تھی۔

اریبہ اور شاہ زمان اس نئی مہم کے لیے خاصے پرجوش نظر آ رہے تھے۔ شاہ زمان میں اب اریبہ کو کسی مہم سے روکنے کی جرأت نہیں تھی۔ اس کا جذبہ ہی ایسا ہو چلا تھا کہ اریبہ بھی اب ایسی مہمات سے پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔ علی اور زمان سے مسکرا کر صاف کہتی تھی کہ یہ ان کی صحبت کا ہی تو اثر ہے۔ وہ دونوں بے اختیار مسکرا کر رہ جاتے تھے۔



بہرکیف... اریبہ اور شاہ زمان دوسرے دن ہی مہم پر نکلنے کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ ضروری تیاری کے بعد شاہ زمان اور اریبہ دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہو کر بمبئی (ممبئی) روانہ ہو گئے۔ دونوں باپ بیٹے نواب شہباز خان اور اقبال خان نے اچھی طرح سے اس مہم کے بارے میں راہنمائی کر دی تھی۔

چنانچہ شاہ زمان اور اریبہ کو ان کے نئے مشن کی کامیابی و کامرانی کی ڈھیروں دعاؤں کے سائے تلے ترپال سے رخصت کر دیا گیا۔

ان دو دنوں میں بھی علی کو حویلی میں محسوس ہوتا رہا تھا کہ کوئی دو آنکھیں مسلسل اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ زمان اور اریبہ کی آمد پر وہ ان جاسوس آنکھوں کو عارضی طور پر فراموش کر بیٹھا تھا لیکن اس سہ پہر میں جب نواب شہباز اپنے بھائی سراج خان کی طرف اپنا ایک قاصد روانہ کرنے کا حکم دے رہے تھے تو علی کو کسی نہ کسی ریشمی چلمن سے وہی دو آنکھیں گھورتی محسوس ہوئی تھیں۔

بانکا ہوا وہ لوہار... آگے بڑھ کر اس کا کھوج لگانے کی کوشش ضرور کرتا۔

چنانچہ اب وہ اسی کوشش میں تھا۔ اریبہ اور شاہ زمان کی روانگی کے بعد اس نے یہی کرنا چاہا لیکن اب اسے وہ دو "جاسوس" آنکھیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ یہ دریافت کرنے کی کوشش کرے کہ گھر میں افراد خانہ کی "تعداد" وغیرہ کتنی ہے؟ چونکہ علی ان کے گھر کا فرد نہیں تھا اسی لیے... وہ نہیں پوچھ سکتا تھا، البتہ اقبال خان سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی مگر اس نے بھی ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ حتیٰ کہ اپنے متعلق بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ تھا یا نہیں۔ یا شاید یہ سب اس نے علی کو بتانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی لیکن علی نے اب تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پتا چلانے کی کوشش ضرور کرے گا۔

وہ ایک ملازم تھا۔ اس کا نام یوں تو شیخ خالد تھا مگر سب اسے چوہیاں کہتے تھے۔ وہ یہاں کے ایک جدی پشتی ملازم جوڑے کی اکلوتی اولاد تھا جو مر چکے تھے۔ چوہیاں... اسی حویلی میں پیدا ہوا تھا اور جب سے ادھر ہی تھا۔ اس کی عمر یہی چھتیس سال تھی، شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی بالو زنان خانے میں کام کرتی تھی۔

علی نے چوہیاں کے ساتھ خاصی گہری نبھائی تھی۔ اسی سے اس نے باتوں باتوں میں دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا حویلی میں کل چار مکین تھے۔ نواب صاحب، ان کی بیگم نائلہ، اقبال خان اور ان کی بیوی مہرو جس کا پورا نام مہر النساء تھا۔

البتہ مہر النساء کے سلسلے میں چوہیاں نے انکشاف ضرور کیا جو کم از کم علی کے لیے چونکا دینے والا ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ... مہرو درحقیقت نواب شہباز خان کے بھائی سراج خان کی بیٹی ہے۔

"غدار کی بیٹی نواب صاحب کے گھر میں...!" علی نے دل میں سوچا اور پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ "تو کیا وہ دو جاسوس آنکھیں مہرو کی تھیں... مگر کیوں...؟ وہ کیوں اسے دیکھتی تھی؟ کیا وہ ان کی باتیں سنا کرتی تھی؟" یہ سب سوچتے ہوئے اچانک علی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔

☆☆☆

بچھو رام... جس خاموشی کے ساتھ گیا تھا اسی خاموشی کے ساتھ راج محل لوٹ آیا۔ کسی کو اس کی مکارانہ آمد و شد کا

بجوبائی بے چینی سے اس کی منتظر تھی، اسے ابھی تک نہیں پتا چلا تھا کہ بچھو رام راج محل لوٹ آیا ہے۔ نہ ہی اس نے بجوبائی کو اپنا چہرہ "دکھایا" تھا۔ وہ بہت مسرور تھا اور ایک "انداز خاص" سے ہی وہ بجوبائی کے پاس جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا جس کے لیے اس نے خصوصی تیاری کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ اب اپنے اتاقی گوشے کے اندر اسی "تیاری" میں مصروف تھا۔

رات اپنے ابتدائی پہر میں تھی اور وہ... جب سابق سفید سوتی ساڑی میں اپنی تجلہ گاہ میں سونے کے لیے آ گئی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، بجوبائی کا اب زیادہ وقت اپنی تجلہ گاہ میں ہی گزرتا تھا کہ یہی اس کے لیے بہتر بھی تھا۔

یہ سب کو معلوم تھا، اس کا بیٹا اشک کمار اور بیٹی سوبھا بھی اسی میں راضی تھے کہ کہیں راجا پرتاب کمار بار بار اسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھے اور... اس کا دبا ہوا قہر و غضب امڈ پڑے اور وہ جلال میں آ کر ان کی ماں کو بندی خانے میں ڈلوانے کا حکم جاری کر دے۔ اس طرح کم از کم وہ ان کی ماں کی سازش کو بھلائے ہوئے تو تھا۔

لہٰذا... وہ صرف اپنے دونوں بچوں کے لیے ہی، سارے دن میں تھوڑی دیر کے لیے باہر آتی اور پھر دوبارہ تجلہ گاہ کا رخ کرتی۔ کھلنے اور دیکھنے والوں کے لیے وہ ایک ایسی دھارک... دھرما عورت کا روپ دھار چکی تھی جس نے خود کو تیاگ دیا تھا اور اب پوجا پاٹ میں خود کو مصروف رکھتی تھی۔ مگر کون جانتا تھا کہ وہ اس طرح ایک کونے میں رہتے ہوئے بھی غافل نہیں اور ایک نئی سازش کا تانا بانا بننے میں مشغول تھی۔ اس چھوٹی سی پوجا پاٹ کی جگہ کو اس نے بظاہر تجلہ گاہ کا نام دے رکھا تھا جو درحقیقت عیاش گاہ تھی۔

وہ تجلہ گاہ میں آ کر اپنی مسہری پر دراز ہو گئی۔ اس کی بڑی گہری آنکھوں میں اب نئے خواب سانس لے رہے تھے۔ مہارانی بننے کے خواب...

اچانک اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کمرے میں دیے اور شمعیں روشن تھیں۔ اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ دیکھنے سے پہلے ہی وہ جان گئی تھی کہ اس کی تجلہ گاہ میں یوں صرف... ایک ہی شخص بغیر دستک دیے داخل ہو سکتا ہے اور وہ ہے بچھو رام۔ وہ واقعی بچھو رام ہی تھا مگر... اس کے باوجود بجوبائی اپنے رازوں کو دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ اس کا چہرہ حیرت کی تصویر اور آنکھیں اس کی تصویر بن گئی تھیں۔

اور دم بخود چھاؤں میں نہایت ہلکی گڑگڑاتی سی آواز میں دروازے پر کھڑے کھڑے بچھورام کی طرف دیکھ کر کہا۔

بچھورام —— جو اس وقت زرق برق اور چمکدار پوشاک میں کھڑا بالکل ایسا ہی دکھ رہا تھا جیسے کسی ریاست کا مہاراجا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ گجوبائی اسے اس "لباس فاخرہ" میں دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے گی اور بے اختیار ہو کر مسکراتی ہوئی آکر اس کی طرف بڑھے گی اور خود سے لپٹا لے گی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

اپنے غلام اور اس کے بیٹے سے بدہیئت وجود پر اپنے آنجہانی پتی کا یہ شاہانہ لباس دیکھ کر گجوبائی سر تاپا ایک جلتا اور سلگتا ہوا انگارہ بن گئی۔ اسے بچھورام کا چہرہ سامنے کشش وجود نظر آرہا تھا لیکن —— چہرہ —— نہیں۔ اس کی جگہ اچانک مہاراجا چندر گپتا کا چہرہ آن ٹکا تھا جس نے گجوبائی کو سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔

وہ بپھر گئی۔ ایسا دوسری یا تیسری بار ہوا تھا کہ جب بھی اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے شوہر کا چہرہ دکھائی دیتا اس کی یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ وہ یک دم اٹھی اور ہسٹریائی سی آوازیں حلق سے خارج کرتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور بچھورام کے گلے سے وجود کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ وہ گھبرا گیا۔ گجوبائی ایک سرو قد اور توانا، بھرپور جسم کی مالک تھی۔ اس نے بچھورام کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر غارزدہ لہجے میں کہا۔

"بچھورام ادھم —— تیری جرأت کیسے ہوئی کہ تُو میرے سورگ باشی پتی کا لباس پہنے؟ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی —— مورکھ ——!"

یہ کہتے ہوئے اس نے بچھورام کا ملبوس اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے نوچ ڈالا۔ یہی نہیں، اس کی پوشاک بھی اتارنے کی مجنونانہ کوشش کرنے لگی۔ اس پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ بچھورام نے اس کے "دورے" کا ایک ہی علاج کر کے گجوبائی کو اس کی اوقات یاد دلا دی۔

اس نے بھی غصے سے اپنے دانت اور ہونٹ بھینچ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ بلبلا کر الٹ پڑی۔ چند قدم پیچھے لڑکھڑائی اور دوسرے ہی لمحے وہ چند قدموں کے فاصلے پر اسی طرح کھڑے کھڑے اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں اور فق چہرے کے ساتھ بچھورام کو تکتی رہ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گال پر تھا۔

میں تجھے بندی خانے تک پہنچا دوں۔" وہ اپنے اندر کی غلاظت کو تیک رک سی گجوبائی کے چہرے پر انڈیلتا ہوا اور اس کے ذرا قریب آکر حریص بولا۔

"مت بھول اپنی اوقات کو تو بھی —— کہ اب مہارانی تو کیا تو گجوبائی بھی نہیں رہی ہے —— بلکہ کچھ بھی نہیں رہی ہے۔ شکر کر میرا کہ تجھے ایک بار پھر بلندیوں تک پہنچا رہا ہوں۔ تیری خاطر میں کہاں کہاں کی خاک چھانتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں کہ تجھے دوبارہ مہارانی بننے کی خوش خبری سناؤں —— پر تو تو نے میری ساری محنت کوشش کا ماتھا پیٹ ڈالا، بلکہ تو اس قابل ہی نہیں ہے کہ تجھے دوبارہ وہی شان نصیب ہو تو اب اجڑی راج محل کے ایک دروازے میں پڑی سڑتی رہ —— ساری زندگی —— یہی تیری سزا ہے۔"

کہتے ہوئے بچھورام نے اپنی مہاراجاؤں والی پوشاک اتار کر غصے سے ادھم سی گٹھڑی گجوبائی پر اچھال دی۔

گجوبائی کے اندر ایک اور دھماکا ہوا —— وہ اپنے غلام، جواب اس کا غلام کہاں رہا تھا —— وہ تو اس کی جلوتوں کا ہی نہیں بلکہ خلوتوں کا بھی ساتھی اور راز داں بن چکا تھا۔ وہ تو اسے تاج حکمرانی پہنانے کے وسیلے کر رہا تھا۔ گجوبائی نے فوراً گرگٹ کی طرح کینچلی بدلی —— اور بے اختیار اس کی طرف بڑھی اور اس کے قدموں میں جا گری۔

اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بچھورام کے قدم پکڑ لیے۔

"مم —— مجھے شما کر دو بچھورام! معاف کر دو مجھے —— میں ابھاگن ہوں، تمہارے اتنے بڑے احسان کو نہ سمجھ سکی۔ میں تمہاری کوششوں کے بعد مہارانی بن بھی جاؤں تو تمہاری کنیز ہی بن کر رہوں گی۔"

گجوبائی کی گریہ وزاری، آنسو اور داد فریاد نے بچھورام کو موم کر دیا۔ اس نے بڑی گرسنہ نظروں سے گجوبائی کے اپنے قدموں میں جھکے ہوئے وجود کو دیکھا اور اس کے اندر کا مرد انگڑائی لے کر —— بیدار ہو گیا۔

گجوبائی نے اسے رام کرنے کے لیے بس اتنا ہی تو کیا تھا کہ —— اپنے بھرے بھرے بدن میں خوب کسی ہوئی ساڑی کا ایک سا پلو، جو قدموں میں جھک جانے کی وجہ سے اس کے شانوں سے ڈھلک گیا تھا، اسے سنبھالنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس "ہتھیار" نے بچھورام کی عقل خبط کر ڈالی تھی۔ وہ اس کے اندر کی کیمپ پر ور کھڑی

اس نے آہستگی سے جھک کر جوبائی کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور دونوں مسہری کی طرف بڑھ گئے۔

جوبائی اس سے کہہ رہی تھی، اسے پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ شاید پے در پے ناکامیوں اور صدمات نے اسے ادھ موا کر دیا ہے۔ پچھورام نے تسلی دی۔

کمرے میں ایکا ایکی بوجھل بھری خاموشی طاری ہو گئی۔ تخلیہ گاہ کی دیواروں پر اب صرف ایک دیے اور ایک شمع کی روشنی لرز رہی تھی جس کے جلو میں دو سائے ایک دوسرے سے چپساں جلوہ کناں تھے۔

اگلے دن سحر ــــ سے قبل پچھورام اپنے کمرے سے وجود پر مہاراجا چندر گپتا کی پوشاک جھلاتا ہوا تخلیہ گاہ سے نکلا اور ــــ سیدھا اپنے اقامتی گوشے کا رخ کیا۔

وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے جلدی جلدی اشنان وغیرہ کرنے کے بعد اپنی اصل پوشاک نکال کر پہنی اور تازہ کار حالات کی سن گن لینے کے لیے اپنے چند آدمیوں سے ملا۔ انہی سے معلوم ہوا کہ ریاست ناگرہ کو فرنگیوں کی طرف سے ایک بڑی جنگ کا خطرہ ہے۔ پچھورام دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا۔

اگرچہ ... تخلیہ گاہ میں جوبائی نے بھی اسے یہی کچھ بتایا تھا تاہم اب اس کی تسلی ہو گئی۔ وہ اس بات سے باخبر تو پہلے ہی سے تھا تاہم اب وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں متوقع جنگ کے جواب میں یہاں کی کیا ''تیاریاں'' تھیں؟

پچھورام اندر کا آدمی تو تھا ہی، جلدی اسے پتا چل گیا کہ فرنگیوں کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے کوہ شالی کی تینوں ریاستوں میں اتحاد قائم ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ خاطر خواہ طریقے سے عسکری تیاریاں بھی مکمل کر لی گئی ہیں۔ یہ خبر پچھورام کے لیے اہم تھی، وہ اس سے واقف نہ تھا۔ اسی وجہ سے فکرمند ہو گیا۔ اس نے ترنت شیورائے بھوپکر تک یہ اہم اطلاع پہنچانے کے لیے اپنے ایک ساتھی کو تیز رفتار گھوڑے پر دولی کی جانب روانہ کر دیا۔

راج محل میں ہی نہیں بلکہ اب ریاست ناگرہ میں بھی پچھورام کی در پردہ حیثیت ایک غدار باغی کی سی تھی۔ اسی سبب اس نے اپنے ساتھ چند ساتھیوں کو ملا رکھا تھا جو پہلے سے ہی اس کی اطاعت کا دم بھرا کرتے تھے۔

اگلے دن ہی رات تک پچھورام کا یہ قاصد لوٹ آیا۔ شیورائے بھوپکر نے اپنے جوابی پیغام کے ساتھ چند ہدایات

سب سے پہلے شیورائے نے ــــ پچھورام کو اس اہم اطلاع دینے کی شاباشی دی اور ساتھ ہی چند ہدایات بھی دیں کہ اتحادی افواج کی نقل و حرکت اور ان کے اسلحے کی صراحت تفصیل کے ساتھ اور ان کی نفری قوت کے بارے میں بتائے۔ سب سے آخر میں ایک ''اسکرپٹ پری پلان'' تھا جس کے مطابق جنگ سے پہلے پہلے پچھورام کو ریاست ناگرہ میں راجا پرتاب کمار کے خلاف پروپیگنڈا مہم چلانا تھی۔ یہ پروپیگنڈا مہم ریاست سمیت راج محل کے اندر بھی چلانے کی کوشش کی جائے اور بالخصوص شاہی فوج کے سینا پتی موج سنگھ اور اس کے نائب ہری رام کو راجا پرتاب کمار سے بددل کیا جائے۔ یوں جنگ کے نتائج زیادہ خاطر خواہ اور تشفی حاصل ہونے کا امکان تھا۔

پچھورام نے فوراً جوابی پیغام لکھ بھیجا تھا جس کے مطابق اس نے کہا تھا کہ پہلے ہی روز سے جب نیا راجا گدی نشین ہوا تھا تو اس نے اپنی ''مہم'' کا آغاز کر دیا تھا۔ البتہ سینا پتی موج سنگھ ایک مضبوط کردار کا آدمی ہے اور وہ راجا کا وفادار ہے، اسے بدلنا ناممکن ہے لیکن اس کے نائب ہری رام کو ہاتھ میں کیا جا سکتا ہے وغیرہ۔

یوں پچھورام نے درون خانہ راجا پرتاب کمار کے خلاف پروپیگنڈا مہم کا آغاز کر ڈالا۔ راج محل سے باہر یا اندر اس کے چیلے بھی ہم خیال تھے، انہیں ہر طرف پھیلا دیا، جنہوں نے عام لوگوں میں گھل مل کر راجا پرتاب کے خلاف زہر افشانی شروع کر دی کہ ــــ پرتاب کمار نے خود ہی باپ کی ہلاکت کا سامان پیدا کیا تھا اور الزام میں اپنی سوتیلی ماں کو راج محل میں ہی نظر بند کر دیا۔

ابھی نہیں نئے راجا کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے فرنگیوں کے ساتھ بھی تعلقات خطرناک حد تک خراب کر دیے گئے ہیں، غرضیکہ نئے راجا نے پوری ریاست کو جنگ میں جھونکنے کا سامان پیدا کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس روز وہ تخلیہ گاہ میں جوبائی کے ساتھ موجود تھا اور وہ اس سے دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''پچھورام! تمہیں پورا وشواس ہے نا کہ ــــ انگریز سرکار ناگرہ کو فتح کر لے گی؟''

''پورا وشواس ہے مجھے ــــ جوبائی! تم کیوں چنتا کرتی ہو۔'' پچھورام نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بھلا انگریز سرکار سے بھی کوئی لڑ سکتا ہے ــــ اور پھر ہم بھی تو یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوئے۔ تم دیکھتی

راجا پرتاب کمار کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگا ہوا ہوں۔''

''ہاں! یہ تو ہے ــــ آخر کو ناگرہ کا مہاراجا بھی تو تم نے ہی بنانا ہے نا ــــ!'' جوبائی اٹھلا کر اور ایک ادائے دلربانہ سے بولی لیکن اس نے دیکھا کہ پچھورام کے چہرے پر گہری فکر کی پرچھائیں رہی تھی۔ کہاں تو وہ اس کی ایک ادا پہ دل آرا اور خوش نگاہ مسکراہٹ پر اس کے قدموں میں لوٹنے لگ جاتا تھا۔ وہ بھویں سکیڑ کر بولی۔

''کیا بات ہے پچھورام، تم کچھ فکرمند نظر آ رہے ہو؟''

''ایک بات بتاؤ جوبائی! یہ بدری ناتھ تم اب اپنے کام کا آدمی سمجھتی ہو یا نہیں؟'' وہ گومگو سے انداز میں بولا۔ جوبائی اس کے عجب سوال پر پہلے تو ذرا بھونچکا سی ہو گئی پھر جواب میں نفرت تیز لہجے میں بولی۔

''اسی موذی نے تو ہمیں آج اس انجام تک پہنچایا ہے۔ ایک نمبر کا مطلب پرست اور ذلیل آدمی ہے یہ بدری ناتھ۔ اب میں سمجھ چکی ہوں، وہ اپنے مطلب کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں رکھتا۔ اس نے ہمیں بھی اب تک محض بہلاوے اور دھوکے میں رکھا، جنگ میں تو اسے اب اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگی ہوں۔''

''ہاں، جوبائی! میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتا تھا۔ اب میں شانت ہو گیا۔'' پچھورام ایک دم بولا، جیسے اس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

''آخر بات کیا ہے؟ تم نے یہ اچانک بدری ناتھ کے بارے میں کیوں پوچھا؟'' جوبائی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاتا ہوں، پہلے مجھے ایک ضروری کام نمٹا لینے دو۔''

پچھورام یہ کہہ کر جلدی سے تخلیہ گاہ سے نکل گیا۔ جوبائی اسے حیران اور الجھی ہوئی نگاہوں سے تکتی رہ گئی۔ پچھورام نے وہاں سے سیدھا کالی کے مندر کا رخ کیا۔ وہ ایک گھوڑے والی بگھی میں وہاں پہنچا تھا۔

پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ ــــ اپنے کسی مخبر سے اس کا کھوج لگوائے گا لیکن معاملہ چونکہ انتہائی رازداری اور احتیاط کا متقاضی تھا اس لیے اس نے خود ہی اسے نمٹانے کا ارادہ کیا تھا۔

وہ کالی کے مندر پہنچا تو اس کی ملاقات ابتدا میں ہی پرس رام سے ہو گئی۔ وہ اس وقت پروہت وغیرہ کے روپ

مہاراجا چندر گپتا کے مرنے کے بعد اب یہاں کے لوگ بھی پچھورام اور جوبائی کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ وہ انہیں احسان فراموش سمجھنے لگے تھے۔ یوں بھی جوبائی مہارانی نہیں رہی تھی اور نہ ہی خود پچھورام کسی مہارانی کا غلام خاص رہا تھا۔ اسی لیے پرس رام جی کیا کالی کے مندر کے کسی پجاری نے بھی اسے منہ لگانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ پچھورام بھی گنوں کا پورا تھا، سمجھ گیا کہ محض کالی کے پجاری نہیں بلکہ چڑھتے سورج کے پجاری بھی تھے۔

یوں ان کی بے رخی نے پچھورام کے دل میں ان کے خلاف مزید نفرت بھر دی۔ کہاں تو یہ سب ہی اس کے آگے پیچھے چلا جاتے تھے کہاں اب ــــ

پھر بھی اس نے مہا پجاری بدری ناتھ سے ملنے کا فیصلہ کیا..... لیکن اسے ملنا تو در کنار مندر کی چوکھٹ تک پار کرنے نہیں دی گئی۔ ناچار اس نے ایک پجاری سے التجا کر ڈالی۔

''ارے بھیا ذرا ایک پرس رام سے ہی ملاقات کرا دو۔''

''وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے، اندر سب جاپ الاپ میں مصروف ہیں۔'' ایک پجاری نے رکھائی سے کہا۔

''ارے تو اس میں اتنا ارامش ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' پچھورام مکاری سے بولا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے وہ پتا اب پھینک ہی دینا چاہیے تھا جس کے اثر کا اسے اندازہ کرنا تھا، بولا۔

''اچھا چلو میرا صرف ایک پیغام پرس رام تک پہنچا دو۔'' پچھورام نے ابھی دانستہ مہا پجاری بدری ناتھ کے بجائے سر دست پرس رام کو پچھاڑنا چاہا تھا۔

''ہاں ہاں ــــ پجاری جی جب وہ فارغ ہوں گے تو ــــ کیا پیغام ہے؟'' اسی پجاری نے بے رخی سے کہا۔

''پرس رام سے اتنا کہہ دینا کہ ــــ میں ماریا کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ بس، چلتا ہوں۔''

پچھورام نے بے پروائی سے کہا اور فوراً پلٹ کر جانے لگا تو وہ پجاری ''ماریا'' کے نام پر بری طرح چونک گیا۔ اس نے فوراً ہی باہر کی طرف جاتے ہوئے پچھورام کو عقب سے آواز دے ڈالی۔

''ارے پچھورام! ذرا ٹھہرو، ادھر آ۔''

پچھورام کے پتلے پتلے بدہیئت سے ہونٹوں پر

مکارانہ مسکراہٹ خود کرائی اور وہ اس کی جانب پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا۔

''ماریا سے متعلق کیا پیغام ہے، مجھے بتاؤ۔'' پجاری نے کہا تو بچھورام مکاری سے بولا۔

''نہیں، یہ تو میں پھر دوبارہ آ کر اب مہا پجاری بدری ناتھ کو ہی بتاؤں گا۔''

''اب زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں۔'' اسی پجاری نے پیچھے سے درشت لہجے میں اس سے کہا۔ ''ٹھہر جاؤ پھر... میں تمہاری ملاقات پروہت سے کرائے دیتا ہوں۔ چل ادھر آ...''

بچھورام اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ پجاری اسے مندر کے اندر لے گیا۔ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے بچھورام کو وہیں رکنے کا کہا اور خود اندر چلا گیا۔ ابھی اسے گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بچھورام نے باہر سے ہی اندر کی ان کہی سن لی تو اسے پرس رام کی تفصیلی آوازیں سنائی دیں اور اگلے ہی لمحے اس نے بذات خود پرس رام کو اسی پجاری کے ساتھ کمرے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ پجاری کو بری طرح جھڑک رہا تھا اور کمرے کے دروازے پر پہنچنے تک اس نے پیچھے بچھورام کو سنانے کی غرض سے پجاری سے کہا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی، بچھورام جیسی معزز شخصیت کو تم نے باہر کھڑا کر رکھا ہے۔'' پھر وہ کھسیانی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بچھورام سے مخاطب ہو کر بولا۔

''شما کر دینا بھائی بچھورام... اس بے وقوف نے آپ کو باہر ہی کھڑا کر دیا۔ چمار ہے... پد چمار ہے۔'' اس نے بچھورام کے سامنے نہایت خوش اخلاقی سے کہا اور بچھورام... جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے تھا، پل کے پل میں سمجھ گیا کہ اس کا پھینکا ہوا پتا، اپنی کامیاب ترپ چال پر آ گیا ہے۔ ورنہ کہاں تو یہی پرس رام اسے خود دیکھ کر بھی منہ موڑ گیا تھا اور اب...

بچھورام اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ دونوں بچھے بچھے فرش پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں اب ان کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

''کیا بات ہے بچھورام! یہ تو بتا رہا تھا کہ تم کسی ماریا کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہے تھے؟''

''میں نے تو تمہیں بھی دور سے ہی دیکھ کر پہچان لیا تھا، مگر تم تو مجھ پر ایک ذرا نگاہ ڈال کر مندر کے اندر گھس لیے تھے؟'' بچھورام نے بھی جیسے اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی۔ تاہم وہ فوراً بھانپ گیا تھا کہ معاملہ وہی ہے جس واسطے سے ہی کی حد تک سب تھا۔ اس پر پرس رام ایک بار پھر مکارانہ فروتنی سے بولا۔

''ارے بھائی بچھورام اب جانے بھی دو۔ ہم تو بڑے مجھے ہوئے تھے کہ تم بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہے۔ تم بتاؤ یہ ماریا کا کیا چکر ہے؟''

بچھورام خود بھی کیا کم کائیاں تھا، اس کی مکاری بھانپ کر اس نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مقصد کی بات کر ڈالی۔ بولا۔

''ماریا نام کی ایک فرنگن دوشیزہ تھی۔ وہ اچانک لاپتا ہو گئی ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے بھائی پرس رام کہ ان سسرے فرنگیوں کا ایک کتا بھی کھو جائے تو یہ اس کا کھوج لگانے کے لیے پاتال تک جا اترتے ہیں۔ یہ تو پھر ایک لڑکی کا معاملہ ہے اور لڑکی بھی کون، کسی معمولی انگریز کی نہیں بلکہ برٹش آرمی کے ایک کرنل کی بیٹی ہے۔ وہ بھی اکلوتی اور لاڈلی۔ کرنل ایڈورڈ رچرڈ نام ہے اس کا۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے دانستہ کچھ دیر کی خاموشی اختیار کر لی اور بھانپتی ہوئی نظروں سے پرس رام کا چہرہ تکنے لگا جو ایک دم فق سا ہو گیا تھا۔ بچھورام بھی سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔

''تت... تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟'' پرس رام نے پوچھا۔



''مجھے کیا پتا چلنا تھا، میں تو شہر گیا تھا، وہیں جگہ جگہ پوسٹر اور اخبارات کے ٹکڑوں میں تصویر کے ساتھ یہ سب اعلان درج تھا... ماریا کی تصویر بھی تھی۔'' بچھورام نے یہ کہتے ہوئے ایک اخبار کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھایا جس میں ماریا کی تصویر بھی تھی جو اس نے شیورائے بھوکر سے حاصل کی تھی۔

پرس رام نے اخبار کا وہ ٹکڑا لے کر اپنے چہرے اور آنکھوں کے بالکل قریب کر لیا۔ بچھورام کی کھاگ نظریں اس کے چہرے کے مدوجزر اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''کیا تم نے اس فرنگن ناری کو کہیں دیکھا ہے؟''

بچھورام نے جان بوجھ کر پوچھا تو پرس رام یوں اچھل پڑا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، گڑبڑاتے لہجے میں بولا۔

''م... مم... بھلا مجھے کیا معلوم...؟ میں تو... میں تو اس تصویر کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر بچھورام کا شک اب یقین میں بدل چکا تھا۔ وہ بڑے آرام سے اس کے شانے پر اپنا ایک ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''دیکھو بھیا پرس رام... بات صاف کر دو گے تو... ہو جائے گی۔ دوستی اور معاملہ داری کی بات کروں گا میں کیونکہ یہاں ہم سب ساجھے ہیں اور کوئی الگ نہیں۔ کوئی آفت آئی تو ہم سب ہی زد میں آئیں گے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو بتا دو ابھی... تاکہ اس کا حل ابھی سے سوچ لیا جائے۔''

شاطر بچھورام کی بات نے پرس رام کو اندر سے بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ تھا کہ اسی معاملے پر کچھ دن سے پرس رام خود بھی پریشان تھا اور اس نے اپنی پریشانی کا اظہار مہا پجاری بدری ناتھ سے بھی کیا تھا۔ تب ہی وہ ایک گہری سانس کھینچ کر ادھر ادھر ایک نظر ڈالنے کے بعد رازدارانہ لہجے میں بچھورام سے بولا۔

''بھائی بچھورام! تمہاری بات کو میں رد نہیں کرتا۔ تھوڑے دنوں پہلے ہی میں نے مہا پجاری بدری ناتھ سے بھی یہی کہا تھا کہ اس فرنگن ماریا کی نشانی تک کو ختم کر دو مگر وہ نہیں مانے۔ بس اب سے ہی مجھے چنتا کھائے جا رہی ہے۔''

''نشانی... کیسی نشانی...؟'' بچھورام (بچھورام) نے بھویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''نشانی'' پر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

تب پرس رام نے نیچی آواز میں کہا۔ ''بھائی بچھورام اب تم ہی میری مشکل حل کر سکتے ہو اور کوئی طریقہ ... کر مہا پجاری جی کی بدھی میں یہ بات آئے۔ ورنہ سب ... کام ہے۔''

''یہی تو کہا میں نے بھیو! جو معاملہ ہے ادھر ہی صاف کر دو۔ بعد میں گلے پڑ جائے گا۔ ویسے یہ نشانی والی کیا بات ہے؟''

''تم تو ہمارے پرانے خیرخواہ ہو بچھورام! کسی سے ... مت کرنا۔'' پرس رام بولا۔ ''مسری ماریا کی اس ... میں ہی چتا جلا دی گئی۔''

''کیا...'' بچھورام کا چہرہ فق ہو گیا۔

''ہاں! پر تم آگے سنو۔ اس مسری ماریا کے پاس ... شاید چھوٹا سا کوئی خنجر تھا... جو اس کے ... نے نشانی کے طور پر اپنی بیٹی (ماریا) کو دے رکھا ... وہ خنجر اپنے بدری ناتھ جی کو بھا گیا۔ وہ اس نے اپنے ... رکھ لیا ہے۔ میں نے سمجھایا بھی کہ یہ خنجر ہم سب کو ... دے گا مگر وہ خود کو مہا گیانی سمجھتے ہیں۔ اس بات کو اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

بچھورام کے کان فوراً کھڑے ہو گئے۔ اندر سے وہ بہت خوش ہوا۔ ماریا کی گمشدگی کے سلسلے میں اس کا یہ خدشہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پرس رام کبھی بھی یہ راز اس کے سامنے نہیں کھولتا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ یعنی بچھورام اور مجو بھائی ان کے کالے کرتوتوں سے پہلے ہی واقف تھے، اسی لیے پرس رام نے بچھورام سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ یوں بھی خود اس کی دم پر پاؤں آ پڑا تھا۔

''تم اب کوئی چنتا مت کرو۔ میں خود بھی دوبارہ یہاں آؤں گا اور مہا پجاری بدری ناتھ سے ملوں گا اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔'' پرس رام اس کی بات پر مطمئن ہو گیا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

بچھورام کا مقصد پورا ہو گیا تھا، وہ فوراً وہاں سے کھسک گیا اور اس نے راج محل آ کر ہی دم لیا۔ اب وہ اپنے اقامتی گوشے میں بیٹھا سوچ میں گم تھا۔ اس کی چال کامیاب گئی تھی۔ اس نے پرس رام سے بڑی چابک دستی سے باتیں کر کے اس کے منہ سے حقیقت اگلوائی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ماریا سے متعلق ایک اہم بات بھی اس کے علم میں آ گئی تھی۔ وہ خنجر، وہ نشانی، ان سب پجاریوں کے گلے کا پھندا بن سکتی تھی۔

''بچھورام! تمہارے ہاتھ ترپ چال لگ چکی ہے۔ فرنگیوں کے جنگ کا ایک اور جواز ان تک پہنچا دے... پھر ان پجاریوں کا قصہ ختم...'' اس نے خود سے کہا اور فوراً ایک قاصد کے ہاتھ یہ اہم پیغام شیورائے بھوکر کی طرف روانہ کر دیا۔

☆☆☆

کوہ شالہ پر چڑھائی کی عسکری منصوبہ بندی کو بالآخر حتمی شکل دے دی گئی تھی۔ اس جنگی پلان کے مطابق... سب سے پہلے ریاست آگرہ کو تختۂ مشق بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ... ایک تو یہی ریاست سب سے پہلے ان کے نشانے پر تھی اور اسے فتح کیے بغیر تراچال اور پالن پور تک رسائی مشکل اور کٹھن تھی، کیونکہ وہ راستہ بے حد دشوار گزار اور ناہموار تھا۔ وہاں صرف انفنٹری فوج ہی داخل ہو سکتی تھی اور اسے بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جبکہ اول الذکر راستے پر لشکری سمیت آرٹلری اور آرڈیننس (توپیں، گولہ بارود) کی آمد و رفت بآسانی ممکن ہوتی۔ لہٰذا اس وقت دلی کی قلعہ بند تا بعض حویلی کے ایک

بال کرتے ہیں پاتھا۔ کرنل اینڈرسن سمیت تمام اعلیٰ عہدے دار وسط میں بچھی ہوئی گول میز پر ایک بڑے سے نقشے پر جھکے ہوئے اسی جوڑ توڑ میں مصروف تھے۔

ان مذکورہ آٹھ اور چند دیگر حفاظتی افسران میں گورنر دلی کا مشیر، جنرل مانگل شاہ، کرنل ہلسٹروڈ، بھیڑی فارسٹ جو چھتیسویں لائٹ کیولری کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا، بریگیڈیئر ڈان کیورشم، کرنل ہلسٹروڈ کی اپنی رجمنٹ کا ایک کمانڈنگ آفیسر جیرالڈ، ایک ریزیڈنٹ آفیسر اور آٹھواں کرنل اینڈرسن شامل تھا۔

شیورائے بھوکر ایک طرف خاموش بیٹھا تھا مگر اس کی نظریں کرنل اینڈرسن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے کرنل اینڈرسن کی جگہ اس کا نائب کیپٹن جیمس وہاں نظر آرہا تھا، بھوکر بھی نہیں تھا وہاں۔ یہ دونوں لگ بھگ کوئی دو گھنٹے پہلے ہی یہاں افراتفری کے عالم میں پہنچے تھے۔ ورنہ تو یہ اہم اجلاس گزشتہ پانچ گھنٹوں سے جاری تھا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ شیورائے بھوکر کو چھورام کا پیغام ملا تھا جو اس نے ترنت کرنل اینڈرسن کو خود ہی (شیخ کھمبات) جا کر پہنچایا تھا۔ اس پیغام کو پاتے ہی کرنل اینڈرسن ایک دم سکتے میں آگیا تھا۔ ایک طرف مارے غم کے وہ ڈھے سا گیا تھا تو دوسری جانب وہ بری طرح طیش میں بھی آگیا تھا۔ چھورام کی اطلاع کے مطابق اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس کی بیٹی کو ناگرہ میں کالی کے مندر میں موجود بدمعاش پجاریوں کے ایک شیطانی گروہ نے اغوا کر کے کالی دیوی کے چرنوں میں قربانی کے طور پر مار ڈالا تھا۔

نشانی کے طور پر ماریا کے پاس اس کے باپ کرنل اینڈرسن کا دیا خنجر تھا، وہ اس شیطانی ٹولے کے سربراہ مہا پجاری بدری ناتھ کے قبضے میں تھا۔ وہاں کالی کے مندر کے تہہ خانے میں اور قیدی لڑکیاں بھی ابھی تک موت کی گھڑیاں گن رہی تھیں۔

بہر کیف ۔۔۔ کرنل اینڈرسن کے علم میں یہ بات تھی کہ عنقریب برٹش ملٹری اپنی پوری فورس کے ساتھ کوہ شوالک کی ایک اہم ریاست ناگرہ پر چڑھائی کرنے والی ہے اور ناگرہ وہی ریاست تھی جہاں یہ کالی کا مندر واقع تھا۔

یہ سنتے ہی کرنل اینڈرسن انتقام کی آگ میں سلگتا ہوا بھوکر ۔۔۔ اور اس کے پیغام سمیت یہاں آن پہنچا تھا اور ساری صورت حال سے عسکری اعلیٰ قیادت کو آگاہ کر دیا تھا۔ ان کے ہاتھ ناگرہ پر حملے کا ایک اور طاقت ور جواز

[illegible] آگیا تھا۔ یوں [illegible] اس میں قبولیت حاصل کر لی تھی اور اپنے نائب کیپٹن جیمس کو اپنی جگہ شیخ کھمبات میں مقرر کر دیا تھا۔

"سب سے پہلے اس ریلوے لائن کو آرڈیننس کی ترسیل کے لیے کام میں لایا جائے گا۔"

جنرل مانگل شاہ نے جنگی نقشے پر اپنے قلم کی نوک رکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔ "یہاں ایک صنوبر کا گھنا جنگل ہے۔ توپیں اور گولہ بارود اسی مقام پر اتارا جائے گا کیونکہ یہاں سے ریاست کا قلعہ راج محل قریب پڑتا ہے۔ گولہ باری کی ابتدا راج محل سے ہوگی۔ اس کے عقب میں کالی کا مندر ہے، ہماری ایک دوسری انفنٹری اس جگہ سے مندر پر حملہ کرے گی۔ ہر ممکن یہ کوشش کی جائے کہ پجاریوں اور قیدیوں کو زندہ حالت میں پکڑا جائے، بالخصوص مہا پجاری بدری ناتھ کو ۔۔۔ تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ اور ملکہ وکٹوریہ سمیت دنیا کو ان کے کالے کرتوت دکھائے جائیں۔ یوں برصغیر میں ہمارے خلاف نفرت اور جارحانہ فضا اٹھنے نہیں پائے گی۔"

جنرل مانگل شاہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

مزید دوسرے افسران بھی اپنی اپنی رجمنٹ کی پلاننگ دیتے رہے۔ توپ، بارود اور گولے دہانوں والی توپوں سے کم کی توپیں استعمال نہیں کی جائیں گی ۔۔۔ اس کا بیڑا ڈان کیورشم نے آخر میں رکھا تھا۔

گفتگو ہوتی رہی جس کے مطابق ناگرہ کو فتح کرنے کی صورت میں برٹش گورنمنٹ فوراً اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرے گی، جس کی باگ ڈور سرکار انگلشیہ کے ساتھ تعاون خواہ آنجہانی مہاراجا چندر گپتا کی بیوہ مہارانی کھیروانی کے سپرد کر دی جائے گی کیونکہ جنگ کا پہلا جواز یہی بتایا گیا تھا۔

دوسری رجمنٹ انفنٹری کی کمانڈ کرنل اینڈرسن کے حوالے کی گئی تھی۔ جو خود بھی اپنے سینے میں بیٹی کے انتقام کی آگ اور شعلے سموئے بیٹھا تھا۔ جبکہ آرٹلری کمانڈ بریگیڈیئر ڈان کیورشم اور کرنل ہلسٹروڈ کے سپرد تھی۔ باقی افسران ان کے معاون اور ماتحت کمانڈر تھے۔

رات گئے تک جنگی حکمت عملی کی یہ کارروائی جاری رہی۔ اگلا پورا دن آرام کیا گیا اور تیسرے دن فوج کوہ شوالک کی جانب کوچ کر گئی۔

☆☆☆

دونوں اس نئی مہم میں پہلے سے زیادہ پرجوش نظر

آرہے تھے۔ ۔۔۔ پھر ٹنگ ڈاک گاڑی نے انہیں ستی پہنچا دیا۔ یہاں سے آگے انہوں نے دمڑہ پہنچنا تھا۔ اس کے بعد شیخ کھمبات اور پھر ان کی اصل منزل "گریز آئی لینڈ" تھی لیکن اب وہ اس ڈاک گاڑی میں آگے تک کا سفر نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کی مخصوص ساخت گشت کرتے ہوئے انگریز اہلکاروں کو چونکانے کا سبب بن سکتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ستی اتر کر ڈاک گاڑی چھوڑ دی۔

کوچبان خالی ڈاک گاڑی کے ساتھ اسی وقت واپس لوٹ گیا۔ یہ دونوں ہوڑہ ندی کے کنارے پہنچے جدھر مچھیروں کی ایک بستی آباد تھی۔ انہیں سب سے پہلے ادھر ہی پہنچنے کا حکم ملا تھا کیونکہ خاور حیات اور اس کے ساتھیوں کا بھی یہیں کیمپ تھا۔ یہ در حقیقت مسلمانوں کی بستی تھی۔ کچھ باوردی تھے، مگر وہ مجاہدین آزادی کے متوالوں کی بھرپور مدد کرتے تھے۔

اس بستی کی طرف انگریز فوجیوں کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ البتہ دو ایک بار فرنگی فوجیوں نے یہاں اچانک چھاپے بھی مارے تھے مگر ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگ سکا تھا۔ وہاں انہیں عبدالرحمان سے ملنا تھا وہ اس کا پتا پوچھتے ہوئے اس کی جھونپڑی تک پہنچے۔ اریبہ اور شاہ زمان اس کے لیے اجنبی ہی تھے لیکن جب زمان نے خاور حیات کا نام لیا تو اس نے ان دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خاور حیات اور اس کے ساتھیوں کی ناکامی اور افسوسناک انجام کا ان دونوں کی زبانی سن کر رحمان کو بہت رنج ہوا۔

وہ ایک پچاس پچپن سالہ دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی بیوی اور ایک جوان شادی شدہ بیٹا بھی تھا۔ اریبہ اور زمان کے لیے الگ جھونپڑی کا بندوبست پہلے ہی سے موجود تھا۔

"رحمان بھائی! ہم آج رات ہی دمڑہ اور پھر وہاں سے اس جزیرے تک پہنچنا چاہتے ہیں جدھر وہ "سی ہاک" کا جہاز لنگر انداز ہے۔"

کھانا کھانے کے دوران شاہ زمان نے عبدالرحمان سے کہا۔ ان کے آگے بھنی ہوئی مچھلی اور ابلے ہوئے چاول رکھے گئے تھے۔ جھونپڑی میں اس وقت ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

"بے شک تمہیں اپنی یہ مہم ضرور سر کرنا چاہیے لیکن کسی قسم کی جلد بازی پہلے یہاں آنے والے مجاہدوں کی طرح ناقابل تلافی نقصان کا سبب بھی بن سکتی ہے۔"

عبدالرحمان نے سنجیدگی سے کہا۔

"جلد بازی کیسی رحمان بھائی؟" اریبہ نے بھنی ہوئی

مچھلی کا ایک نوالہ اور تھوڑے سے چاول منہ میں ڈالتے ہوئے عبدالرحمان سے پوچھا۔ "آپ نے ہماری منزل تک راہنمائی کرنی ہے۔"

عبدالرحمان نے پرشفیق مسکراہٹ سے اریبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! تم دونوں کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری یہ مہم کس قدر اہم اور اس سے زیادہ خطرناک بھی ہے۔ شکست کی صورت میں یا تو جان جانا لازمی ہے یا پھر موت سے بدتر قید ۔۔۔ میں تمہیں خوف زدہ نہیں کر رہا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس مہم میں وہی مجاہدین سامنے آتے ہیں جو موت سے نہیں ڈرتے، لیکن بیٹی! اصل بات تو جذبہ دل سے بھی بڑھ کر ہے، وہ مشن کی کامیابی ہی ہوتی ہے۔ اگر خاور حیات کی طرح اس بار بھی مشن خدانخواستہ ناکام ہوا تو سمجھو سب ختم ہو گیا۔"

عبدالرحمان اتنا کہہ کر چند ثانیوں کے لیے رکا، اریبہ اور شاہ زمان بڑے غور سے اس کی بات سننے میں محو تھے۔ وہ آگے بولا۔

"تمہیں یہاں سے پہلے دمڑہ پہنچنا ہوگا، جہاں مکمل طور پر فرنگی سامراج قابض ہے۔ جو ایک اڑتی ہوئی چڑیا کے بھی پر گنتے سے نہیں چوکتے۔ یہ جب پرتوں گشت کر رہے ہوتے ہیں پھر وہاں سے اگر بچ نکلے تو آگے شیخ کھمبات ۔۔۔ کے ساحل تک پہنچنا اس سے بڑھ کر مشکل مرحلہ ہے اور سارے مشکل مرحلوں کی آخری حد وہ منحوس جزیرہ ۔۔۔ ہے، جہاں ہمارے وطن اور دھرتی کے لوٹے ہوئے خزانوں کا ڈھیر چھپا رکھا ہے۔ جنہیں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد بحری جہازوں میں لاد کر انگلستان پہنچایا جاتا ہے۔ اس خطرناک جزیرے (گریز آئی لینڈ) میں تم دونوں کو اس وقت تک رہتے ہوئے فرنگی چوروں کا منصوبہ خاک میں ملاتے رہنا ہوگا جب تک کہ ان کے تینوں باربردار جہاز تباہ نہیں ہو جاتے۔ یا پھر خزانے کے اس ڈھیر کو کسی اور جزیرے پر نہیں پہنچا دیا جاتا۔"

"ہماری منصوبہ بندی بھی یہی ہے، اسی لیے ہم دونوں اس اہم مشن کے لیے روانہ کیے گئے ہیں۔" شاہ زمان نے فوراً کہا۔

"ہم اس جہاز کو جو وہاں اب تک لنگر انداز ہے اور انگلستان روانگی کے لیے تیار ہے، کسی دوسرے گمنام جزیرے تک لے جانے اور سارا خزانہ ان غاصب اور چور فرنگیوں کی نظروں سے وہیں چھپائے رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

بولا۔ "لیکن یہ ساری باتیں اتنی آسان نہیں ہیں۔"

"مشن کوئی بھی آسان نہیں ہوتا عبدالرحمان بھائی!" اریبہ نے کہا۔ "مگر ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ باطل کی جنگ کے خلاف حق کو ہمیشہ فتح ہی نصیب ہوتی ہے اور ان شاء اللہ فتح ہماری ہی ہوگی۔"

"ان شاء اللہ! آمین۔"

شاہ زمان اور عبدالرحمان نے بیک وقت زیرلب کہا اور اس کے بعد یہ لوگ ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

اگلے دن صبح اریبہ اور شاہ زمان بستی سے نکل پڑے۔ وہ دونوں مچھیروں کے بھیس میں تھے اور مچھلیوں کے ٹوکرے اٹھائے ایک موٹر بس میں سوار ہو گئے۔ یہ بس مدھرا ہی جارہی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، ریاست مدھرا پر مکمل طور پر غاصب فرنگیوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور اسے بستی شہر میں ضم کرلیا گیا تھا جبکہ پہلے یہاں کسی راجا کے نام پر کٹھ پتلی حکومت قائم کی گئی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کے سارے ریاستی امور ختم کر کے باقاعدہ برٹش شہری انتظامیہ کے زیر تسلط لے آیا گیا تھا۔ ریاست مدھرا کا اب صرف نام رہ گیا تھا۔

وہ دونوں بس کے آخری حصے میں بیٹھے تھے۔ ان کے بدن پر مچھیروں والا ہی لباس تھا اور ان کے ٹوکروں سے مچھلی جھینگوں کی بو اٹھ رہی تھی۔ کئی مسافروں نے انہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی۔ ان کے لباس سے بھی اسی قسم کی بو اٹھ رہی تھی۔ یہ ان دونوں کے لیے "اچھی" ثابت ہو رہی تھی، کیونکہ آگے ایک چوکی پر بس کو روک کر چند فرنگی سپاہیوں نے چیکنگ بھی کی تھی اور ایک ایک مسافر کو بہت گھور گھور کر دیکھا تھا۔ جس مسافر پر انہیں ذرا سا بھی کسی قسم کا شبہ ہوتا وہ فوراً اس کی تلاشی لینا شروع کر دیتے اور بعض کو بس سے اتار کر اپنے ساتھ بھی لے جاتے تھے۔

ان فرنگی غاصبوں کی ظالمانہ روش دیکھ کر شاہ زمان اور اریبہ غصے سے کھول اٹھے تھے۔۔۔ دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر ان غاصب فرنگیوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

ایک اور چوکی پر ان کی بس روک لی گئی۔ سرخ وردی میں کچھ فرنگی اہلکار بس میں چڑھے اور ایک ایک مسافر کو تیز اور گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کے آگے تیز چمکتی ہوئی سنگینیں

نصب تھیں۔ ان کی جانب بھی دو اہلکار آئے۔

"اس میں کیا ہے؟" ایک فرنگی نے بس کے فرش پر رکھے ٹوکرے کو اپنے بوٹ سے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے ان دونوں سے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

"حضور سائیں باپ! مچھلی اور جھینگا ہے۔" شاہ زمان نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" دوسرے اہلکار نے تحکمانہ درشتی سے پوچھا۔

"ہوڑہ ندی سے۔۔۔"

"کہاں جارہے ہو؟"

"بڑی مارکیٹ۔۔۔"

"یہ عورت تمہاری کیا لگتی ہے؟" پہلے والے نے اریبہ کی طرف گھورتے ہوئے شاہ زمان سے پوچھا۔

"یہ۔۔۔ یہ میری پتنی ہے سرکار۔۔۔!"

"تمہارا نام۔۔۔؟"

"میرا نام کھیلو اور یہ میری پتنی، راجو ہے۔" اس بار اریبہ نے جواب دیا۔

"راجو کیا نام ہوا؟ پورا نام کیا ہے؟"



"رر۔۔۔ راج کمار۔۔۔" شاہ زمان نے فوراً کہا۔ دونوں اہلکار اس کے نام پر ہنسے۔ ایک نے تمسخر آمیز حقارت سے کہا۔

"نام دیکھو راج کمار۔۔۔ اور دھندا دیکھو۔۔۔"

"بس جی حضور! ماتا پتا نے جانے کیا سوچ کر یہ نام رکھ دیا تھا میرا۔ پرنتو اسی لیے میں صرف راجو ہی کہلوانا پسند کرتا ہوں۔" شاہ زمان نے کہا۔

اہلکار بس سے اتر گئے اور اسے روانگی کا حکم مل گیا۔

ان دونوں کی سانس میں سانس آئی۔ عبدالرحمان نے غلط نہیں کہا تھا کہ یہاں قدم قدم پر سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر بھی انہیں فرنگی سپاہیوں اور فوجیوں کے گشتی دستے نظر آرہے تھے۔ شاید یہاں بغاوت پھوٹنے کا زیادہ خطرہ تھا۔ بہرطور یہ دونوں بڑی مارکیٹ والے اسٹاپ پر اتر گئے۔

عبدالرحمان نے انہیں بتایا تھا کہ وہ بڑی مارکیٹ میں پہنچ کر اس کے وسطی راستے سے ہوتے ہوئے دوسری طرف سے باہر نکلیں گے تو سیدھے ہاتھ پر شاکر حسین نامی ایک آدمی کی چھابڑی نما دکان پر پہنچ کر رک جائیں اس سے آگے کی راہنمائی۔۔۔ وہی کرتا۔ ان دونوں کو وہاں پہنچ کر عبدالرحمن کا حوالہ دینا تھا۔

مارکیٹ میں خاصی گہما گہمی تھی۔ جگہ جگہ فرنگی سپاہی گشت کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ وہ مارکیٹ میں کسی بھی دو افراد کو زیادہ دیر کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے بھی نہیں دیتے تھے اور ان کے قریب پہنچ کر انہیں پرے ہٹا دیتے۔

یہ دونوں مارکیٹ کے بیچ والے راستے پر چلتے ہوئے شاکر حسین کی چھابڑی پر پہنچے۔ وہاں کچھ گاہک موجود تھے۔ ایک دبلا پتلا لمبا تڑنگا سا شخص ململ کی بنیان اور اسی طرح کی شلوار پہنے گاہکوں کو مچھلی فروخت کر رہا تھا۔ عبدالرحمان کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق شاہ زمان کو یہی شاکر حسین لگا تھا۔

یہ دونوں سروں پر ٹوکرے اٹھائے اس کے قریب پہنچے۔ شاہ زمان نے اس کے ذرا قریب پہنچ کر ہولے سے کہا۔

"تم شاکر حسین ہو؟"

"ہاں۔۔۔"

"میں ہوڑہ ندی والی بستی سے آیا ہوں، عبدالرحمان نے بھیجا ہے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔"

شاکر حسین اس کی بات پر چونکا اور چوکنا نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد سرگوشی میں بولا۔

"ابھی ٹھہرو، میں ان گاہکوں کو فارغ کر دوں۔"

اتنے میں دو اہلکار اس طرف کو آئے۔ وہ شاہ زمان اور اریبہ کو دیکھ کر رک گئے۔ وہ دونوں انہی کی طرف گھور رہے تھے۔

"ارے بھائی! ادھر ہی دو، جو میں نے بتائے تھے۔" شاکر حسین نے ان دونوں فرنگی سپاہیوں کو ان کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر چالاکی سے کہا۔ شاہ زمان اور اریبہ بھی رک گئے۔

شاہ زمان نے فوراً ٹوکرا اٹھایا اور کچھ اضطراب سے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ارے بھیا! ایک دم فرسٹ کلاس لایا ہوں، دام تو ذرا مناسب دے دو۔"

"نہیں بھائی نہیں، جو دام بتایا ہے اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ آگے جاؤ نہیں تو۔۔۔"

"اچھا بھائی ادھر ہی دے دو پھر۔" اس بار اریبہ نے کہا۔

"پہلے گاہک فارغ کر دوں، ابھی ٹھہر جاؤ۔" شاکر حسین بولا۔

وہ دونوں اہلکار مطمئن ہو کر آگے بڑھ گئے۔ اریبہ اور شاہ زمان خاموش کھڑے رہے۔

شاکر جب فارغ ہوا تو جلدی سے بولا۔ "تم لوگوں کا زیادہ دیر یہاں کھڑا رہنا اب ٹھیک نہیں ہے۔ سپاہی تمہیں دیکھ گئے ہیں۔ یہاں سے سیدھے جانے کے لیے۔۔۔ تم پیدل بندرگاہ تک جاؤ گے۔ کم از کم ایک کلومیٹر پیدل چلنا پڑے گا۔ کسی موٹر بس یا سائیکل رکشا میں مت بیٹھنا، شبہ ہو جائے گا۔ وہاں بندرگاہ پر مراد خان نام کے ایک آدمی کو ڈھونڈنا ہوگا تمہیں۔۔۔ وہ گوداموں کا چوکیدار سپروائزر ہے۔ اس سے میرا نام لینے کے بجائے رحمان بھائی اور خاور حیات کا نام لے لینا۔ جاؤ اب یہاں سے۔۔۔"

حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اریبہ اور شاہ زمان وہاں سے فوراً رفوچکر ہو گئے۔

گو کہ سردی کا موسم تھا لیکن باوجود اس کے بندرگاہ تک پیدل چلتے چلتے دونوں کے جسموں پر پسینا چھلکنے لگا۔ وہ بھی سستانے کے لیے بیٹھ جاتے اور پھر چل پڑتے۔

عبدالرحمان کی درست راہنمائی اور کچھ اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے یہ دونوں بالآخر خیریت کے ساتھ بندرگاہ پہنچ ہی گئے۔ وہاں یہ ذرا سستانے کے لیے رکے۔ ایک قریب کے نل سے پانی پیا۔

چوکیدار مراد خان کو تلاشنے میں انہیں چنداں دشواری نہیں ہوئی تھی لیکن یہاں بھی انہیں گشتی اہلکاروں کے دستے دکھائی دے رہے تھے۔

مراد خان ایک چالیس پینتالیس سالہ آدمی تھا۔ دراز قامت اور صحت مند۔ وہ ان کے منہ سے عبدالرحمان اور خاور حیات کا نام سنتے ہی انہیں ایک ویران کمرے میں لے آیا۔

☆☆☆

ان دنوں "جاسوس آنکھوں" کو اس بار چھاپنے کا علی رحمان نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔ یہ جاسوس آنکھیں اس وقت علی کو دکھائی دیتی تھیں جب وہ نواب شہباز یا اقبال خان سے محو گفتگو رہتا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتا اور وہ آنکھیں کسی پردے یا چلمن کے کونے سے اسے گھورتی ہوئی نظر آتیں۔

اس وقت بھی علی، نواب صاحب اور اقبال۔۔۔ ایک کمرے میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ علی اور اقبال اپنی افواج کے ساتھ کل صبح غروب آفتاب سے پہلے ہی ناگرہ کی طرف روانہ ہونے والے تھے۔ ترپالی پہاڑی پر انہیں رکنا تھا جہاں پالن پور کی فوج سے ان کا الحاق

ہوتا اور اس کو بیٹی نے بعد اٹھی کا گروہ کی طرف ایک کھڑکی صورت میں روانہ ہو جاتا تھا۔

نواب شہباز نے بالآخر اس فوج کی کمانڈ ہاتھ میں لینے کے لیے علی ریحان کو رضامند کر ہی لیا تھا۔ ان کا اپنا سپہ سالار محمد علی تھا۔ وہ ایک بہادر اور دلیر آدمی تھا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ ترپال کی سرحدوں کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔

نواب شہباز نے ایک سو جانثار، تربیت یافتہ جنگی ماہر کے حامل جری سپاہیوں کی ایک صف بنالیں فوج علی ریحان کے سپرد کر دی تھی۔ ان میں دو کپتان تھے مشتاق شاہ اور حفیظ اللہ۔ چار توپچی تھے اسلحے میں سنگین والی ...... رائفلیں اور کارتوس پستولیں تھیں۔ گولہ بارود بھی تھا۔ دو عدد توپیں تھیں۔ دشمن کے قریب ہاتھی بھی تھے۔ ان کے ہودوں میں بہترین نشانچی اور ماہر تیر انداز اور نیزہ باز موجود تھے۔

اقبال خان نائب سالار تھا۔ علی کو اس پر شرمندگی تو ہوئی تھی کہ ایک نواب زادہ اس کا نائب تھا۔ اس نے اس کا اظہار صرف نواب شہباز سے ہی نہیں بلکہ اقبال خان سے بھی کیا تھا۔ انہوں نے بڑی فراخ دلی اور وضع داری کے ساتھ جواب دیا تھا کہ ــــ مقصد اس جنگ کو کامیاب بنانا اور اس کے مثبت نتائج حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا جو جس عہدے کی اہلیت رکھتا ہے، ایمان داری اور غیر جانبداری سے اس کا تعین کرنا ہی عظیم مقصد کی کامیابی ہے۔

علی نے بھی تہہ دل سے نواب صاحب سے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس عظیم مقصد کی خاطر اپنی جان تک لڑا دے گا۔ جبکہ نواب شہباز اور ان کے بیٹے اقبال خان کو اس کا پہلے ہی اندازہ تھا کہ علی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی ایک بہادر اور بے جگر جوان تھا۔ اس نشست کے اختتام تک علی نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک کھڑکی کے جھولتے پردے سے ان دو جاسوس آنکھوں کو دیکھا تھا۔

نشست کے اختتام کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا اور ــــ دانستہ خود کلامی بولنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی کن انکھیوں سے اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے کی طرف بھی دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اسے پردے کا ایک کونا سرکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں وہی دو آنکھیں دکھائی دیں مگر وہ اس سے بہ ظاہر لاتعلق بنا اسی طرح بڑبڑاتا ہوا کھڑکی کے قریب سرکتا چلا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے پردے پر جھپٹا مارا اور کسی کی نرم و نازک گردن اس کے ہاتھ کے مضبوط شکنجے میں آ گئی۔ ساتھ ہی ایک دبی دبی سی نسوانی کراہ آواز بھی ابھری۔

علی نے دیکھا وہ ایک دبلی پتلی اور سانولی سی عام وصورت کی جوان لڑکی تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے ایک معمولی سی ملازمہ لگی تھی۔ بس اس کی ایک ہی خصوصیت تھی کہ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر کشادہ تھیں۔

"کون ہو تم اور کس کے کہنے پر یہ جاسوسی کرتی ہو؟"

"م ــــ میں کسی کے لیے ــــ نہیں ــــ جاسوسی نہیں کرتی۔" وہ ہراساں لہجے میں پھنسی پھنسی آواز سے بولی۔

"جھوٹ مت بولو۔ جانتی نہیں ہو کہ میری اس محل میں کیا حیثیت ہے؟" علی نے درشت لہجے میں اسے دھمکایا۔ "سچ بتادو ورنہ اسی وقت تمہاری گردن کا منکا توڑ ڈالوں گا۔" یہ تہدید کرتے ہوئے علی نے اس کی نازک گردن پر اپنے مضبوط ہاتھ کے شکنجے کا دباؤ تھوڑا بڑھایا تو ایک دم خوف زدہ سے لہجے میں گھٹی گھٹی آواز سے بولی۔

"ب ــــ بتاتی ہوں۔"

"بتاؤ گی تو بچ ــــ ورنہ اب کی بار ایک ہی جھٹکا دوں گا اور قصہ ختم ــــ" علی اس بار خونخوار لہجے میں بولا اور اس کی گردن پر دباؤ کم کیا۔

"و ــــ وہ ــــ میں بی بی کے کہنے پر ایسا کرتی ہوں۔"

"بی بی کون؟ کھل کر بولو۔" علی نے اسے گھورا۔

"م ــــ مہرو ــــ مہر النساء۔"

اس نام پر علی چونکا۔ چھمیاں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس کا شبہ اسی پر تھا۔ وہ تصدیق کی خاطر بولا۔

"مہرو بی بی سے تمہاری مراد وہی خاتون تو نہیں جو نواب صاحب کی بہو اور ان کے چھوٹے بھائی سراج خان کی بیٹی ہے؟"

"ج ــــ ہاں ــــ!"

"ہوں ــــ" علی نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی اور اسے دھکا دے کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ ایک دم خوف زدہ ہو کر یوں بھاگی جیسے اسے تھوڑی بھی دیر ہو گئی تو موت آ جائے گی۔

علی سوچ میں پڑ گیا۔ اگلے دن ناگرہ روانگی تھی۔ وقت سہ پہر تھی۔ اس نے سب سے پہلے اقبال سے اس بارے میں بات کرنا مناسب سمجھا اور اس کی آمد کا منتظر رہا۔ وہ آرام کرنے اپنے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ ان کی آخری نشست رات میں ہوئی تھی۔

اس کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ اسے کہلوا کر اقبال خان کو اسی وقت بلوا لیا۔

وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ علی کو اب بھائی کہتا تھا۔

"خیریت تو ہے نا ــــ علی بھائی! اس وقت بلا لیا۔ یہ آپ کے آرام کا وقت نہیں تھا؟"

"آرام بھی کرلیں گے ابھی رات پڑی ہے۔ یہ بھی آپ تو آرام نہیں کر رہے تھے؟ یا مصروف ــــ"

"ارے ــــ نہیں نہیں میری بھلا کیا مصروفیت ــــ بس ــــ" اقبال کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ علی بھی اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ بے شک اس کے اس نواب زادے کے ساتھ کچھ بے تکلفانہ مراسم پیدا ہونے لگے تھے مگر پھر بھی علی اس کے ساتھ انداز تخاطب، نشست و برخاست اور رائج القابات کے سلسلے میں خیال رکھتا تھا۔ وہ اب اس مخمصے میں پڑ گیا تھا کہ کہیں اقبال کو اس کی بات بری نہ لگ جائے لیکن بات تو حقیقت تھی اور بتانی بھی ضروری تھی۔

"کیا بات ہے، لگتا ہے کوئی اہم بات رہ گئی ہے۔" اقبال نے گہری سوچ میں گم دیکھا تو علی نے ایک گہری سانس خارج کی اور اسے ساری حقیقت بتا دی۔ یہ بتاتے ہی اس نے فوراً سے پیشتر نواب زادے کے چہرے کو دیکھا مگر وہاں ایسے کوئی تاثرات نہ تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اسے علی کی بات بری لگی ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ ایک دم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ــــ یہ مجھ ــــ اور مہرو ــــ" پھر وہ علی سے مخاطب ہو کے بولا۔

"تم ٹھہرو میں ابھی ــــ"

"نہیں نواب زادہ صاحب!" علی ریحان نے ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس سے کہا۔ "ابھی یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ کل ہم نے فوج کے ساتھ ناگرہ روانہ ہونا ہے لیکن مجھے فکر و تشویش اس امر کی ہے کہ آپ کی اس عظیم الشان حویلی پر کل میں چھپے ہوئے دشمن ہماری غیر موجودگی میں کوئی گل نہ کھلا دیں۔"

"میں اسی لیے تو بیتی کرنے جا رہا ہوں۔" اقبال غصے میں بولا۔

"آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔" علی نے تحمل سے کہا۔ "اگر گھر کا کوئی فرد، جیسا کہ اس مذکورہ واقعے سے ... سکتا ہے یہ تو آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان پر کسی قسم کا تشدد کیے بغیر سردست حویلی میں نظر بند کر دیا جائے اور ملازمہ کو ذرا یہاں سے نکال دیا جائے۔"

اقبال نے علی کی طرف دیکھا اور اچانک سے مسکرا دیا۔ علی کو حیرت ہوئی۔ اقبال اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں بولا۔

"علی! الفاظ ــــ مجھ کا تو تم نے نام لے لیا مگر جو اصل مجرم ہے اس کا نام تم نے لیے بغیر اشارے سے کام چلایا۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی اور شرافت ہے۔"

"مجھے اپنے معزز میزبانوں کے گھر میں کسی پردہ دار خاتون کا نام لینا مناسب نہیں لگتا۔" علی نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن مجھے ان کے مجرم ہونے پر بے حد افسوس ہے۔"

"ہاں امیر النساء میری بچپن کی منگیتر تھی۔ ہمارے دادا حضور کی یہی خواہش تھی کہ دونوں بھائی (نواب شہباز خان اور سراج خان) آپس میں خاندانی اور خون کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے کے سمدھی بھی ضرور بنیں۔ دادا حضور کی یہ خواہش ایک طرح سے ان کی وصیت کا بھی درجہ رکھتی تھی۔ یوں مہرو تین سال پہلے میری بیوی بن کر یہاں آ گئی۔" وہ اتنا کہہ کر رکا پھر بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں، کل صبح روانگی ہے۔ فجر کی نماز سب اکٹھے ادا کر کے نکلیں گے۔"

"ان شاء اللہ۔" علی نے کہا۔

اگلے دن باجماعت نماز فجر ادا کی گئی اور یہ جنگی قافلہ ناگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی سالار کی حیثیت سے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے پاس رائفل، ترولی اور تلوار بھی تھی۔ کمان ... اس کے کاندھے پر تھی اور ترکش اس کی کمر پر۔ وہ پوری طرح سے ہتھیاروں سے لیس تھا۔

اقبال خان بھی اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ بھی ہتھیاروں سے لیس تھا .... یہ قافلہ دوپہر تک رواں دواں رہا اور بالآخر سہ پہر تک یہ ناگرہ پہنچ گئے۔

علی کو اب اس بات کا خوف نہ تھا کہ راج محل کے لوگ اسے "سوشیل" کے حوالے سے پہچان لیں گے۔ اب وہ دور والی بات ہی نہیں رہی تھی۔ فرنگیوں کے اب سب دشمن بن بیٹھے تھے تاہم پھر بھی اس نے کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے کافی حد تک اپنی مخصوص پوشاک کے ذریعے حلیہ بدل رکھا تھا۔

استقبال کیا۔ پھر علی ریحان اور اقبال خان کو راجا پرتاب کمار کے روبرو بھی پیش کیا گیا۔ راجا پرتاب نے ان کے جذبۂ یکجہتی کو سراہا اور انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اسی طرح شام تک پالن پور سے مہاراجا مہندر سنگھ کی بھی امدادی فوج پہنچ گئی۔

راتوں رات اتحادی افواج کے سالاروں کی اہم نشست ہوئی اور یہ لوگ جنگی حکمتِ عملی تیار کرنے لگے۔

☆☆☆

حویلی نما اس مکان کے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں سراج خان اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی بھی تھی اور تفکر و تشویش کے گہرے سائے بھی۔

اس کمرے میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ تین افراد اور بھی تھے جن میں اس کا بدہیئت قسم کا ملازم بھی شامل تھا جو درحقیقت ایک بدمعاش تھا۔ سراج کے آدمی اسی کے زیردست رہتے تھے۔ اس کی دائیں کنپٹی زخمی نظر آرہی تھی اور اس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا نام داور تھا۔ دوسرا انسپکٹر منظور شاہ تھا جبکہ تیسری شخصیت نجمہ کی تھی۔ یہ وہی نجمہ تھی، جسے علی ریحان نے بے نقاب کیا تھا اور بعد میں اسے نواب شہباز نے ہمیشہ کے لیے پری محل سے نکال دیا تھا۔

یہ تینوں گم صم اور شکست خوردہ سے کھڑے تھے۔

اچانک سراج خان ٹہلتے ٹہلتے رکا اور ان تینوں کی طرف گھوما پھر غیظ بھرے لہجے میں بولا۔

"غضب ہوگیا یہ تو... یہ میدان میں شکست ہو رہی ہے ہمیں... ایک طرف وہ چکنی مچھلی کی طرح ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور دوسری طرف منظور شاہ تم بھی کچھ نہیں کر سکے۔ تیسری جانب داور نے راہزن کے بھیس میں بھی کچھ نہیں کیا اور اب یہ نجمہ بھی اپنا چہرہ لٹکائے یہاں روتی ہوئی آگئی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پھر غصے سے ٹہلنے لگا اور پھر رک کر ان کی طرف گھوم گیا۔ تینوں کی طرف دیکھ کر اس نے دانت پیس کر دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔

"جی تو چاہتا ہے کہ تم تینوں کے چہروں پر کالک مل دوں۔"

"جناب! میں نے تو پوری کوشش کی تھی۔" انسپکٹر منظور شاہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میں نے اور داور نے راہزنوں کے ٹولے کا ڈراما بھی کیا تھا مگر..."

طیش کے مارے دہاڑ کر بولا۔ "اب جانتے ہو وہ کیا اہم پیغام تھا اور ہمارے لیے کتنا اہم ہوگا۔ اس جنگ کا کیا احوال ہوتا جس کی اتحادی فوجوں کی صورت میں ناگرہ کی جانب روانگی ہو رہی ہے۔ اوپر سے یہ بدذات عورت نجمہ نے کام خراب کردیا خود کو ظاہر کرکے۔ شہباز خان اب مجھ پر ایک بار پھر نظربندی کے احکامات جاری کردے گا۔ یہی وقت تو تھا انگریز بہادر کی مدد وہاں لینے کا، سب بگڑ گیا۔ سارا کام لوگوں کی نالائقیوں کی وجہ سے خراب ہوگیا۔ تم صرف حرام کے نوالے توڑتے رہے ہو اور بس..."

وہ بری طرح تلملانے لگا۔ ان تینوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

"دفع کیوں نہیں ہوجاتے اب ہماری نظروں کے سامنے سے..." وہ پھر جنونیوں کے سے انداز میں چلایا۔

"تمہاری منحوس صورتیں دیکھ کر میرے اندر کا ابال مزید بڑھ رہا ہے۔"

وہ تینوں الٹے قدموں وہاں سے کھسک گئے۔ سراج خان کرسی پر گرنے کے انداز میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ وقت اور موقع بڑا نازک تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایسے میں اگر وہ انگریز سرکار کے کام آجاتا تو یہاں ان کی نظروں میں اس کا اہم کام شمار ہوتا۔

اچانک وہ ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال پر چونکا اور خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"چلو زیادہ نہیں مگر اتنا تو کر ہی سکتا ہوں کہ ناگرہ کی طرف اتحادی افواج کوچ کر چکی ہے... بے شک ان کے مخبروں نے بھی مطلع کردیا ہوگا لیکن میں تو اپنا 'فرض' نبھاؤں۔"

یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً داور کو بلایا اور اسے یہی پیغام دے کر فوراً روانہ کردیا۔

سراج خان کے تعلقات کرنل ایڈورڈسن تک تھے۔ داور یہ پیغام لے کر اسی وقت ایک برق رفتار گھوڑے پر دلی کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

پچھو رام سے ملنے کے بعد پرس رام کو اب کہیں جاکر کچھ سکون حاصل ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ پچھو رام اس نازک مرحلے میں ضرور اس کی مدد کرے گا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ وہ تو خود یہاں ان کی قبر کھودنے کی نیت سے آیا تھا۔ جبکہ کھوج بھی چکا تھا اور کرنل ایڈورڈسن اپنے سینے میں انتقام کی ایک زبردست طوفانی آگ لیے اس طرف کا رخ کرنے

بھینٹ کالی کے مندر کی بھی ایک سے ایک جواہرات سے آراستہ ہوا تھا۔

پرس رام اس وقت خیالوں کی جنت میں تھا کہ اچانک اسے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔

"پرس رام... اترنت ہمارے پاس پہنچو۔"

وہ اس آواز اور حکم پر بری طرح لرز گیا اور ہڑبڑا کر اپنے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا تو بھی دروازہ... وہ حیران ہوا اور خوف زدہ بھی۔ اگرچہ وہ اس آواز کو پہچان چکا تھا جو مہاپجاری بدری ناتھ ہی کی تھی لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ آواز اس قدر قریب سے آئی تھی جیسے بدری ناتھ اس کے کہیں آس پاس ہی موجود ہو۔

بہرکیف... وہ ایک دم اٹھ کر بھاگا کمرے سے نکلا اور دھوتی سنبھالے بھاگتا ہوا اس کے کمرے کی طرف جانے کے لیے بڑے وسیع و عریض ہال سے گزرا جہاں کالی کا دیوقامت، پراسرار اور بدہیبت بت ایستادہ تھا کہ اچانک بدری ناتھ کی آواز نے اس کے قدم وہیں روک دیے۔

"رک جاؤ پرس رام..."

پرس رام کا دل دھک سے رہ گیا۔ جسم بھی لرزا۔ سیدھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اس نے دیکھا وہاں اور گرد اور پجاری کھڑے تھے... ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ وہ کچھ گیا کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ مہاپجاری اس پر بری طرح برہم ہے مگر کیوں...؟ اسے معلوم نہیں تھا۔

اس کا رخ کالی کے بت کی جانب تھا اور اگلے ہی لمحے اس نے جب کالی کی مورت سے مہاپجاری بدری ناتھ کو نمودار ہوتے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی پرس رام کا اپنا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔

مہاپجاری بدری ناتھ کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ اسی وقت سانپوں کی تیز آواز کے ساتھ پھنکاروں سے ہال گونج اٹھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد زہریلے سانپ بت کے سر، کاندھوں اور پھیلے ہوئے آٹھ ہاتھوں پر رینگتے نظر آنے لگے مگر ابھی تک کسی سانپ نے رخ نہیں کیا تھا۔

"پرس رام! تم نے ایسا کیوں کیا...؟ کیا تمہیں نہیں پتا تھا کہ ہم... مہاکالی کے مہابلی... بلکہ مہارشی ہیں۔"

بدری ناتھ نے اسے قہرناک اور سرخ انگاروں بھری آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہم... ہم... مہاشے... جی... مگ...

گی... لیکن مجھ سے غلطی کیا ہوئی؟" پرس رام کی حالت پتلی ہوئی جارہی تھی۔

"تم نے اس مندر کی کالی ماں دیوی کی اتھیا کی ہے مورکھ! اب اپنے انجام کی چنتا کر..." بدری ناتھ بولا تو پرس رام حیران و پریشان رہ گیا۔

"تم نے... پچھو رام کو اندر آنے کیوں دیا؟ ہم اب کی بائی اور پچھو رام سے ہر قسم کا سمبندھ توڑ چکے تھے۔ تم اس کی باتوں میں کیوں آئے اور اس کھنڈر کا راز کیوں اگلا؟"

بدری ناتھ کی زبانی یہ سن کر پرس رام آدھی موت مرگیا۔ اس نے ملتجیانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے لیکن اسی وقت کالی کے بت پر رینگتے ہوئے کئی زہریلے سانپ اچھلے اور سیدھا پرس رام کے اوپر آن گرے۔

"مجھے... چھما کرو... مہاگرو..." پرس رام کے منہ سے انتہائی کربناک آہ برآمد ہوئی اور اسی لمحے ایک ایک سانپ نے اس کی گردن میں دانت گاڑ دیے۔ پرس رام کے حلق سے جگر پاش چیخ ابھری۔ دوسرے سانپ نے اس کے چہرے پر پھن مار کے اسے بری طرح ڈسا کہ پرس رام کی کپکپاتی چیخوں میں دم ہی نہ رہا... اور وہ فرش پر گر پڑا۔ اس کا منہ کھل گیا اور منہ سے جھاگ بہہ نکلا۔ اس کا وجود ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا... اور بالآخر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

ان بدمعاش پجاریوں میں سے ایک پجاری اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔

دیگر پجاری سر جھکائے ہاتھ جوڑے اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔ کسی نے آگے بڑھ کر پرس رام کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"دیکھ لیا تم سب نے غداری کا انجام..."

مہاپجاری بدری ناتھ نے گونجیلی آواز میں کہا۔

"ہم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ ہم مہابلی نہیں بلکہ مہارشی بن چکے ہیں۔"

"رشی مہابلی کی جے... رشی مہابلی کی جے..."

وہاں موجود دیگر پجاریوں نے نعرے لگائے۔

"تم کیا جانو کہ ہمیں کالی نے کتنی شکتیاں دان کردی ہیں۔ افسوس پرس رام کے انجام پر ہے ہمیں کہ اس نے ہماری، کالی کی طاقت پر بھروسا نہ کیا اور ایک راز کھول دیا۔ کسی اور سے مدد مانگی۔ اس کا یہی انجام ہونا تھا۔"

پجاریوں نے پھر سے جے کار کے نعرے بلند کر

میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ وہ آنکھیں موندیں زیر لب کچھ بڑبڑانے لگا اور تمام سانپ رینگتے ہوئے کالی کے بت کے عقب میں جا کر غائب ہو گئے۔

''ہمیں سب معلوم ہے۔'' بدری ناتھ پھر آنکھیں کھول کر بولا۔

''فرنگی ناگرہ پر چڑھائی کرنے والے ہیں۔ انہوں نے جنگ کا بگل بجا دیا ہے۔ یہ لوگ کالی کے اس پوتر استھان پر بھی حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر ہم انہیں نشٹ کر کے رکھ دیں گے۔ ہاہاہاہا۔۔۔''

یہ کہتے ہوئے مہا پجاری بدری ناتھ نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور پھر کالی کے بت کے پیچھے جا کر غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے کمرے میں تھا۔ یہ کمرا مندر کے تہ خانے کے قریب ایک بعید ترین گوشے میں بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں وہ جاپ لاپ کیا کرتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کوئی نیچے زمین پر اور کچھ دیواروں کے طاقچوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں عجیب سی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ چھت سے دو گھنٹیاں بندھی ہوئی جھول رہی تھیں۔ ایک جانب ترشول رکھا ہوا تھا اور بھی الا بلا پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

کمرے کے وسط میں انگیٹھی تھی جس میں شعلے دہک رہے تھے۔ اس نے ایک طاقچے سے سیاہ رنگ کی مورتی اٹھائی۔ یہ کسی مرد سادھو کی تھی، جو خاصا موٹا تازہ اور موٹا تھا۔ وہ نیم برہنہ تھا۔ اس کا سر بھی گنجا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کھلی پڑی تھیں۔ ایک میں قشقے کا مسالا اور دوسرے ہاتھ میں زرد رنگ کا پاؤڈر تھا جیسے سیندور ہو۔

بدری ناتھ نے اس مورتی کو نہایت احترام کے ساتھ اٹھا کر اپنے سامنے فرش پر رکھا اور خود بھی پلتھی مار کے بیٹھ گیا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس مورتی کے سامنے اپنا ماتھا ٹیکا اور پھر سیدھا ہو کے آنکھیں موندیں۔ وہ زیر لب کچھ بڑبڑانے لگا۔۔۔ ذرا دیر بعد وہ سادھو کی مورتی کے دونوں آگے کی طرف پھیلے ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیوں سے سفوف نما شے کو چٹکی میں لیتا اور دہکتی ہوئی انگیٹھی میں ڈال دیتا۔ شعلے ایک لمحے کو دہکتے اور آگ بھڑکتی اور پھر معدوم سی ہو جاتی۔

اچانک انگیٹھی میں سلگتے الاؤ کی روشنی تھوڑی ماند پڑی اور کمرے میں تاریکی سی پھیل گئی۔ تب ہی ایک ہنکارا ابھرا ہو۔

مہا پجاری بدری ناتھ نے یک دم اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کا ماحول ایکا ایکی خوفناک اور پراسرار سا ہو گیا تھا۔ بدری ناتھ کی کھلی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک خمار سا تھا۔ اس کا مکروہ چہرہ ذرا ذرا سا ہونے لگا۔ تب ہی اس کے حلق سے آواز ابھری۔ یہ اس کی اپنی آواز ہرگز نہ تھی۔

''کالی کی رکھشا تیرے ذمے ہے۔ کالی کا استھان خطرے میں ہے۔ پر تو مجھے کالی نے شکتیاں دان کر دی ہیں۔ اسے مہا شکتی کرنے کے لیے تجھے ایک کنواری کنیا والی فرنگن کو ترنت بلیدان کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ [illegible] سیاہ مندر کے پوتر استھان اور کالی کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔۔۔ مجھے اور کالی کو اس کنواری کنیا کے خون سے نہلا دے۔''

بدری ناتھ کے موٹے موٹے بدہیئت ہونٹ ایک دم تھم گئے۔ آنکھوں میں شیطانی لو غائب ہو گئی۔ چہرے کا ذرا ذرا پن جاتا رہا۔ اس کا چہرہ بتدریج معمول پر آ گیا۔ [illegible] بار بدری ناتھ کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمودار ہوئے اور وہ فوراً اٹھا۔ انگیٹھی سرد ہو چکی تھی۔ اس نے مورتی کو طاقچے میں اٹھا کر رکھا اور کمرے سے نکل کر [illegible] ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا اور تین [illegible] روبرو پیش کیا پھر انہیں حکم دیا کہ اسی وقت [illegible] کی طرف نکل جاؤ اور اس فرنگن (ریٹا) کو اٹھا لاؤ۔

☆☆☆

وڈیرے نما اس کمرے کی بہ ظاہر تو حالت [illegible] تھی جس کا ماحول سیلن زدہ سا تھا۔ دیواریں بھی [illegible] اور زنگ آلود ہو رہی تھیں۔ ایک چارپائی بچھی [illegible] تھا۔ آگ تاپنے کے لیے ایک کونے میں انگیٹھی رکھی تھی پانی کا گھڑا تھا اور اس [illegible] تھا۔۔۔ ایک کونے میں میلا چیکٹ موٹا سا گرم [illegible] پڑا تھا۔

اب شام ہو چلی تھی اور تاریکی سی اطراف میں [illegible] گئی تھی۔ سردی بھی بڑھنے لگی تھی۔ مراد خان نے [illegible] دہکا دی تھی اور گرما گرم قہوہ بنا لیا تھا۔

پھر قہوہ پینے کے دوران اریبہ اور شاہ زمان [illegible] مراد خان کو دھیرے دھیرے اور سرگوشی میں [illegible] دیں۔ [illegible] کے بعد چند ہدایتوں کے لیے مراد [illegible] خاموشی اختیار کر لی اور اس کے بعد سرگوشی میں بولا۔

حالات خراب ہیں اور تمہیں یہ مشن بھی جلدی نمٹانا ہوگا۔''

''ہم خود بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتے۔'' شاہ زمان نے فوراً جواب دیا۔ ''کیونکہ ہمیں بھی ان حالات کا اندازہ ہو چکا ہے۔ یہاں بندرگاہ پر تو زیادہ ہی سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔''

''اس لیے کہ۔۔۔ خاور حیات والے مشن کی بھنک پڑنے اور اس کی ناکامی کے بعد فرنگیوں کو خوب اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کی چوری مجاہدین کے علم میں آ چکی ہے اور وہ خاور حیات کی ناکام مہم کے بعد اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ کوئی اور مجاہد گروپ یہاں کا رخ کر سکتا ہے اور اس [illegible] تک رسائی کی کوشش بھی جلدی ہی سے شروع ہوتی [illegible]'' مراد بولا۔ ''لیکن اس کے ساتھ ہی تمہیں ایک خوش [illegible] بھی سناؤں گا۔ اس بار اس مشن میں خطرہ پہلے کی نسبت کم ہو گیا ہے اور کچھ آسانیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔''

''اچھا۔۔۔ وہ کیسے؟'' شاہ زمان نے اس کی طرف دیکھ کر [illegible] اور شاہ زمان کی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

''کرنل اینڈرسن ایک تجربہ کار اور گھاگ آدمی ہے [illegible] اور بے رحم بھی لیکن اب وہ اس جزیرے پر نہیں رہا۔ [illegible] کے لیے کہیں چلا گیا ہے۔ اس کی جگہ ایک کیپٹن کو [illegible] دیا گیا ہے۔ اس کا نام جیکس ہے۔ وہ ایک نوجوان [illegible] ہے۔ اس کی نئی نویلی بیوی انڈیا سے آئی ہے [illegible] کہ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وہ دونوں [illegible] سرکاری اہلکاروں کی معیت میں اس جزیرے [illegible] طرف گئے تھے۔''

''اوہ۔۔۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' اریبہ اس [illegible] آسانی محسوس کر کے خوش ہو کے بولی۔

''ہاں اریبہ بہن اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ واقعی [illegible] اچھا ہے۔ پتا نہیں کب کرنل اینڈرسن [illegible] اس سے پہلے یہ مشن نمٹا لو۔''

[illegible] ہو چکا تھا اچانک باہر سے کسی نے ٹین کے [illegible] پر موٹا سا ڈنڈا زور سے بجایا۔ تینوں چونک [illegible] مراد نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے [illegible] انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ شاید [illegible] کے اس انداز کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا کہ باہر [illegible] کھڑے ہیں۔

[illegible] اور اس نے ان دونوں کے نوکروں کو فرش پر [illegible] دروازے کی طرف لپکا۔

اینڈ دوسرے پر رکھا اور فرش پر پھیلی ہوئی گٹھلیوں اور چھلکوں کا شمار کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اندر داخل ہونے والے دو تنومند اور سپاہی تھے۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں۔۔۔؟''

ایک فرنگی نے درشت لہجے میں پوچھا ساتھ ہی وہ دونوں فرش پر بیٹھے اریبہ اور شاہ زمان کو گھورتے ہوئے [illegible] ہوئے دیکھنے لگے۔

''کون۔۔۔ ہیں یہ دونوں۔۔۔؟'' دوسرے نے بھی سوال داغا۔

اریبہ اور شاہ زمان اپنا ''کام'' چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ مراد نے قدرے مؤدبانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''سرکار۔۔۔ یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اصل میں کے بھتیجے لائے تھے۔ کچھ لین دین اور ضروری بات کرنا تھا ان سے۔''

''ہوں۔۔۔'' ایک فرانٹ سے سپاہی نے ہنکاری بھری۔ پھر تحکمانہ درشتی سے بولا۔

''انہیں جلد فارغ کرو یہاں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں۔''

''جی حضور ابھی ایک پل۔۔۔ یہ خود بھی جلدی میں ہیں، بس تھوڑی دیر۔'' مراد نے کہا۔ ''قہوہ پیش کروں سرکار۔۔۔؟''

دونوں سپاہی ایک دوسرے کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے پھر ایک نے مراد سے کہا۔

''ہم باہر کھڑے ہیں۔ وہ پیالی بھیج دو۔''

''ابھی بھیجتا ہوں حضور۔۔۔!'' مراد نے کہا۔ وہ دونوں فرنگی سپاہی اریبہ اور شاہ زمان کو ایک بار پھر کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد مراد نے جلدی جلدی انگیٹھی پر دوبارہ قہوہ تیار کیا اور دو پیالیاں باہر کھڑے سپاہیوں کو پیش کیں۔ جسے پینے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے گشت پر آگے نکل گئے۔

''دیکھا تم لوگوں نے۔۔۔ کس قدر سختی ہے۔'' مراد ہولے سے بولا اور وہ دونوں اپنے سر کو پرخیال انداز میں دھیرے دھیرے جنبش دینے لگے۔

تھوڑی دیر بعد مراد نے ٹین کے کمرے سے نکل کر باہر ادھر ادھر جھانکا۔ وہاں سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ دوبارہ اندر آیا اور بولا۔

''یہی وقت ہے فوراً نکلنے کی کرو۔ وہ سارے لوگ شراب و کباب میں مصروف ہوں گے۔ دوبارہ گشت شروع ہو گیا تو منزل کا رخ نہیں کر سکو گے۔''

باہر نکل گیا کرتا تھا۔

اریب اور شاہ زمان جلدی سے نکلے اور مطلوبہ سمت کی طرف بڑھ گئے۔ جلد ہی انہیں وہ لانچ دکھائی دے گئی جہاں انہیں پہنچنا تھا۔

لانچ پر سناٹا طاری تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ چند گن مین روشن اور کچھ تاریک تھے۔ وہ چاق گشت کرتے نظر آئے۔ ان کے انداز سے تساہل ظاہر ہو رہا تھا۔ شاید وہ شراب و کباب کی اس شبینہ تقریب سے محرومی پر بددلی کا شکار تھے۔

اریب اور شاہ زمان — ان کی نظروں سے بچتے ہوئے لانچ میں سوار ہو گئے۔

مراد کے مطابق یہ لانچ ہر روز رات کے دوسرے پہر جاپانی اور تو... کی شکل میں جرائے کے لیے مذکورہ جزیرے تک آتی جاتی تھی۔

لانچ کے اندر ایک محفوظ اور مخفی جگہ پر دونوں چھپ کر بیٹھ گئے۔

مہم کا ایک بڑا ابتدائی حصہ کامیابی سے اور غیر متوقع طور پر جلد طے ہو گیا تھا۔ مہم ابھی آخری اور فیصلہ کن مرحلہ باقی تھا۔ اگرچہ یہاں تک بھی رسائی حاصل کرنا خطرے سے خالی نہ تھا مگر دونوں نے اپنی روایتی ہوشیاری اور زیرک دماغی سے ابتدائی مرحلہ کامیابی سے سر کر لیا تھا۔ آگے کی بھی انہیں امید اسی لیے تھی کہ اب وہاں کرنل ابتدائی جیسے گھاگ، تجربہ کار اور فراست افسر کے بجائے ایک کیپٹن رینک کا نوجوان تعینات تھا۔

شاہ زمان بھی چاہتا تھا کہ کرنل ابتدائی ہوتا تو وہ اسے جہنم واصل کر کے خاور حیات اور اس کے مجاہد ساتھیوں کی موت کا بدلہ ضرور لیتا۔

☆☆☆

رات اپنے جوبن پر تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ جنگل میں سناٹا طاری تھا۔ دور کہیں بھی کسی جانور کے رونے کی آواز ابھرتی اور پھر وہی سناٹا منحوس گدھ کی طرح اپنے پر پھیلا لیتا۔

وہ تینوں پجاری بہت احتیاط کے ساتھ ریکاشی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔

ریتا کے اغوا کی منصوبہ بندی اور اس کا کھوج لگانے کی مہم بہت پہلے سے جاری تھی۔ پھر جب مقرر کردہ دو جاسوس پجاریوں نے مطلع کیا تھا کہ ریتا کاشی بستی کے ہی

پہرے سے تو چوری ناممکن ہوتی کہ اب وہ نکل کر ... جاسکتی تھی۔ تاہم اسے کوشش تو ہوتی تھی کہ وہ ان کے دشمنوں کی گود میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھی۔

اس وقت بستی پر مکمل خاموشی کا راج تھا۔ سرکنڈوں اور پھر بیل کی لکڑی کی چھتوں والے جھونپڑوں اور ... پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

تینوں پجاری اب بڑے آرام اور اطمینان کے ساتھ مطلوبہ جھونپڑے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر ایک نے کھڑکی کا رخ کیا، دوسرے نے دروازے کی طرف ایک تیسرا عقب میں چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد اپنے تئیں کچھ اطمینان کر کے وہ دروازے پر آ کر یکجا ہو گئے۔

"اندر وہ گوشے پہ ہے ... ہیں۔ دونوں ... جھونپڑے کی عقبی دیوار کے پاس ہے۔" ایک پجاری سرگوشی کی۔

"وہاں ایک کھڑکی بھی ہے مگر وہ اتنی بڑی نہیں کہ اندر گھس سکیں۔"

"ہم دروازے سے جائیں گے لیکن صرف ... ایک باہر ہی موجود رہے گا۔"

دوسرے پجاری نے اثبات میں اپنے ... "اگر کوئی جاگ پڑا تو خنجر مار کے ہلاک کر دوں گا۔"

پھر تینوں شیطان کے پجاری ... دونے جھونپڑے کا کمزور سا دروازہ دھکیل دیا۔ ... تھا۔ ایک دیا روشن تھا جس کی پیلی زرد روشنی میں ... سوئے اور گرم لبادے اوڑھے گہری نیند سوتے ... آئے۔ یہ دونوں شوہر اور بیوی تھے۔

دونوں پجاری — ان کے بیچ سے گزر ... ساتھ جھونپڑے کے عقبی گوشے کی جانب بڑھے۔

اندر قدم رکھتے ہی ان کے چہروں پر ... مسکراہٹ طاری ہو گئی۔ ... ریتا ... قریب ... نیند سو رہی تھی۔

یہ دونوں اپنا شکار تاڑ چکے تھے۔ اس کے ... نے اپنے لبادے سے کوئی سفوف نکالا اور ... ہوئی ریتا کے چہرے پر چھڑکا۔ اس کے بعد ... سے ان دونوں نے ریتا کے بے سدھ وجود کو ... کاندھے پر لادا اور جھونپڑے سے باہر نکل گئے۔

(جاری ہے)

... لیکن ایک پہلو ایسا بھی ہے جو ہم بھی ...

☆☆☆

... ایسا ... سی تھا۔

... کی آنکھوں کا تارا وہ دادا دادی کی زندگی کی سب ... اور ... کا راج دلارا بھائی۔ ... اس قدر ... کہاں کے ... کی بھول ہی نہ سکا۔

... اتفاق کی سماعت میں ان فقرات کی گونج پڑی۔

"ارے میاں اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ماشاء اللہ۔ انور ... کے معاملے میں بھی کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔" ابا جان فوراً وضاحت دیتے۔

یوں لگ بھگ ... اس کی زندگی میں "معاشی ..." نے بے حد اہمیت اختیار کر لی۔

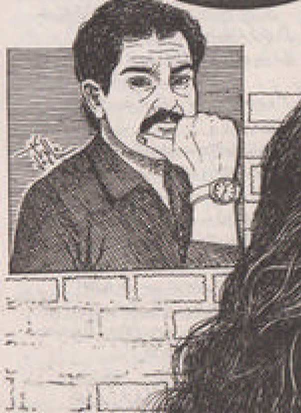
تین سال کی عمر میں اسے قریبی مسجد میں بھیج دیا گیا۔ سفید براق شلوار قمیص میں ملبوس، سر پہ جالی دار ٹوپی، آنکھوں میں سرمہ، گردن پر خوشبو دار پاؤڈر اور بازو پہ دادی جان کا دیا ...

جی جی کر مرنا اور مر مر کر جینا، عجیب فلسفہ ہے زندگی کا... اس کے باوجود وقت کا ایک ایک لمحہ اپنا حق ادا کرنے میں کسی غفلت کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ بھی کیسا مقدر لکھوا کر لایا تھا۔ جن کی نظروں میں سب سے بلند مقام ہونا تھا انہی کے دل سے اتر گیا مگر کیوں... اس سوال کا جواب تلاش کرتے کرتے وہ عمر کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔ افسوس جواب نہ پاسکا البتہ زندگی کے آخری باب میں اس تشنگی کی کچھ یوں تلافی ہوئی کہ اسے خدا کی رضا پر پیار آگیا۔

آخری باب

کبھی اپنوں اور کبھی غیروں سے ٹکرائے جانے والے ایک معصوم انسان کا قصہ

زویا اعجاز





"مجھ سے دل لگا کر سپارہ پڑھنا میرے شہزادے۔" ماں نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے ہدایت کی۔

"جی اماں! میں خوب دل لگا کر پڑھوں گا۔" اس نے اپنا ننھا سا سینہ تان کر کہا۔

"وہاں گندے بچوں کے ساتھ وقت مت گنوانا۔" بڑی بہن نے سمجھایا۔

"لیکن گندے بچے مسجد میں کیسے آسکتے ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مسجد اللہ کا گھر ہوتا ہے۔" اس کے چھوٹے سے ذہن نے فوراً تاویل پیش کی۔

"اُفوہ! بھئی ہمارا مطلب ہے کہ دوستی سوچ سمجھ کر کرنا۔" بہن نے جواب دیا۔

"بھئی اخلاق میاں! مولانا صاحب سے ہماری بڑی اچھی یاد اللہ ہے۔ انہیں کسی شکایت کا موقع دیا تو سمجھو ہماری ناک کٹ جائے گی۔" دادا جان نے بڑے مان سے کہا۔

"میں کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا دادا جی! میں ان کی ہر بات مانوں گا۔" اخلاق نے انہیں یقین دلایا۔

"چلو بھئی! میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ دیر سے جانا بالکل اچھی بات نہیں ہوتی۔" ابا نے بھی پیچھے سے ایک نصیحت تھمائی۔

"میں کبھی بھی دیر نہیں کروں گا ابا جان! ہمیشہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو جایا کروں گا۔"

"شاباش! بڑوں کی بات ماننے والے زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہوتے۔" ابا نے ایک گر سکھایا جو اس نے اپنے ذہن کی سلیٹ پر انمٹ سیاہی سے نقش کر لیا۔

اخلاق علی نے گھر کے ہر فرد سے کیا ہوا وعدہ مکمل ایمانداری سے نبھایا۔

قاری صاحب اس کی ذہانت اور تابعداری سے بہت خوش تھے۔ وہ اپنا سبق سب سے پہلے یاد کرتا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی بہت اپنائیت سے نمٹا دیتا۔ بچوں کے زیر استعمال چٹائیاں بچھانے اور تہ کرنے کی ذمے داری اس نے بن کہے ہی سنبھال لی تھی۔ گھڑوں میں پانی بھرنے اور جھاڑو دینے میں بھی اسے کوئی عار محسوس نہ ہوتا۔

"اخلاق تو ہمارا سب سے ہونہار شاگرد ہے۔ بڑا ہی بخت آور ثابت ہوگا۔" ایک روز مولانا صاحب نے دادا جان کو بتایا۔ ان کا خون سیروں بڑھ گیا۔

☆☆☆

دوسرا باب:

اخلاق علی کی عمر پانچ برس عبور کر چکی تھی۔ وقت آن پہنچا تھا۔ ابا جان نے ایک قریبی اسکول میں اس کا داخلہ کروا دیا۔ روانگی کے پہلے روز گھر میں عجیب کہرام برپا تھا۔ اس کے صدقے کے لیے ایک کالا بکرا پہلے ہی ذبح کیا جا چکا تھا۔ چاروں بہنیں، والدین اور دادی اماں کی حالت ایسی تھی گویا اسے میدان جنگ میں بھیجا جا رہا ہو۔

"آج تمہاری زندگی کا بہت اہم دن ہے بیٹا! اب تم نئے دوست بناؤ گے۔ معاشرے میں چلنا سیکھو گے۔" ابا جانے کیوں ایسی مشکل باتیں کرتے تھے جنہیں وہ مکمل سمجھ ہی نہ پاتا۔

اخلاق کے ذہن نے چپکے سے یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لی کہ مشکلوں کا سامنا ہی اسے مردانگی کا تمغہ دلوا سکتا ہے۔ اس نے ایک نئے جذبے سے کمر کس لی۔

☆☆☆

اخلاق اسکول کی پڑھائی میں بھی بہت ہونہار ثابت ہوا۔ اساتذہ اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے۔ تابعداری تو اس پر ختم تھی۔ والدین اور بہنوں کے سنگ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ کوئی معاشی پریشانی بھی نہ تھی۔ زندگی دیگر مسائل۔۔۔ وہ احسن طریقے سے تعلیمی مدارج طے کرتا چلا گیا۔ اسی دوران بڑی دو بہنوں کی شادی ہو گئی۔ اخلاق نے میٹرک کا امتحان شاندار نمبروں سے پاس کیا۔

"آج اماں بی کی روح کتنی خوش ہوگی۔ کاش وہ ہم سب میں موجود ہوتیں۔" ابا جان آبدیدہ ہو گئے۔

"ہاں ابا بھی ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔" اس کے چچا نے قدرے حاسدانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کا بیٹا اخلاق سے دو سال بڑا ہونے کے باوجود میٹرک میں کئی بار فیل ہو چکا تھا۔ تنگ آ کر چچا نے اسے اپنے ساتھ دکانداری سکھانی شروع کر دی تھی۔

"اخلاق بیٹے نے واقعی ہمارے خاندان کا نام روشن کر دیا ہے۔" ایک ماموں نے بھی محبت جتائی۔

"لیکن اصل آزمائش کا وقت تو اب شروع ہوگا۔" چچا نے چٹکتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔۔۔ اب ایسا کیا ہو گیا؟ خدا نہ کرے بچے کو آزمائشوں سے خوفزدہ نہ کیجیے۔" امی بول اٹھیں۔

"اب اخلاق میاں کالج میں داخلہ لیں گے۔ وہاں تو لڑکے ایک سے ایک رہتے ہیں پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔" چچا کی شیریں زبان ان کی آنکھوں میں جھلکتے عکس سے بالکل لگا نہیں کھا رہی تھی۔

ایسی کوئی عمر ہے کہ سب ہی جنہیں پہچان سا بھی ہوتی ہیں۔ ہم نے انہیں عورت ذات کی عزت کرنا بہت صحیح سے سکھایا ہے۔" ابا جان کے ان سنجیدہ الفاظ نے اسے اپنی ہی نظروں میں معتبر کر دیا۔

اس روز اپنے بزرگوں کے مابین بیٹھے اخلاق علی نے عزم صمیم کر لیا کہ اپنا دھیان محض پڑھائی ہی کی طرف رکھے گا۔ ڈاکٹر بننا اس کا جنون تھا اور اس جنون کی راہ میں آنے والا ہر پتھر وہ پاش پاش کر دے گا۔

☆☆☆

تیسرا باب:

میڈیکل کالج میں داخلہ اخلاق کے حسین ترین خوابوں کی تعبیر تھا۔ پڑھائی میں تو وہ شروع ہی سے بہت اچھا تھا۔ تیزی اور لگن شامل ہوتے ہی اس کی کامیابیاں مزید نکھرنے لگیں۔ پہلے سال کا اختتام انٹر بورڈ میں اس کی تیسری پوزیشن پر ہوا تو ساتھی طلبہ و طالبات نے پہلی دفعہ اسے "نوٹس" کرنا شروع کیا۔

"میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ یہ کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک گریز اور تڑپ دکھائی دیتی ہے۔ ایسے افراد ہمیشہ ہی بہت خاص ہوتے ہیں۔" نازک مزاج اور حسین فریحہ نے لگاوٹ کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں تھی لیکن اپنے حلقہ احباب کی وجہ سے کبھی کوئی کام بھی نہیں رکتا تھا۔

اس کے توصیفی کلمات نے وہاں بیٹھی سبھی لڑکیوں کے دل میں حسد و جلن کے جذبات برپا کر دیے۔ لڑکوں کے جذبات البتہ قدرے مختلف تھے۔ انہیں یہ حسد تھا کہ اتنا ہونہار اور ہمہ گیر خوبیوں کا ایک انسان آج تک ان کی نظروں سے پوشیدہ کیوں رہا۔

اس کے بعد وہاں مقابلے کی سخت فضا قائم ہو گئی۔ کلاس کی لڑکیوں نے اخلاق کو اپنی جانب مائل کرنے کی ہر ممکن کوششوں کا آغاز کر دیا۔ وہ کبھی نوٹس لینے کے بہانے اس کے ارد گرد منڈلاتیں تو کبھی اہم ٹاپک سمجھنے کے لیے فارغ پیریڈ میں اس سے ملتجی ہو جاتیں۔

"اخلاق ڈیئر! لیکچر تو کچھ سمجھ آ کے ہی نہیں دے رہا۔ تم سمجھا دو نا پلیز!" کوئی پری وش اس کے قریب آ کر ٹھنکتی تو قربت کی حرارت سے اخلاق کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ حلق میں کانٹے اگ آتے۔

"کلاس روم میں جس وقت یہ لیکچر دیا جا رہا تھا تب بھی بدقت تمام کہتا۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ ہر ذہین شخص اچھا معلم بھی ہو۔۔۔ اور جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارا سمجھایا ہر لفظ میرے دل میں اتر جائے گا۔" اس پر اخلاق کا دل پسلیوں کے قفس سے نکل کر اس کے قدموں میں لوٹنے کے لیے بے تاب ہونے لگتا۔

"تو پھر میں تمہاری طرف سے اقرار ہی سمجھوں؟" اخلاق کی یہ کیفیت اس لڑکی کو بہت محظوظ کر رہی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ جان گئی کہ لوہا گرم ہو چکا ہے اور ایک معمولی سی چوٹ بھی اس کے لیے کافی ہوگی۔ لڑکی نے نہایت اپنائیت سے اس کے بازو پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھ دیا۔

اخلاق کے لیے اپنی دھڑکنوں پر ضبط ناممکن ہونے لگا۔ وہ جذبات و احساسات سے بھرپور انسان تھا۔ کالج کی رنگینیاں اور اٹھلاتے آنچل اسے اپنی جانب بھرپور مائل کرتے تھے لیکن اپنے عہد کا احساس قدم بہکنے سے روک لیا کرتا۔

لڑکی ہنوز امید بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ "میں کل سے فری پیریڈ میں تمہارے پاس آ جایا کروں گی۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے تمہیں یا کسی اور کو پڑھانے سمجھانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جاؤ اپنا وقت ضائع مت کرو۔" اس نے رکھائی و بے نیازی کے خول میں سمٹتے ہوئے جواب دیا۔ لڑکی اس رد عمل کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔

"میں ان خرافات میں بالکل نہیں الجھوں گا۔ میں ان سب کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔" اس نے خود کلامی کی۔ یہ الفاظ اس لڑکی کے لیے تیزاب کے چھینٹے ثابت ہوئے۔ اخلاق کو اندازہ نہ ہو سکا کہ ایک عہد کی پاسداری کرتے وہ اپنے لیے بہت بڑے مسائل کھڑے کر چکا تھا۔

کلاس کی دیگر لڑکیوں کے علاوہ فرسٹ ایئر کے طلبہ بھی اس سے مدد طلب کرنے چلے آتے۔ وہ سارے باندھ ہے لڑکوں کی مدد تو کر دیتا تھا لیکن صنف نازک سے گریز کا اب بھی وہی عالم تھا۔ یہ رویہ ہر سو ایک نئے تنازع کو جنم دے رہا تھا۔

"میاں اخلاق! تم ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ چھپے رستم ثابت ہوئے ہو۔" سمیر نے بے تکلفی سے کہا۔

"کیوں۔۔۔ اب میں نے کیا کر دیا بھلا؟"

"لڑکیوں سے گریز و رکھائی اختیار کر کے انہیں اپنی کشش میں دیوانہ کرنے کے یہ طریقے ہمیں تو بھی بتا دو۔"

"مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ میں تو۔۔۔" اخلاق

کرکے اس بات کو الگ ہی رنگ دے دیا۔

"یہ تو ہمیں نظر ہی آ رہا ہے کہ تمہیں ان میں کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔ تمہاری دلچسپی کے محور کچھ اور ہی ہیں۔" اس نے لوفرانہ انداز میں بائیں آنکھ دبائی۔

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ پتا نہیں کیا خرافات سوچتے رہتے ہو تم لوگ۔" اخلاق بھڑک اٹھا۔

"غصہ کیوں کرتا ہے پیارے، ابھی ہمیں بھی تو اپنی خدمت کا موقع دے۔" ایاز نے مزید طرح دی۔

اخلاق کے لیے یہ سب ناقابل برداشت ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے وہاں سے اٹھ جانا بہتر سمجھا۔ مگر تیز قہقہوں اور ذومعنی فقرات کی گونج میں اسے ایک اور طوفان کی آہٹ سنائی ہی نہ دی جو اس کے عقب میں پوری قوت سے سر اٹھانے کو تیار تھا۔

☆☆☆

اپنی ذات سے کیے گئے عہد نبھاتے ہوئے اخلاق علی یہ حقیقت فراموش کر بیٹھا تھا کہ توازن ہی زندگی کا رابطہ اور خوبصورتی کی اصل بنیاد ہے۔ وہ خود کو صاحب کردار اور بے نیاز ثابت کرنے کے لیے کائنات کی سب سے نازک اور حساس صنف 'عورت' کے جذبات مجروح کرنے لگا تھا اور زخمی انا کی حامل عورت کسی چوٹ کھائی ہوئی ناگن سے کم نہیں ہوتی۔

فریحہ، سنبل، شازیہ، نازنین اور ساجدہ جب اپنی مہم میں ناکام ہو گئیں تو احساس ذلت اور انتقام سے بے حال تھیں۔ فریحہ کا حال بدترین تھا۔ اسے اپنی "توہین" پر بے حد ملال تھا۔ وہ آتش انتقام میں بری طرح پھنک رہی تھی اور پھر ایک روز اسے اپنے انتقامی جذبات سرد کرنے کا شاندار موقع میسر آ گیا۔

فریحہ نے اخلاق کی سبھی عادات اور معمولات پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پہلے پہل وہ تفریح کی خاطر فری پیریڈ اپنے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں گزارا کرتا تھا لیکن پھر سمیر اور ایاز کے لغو انسانیت تبصروں کے بعد وہ ان سے بھی گریز برتنے لگا۔ فراغت میں وہ لائبریری جانے کو ترجیح دیا کرتا۔ اس کے مزاج میں مردم بیزاری کا عنصر غالب آ گیا تھا۔ لائبریری کے انتہائی گوشے میں کتابوں کے مطالعے اور نوٹس کی تیاری میں اسے ذاتی کوفت سے نجات مل جاتی۔

ایسے ہی ایک روز وہ حیاتیات کے اہم اسباق کے متعلق

سہولت اس قدر عام نہیں ہوئی تھی اور کتابوں کی محبت ضرورت بن کر طلبہ کی زندگی کا اہم حصہ تھی۔ وہ اپنی مصروفیت سے اس وقت چونکا جب ایک تیز خوشبو کا جھونکا بالکل پاس محسوس ہوا۔ اس کے سامنے کھڑی فریحہ کی آنکھوں میں نفرت و وحشت کا مکمل جہان آباد تھا۔

"کیا بات ہے۔۔۔ یہاں کیوں آئی ہو؟" اخلاق نے رکھائی سے پوچھا۔

"یہ لائبریری کسی کی ذاتی جاگیر نہیں ہے مسٹر افلاطون۔۔۔ میں یہاں وہ کرنے آئی ہوں جو تمہاری سوچ اور تصور سے بہت بالاتر ہے۔" فریحہ کے لہجے میں زہریلی پھنکار تھی۔

"تو کرو، میں چلتا ہوں پھر یہاں سے۔" وہ اطمینان سے اٹھا اور اپنی کتابیں سمیٹنے لگا۔

فریحہ کے ہاتھ تیزی سے حرکت میں آئے۔ اس نے ایک جھٹکے سے میز پر دھری سب کتابیں نیچے گرا دیں۔

"یہ۔۔۔ تک۔۔۔ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ حیران ہوا۔ اسی لمحے فریحہ نے اپنی آستین اور کندھوں سے کپڑے پھاڑ کر بالوں کو تیزی سے بکھیر کر منتشر کر دیے۔

"مجھے چھوڑو۔۔۔ اخلاق! اس نے آخر تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ اس لائبریری کے تقدس کا ہی خیال کرو۔" وہ چیختے ہوئے انداز میں کتابوں کے ریک کی طرف بڑھی اور انہیں بھی نیچے گرا دیا۔

اس شور شرابے کی آوازیں اب لائبریرین تک پہنچ چکی تھیں۔ اگلے چند لمحات میں اخلاق کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ فریحہ کی دگرگوں حالت اور کہرام اسے مظلوم ثابت کر چکا تھا۔ اس موقع پر سنبل اور ساجدہ نے بھی اخلاق کی بدمعاشی کے قصے مشہور کرنے شروع کر دیے۔

کالج کے چند "سماجی خدمت گار" ممتاز کے ایسے واقعات بھی انتظامیہ کے سامنے لے آئے جن میں جونیئر لڑکوں سے اخلاق کی بدفعلیاں ثابت ہوتی تھیں۔ وہ وقت اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ اپنے کردار کی حفاظت کرنے کے سلسلے میں اسے ہولناک رسوائی اور کالج سے معزولی کا پروانہ ملا۔ یہ صدمہ اس کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہونے کے بعد وہ ایک طویل عرصے تک صاحب فراش رہا۔

اس کے خوابوں کا گلشن بری طرح اجڑ گیا تھا۔

☆☆☆

انسانی زندگی میں بعض حادثات کی نوعیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتی جاتی ہے۔ متاثرہ شخص اگر اس آسیب سے نکلنا بھی چاہے تو اسے کسی جانب سے کوئی مدد یا آسرا نہیں ملتا۔ یہ صورت حال اس کے لیے ایک گرداب ثابت ہوتی ہے جس میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس کے اسپتال سے آنے کے بعد گھر میں عزیز رشتے داروں، پڑوسیوں اور دیگر احباب کا تانتا بندھنے لگا۔ اخلاق کی سیہ حرکات پر تاسف، غم و غصے کا اظہار زبان زد عام تھا۔

"اکلوتے لڑکے اکثر والدین کے ہاتھوں سے یونہی نکل جایا کرتے ہیں۔ بوڑھے ماں باپ اب ان کے پیچھے بھاگ تو نہیں جا سکتے نا۔" چچا نے بڑی ہمدردی سے نکتہ اٹھایا۔

"ٹھیک کہتے ہو بھائی، اکلوتی اولاد زیادہ لاڈ پیار میں بگڑ بھی جاتی ہے۔" ممانی نے کہا۔ "ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ صداقت صاحب کو اولاد کی تربیت پر مان بھی تو بہت تھا۔"

"ہاں اللہ پاک ہمیشہ یونہی غرور اور مان کے بت توڑا کرتا ہے۔"

یہ تبصرے یونہی شب و روز اس کی سماعت میں گونجتے رہتے۔ زہر بجھے فقرات کی بازگشت اس کی قوت ارادی کے پرخچے اڑا کر رکھ دیتی اور نتیجتاً وہ صحت یابی کے مطلوبہ معیار تک نہیں پہنچ سکا۔

"اچھی خاصی صحت ہوا کرتی تھی لڑکے کی۔۔۔ اب دیکھو ذرا، کیسے ہڈیاں نکل آئی ہیں۔" کوئی رشتے دار خاتون اتنی ہمدردی سے کہتیں تو اخلاق ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب جاتا۔

"ارے یہ تو سامنے کی بات ہے، ایسے کاموں میں سب سے پہلے صحت و تندرستی ہی کا تو کباڑا ہوتا ہے۔" خاتون کے شوہر نے بے باکی سے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بس بھائی صاحب! اسے اپنی غلطی پر بہت ملال ہے۔ یہ آئندہ ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گا۔" امی کے الفاظ نے اسے شرمساری کے بحر میں غرق کر دیا۔ اپنی تربیت کو ناکام ثابت کرنے کے لیے انہوں نے کتنی آسانی سے ایک بہتان تراش لیا تھا۔

ابا جان چند ایک اداروں میں واسطے پڑنے کے بعد بہت دل برداشتہ ہو گئے۔ دو ماہ بعد چند احباب نے ابا جان کو

دوران کسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں یہ قدم اٹھانے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ کریانے کے ساتھ پنساری کے لوازمات سے ان کی دکان پر خاصی چہل پہل اور پیسوں کی مناسب ریل پیل رہتی تھی۔

"کل سے میرے ساتھ دکان پر چلنا۔ میں خود تو اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ کیش کے معاملات کے لیے کسی نہ کسی کو ملازم رکھنا پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ اب یہ کام تم خود سنبھال لو۔"

"ٹھیک ہے ابا! میں آ جایا کروں گا۔" وہ تابعداری سے بولا۔ اس موقع پر وہ ایک بار پھر اپنی صفائی اور بے گناہی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے علم تھا کہ حسب سابق یہ کوشش بے کار ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کے خواب دیکھنے والے اخلاق علی نے خاموشی سے ابا کے ساتھ دکان پر مالی معاملات دیکھنے کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

اخلاق علی کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا تھا۔

اس نے اپنے خوابوں کی ناگہاں موت پر صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئے معمولات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ابتدا میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹوٹے، بکھرے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں اور دل میں کسک کا احساس پیدا کرتی تھیں لیکن دھیرے دھیرے یہ چبھن روح میں ان مٹ خلا پیدا کرتی گئی۔ اس کے سامنے جوان بہنوں کی شادی کا کٹھن مرحلہ بھی موجود تھا۔ بڑی دو بہنوں کی شادیاں خاندان میں ہی خوش اسلوبی سے انجام پا چکی تھیں۔ تیسری بہن کی منگنی بچپنے ہی سے ہو چکی تھی اور چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ پہلے ہی طے قرار دے دی گئی تھی۔

اخلاق کا رجحان مذہب کی طرف مائل ہونے لگا۔ نماز کی ادائیگی تو وہ پہلے بھی کرتا تھا لیکن اب اس معمول میں باقاعدگی آ گئی تھی۔ رب دو عالم کے دربار میں پنجگانہ حاضری اسے اس بات کا احساس دلاتی تھی کہ اس دنیا میں کوئی تو ہے جو اس کی بے گناہی اور معصومیت کا شاہد ہے۔

"گناہ کا احساس بہت جان لیوا ہوتا ہے بھئی! اس دور میں اپنی غلطی و کوتاہی کا احساس بھی اللہ کی رحمت سے کم نہیں ہوتا۔" یہ فتویٰ صادر کرنے والی اس کی پھوپھی خالہ تھیں جو اخلاق کی تیسری بہن کی شادی کی تقریب پر رشتے داروں کے جم غفیر میں اس کی ذات کو تختۂ مشق بنائے ہوئے تھیں۔

"ہاں بہن اب اپنے اخلاق میاں کی طرف ہی دیکھ لو۔ تو جوانی کے جوش میں غلطی تو کر بیٹھا لیکن شریف ماں باپ

سمجھنے کی بھرپور صلاحیت تھی۔

''اخلاق کی موجودہ زندگی دیکھ کر مجھے تو بہت افسوس ہوتا ہے بھئی!'' چچا نے افسوس سے ہاتھ ملے اور پھر حاضرین کے بھرپور سوالات کے بعد سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا خاصا لائق فائق لڑکا تھا۔ اس کے سامنے ایک بھرپور روشن مستقبل موجود تھا لیکن ایک ذرا سی غلطی نے سب کچھ ختم کر دیا۔ وہ ہاتھ جنہیں سیکڑوں لوگوں کے لیے مسیحا بننا تھا' آپریشن کرتے ہوئے جانے کتنے لوگوں کی زندگیاں بچانی تھیں' اب خواتین سے ساز و سامان تول کر کیش لیتے ہیں۔'' انہوں نے تاسف سے کہا۔ قریب ہی مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے اخلاق کے سینے میں گہرا دھواں سا بھر گیا۔

وہ سر جھکائے اپنی راہ پر چل دیا۔

☆☆☆

بہن کے فرض سے سبکدوش ہوتے ہی زندگی میں ایک نیا رخ پیدا ہو گیا۔ احباب و اقارب اس کی سوتی زندگی کے بارے میں فکر مند نظر آنے لگے اور حسب سابق انہوں نے یہ تشویش اخلاق کے والدین میں بھی منتقل کر دی۔ ہر بار مختلف تبصروں اور تجویزوں کا ایک نیا بازار گرم ہونے لگا۔

''بیٹے کی شادی میں تاخیر سے کام نہ لینا۔ شادی کا فریضہ وقت پر ہی ادا کرنا بہتر ہوتا ہے۔'' دوستانہ مشورہ دیا جاتا۔

''بالکل ٹھیک کہا اس نے۔ اخلاق میاں کے ساتھ تو یوں بھی ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر شیطان کے بہکاوے میں آئے اسے کسی کھونٹے کے ساتھ باندھ دینا ہی مناسب ہوگا۔'' دوسری رائے ابھرتی۔

''لیکن ایک بات کا خیال رکھ لینا صداقت بھائی!'' کسی مرد رشتے دار کی آواز سب کو پرفیکٹ کرتی۔ ''بیٹی کی شادی سے پہلے گھر میں بہو لے آئے تو بیٹے کو ہاتھ سے گنوا بیٹھو گے۔''

''ابھی تو ایک بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ فی الحال حالات اجازت نہیں دیتے کہ کوئی اور قدم اٹھایا جائے۔'' ابا جان نے سادگی اور صاف گوئی سے کہا۔

''ہم تو آپ ہی کی بھلائی کے لیے کہہ رہے تھے۔ اپنی اولاد کے لیے آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' چچا ہمیشہ کی طرح چاروں جانب اسٹروک کھیلنے کے ماہر تھے۔

اخلاق کے لیے یہ سب تبصرے و تجزیے کڑوے کسیلے سہی لیکن شادی کا ذکر سنتے ہی اس کے تصور میں غیر ارادی

میں اپنا سراپا جسم سے آنکھوں کے دریچوں سے جھلک دکھانے لگتا۔ اس کے دل میں میٹھی میٹھی سی کسک جاگ اٹھتی تھی۔ چاہتے چاہے جانے اور خود سپردگی کے جذبات تن من میں سرشاری پیدا کرنے لگتے۔ وہ دکان کے معاملات میں بھی نہایت تندہی سے محنت کرنے لگا تھا۔ اس مصروفیت میں دو سال دبے پاؤں بیت گئے۔ کام کاج کی لگن نے ان مختلف آرا اور تجویزوں کی جانب توجہ ہی مبذول نہ ہونے دی جو اس کی شادی میں تاخیر پر کسی مقدس فریضے کی طرح ادا کی جا رہی تھیں۔ اس تاخیر کا سبب اخلاق کی کسی جسمانی و اخلاقی کمزوری کو گردان کر اس کے کردار کی خوب دھجیاں اڑائی جاتیں۔

کچھ ماہ بعد مریم کے لیے رشتے دیکھنے کا آغاز ہوا تو والدین نے فیصلہ کیا کہ اس کی شادی بھی ساتھ ہی نمٹا دی جائے کہ تصور کی رعنائی میں چند خواب مزید چمکنے سے در آئے۔ اس دوران چچا کے بیٹے کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ عام طور پر وہ ایسی کسی بھی تقریب میں جانے سے گریز کیا کرتا تھا لیکن اب متوقع بھتیجی شادی کے خیال نے اسے بہت متحرک بنا دیا تھا اور وہ سب کی چہرہ سرائی سے محظوظ ہو کر تمام تقاریب سے بہت اچھی طرح لطف اندوز ہو سکا تھا۔

اس منصوبہ بندی اور خیالات پر تقدیر کے ایک [illegible] وار نے اس سمت تباہی پھیر دی۔

☆☆☆

پانچواں باب:

مہندی کی تقریب کے لیے اخلاق بہت پرجوش تھا۔

اس نے دیگر کزنز کے ساتھ باقاعدہ مہندی سے مخصوص گرم شلوار سوٹ سلوایا تھا۔ ان سب نے ڈھول کی تھاپ پر رقص کا منصوبہ بھی بنا رکھا تھا۔ چچا کے بیٹے کی شادی چونکہ تایا کی بیٹی سے ہو رہی تھی لہٰذا تقریب کا انتظام ان کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ ٹینٹ اور کھانے پینے کا انتظام چھت پر تھا۔ رسم کی ادائیگی سے قبل کزنز کی ٹولیوں کو دوپٹے کی کمی محسوس ہوئی تو اخلاق کو نیچے دوڑا دیا گیا۔ اس کی مطلوبہ کمرے میں آمد ایک نیا دھماکا ثابت ہوئی۔ وہ دروازے پر دستک دیے بنا بے نیازی سے کمرے میں داخل ہوا تو منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہاں آدم و حوا کے مابین شرمناک تعلق نہایت دھڑلے سے جاری تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے زمین و آسمان کی گردش تھم کر رہ گئی۔ اخلاق کی تیسری بہن زاہدہ کے شوہر اور ابا کی چچا زاد بہن کی بیٹی زرقا کو ایک ساتھ دیکھ کر

''تم... تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔ اپنے بچے اور سوال کے بوجھ تلے دبے ہونے کا احساس اسے مزید نروس کر رہا تھا۔ ''شہزاد بھائی آپ! آپ سے یہ امید نہیں تھی... میں ابھی سب کو بلاتا ہوں یہاں۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی شہزاد نے ایک جست لگا کر دروازہ پار کیا اور صحن میں جاتے ہی بآواز بلند خاندان کے بزرگوں کو صدائیں دینے لگا۔ ذرا سی دیر میں وہاں ایک مجمع لگ چکا تھا۔

''وہ دھوکے سے زرقا کو لے لیں... بھیج کر یہاں کی واشگاف دکھائی آپ لوگوں نے؟'' وہ چلا کر بولا۔ ''اگر میں یہاں اس کا تعاقب کرتے ہوئے نہ پہنچتا تو یہ جانے کیا گل کھلاتا۔''

''سچ کہتے ہیں بھئی اچکا چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔'' زرقا کے والد خاور شکیل نے تنفر سے کہا۔

''خدا جانے کب سے یہ کچھ ہوتا رہا ہے۔'' شہزاد نے مزید ہوا دی۔ زرقا کی رنگت بھی زرد پڑ چکی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تنہائی میں اسے سبز باغ دکھلا کر محبت کے نام پر خراج وصول کرنے والا شہزاد یکدم کیا کرنے لگا ہے۔ اس کا ڈھلکا آنچل اور ستا ہوا چہرہ اپ گناہ گار لمحات کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

''یہ جھوٹ بول رہے ہیں... میں تو ابھی یہاں آیا تھا۔'' اخلاق ہکلا گیا۔

''اس کی باتوں پر مت جائیے۔ یہ ماضی میں بھی یہی کچھ کرتا رہا ہے۔'' شہزاد نے آگے بڑھ کر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کی سخت تیز نظریں اور بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے مخصوص اشارے بھانپ کر اخلاق جان گیا کہ اس نے کردار کی ایک اور بازی ہار دی ہے۔ کسی بھی بحث اور حجت کی صورت میں زاہدہ کے ساتھ ہونے والے سلوک کی کوئی ضمانت نہ تھی۔

''میرا بس چلے تو میں ابھی اس کے ٹکڑے کر ڈالوں۔'' خاور نے اسے دبوچ لیا۔ اس صورت حال میں صداقت بھی ہاں پاس ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ بیٹے کی ناقابل معافی غلطی اور متوقع سلوک نے ان کے بیٹے پر دوبارہ داغ لگا دیا لیکن وہ سب کچھ نظر انداز کیے اس کا گلا دبوچ کر بے دردی سے ٹھوکریں رسید کرتے شکیل کو قابو کرنے لگے جن کے حلق سے غراہٹیں برآمد ہو رہی تھیں۔

''میں اسے جان سے مار دوں گا۔'' اس نے گھر کی دیواروں پر بھی گویا لرزہ طاری کر دیا تھا۔

تبدیل ہو گیا۔

''معاف کر دیجیے بھائی صاحب! میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔'' امی سے شاید اکلوتے بیٹے کی حالت دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے ہاتھ جوڑنے کے بعد اپنا دوپٹا بھی خاور کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس صورت حال پر اخلاق شدت سے موت کی تمنا کرنے لگا۔

''امی! میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس کی گھگھیاہٹ پر ابا جی نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

''خاموش رہو بدبخت! خاموش رہو۔'' غضب سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔

''اس کی یہ حرکت بالکل قابل معافی نہیں ہے۔ پوری برادری کے سامنے میری بیٹی کو ذلیل و رسوا کیا ہے۔ اب کون بیاہنے آئے گا اسے؟'' خالہ نے آنسو بہائے۔

''میں اسے اپنی بہو بنانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو بھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' امی نے فوراً کہا۔

اخلاق کو اپنے وجود سے کوئی ٹرین گزرتی محسوس ہوئی۔ اس نے شدت کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ زرقا بھی کسی سنگی مورت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اپنی ذات پر پڑنے والی اس افتاد سے وہ جان ہی نہ سکا کہ زرقا کی روح بھی کند چھری سے ذبح ہونے کی اذیت محسوس کر رہی ہے۔

شہزاد سے اس کا تعلق نیا نہیں تھا۔ وہ شادی سے قبل ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ان کی یہ محبت تمام حدود و قیود سے مبرا تھی۔ والدین کے دباؤ پر شہزاد کو زاہدہ سے شادی کے لیے ہامی بھرنی پڑی لیکن اس نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی بیوی کو طلاق دے کر زرقا کو اس کا مقام ضرور عطا کرے گا۔ محبت، وعدوں اور قسموں کی دکھائی خوش نما تتلیوں کا تعاقب کرتی زرقا اس کی بے دام کنیز تھی۔ وہ چوری چھپے باہر ملا کرتے اور اکثر کسی تقریب میں بھی شہزاد اس سے اپنی محبت کا 'خراج' ضرور وصول کرتا تھا۔ آج اخلاق کی آمد پر اس نے جس طرح طوطا چشمی اور خود غرضی کا مظاہرہ کیا' وہ زرقا کی نسوانی انا اور وقار کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اسے شہزاد کے ساتھ اخلاق سے بھی شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ ایک مرد کی دلیرانہ موقع شناسی اور دوسرے مرد کی بزدلی نے اسے نفرت کے گہرے سمندر کا مسافر بنا دیا۔ محبت نے اس کی زندگی بہت اہتمام سے اجاڑ دی تھی۔

☆☆☆

مہندی کے اسی فنکشن پر اخلاق کا نکاح زرقا سے پڑھوا

خالو نے دورانِ گفتگو ہی اس کا اظہار کرتے ہوئے کئی لاکھ کی
پچاس لاکھ کی بھاری رقم تفویض کروائی اور یوں ایک مقدس
ترین بندھن کی بنیاد نفرت، کدورت و رنجش کی بھینٹ چڑھ
گئی۔ اخلاق کے لیے ازدواجی زندگی کا ایسا آغاز قطعی
غیر متوقع تھا۔ اس کے سہانے خوابوں کی کرچیاں دن رات
دل و دماغ کو لہولہان رکھتیں۔ اپنے کردار پر لگنے والی ایک اور
تہمت کی اذیت اس سے سہی نہ جا رہی تھی۔ زرقا کی صورت
میں یہ زخم ہمیشہ ہرا ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے رویے میں
مردم بیزاری اور چڑچڑا پن غالب آ گیا۔ وہ گھر میں شہزاد کی
آمدورفت پر کوئی روک ٹوک لگا سکتا تھا نہ ہی دل و دماغ پر
نقش وہ منظر بھول سکتا تھا۔ اس موقع پر قدرت کو شاید اس پر
ترس آ ہی گیا اور شہزاد کو بیرون ملک ملازمت مل گئی۔ کچھ ماہ
بعد اس نے بیوی کو بھی وہیں بلوا لیا۔ وقت دبے پاؤں بیتتا گیا
مریم کی شادی بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ ہر فرد اپنی زندگی
میں مطمئن اور خوش تھا مگر اخلاق خوشی اور اطمینان کے معنی ہی
بھول چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ خدا سے بے اختیار شکوے کرنے لگتا
کہ اسے کن گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے۔ ازدواجی زندگی
نہایت تلخی کا شکار تھی۔ زرقا سے آئے روز جھگڑے اسے ہمہ
وقت ذہنی تناؤ میں مبتلا رکھتے۔ وہ دونوں ہی نفرت و منافقت
کی زندگی جی رہے تھے۔

"شہزاد بھائی کے بیرون ملک چلے جانے کا افسوس
تو بہت ہوا ہوگا تمہیں۔ آخر برسوں پرانا یارانہ جو چھوٹ گیا
ہے۔" وہ اکثر اسے کچوکے دیتا۔

"نہیں! مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اگر وہ میرے
سامنے رہتا تو میں خود ہی کسی روز اسے جان سے مار دیتی۔"
زرقا پھنکارتی۔ "البتہ ایک بات کا افسوس ضرور ہے کہ میری
قسمت میں تم جیسا بزدل مرد لکھا تھا۔ یہ بزدلی اور کمزوری
تمہیں کہیں کا نہ رکھے گی۔ لکھوا لو میری یہ بات۔"

"بدچلن اور بدزبان عورت۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا
تو زرقا نے اس کا چہرہ اپنے تیز دھار ناخنوں سے نوچ لیا۔

"خبردار! خبردار... جو مجھے پھر کبھی ایسی گالی دینے کی کوشش
کی۔ مجھے کچھ بھی کہنے سے قبل اپنے کردار پر ایک نظر ڈال
لیا کرو۔ جو اس قدر مشکوک تھا کہ کسی نے بھی سچائی کی دستک سننے
کی کوشش کیے بغیر ہی تمہیں اصل مجرم تسلیم کر لیا۔" اس کے
دوبدو جواب بے خوفی اور دیدہ دلیری اخلاق کو مزید طیش میں
مبتلا کر دیتی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پا رہے
تھے۔ اخلاق کے دل میں کہیں نہ کہیں خواہش تھی کہ زرقا اپنی

میں چھپی سچائی کو ایک بار آشکار کر دے۔

دوسری جانب زرقا شوہر کی جانب سے ان کدورتوں
کے خاتمے کی دل سے خواہش مند تھی۔ ماضی میں ہوئی غلطیوں کو
بھلا کر وہ بھی خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی مگر
شوہر کا طرزِ عمل اسے انتقامی جذبات میں مبتلا کر دیتا۔

زندگی یونہی گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ ایک جبری ازدواجی
زندگی کے ساتھ وہ اولاد کی دولت سے محروم تھے۔ ان
کے والدین بھی پوتا پوتی کھلانے کے آرزومند دکھائی
دیتے۔ کچھ وقت اور گزرا تو احباب اور واقف کاروں نے
اپنے مخصوص انداز میں ٹوکنا شروع کر دیا۔

"شادی کو آٹھ سال ہو گئے۔ کسی خوشخبری کی طرف
سے کان ترس گئے ہیں۔"

"بس دعا کرو کہ اللہ کرم کر دے اپنا۔" امی ٹھنڈی آہ
بھر کر کہتیں۔

"کہیں علاج وغیرہ کروا کے دیکھو۔ آج کل تو سائنس
نے اتنی ترقی کر لی ہے۔"

"اللہ کے فضل سے دونوں ہی نارمل ہیں۔ بس اللہ ہی
کی طرف سے دیر ہے۔"

"اچھا! پھر اللہ کرم فرمائے۔ بیٹی ہی دے دے مگر
گود تو بھرے۔" جواب میں دعا موصول ہوتی۔

"اخلاق میاں کی طرف سے کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں
اس کے معمول بھی تو بہت مشکوک رہے ہیں۔" ایک اور بے
باک تبصرہ اس کی روح کو گھائل کرتا۔

اس کشمکش میں کتنے ہی موسم بیت گئے۔ اخلاق نے
اپنی ذات کو کاروبار تک محدود کر لیا۔ والدین کو حج کرنے کی
دیرینہ آرزو تھی۔ اس نے وہ ذمہ داری لے کر اگلے سال ہی کے
انتظامات مکمل کر دیے۔ روانگی سے دو روز قبل ابو جی نے
اخلاق کو اپنے پاس بلایا۔ زرقا اس وقت گھر پر موجود نہیں تھی۔

"اخلاق... میرے بیٹے! میں تجھ سے بہت خوش
ہوں۔ تیری تابعداری پر مجھے فخر ہے۔" ابا کا آبدیدہ لہجہ
اور الفاظ کی سنجیدگی نے اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھیر دی۔

"چھوڑیں ابا جی! اچھی بات ہے... اولاد ہی تو ہوں بھلا؟"

"نہ بیٹا! مجھے اور شرمندہ مت کر۔" ابا جی نے
بوجھل آواز میں کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ تیرے سلسلے میں ہم سے
کچھ زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن ہمارا مقصد قطعی غلط نہیں تھا۔"

"مجھ... کیا صرف کچھ زیادتیاں تھیں؟" وہ آزردہ ہوا۔

"میں جان گیا تھا کہ زرقا کے معاملے میں اصل قصور



ابا جی نے تھے۔ ان کی بیٹی کا معاملہ تھا۔ اسی لیے اسے
قصوروار نہ ٹھہرا سکا۔ بیٹی کا گھر اجاڑنے کی ہمت نہیں تھی مجھ
میں۔" ابا جی کی آنکھوں میں نمی چمکی۔

"اپنے مجبور ماں باپ کو معاف کر دو بیٹا!" امی نے
کہا۔ اخلاق کے الفاظ گنگ تھے۔ "میں نے تیری بہن کو بھی
بعد میں ساری حقیقت بتا دی تھی۔ اسی نے طریقے سے دباؤ
ڈال کر شہزاد کو بیرون ملک ملازمت کی طرف مائل کیا۔"

"کیا فائدہ اب اس کا؟" وہ افسردگی سے کہتا
ہوا اٹھ گیا۔ والدین بھی افسردگی سے اسے جاتے دیکھتے
رہے۔ انہیں خیال تھا کہ واپسی کے بعد وہ اس سے ایک
بار پھر اس موضوع پر بات کریں گے لیکن تقدیر نے انہیں
ایسا کوئی موقع ہی نہ دیا۔ اس سال دورانِ حج حجاج کے کیمپوں
میں آتشزدگی کا واقعہ ہوا جس میں جاں بحق ہونے والے افراد
میں اخلاق کے والدین بھی شامل تھے۔

☆☆☆

چھٹا باب:۔

والدین سے محرومی خواہ کسی بھی عمر میں ہو انسان کی
زندگی تند و تیز ہواؤں کی زد میں آجایا کرتی ہے اور اخلاق
تو تبدیلی در تبدیلی کا شکار ہوا تھا۔

اس کا آخری جذباتی سہارا بھی ختم ہو گیا۔ زندگی میں
کیف اور امنگ ناپید ہو گئی۔ انہی دنوں اسے خوشخبری ملی کہ
زرقا امید سے ہے۔ یہ خبر تازہ ہوا کا ایک جھونکا ثابت ہوئی
لیکن حسب سابق وہ اپنی خوشی کے اظہار سے قاصر تھا۔ زرقا
البتہ بے حد مسرور تھی۔ ماضی کی بیزاری سے قطع نظر اولاد کی
نوید نے اس کے وجود میں توانائی کا ایک نیا ذخیرہ پیدا کر دیا
تھا۔ لاشعوری طور پر وہ شوہر سے بھی ایسے ہی بے ساختہ
جذبات کے اظہار کی خواہش مند تھی لیکن اخلاق کو کاروباری
معاملات نے بے حد الجھا رکھا تھا۔ اسے ابا جان کی کمی بے
حد محسوس ہوتی تھی۔ ان کی موجودگی نے کتنے ہی کاروباری
مسائل پیدا ہونے سے روک رکھے تھے۔ انہی معاملات
کو سلجھاتے بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب زرقا نے ایک پھول
سی بچی کو جنم دیا۔ بچی قدرے کمزور لیکن بہت خوبصورت
تھی۔ اخلاق کے دل و دماغ میں عجب کیفیت برپا تھی۔ اس
کے سینے میں محبت کا ایک طوفان موجزن تھا لیکن زرقا کی گود
میں گلابی کمبل میں ملبوس بچی کے وجود سے ایک بے عنوان
الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے میکانکی انداز میں اس کے
کانوں میں اذان دی۔ تھوڑی ہی دیر میں اہلِ خانہ و احباب

"اللہ نے آخر سن ہی لی اخلاق کی بھی۔ ورنہ اب
تو لوگ طرح طرح کے سوال پوچھ کر شرمندہ کرتے
تھے۔" بڑی بہن نے کہا۔

"اللہ ہی سنتا ہے آپا! اور کون حاجت روا ہے بھلا؟"
اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں بھئی بیٹی ہی سہی لیکن اولاد تو ہوئی... تم دل
چھوٹا نہ کرو۔ بیٹا بھی دے گا اللہ۔" آپا بچپن میں اپنی اور
بچوں کی پیدائش کے ضمن میں ہونے والے تبصرے ہی
لاشعوری طور پر دہرا رہی تھیں۔

"بیٹا ہو یا بیٹی! کیا فرق پڑتا ہے۔ اولاد تو بس نیک اور
بانصیب ہونی چاہیے۔" زرقا نے سادگی سے کہا۔ اس نے بھی
ایسے مواقع پر بزرگوں سے سنی بات ہی دہرائی تھی لیکن اخلاق
کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ
زرقا نے براہ راست اس کے کردار پر وار کیا ہے۔ اس لمحے
اسے بیوی سے پہلے سے کہیں زیادہ نفرت محسوس ہوئی۔ کچھ
دیر پہلے زرقا کے لیے جو بے عنوان محبت اور کشش محسوس ہوئی
تھی یکدم ناپید ہو گئی۔

"آپا کے کہنے کا مقصد ہے کہ تمہارے خاندان میں
بیٹیاں ہی زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ کہیں تم بھی یہی معمول نہ
دہرانے لگو۔" اخلاق نے سرد مہری سے مخاطب کیا۔

"اولاد مرد کے نصیب سے پیدا ہوتی ہے۔ عورت
کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اتنا پڑھ لکھ کر بھی یہ بات نہ
سمجھ سکے آپ۔ تعلیم حاصل کرنے پر دھیان ہوتا تو آج یہ
نوبت تھوڑی ہی آتی۔" زرقا نے بھی بدلحاظی سے جواب
دیا۔ وہ اس وقت بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی۔ اس کی
ہر بات اور عمل اخلاق کے دل میں مزید نفرت اور بیزاری
پیدا کر رہا تھا۔

خاندان کے سامنے یہ گفتگو معمولی بات ہرگز نہیں
تھی۔ وہ کسی گہری تبدیلی کا لمحہ تھا۔ اخلاق کو اپنے وجود میں
ایک کلیجہ سا اترتا ہوا محسوس ہوا۔ آس پاس بیٹھے افراد سے
بیگانگی اور اجنبیت کا احساس اس قدر گہرا تھا کہ وہ خود ان
محسوسات کی گہرائی سے خوفزدہ ہو کر رہ گیا۔

زندگی کا یہ باب پہلے سے کہیں زیادہ تلخ اور ناقابلِ
برداشت ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

بیوی سے ہونے والی اس چپقلش کے بعد اخلاق نے
خود کو کاروباری معاملات میں غرق کر دیا۔

اس نے اردگرد کی دو دکانیں خرید لیں۔ اس دوران خواہش کے باوجود دوسری اولاد کے لیے کوئی امید بر نہ آسکی۔ اخلاق کو اپنی بیٹی.... کے لیے بے حد گداز اور محبت محسوس ہوتی تھی لیکن اس محبت میں پوشیدہ خوف اسے بے حد نڈھال اور بوجھل کیفیت میں مبتلا رکھتا۔ کالج میں فریحہ، ساجدہ، شاذیہ اور نازنین کے بعد زرقا کی صورت میں اسے ایک نہ ختم ہونے والی آزمائش میسر آئی تھی۔ وہ شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو کر ایسی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا جہاں محرومیاں اور کسک آسیب بن کر ہم و شعور پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ اپنی انہی الجھنوں سے لڑتا وہ ایک میکانکی زندگی گزار رہا تھا۔ کاروبار وسعت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ نصیب کا یہ عالم تھا کہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تو سونا بن جاتی۔ اس کامیابی پر عزیز و اقارب بھی انگشت بدنداں تھے۔

”بھئی اخلاق میاں! تم نے تو خوب ترقی کمائی۔ دولت تو مینہ کی طرح برس رہی ہے۔“ خاندان کے بزرگ اکثر کسی نہ کسی تقریب میں اسے گھیر لیتے۔

”کیا فائدہ بھئی اتنا کچھ کما رہا ہے لیکن کل کلاں کو سب داماد خور لے گا۔ بیٹا ہوتا تو کاروبار سنبھال بھی لیتا۔“ چچا نے حسب سابق اپنی دور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ ان کے دو پوتے تھے لیکن بیٹے کا کاروبار اس قدر مستحکم نہیں تھا۔ اخلاق ان کی بات پر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اسے ہمیشہ یونہی اولاد نرینہ سے محرومی کا احساس دلایا جاتا تھا۔

”اللہ پاک نے قسمت میں یہ لکھا ہوا ہے تو ضرور ملے گا ورنہ ہم انسان کیا کرسکتے ہیں؟“

”تو بھلا کریں کیوں نہیں سکتے۔ شریعت نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔“ اس کی ممانی دبے لفظوں میں جتاتیں۔

”ارے ممانی! آپ کی مطلقہ بیٹی کے لیے اس بیٹی کے باپ پر تو نظر نہیں ٹھہری آپ کی؟“ زرقا بدلحاظی سے کہتی۔ ”اگر ایسا سوچ بھی رہی ہیں تو یاد رکھیے کہ ابا جان نے نکاح نامے میں دوسری شادی پر قدغن رکھی تھی۔“

”ارے ہاں بھئی! تمہاری شادی اور وہ حالات کون بھول سکتا ہے بھلا؟ اللہ کو بھی جانے کیا آزمائش منظور تھی کہ تمہارے ہاں بھی صرف بیٹی پیدا کی۔ اب بتاؤ بھلا! اپنی جوانی تو سنبھال نہ سکیں، بیٹی کی تربیت کیا خاک ہوگی۔“

”یہ گھر بھی بیکار کر رہی ہیں آپ۔ جو لوگ اپنے ماضی سے سیکھتے ہیں وہ مستقبل میں وہی غلطیاں کبھی نہیں دہراتے۔“ اسے گھبراہٹ کر دیا۔ وہ شوہر کی جانب سے دفاع کی منتظر تھی لیکن اخلاق کے چہرے پر نظر آتی بے نیازی نے اسے اپنا دفاع خود کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعے کے بعد ان کے مابین سرد مہری اور نفرت مزید گہری ہو گئی۔

☆☆☆

وقت کی پرواز جاری رہی۔

اخلاق اور زرقا اپنے متعین کردہ دھاروں میں بہتے رہے۔ ان کے باہمی تعلقات نہایت واجبی تھے تاہم سیماب کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر اب اخلاق نے اسے ماضی کے حوالے سے کوئی بھی بات جتانا چھوڑ دی تھی۔

زرقا بھی بیٹی کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔ اخلاق اس کی ذہنی کیفیت سے نا آشنا تھا اور وہ اسے سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ عورت کے پاس جب شوہر کی محبت، اعتماد اور ستائش نہ ہو تو جبلی طور پر ہی وہ اپنی ذات کو اولاد کے لیے فراموش کر دیتی ہے۔ زرقا بھی یہی کر رہی تھی۔ وہ شوہر کی واپسی یا اصلاح کی طرف سے مکمل مایوس ہو چکی تھی۔ ایسی مایوس، افسردہ اور تھکی ہوئی نظر انداز عورت اپنی ذات کو مجسم قربانی و ایثار بنا کر اولاد کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اولاد اور باپ میں غیر محسوس طریقے سے فاصلے پیدا کر دیتی ہے۔ اخلاق کے بھی خیال میں اس کی بنیادی ضروریات پوری کر دینا ہی باپ کا سب سے بڑا فریضہ تھا اور اس فرض کی ادائیگی وہ بہت اچھی طرح کر رہا تھا۔

سیماب بہترین تعلیمی ادارے میں پڑھ رہی تھی۔ زرقا نے اسے خاندان کے دیگر افراد اور بچوں سے دور ہی رکھا تھا۔ بیٹی کے حوالے سے اخلاق کے ذہن میں ایک خاص لائحہ عمل تھا جس کے بارے میں وہ مکمل منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ زرقا سے کشیدہ تعلقات کی اسے کوئی پروا نہ تھی۔ وہ اپنی حکمت عملی کے مطابق ہی سبھی معاملات چلا رہا تھا۔

اگلے کئی سال انہی معمولات اور تلخیوں میں گزر گئے۔

ایک ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح رہتے وہ ایک دوسرے کی ذات سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ سیماب تیزی سے عہد شباب کی طرف گامزن تھی۔ وہ پڑھائی میں بھی بہت اچھی تھی۔ ہر سال اچھا نتیجہ لاتی۔ اخلاق کے دل میں بے ساختہ فخر و مسرت کے جذبات پیدا ہونے لگتے۔ پڑھ لکھ کر کسی بلند مقام پر پہنچنا اس کی اپنی خواہش بھی تو تھی جو کسک بن کر آج بھی دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ تھی۔ دل ہمک کر بیٹی کو اپنے سینے سے لگانے کے لیے مچلتا لیکن ایسے ہی کسی لمحے جانے کیسے زرقا کو



”یہ سامان جلدی سے سمیٹو اور سونے کی تیاری کرو۔“ وہ تنک سے انہیں سابقہ معمولات کا احساس دلاتی۔

”مما پلیز! تھوڑی دیر اور....“ سیماب کے انداز میں بے تابی اور تشنگی ہوتی لیکن ماں کے چہرے پر چھائی خشونت اور غصہ اسے مزید دم مارنے نہ دیتا۔ وہ خاموشی سے اپنے خائف سمیٹ کر پیاسی نظروں سے باپ کو نہارتی لوٹ جاتی تو زرقا کے چہرے پر طمانیت اور زہریلی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی۔ اخلاق کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور رد عمل کے طور پر وہ ایک بار پھر سرد مہری کے خول میں سمٹ جاتا۔

☆☆☆

موسموں کے تغیر کی تال میل کے ساتھ کیلنڈر کا رقص جاری رہا۔

اخلاق اور زرقا کی زندگی سابقہ مدار کے گرد ہی گردش کرتی رہی۔ عزیز و اقارب اور احباب کے ”پرخلوص مشورے اور تجاویز“ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پھر سیماب نے میٹرک کا امتحان نہایت شاندار نمبروں سے پاس کرلیا۔ اس روز زرقا کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ اخلاق کے دل میں بھی فخر و مسرت کے ساتھ اپنے ماضی کی ایک سنہری یاد جیسی آنچ سے کسک دینے لگی۔ اس نے بیٹی کی کامیابی کی خوشی میں ایک تقریب منعقد کرائی۔

”سیماب کو کون سے کالج میں پڑھانے کا ارادہ ہے؟ ماشاء اللہ اتنے اچھے نمبر حاصل کیے ہیں اس نے۔“ اس روز خاندان کے ہر فرد کی زبان پر یہی کلمات تھے۔

”ارے تو کوئی بھی کالج ہاتھوں ہاتھ لے گا۔“ اخلاق کی بہن ساجدہ نے کہا۔

”سیماب کسی کالج میں نہیں جائے گی۔ اس کی پڑھائی کا سلسلہ یہیں ختم ہو جائے گا۔“ اخلاق نے اطمینان سے جواب دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟“ حیرت اور تعجب بھری صدائیں ابھریں۔

”بالکل ممکن ہے۔ میں نے اپنے ایک کاروباری دوست کے بیٹے سے اس کا نکاح طے کردیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں موجود ہوں گے۔ نکاح کے ساتھ رخصتی بھی کردی جائے گی۔“ اس کا اطمینان برقرار تھا۔ اس کے الفاظ گویا بم دھماکا تھے جس کی گونج وہاں موجود ہر شخص پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

”خاندان کے لڑکے مرگئے ہیں کیا جو تم کسی انجان کے ہاتھ بیٹی کا ہاتھ تھمانے چلے ہو؟“ بہن نے غصے سے کہا۔ ”کسی سے مشورہ کیا نہ اطلاع دی۔ شادی بیاہ تو تمہارے لیے ہر بار ہی گڈے گڑیا کا کھیل رہا ہے۔“ اس کے طنز نے اخلاق کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھیر دی۔

”میں سیماب کا باپ ہوں۔ اس کا بھلا برا آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ کالج نہ جانا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ پڑھائی کی آڑ میں وہاں کیا کچھ ہوتا ہے۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا۔ ”کم عمری میں ہی شادی کردینی بہتر ہوتی ہے ورنہ نفس بہک جائے تو اپنی لپیٹ میں بہت سی زندگیاں مزید تباہ کردیتا ہے۔“

”تم نفسیاتی مریض.... تم اپنی اولاد کے ساتھ ایسا کیسے کرسکتے ہو؟“ زرقا اپنا ضبط کھو بیٹھی۔ سیماب بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے باپ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”اسی میں سب کی بھلائی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”دیکھو اخلاق میاں! ایسے فیصلے اتنی عجلت میں کرنے مناسب نہیں ہوتے۔ تم ہتھیلی پر سرسوں کیوں جما رہے ہو؟“

عظیم ماں

تھامس ایڈیسن مشہور عالم سائنس دان جب بچہ تھا۔ وہ اسکول سے آیا اور ایک سربمہر لفافہ اپنی والدہ کو دیا کہ استاد نے دیا ہے کہ اپنی ماں کو دے دو۔ ماں نے کھول کر پڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر اس نے بہ آواز بلند پڑھا۔ ”تمہارا بیٹا ایک جینئس ہے۔ یہ اسکول اس کے لیے بہت چھوٹا ہے اور اتنے اچھے استاد نہیں کہ اسے پڑھا سکیں، سو آپ خود اسے پڑھا لیں۔“

سالوں کے بعد جب تھامس ایڈیسن ایک سائنس دان کے طور پر مشہور عالم ہو گیا تھا اور والدہ وفات پاچکی تھیں تو وہ اپنے خاندان کے پرانے کاغذات میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے وہی خط ملا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”آپ کا بیٹا انتہائی ذہنی ناکارہ ہے۔ ہم اسے مزید اسکول میں نہیں رکھ سکتے۔“ اس دن ایڈیسن نے ڈائری میں لکھا۔ تھامس ایلوا ایڈیسن ایک ذہنی ناکارہ بچہ تھا، جسے ایک عظیم ماں نے صدی کا سب سے بڑا سائنس دان بنا دیا۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، افضل ہزارہ

لیے سیماب کا ہاتھ مانگنے کے دیرینہ آرزومند تھے۔

"میں کچھ غلط کر رہا ہوں نہ ہی منفرد — عجلت میں شادی ایک بار پہلے بھی تو ہو چکی ہے۔ اس وقت آپ سب اس فیصلے پر عملدرآمد کرنے پر تلے تھے، مبادا میں کہیں فرار ہی ہو جاؤں — اب اتنی تڑپ کیوں؟"

"اس وقت بات کچھ اور تھی — لیکن اب —" انہیں کچھ ہی نہ آ رہا تھا کہ اخلاق کو کیسے سمجھائیں۔

"تو تم اس بات کا بدلہ اپنی اولاد سے لو گے؟" زرقا بے یقین تھی۔

"نہیں احمق عورت! میں اپنی اولاد کو مستقبل کے بہت سے مسائل سے بچا رہا ہوں جو تم کبھی سمجھ ہی نہیں سکو گی۔" وہ جھلایا۔ "میں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک بہترین لڑکا منتخب کیا ہے۔ وہ سرکاری محکمے میں ملازم ہے۔ اس میں کوئی شرعی عیب نہیں۔ میں نے سیماب کی تصویر دکھا کر ہی یہ رشتہ پکا کیا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" زرقا کی تڑپ دیدنی تھی۔ "سنو! میں جان گئی ہوں کہ تمہارا مقصد کیا ہے — تم مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہو نا؟ تمہیں خدا کا واسطہ — یوں مت کرو۔ میں تمہاری بے گناہی کا —"

"خاموش! بس خاموش ہو جاؤ۔" وہ غرا کر بولا۔ "میں اتنا کم ظرف نہیں کہ تمہارے اعتراف کے لیے اپنی اولاد کی زندگی سے کھیلنے لگوں۔ اس بات کو یہیں ختم کر دو تو بہتر ہے۔"

سیماب کی حالت ان سب سے مختلف تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کس قدر آسانی اور اس کی ذاتی خواہشات کو نظرانداز کر کے طے کر لیا گیا ہے۔

زندگی نے سیماب کو کبھی ہموار راہ گزر فراہم نہیں کی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو عجیب و غریب اور مشکل نفسیات کے حامل افراد میں گھرا پایا تھا۔ والدین نے کبھی آپس میں خوشگوار لب و لہجے یا انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ ان کی آنکھوں سے جھلکتی بیزاری اور رنجشوں کی تپش وہ کم عمری میں بھی مکمل شدت سے محسوس کیا کرتی تھی۔ والد کے لیے اس کا دل بے حد ہمکتا لیکن گلے لگانے، گود میں اٹھا کر لاڈ کرنے، کندھوں پر جھولنے کی حسرت ہمیشہ حسرت ہی رہی۔ اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ ہر خواہش ان کہے ہی تکمیل پاتی مگر باپ کا لمس اور اظہارِ محبت کبھی نصیب نہیں ہو سکا۔ ماں نے اسے کڑی نگرانی میں تربیت دی تھی۔ اسے کسی خاندانی تقریب میں بھی شرکت کی اجازت نہ تھی۔ یہ صورت

پائی کر اپنے ماضی کی بازگشت اس تک پہنچنے سے روکنے کے لیے ہی زرقا نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

"پاپا میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" اس کی سوچ اب ایک ہی نکتے پر مرکوز تھی۔ بکھرتے ذہن اور بکھری ہمت کو مجتمع کرتے اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"مجھے یہ شادی نہیں کرنی — مجھے پڑھنا ہے — پلیز پاپا! میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا — مگر آج میری یہ خواہش تسلیم کر لیجیے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

اخلاق کے سینے میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہو گیا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر بیٹی کو گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"میری بچی! میرا یہ فیصلہ تمہاری بہتری ہی کے لیے ہے۔ احمد نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہیں پڑھائی سے بھی نہیں روکے گا۔ وہ تمہارا ہر جائز خواب پورا کرے گا۔"

سیماب کے وجود پر بھی ایک لرزہ طاری تھا۔ باپ کی محبت اور لمس کی خواہش پوری ہوئی بھی تو کس مقام پر۔ اس کے کشادہ سینے میں سماتے ہی وہ اپنی ہر سوچ اور تمنا سے دستبردار ہونے کے لیے جانے کیسے خود کو آمادہ پا رہی تھی۔ اپنے یہ جذبات خود اس کی سمجھ سے بھی بالاتر تھے۔ باپ کے وجود سے اٹھتی خوشبو اس کی تھکن اور بوجھ جادوئی لیے تھے۔

"ٹھیک ہے پاپا! آپ کی خوشی کے لیے مجھے ہر فیصلہ منظور ہے۔" چند لمحوں بعد اس نے خود کو کہتے پایا۔

اخلاق کی آنکھوں سے نکلے آنسو اس کی داڑھی کے بال بھگونے لگے۔ وہ بہت مطمئن اور سرشار تھا۔ سیماب کی رخصتی کے بعد اب محض ایک ہی فرض باقی رہ گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی تکمیل بھی اس کے لیے مشکل ثابت نہ ہو گی۔

☆☆☆

آخری باب:

نیم تاریک کمرے میں یادوں کا رقص مکمل آہنگ سے جاری تھا۔

کبھی کسی یاد کا ٹکڑا الگ ہوتا اور اس کے بے بس وجود سے لپٹ جاتا۔ خواہش کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کچھ دیر مزاحمت کے بعد اس نے اپنے آپ کو اس تند و تیز لہر کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ جھٹکے سے اٹھا اور اپنا بوجھل وجود گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو ایک اور سایہ بھی اس کے ہمرکاب تھا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ اس کے قدم خود بخود ایک منزل

کی روشنی، عظمت اور ٹھہراؤ سے معمور "خانۂ خدا" کے روبرو پایا۔ یہاں پہنچتے ہی دہشت کا وہ رقص ختم ہو گیا۔ اس نے نوافل کی نیت باندھ کر لرزتے وجود سے خشوع سے فرش پر پیشانی ٹیکی تو سچائی کی تاثیر روئیں روئیں میں سرایت کر گئی۔ دعا میں ہاتھ اٹھاتے تو دل میں رستا ناسور آنسوؤں کی صورت میں اخراج بن گیا۔ اس کے دماغ پر ایک دھند سی طاری ہونے لگی تھی۔

اپنی عمر کے اس آخری پڑاؤ میں ہر انسان کی طرح وہ بھی زندگی میں بیتے ہر باب سے ایک بار پھر گزر رہا تھا۔ ماضی کا یہ سفر ہر موڑ پر ایک سوال چھوڑ کر کسک پہنچاتا اور ملال کی نئی لہر میں شرابور کر دیتا۔ نوافل سے فراغت پاتے ہی اس نے ستون سے کمر ٹکائی۔ ٹھنڈک اور سکون کی غیر مرئی لہریں وجود کو سکون دینے لگیں۔

"پڑھ لیے نوافل؟" اس کی سماعت میں ایک شناسا آواز پڑتے ہی دل و دماغ نے یاد دلایا کہ وہ اس آواز سے کس قدر نفرت میں مبتلا رہا ہے۔

"ہاں! مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے یہاں چلا آیا۔" اس نے خود کو کہتے پایا۔

"یہاں نیند آنے کا سوال ہی کیا؟ آئینہ تو وہ تھی جس میں جذبہ ایک جبری مدار میں گردش کرتے ہیں۔ یہاں اس مقام پر تو ہر کسی کی خوابیدگی اور غفلت اپنا وجود کھو کر انہیں اپنے اصل کا آئینہ دکھا دیتی ہے۔"

"سچ کہہ رہی ہو۔ میرے ساتھ بھی تو یہی ہو رہا ہے۔" اس نے ایک بار پھر خود کو زرقا سے متفق پایا۔ یہ امر اس کے لیے مزید حیران کن تھا۔ اس عورت سے تو وہ تمام عمر اختلاف ہی کرتا رہا تھا — تو پھر آج کیوں اس کی باتوں سے متفق ہو رہا تھا؟ وہ الجھ گیا۔

"اس الجھن کو ذہن پر سوار مت کرو۔ میرے ذہن میں بھی اس وقت یہی سوال برپا ہے کہ ساری زندگی تم سے نفرت اور بیزاری سے بھرپور وقت گزارنے کے بعد میں اس مقام پر آتے ہی تمہاری اہمیت اور محبت کس طرح محسوس کرنے لگی ہوں؟"

"تو کیا جواب ملا؟"

"جواب کی صورت میں غلطیوں اور کوتاہیوں کا ایک طویل باب مجسم سامنے آ جاتا ہے۔ میں ان غلطیوں کو شمار کر کے باب رقم کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ کسی بھی طرح گرفت میں آنے ہی نہیں دیتے۔"

اس مقام پر کیا انکشاف ہوتا ہے۔ غلطیاں — کوتاہیاں اور خود ساختہ دنیا میں قید زندگی کے ہر باب میں اپنا کردار — ہاں! میں جان گیا۔"

"مجھے یہاں ایک زرقا دکھائی دے رہی ہے۔ وہ زرقا جو اپنے والدین کے گھر خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ والدین نے ایک حد میں اسے ہر آسائش مہیا کر رکھی تھی۔ وہ خوش بھی تھی لیکن اس خوشی کی تہ میں ایک چبھن ہوتی تھی جو ان خوشیوں کو پوری طرح محسوس ہی نہیں کرنے دیتی تھی۔ جانتے ہو وہ چبھن کیا تھی؟" زرقا کے توقف پر اخلاق نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ہاں! اب میں واضح طور پر دیکھ سکتی ہوں کہ اس لڑکی کے آس پاس موجود افراد کی سوچ، گفتگو اور نظریات بہت الجھے ہوئے، کبھی دو متضاد اور کبھی دل دکھانے والے ہوتے۔" وہ ایک ستون پر نظریں جمائے کہتی چلی گئی۔ انداز ایسا تھا جیسے سامنے نظر آتے منظر کو بیان کر رہی ہے۔ "ذرا ہوش سنبھالتے ہی اس کے والدین کو احساس دلایا جانے لگا کہ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ ان سے انتہا درجے پیار کرنا ان کے مستقبل کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ پھر کچھ عرصہ گزرا تو اس کی سماعت میں ایسے تفکرات پڑنے لگے کہ لڑکی ذات کو اتنی تعلیم دلانا بے سود ہوتا ہے۔ انہیں تو مستقبل میں صرف گھرداری ہی سنبھالنی ہوتی ہے۔ ایسی ہی باتوں سے مجبور ہو کر والدین نے انٹر کے بعد مزید پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ ہاں! میں دیکھ رہی ہوں کہ اس زرقا کے وجود میں تلملاہٹ، بغاوت اور محرومی کا پہلا بیج اسی مقام نے بویا تھا۔ اب منظر بدل گیا ہے۔ اب میرے سامنے وہ لڑکی موجود ہے، جس کے چہرے پر دبا دبا غصہ اور خوف ہے۔ وہ کسی رشتے دار کی گفتگو سن رہی ہے جو اس کے والدین کو کہہ رہا ہے کہ موجودہ وقت میں اچھے رشتے ملنا کس قدر مشکل ہوتے ہیں۔ لوگ شرافت کا نقاب پہن کر سامنے آتے ہیں اور شادی ہوتے ہی اپنا اصل چہرہ دکھا دیتے ہیں۔ انجان لوگوں، ایک اجنبی انسان کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال زرقا کے دل میں خوف کی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔ اس کی ذہنی رو دھیرے دھیرے شہزاد نامی ایک عزیز کی طرف منتقل ہو رہی ہے جو کافی عرصے سے اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ زرقا کو ایک عجیب سی تقویت کا احساس ہونے لگا ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ شہزاد کی محبت قبول کر لی تو سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو

سوچتے ہوئے وہ یہ بھول گئی ہے کہ ان کے والدین میں کس قدر گہری اور ان مٹ دلکش استواری رہی ہیں... وہ صرف یہ سوچ رہی ہے کہ شہزاد اسے پلکوں پر بٹھا کر رکھے گا۔ یہ خیال اسے شہزاد کی طرف مائل کرنے لگا ہے۔" اس نے ایک توقف کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اب مجھے جو زرقا نظر آرہی ہے میں اسے دیکھتے ہوئے شدید کرب میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ وہ محبت کی خوش رنگ تتلیوں کے رنگ بھری ہوئی شادی کی آنکھوں میں پوشیدہ ہوس کے رنگ کیوں نہیں پہچان پا رہی؟ شہزاد کو سامنے پا کر بے خودی کی منازل طے کرتی اس لڑکی کو کیوں احساس نہیں ہو رہا کہ مرد بھی مجبور نہیں ہوتا۔ وہ اگر والدین کے دباؤ میں آکر زاہدہ سے شادی کر چکا ہے تو اسے بھی کرنا تھا۔ زرقا کو یونہی ٹھوکر کھانی تھی۔ لو دیکھو اب وہ گناہ گار بنی ایک کٹہرے میں کھڑی ہے۔ اس کا محبوب ہی اسے سرعام رسوا کر رہا ہے۔ اس کا نکاح ایک ایسے فرد سے پڑھایا جا رہا ہے جس کی بابت وہ مختلف چہ میگوئیاں سنتی رہی تھی۔ اس نکاح کے بعد زرقا کے دل میں شوہر کے لیے ایسے جذبات پیدا ہوئے ہیں جن سے وہ پہلے نا آشنا تھی۔ یہ محبت کا ایک نیا روپ تھا۔ وہ جوابی طور پر بھی ایسی ہی محبت کی طالب نظر آرہی ہے لیکن ارد گرد بسنے والے لوگ اسے اپنی غلطی بھولنے نہیں دے رہے ہیں۔ نہ ہی شوہر کو اس کی طرف مائل ہونے دے رہے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے ماضی ان کے سامنے ابھار کر دیتے ہیں اور شوہر اس کی جانب آتے آتے بھی پلٹ جاتا ہے۔ ذلت، محرومی اور توہین کا یہ احساس زرقا کی روح کو زہر آلود کرنے لگا ہے۔ وہ اولاد کے سامنے اپنی کوتاہیوں کے تذکرے سے خائف نظر آرہی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کو بھی رشتے داروں اور خاندان میں گھلنے ملنے نہیں دیا۔ وہ انتقامی ردعمل کے طور پر اسے بھی دور کر رہی ہے۔ اسے یہی خدشہ تھا کہ اگر اخلاق اس کا ماضی بیٹی کے سامنے طشت ازبام کرے تو اس کی زندگی کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن اخلاق جو کچھ کر رہا ہے وہ اس کی سوچ سے بھی بالاتر ہے۔ وہ اچانک بیٹی کا نکاح طے کر کے شادی کا فیصلہ سنا رہا ہے۔ زرقا تڑپتے ہوئے خود ہی ماضی کے اوراق برہنہ کرنے پر مائل نظر آرہی ہے لیکن اس نے یہ حماقت سرزد نہیں ہونے دی۔ یہ سب شادی کے بعد اپنے گھر رخصت ہو چکی ہے۔ وہ احمد کے ساتھ ایک خوش باش اور بھرپور زندگی بسر کر رہی ہے... اس وقت زرقا مجھے ایک اونچے مقام پر بیٹھی یہ سوچتی نظر آرہی ہے کہ اخلاق کے اس مرضی سے یا خاندان ہی میں کہیں بیٹی کا رشتہ طے کر دیتی تو زندگی بھر کی مسافت رائیگاں نہ جاتی۔ اولاد کا دکھ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا۔ زندگی کی کتاب اپنے آخری باب تک آن پہنچی ہے اور ان انتقامی صفحات کو پلٹتی زرقا یہ سوچ رہی ہے کہ گزشتہ ابواب کی تلخیاں اور غلطیاں کیسے بھول جائیں؟ کیسے اصلاح کی جائے؟" اس کی آواز معدوم ہوئی تو ایک کراہ کی صدا نے ماحول کو بوجھل کر دیا۔

"تم رو رہے ہو... مرد بھی کبھی روتے ہیں کیا؟" زرقا نے حیرانی سے استفسار کیا۔

"ہاں! مرد بھی روتا ہے کیونکہ وہ بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ تمہیں اس بابرکت اور مقدس سرزمین پر اپنے مستقبل کے تصور میں جو زرقا نظر آرہی ہے۔ اس کے مقابل مجھے بھی تو ایک اخلاق دکھائی دینے لگا ہے۔ ذمے داریوں اور توقعات کے بوجھ تلے دبا ننھا سا لڑکا... وہ خود کو ہر ایک کی نظروں میں اچھا ثابت کرنے کے لیے بساط سے بڑھ کر کام کر رہا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں اوائل عمری سے ہی ایک بات نقش کر دی گئی تھی کہ بڑوں کی بات پر عمل کرنے والا زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہوتا... میں چاہ کر بھی اسے روک نہیں پایا۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ بساط سے بڑھ کر کیے گئے کام اس کے وجود کو دھیرے دھیرے ایک آسیب میں بدل لیتے ہیں۔ اپنی ذات کو ہمیشہ ممتاز، منفرد اور دوسروں سے برتر دیکھنے کا آسیب...

"وہ لڑکا اب اسکول جانے لگا ہے۔ ذمے داریوں کا بار پہلے سے مزید بڑھ گیا ہے۔ اساتذہ اس کی تعریفیں کرتے ہیں اور ساتھی طلبہ حسد۔ اسے دوسروں کو حسد میں مبتلا ہوتے دیکھ کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے چہرے سے خوشی و فخر کا یہ احساس نوچ کر پھینک دوں۔ اسے یہ بتاؤں کہ ایسے ہی لمحے تو ہماری آزمائش ہوتے ہیں۔ جس قدر طویل یہ لمحات ہوں گے اسی قدر بھیانک آزمائش ہوگی۔ اس لڑکے کو کیسے سمجھاؤں میں؟"

اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا آ پھنسا۔ چند لمحے آنکھیں موند کر اس نے ستون کی جانب دیکھا اور پھر سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے اہل خانہ اکلوتا ہونے کے سبب اسے دوسرے لڑکوں اور محلے کے بچوں سے گھلنے ملنے نہیں دیتے۔ وہ اپنے ہم جولیوں میں نہیں کھیلے گا تو کیسے جانے گا کہ دنیاداری اور ایک عام انسان سے برتاؤ کے طریقے کیا ہوتے

سن کر اداس کر رہا ہے تو دوسروں سے ممتاز رکھنے کی خواہش میں وہ اسے تنہائی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔" وہ بے بسی سے ہتھیلیاں مسلنے لگا۔ "اب مجھے میٹرک کے امتحان میں شاندار کامیابی سمیٹ کر عزیز و اقارب کی ستائش سمیٹتا شرمیلا سا نوجوان نظر آرہا ہے... لیکن وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے آس پاس اور بھی لوگ موجود ہیں جو کامیابی پر مبارکباد کے ڈونگرے برساتے اس کے مستقبل کی بابت تشویش میں مبتلا دکھائی دے رہے ہیں۔ تابعداری اور بزرگوں کے ادب میں سر جھکائے اس لڑکے کی گردن اٹھا کر میں اسے دکھانا چاہتا ہوں کہ ان میں چند ہی افراد دلی طور پر مخلص ہیں۔ اکثریت کے مسکراتے لبوں کے عقب میں نہایت حقیر عزائم پوشیدہ ہیں۔ وہ اس کے کردار کو بودا ثابت کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن اس نادان نے ان کی باتوں کے پیش نظر ایک لائحہ عمل تیار کر لیا ہے کہ وہ صنف نازک سے ایک فاصلہ برقرار رکھے گا تاکہ آئندہ ایسی محافل میں اسے "باکردار" ٹھہرایا جا سکے... بے وقوف... کم فہم انسان اسے سمجھ کیوں نہیں رہا کہ ہر پہلو میں توازن ہی زندگی کی اصل خوبصورتی ہوتی ہے۔" اخلاق کا عکس بے ربط اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔

"کالج کے پہلے سال اس نے اپنی عام سی شخصیت کے باعث بہت نظر اندازی اور حقیر خطابات برداشت کیے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ان سبھی کو ذہانت کے بل بوتے پر مات دینے کا جنون نظر آنے لگا ہے... لو دیکھو اب وہ بورڈ میں تیسری پوزیشن کا مالک بن گیا ہے۔ ارد گرد ساتھی اسے رشک و حسد کے جذبات سے دیکھ رہے ہیں۔ یہی جذبات تو اسے مطلوب تھے۔ اسے منفرد نظر آنے کا شوق تھا۔ کلاس فیلو لڑکیاں بہانے بہانے سے اس کے قریب آنے کی کوشاں ہیں۔ یہ تو اس کے لیے بڑی تسکین کا سامان ہے۔ لڑکوں کو جلن میں مبتلا کر کے ملنے والی خوشی ایک طرف اور ان لڑکیوں سے گریز میں کامیابی کے بعد خود کو "باکردار" ثابت کرنے کی مسرت کا بھی کوئی مول ہی نہیں... میں اسے ان اقدامات سے روک کر بتانا چاہتا ہوں کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور اسے کسی کو یوں دھتکار کر انسانیت کی تذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اس سے پڑھائی میں مدد ہی لینا چاہتی ہیں۔ شاید سے انجام کر دو... اور ان کی ناجائز ترانی کو مثبت طریقے سے کسی اور دھارے میں تبدیل کر دو لیکن وہ تو ایک کے بعد ایک غلطیاں دہراتا ہی چلا

"لو دیکھو ذرا اب وہ لائبریری کے گوشے میں ہونق بنا فریحہ کو کسی ناگن کے روپ میں دیکھ رہا ہے... یہ تو ہونا ہی تھا... اسی کی آبیاری تو اس نے کی تھی۔ اب اگر کالج کے سربراہ نے وہاں موجود لڑکوں اور لڑکیوں کی گواہی پر اسے معطل کر دیا ہے تو حیرانی کیسی؟ اس نے کسی کو اپنا دوست بنایا ہی کب تھا کہ انہیں اپنی دلی کیفیات سے آگاہ کر سکے۔ وہ اسے دوشی........ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں... یہ تو ہونا ہی تھا... اس معطلی کے بعد خاندان بھر میں ہونے والی سبکی بھی پہلے ہی سے طے تھی۔ اکثریت اسی دن کی تو منتظر تھی۔ اپنی اولاد سے برتر نظر آتا وہ انتہائی عام سا لڑکا ذلیل و رسوا ہونے لگا ہے تو ان کا بھی حق تھا کہ اسے مزید دباؤ میں مبتلا کریں... مجھے اس کا بے بس باپ سرکاری کاغذوں میں سر کھپاتا نظر آرہا ہے لیکن اپنی بربادی کے غم میں مبتلا اخلاق اتنا سا نکتہ کیوں نہیں سمجھ پا رہا کہ وہ پرائیویٹ تعلیم بھی تو جاری رکھ سکتا ہے۔ اس احمق نے دکانداری سنبھال کر منفی سوچ کے حامل افراد کی حس انتقام کو تسکین فراہم کر دی ہے لیکن اپنے خیرخواہوں کے لیے کوئی مثبت راہ دکھائی کیوں نہیں دے رہی جو روشن اور واضح تر ہے۔ دکان سنبھالتے اپنے کردار کی دھجیاں اڑتے دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہوتے اخلاق کو اپنا ہمجولی ایک لڑکی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں نظر آیا ہے تو اس کے دل و دماغ میں کسی محرومی نے اسے ایک ہی راہ سجھا دی ہے۔ وہ ناکردہ گناہوں کی سزا پا کر زندگی میں ہر مقام پر ذلیل و رسوا ہوا ہے تو یہ گناہ گار بھی تو انہی والدین کی اولاد ہیں جو اسے ہر بار کچھ دینے سے باز نہیں آتے... انہیں بھی تو یونہی رسوا ہونا چاہیے۔ یہ سب سوچتے اور عمل کرنے کے لیے تیار کھڑے اخلاق کو میں کیسے باور کراؤں کہ عزت اور ذلت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مقابل اس کا ہمجولی ہے اور شادی شدہ بیٹی کا گھر کسی بھی تہمت سے محفوظ رکھنا پہلے ہی سے رسوائی کا شکار بیٹے کو مزید رسوا ہونے سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے والدین نے اپنی بشری کمزوری کے تحت بیٹی اور داماد کا رشتہ بچا لیا... اس کے نکاح میں آنے والی وہ لڑکی رسوائی و ذلت کا مجسم تصور تھی۔ اسے دیکھ کر وہ بڑی کشمکش میں مبتلا ہو رہا ہے... ایک طرف نکاح کے مقدس بولوں کی طاقت اسے محبت کرنے کی طرف مائل کرتی ہے تو دوسری جانب اپنی بے گناہی اور اس کے گناہ گار ہونے کا احساس دل میں نفرت پیدا کرتا ہے... رک جا کم عقل انسان! تو

کیوں اپنی مردانگی کے زعم میں اسے سزا دینے میں خود کو حق بجانب تصور کر رہا ہے۔"

کرب کی ایک ہی لہر تھی جو اخلاق نے اس کے وجود کو ایک بار پھر اپنی جانب لیا۔ اس نے بمشکل سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

"اخلاق اب انتقام کی ایک ہی راہ پر چل نکلا ہے۔ وہ اس عورت کو اولاد کی تڑپ میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہے اس لیے دیدہ و دانستہ اسے اولاد سے محروم رکھے ہوئے ہے۔ ہوش تو اسے تب آیا ہے جب سالہا سال گزرنے کے بعد والدین نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کر کے اس کی ذہنی انا کو تسکین پہنچائی اور عزیز و اقارب اس کی مردانگی پر سوال اٹھانے لگے۔ اسے بھی جانے کیوں شدت سے زندگی میں اولاد کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ پروردگار نے بھی اس کے لیے بہترین سزا تجویز کر رکھی تھی۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود امید کی کوئی کونپل پھوٹ کر ہی نہ دی۔۔۔ وہ کم عقل اب بھی سمجھنے کے بجائے بچی سے خوفزدہ رہنے لگا ہے۔ خواہش کے باوجود اسے قریب لانے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہا۔ اس دنیا میں سیماب کی ذات ہی تو ایسی ہے جس کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے بے ریا محبت نظر آتی ہے۔ جانتے ہیں اس کے ماضی کے متعلق چھ اس علم نہیں۔ اس کی محنت سے کاروبار میں ترقی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کاروباری سنجیدہ حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے سے اس کی کم عمری کو شعور عطا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اسی فہم و ادراک نے اسے آگہی کے ایک اور عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کی زندگی کا حاصل سیماب ہی تو ہے۔ جلد یا بدیر خاندان سے اس کے طلبگاروں کی فہرست طویل ہوتی جائے گی۔ وہ کس کو انکار کرے گا؟ کس کو قبول کرے گا اور جانے اس کی دولت پر بھی نظریں جائے ہوں گے۔ چلو خیر دولت تو بنیادی مال ہے۔ انکار کی صورت میں کسی کی بھی جانب سے ان کے ماضی کا افسانہ پوشیدہ نہ رہ سکتا ہی نہ ہوتا اور پھر سیماب اس سے نفرت کرنے لگتی۔۔۔ اس موڑ پر ایک اہم ترین فیصلے کی ضرورت شدید ترین ہے اور اس نے بالآخر مناسب ترین وقت پر بیٹی کی ذمے داری سے سبکدوشی کا ارادہ کر لیا ہے۔ کاش وہ اپنے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی لا کر ادب و لحاظ کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے عزیز و اقارب کو ان کی غلط گوئی پر ٹوک بھی پاتا۔ زاہدہ کو یہ احساس دلا سکتا تھا کہ اس نے بہنوں کے سامنے شوہر کی عزت بنائے رکھنے کے لیے بھائی کے وجود میں ایک موت برپا کر دی ہے۔ زرقا سے اس کی نفرت اپنی جگہ

کہتا۔۔۔ وہ تو خود بھی اس شعاعِ زہر پر عمل کے باوجود اپنی انتقامی خاموش روش کو درست سمجھتا رہا۔۔۔ اخلاق علی الاعلان حق گوئی کی ہمت تو نہیں کر سکا لیکن ایک کٹھن مسافت طے کرتے ہوئے بیٹی کو محفوظ ہاتھوں میں سونپنے کی کامیابی پر وہ بہت خوش ہے۔ اب اس کے سامنے ایک آخری قرض ہے۔۔۔ اس کے والدین بیج کی کمی اور انگلی سے قبل ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ ابھی کے لیے اس مقدس سرزمین میں چلا آیا ہے۔۔۔ مجھے اخلاق ایک پُرنور مقام پر زرقا کے ساتھ بیٹھا نظر آ رہا ہے۔۔۔ وہ اپنی ساری انا اور جذبات ایک جانب رکھ کر اسے بتانا چاہتا ہے کہ زرقا اخلاق تم سے بہت محبت کرتا ہے۔۔۔ اس لمحے سے جب اس نے تمہیں اپنی زوجیت میں قبول کیا تھا۔ وہ اپنی تمام کوتاہیوں پر بہت شرمندہ ہے۔۔۔ مداوا کرنا چاہتا ہے۔۔۔ تمہیں ایک باعزت زندگی دینا چاہتا ہے۔۔۔ لیکن زندگی کی اس کتاب کے تمام ابواب پلٹنے اخلاق کو کوئی رستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔۔۔ ڈرتا ہے کہ زرقا نے اسے معاف نہ کیا تو۔۔۔" اس کی آواز معدوم ہوتے ہوتے سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔

زرقا نے تڑپ کر اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اتنی دیر کیوں کر دی اخلاق! اتنی دیر کیوں کر دی آپ نے یہ مسرت مجھے پہلے عطا کر دیتے تو شاید کتابِ حیات کے کچھ باب ہم تبدیل کر پاتے۔"

سکوت کا ایک طویل لمحہ ان کے مابین ساکت ٹھہر گیا۔ ان کی آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ اس خاموشی کو اخلاق کی بوجھل آواز نے چھناکے سے توڑا۔

"زرقا! کیا ہمارا آخری باب بھی یونہی اختتام پذیر ہو گا؟"

"نہیں! ہم اسے تشنہ نہیں رہنے دیں گے۔۔۔ ہم اس سرزمین پر ایک عہد کر کے لوٹیں گے کہ جو روایات دانستگی یا نادانستگی میں ہمارے بزرگوں نے قائم کیں ہم ان سے اپنی نسل کو آگاہ اور محفوظ رکھیں گے۔" زرقا اب بہت پُراعتماد دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاں زرقا! ہم بہت سی زندگیوں کا آخری باب اس قدر کٹھن اور تشنہ رہنے سے بچا لیں گے۔" اخلاق نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

فضا میں فجر کی اذان کے مقدس کلمات کی گونج انہیں حاجی کا ایک اور موقع فراہم کرنے کے لیے بارگاہِ الٰہی میں طلب کر رہی تھی۔ وہ اس اطاعت کے لیے مکمل تیار تھے۔

خان مشتاق کوٹھی کے ٹیرس پر بیٹھا اچانک برسنے والی بارش سے بھیگے خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن درحقیقت ماضی میں جھانکتے ہوئے اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے بھی گزر رہا تھا۔ بیوی کے آ جانے پر خیالات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ پیچھے آن کھڑی ہوئی اور دونوں ہتھیلیاں اس کے گالوں پر جما کر بولی۔ "میں نے تمہیں ہوٹل والوں کو فون کر دیا ہے۔ آج کے موسم نے بڑی پرانی یاد دلا دی۔ یاد ہے نا اسی طرح رم جھم"

اس نے خاوند کی مونچھوں کے سرے انگلیوں کی پوروں میں لے کر مروڑنے شروع کر دیے۔ خان نے بیوی کی کلائیاں پکڑ کر کھینچ لیں۔۔۔ وہ کھنچی اور شوہر کے گال سے گال ملا دیا۔ بارش میں تیزی آ گئی اور وہ بازو چھڑا کر پلک جھپکنے میں ساتھ میں زانو ملا کر بیٹھ گئی۔ خان نے کہا۔ "تم بھی وہی بارش کا دن یاد کر رہی ہو۔ کتنے سال گزر گئے۔ وہ دن کبھی نہیں بھولتا۔ میں بھی اس وقت وہی سب کچھ یاد کر رہا تھا۔۔۔ کتنے سال ہوتے ہیں ہمیں۔"

وسیلہ

محمد الیاس

انسان خطا کا پتلا ہے لیکن یہ بھی قدرت کی مہربانی ہے کہ انسان کو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا نہ صرف شعور دیا بلکہ وسیلہ بھی بنا دیا اور جو لوگ اس کارِ خیر کو نیک نیتی سے کرتے ہیں اس کا اجر انہیں ان کے گمان سے بڑھ کر ملتا ہے۔ کچھ یہی حال اس جوڑے کا بھی تھا جن کا ساتھ نباہنا تو کیا ساتھ رہنا بھی مشکل ترین تھا مگر پھر بھی زندگی کی آخری سانس تک ساتھ نہ چھوڑ پائے۔

قدرت سے منہ پھیرنے والے جوڑے کی محبت بھری کہانی

تھے۔ جاتے جاتے بارشوں کا موسم پلٹ آیا تھا......"

ساجدہ نے ٹوک دیا۔ "موسم نہیں، ہمارا مقدر پلٹ آیا تھا۔ ورنہ سوچو خدانخواستہ اگر اس روز...... اللہ کی قسم میں نے پکا پکا فیصلہ کرلیا تھا۔ چاروں بیٹیوں سمیت شام کے بعد اندھیرا ہوتے ہی ڈیم میں چھلانگ لگادوں گی۔ پچھلی رات سے فاقہ تھا۔ لڑکیاں رو رہی تھیں۔ سلمہ کو تمہارے پاس بھیجا اور وہ روتی ہوئی واپس آگئی۔ بتایا کہ ابا نہیں مانتے۔ وہ مار رہے ہیں۔ کہتے ہیں گھر نہیں آؤں گا۔ میں نے لڑکیوں کو اندر بٹھایا اور بہانہ بنا کر نکل آئی۔ ڈیم کے کنارے کھڑے ہوکر دیکھا۔ جھیل کنارے تک بھری ہوئی تھی۔ پہلے سوچا کہ اکیلی مروں۔ تینوں چھوٹی تمہارا خون ہیں۔ ضرور خیال کرو گے۔ لیکن بڑی سے تو تمہارا کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ گھر میں نے اس کو بھی اسی طرح جنا ہے، جیسے چھوٹیوں کو۔ میری چاروں لگتی ہیں۔ کیا ہوا اگر ان سب کا باپ ایک نہیں۔ پہلے والے کمینے شوہر سے ماتھا پیٹ پیٹ کر جان چھڑائی تو دوسرا کمینے بھائی نے اجوڑ نکالا......"

مشتاق خان نے بیوی کو بازوؤں میں بھرا اور بولا۔ "ذرا فضول باتوں سے باز نہ آئی۔ بوڑھی ہوگئی۔ جس اور بڑی آخری عمر میں ایک ہی جیسے ہوجاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب اپنے دوستوں کی محفل میں میاں محمد بخش کے شعر اکثر سنایا کرتے تھے۔ سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں، سدا نہ ماپے حسن جوانی سدا نہ صحبت یاراں...... ہم دونوں کے ماں باپ پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔ مجھ پر بھی حسن جوانی آئی نہ تھی۔ شکر ہے سوال کا تمہارا واحد ابھی قائم ہوا۔ اپنی ذات کی کھری اور سوہنی تھی مگر بد تمیز، اکھڑ اور مغرور...... میں نے کسی سے دھوکا نہیں کیا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے، میری ذات، میرا پیشہ اور یہ کہ تو ایک بیٹے کا باپ۔ تمہیں میرے بن ماں کے بیٹے پر بھی رحم نہ آیا۔ اس کو گھر میں برداشت ہی نہ کیا۔ تمہاری پھپھی ہوگئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیک کرکے صاف کہہ دیا کہ اب تم بچے پیدا نہیں کرسکتیں۔ کتنا سمجھایا کہ حبیب، بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارے بعد ان کا خیال رکھنے والا اس کے سوا اور کوئی نہ ہوگا۔ میں اسی لیے دوسری شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ آنے والی کہیں حبیب سے برا سلوک نہ کرے۔"

ساجدہ نے لاٹ لپیٹ کرتے ہوئے ٹوک دیا۔ "چلو چھوڑو نا...! ماسٹر اعجاز صاحب کی باتیں کرو۔ ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوئے...... اللہ کرے سارے لوگ ہی ان جیسے ہو جائیں۔ میرے اور تمہارے رشتے داروں نے صرف تماشا دیکھا۔ سسرالی برادری ہماری لڑائی دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ میرا

میں تو ان کو شیں ایک ہو گیا تھا اور اتفاق ہونے سے پہلے ہی بائیکاٹ کردیا کہ چھوٹی ذات والے کو لڑکی دے کر برادری کی ناک کٹوا دی۔ میرے بھائی نے کسی کی پروا نہ کی۔ مجھے سمجھایا...... مشتاق میرے ساتھ ساتویں جماعت تک پڑھا ہوا ہے۔ میں اس کی خوبیاں جانتا ہوں۔ ایسا بندہ کبھی بھوکا نہیں مرتا۔ ماسٹر صاحب کے منہ سے روزی کما سکتا ہے۔ اس کے باپ اور دادا نے باعزت والا پیشہ ضرور اختیار کیا تھا۔ یہ پیشہ ہے، ذات نہیں اور کسی پیشے میں کوئی برائی نہیں ہوتی۔ انگریز قوم اسی لیے کامیاب ہے کہ کسی پیشے کو گھٹیا نہیں سمجھتی۔ مجھے خود انگلینڈ میں جاکر دکان پر نوکری کی اور اب اچھا بھلا کاروبار کررہا ہوں۔ رشتے داروں کی باتیں مت سنو۔ ہمارے ماں باپ مر چکے ہیں۔ تم اس کے بیٹے کا خیال رکھنا، وہ تمہاری بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھے گا......"

اچانک جھماکا سا ہوا اور ہوا کے جھکڑ کے ساتھ دونوں پھوار میں بھیگنے لگے۔ بخیل اسی میں ہونے پر دونوں باہم جڑے چپک گئے۔ مشتاق بولا۔ "پھر تم نے بھائی کی نصیحت پر عمل کیوں نہ کیا۔ میرے اپنے سارے رشتے دار اس لیے ناراض تھے کہ خاندان میں کوئی رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ تمہارے بھائی سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ میں نے اسکول چھوڑ کر کام سیکھنا شروع کر دیا تھا...... تمہارا بھائی میٹرک کرکے انگلینڈ چلا گیا۔ جب تمہاری طلاق ہوئی تو واپس آیا۔ مجھ سے بات کی، میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ ساجدہ زبان کی سخت ہے۔ دل کی بری نہیں۔ تم دوست ہو۔ میں جوان بہن کو اکیلے چھوڑ کر انگلینڈ میں چین سے نہیں رہ سکوں گا......"

ساجدہ نے کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "چلو چھوڑو اس کہانی کو...... سو بار، ہزار بار سنا چکے ہو۔ ماسٹر صاحب کی بات کرو۔ وہ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کا پتا کرو۔ اللہ کرے زندہ ہوں اور تندرست خوش باش ہوں۔ ان کو ہم اپنے ہاں مہمان بلائیں گے۔ ہمیں دیکھ کر انہیں خوشی ہوگی کہ جس پودے کو اکھڑا ہوا انہوں نے اپنے ہاتھوں سے دوبارہ لگایا اور پانی دیا وہ پھل پھول کے درخت بن چکا ہے۔"

مشتاق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شہر کے وہ تمام لوگ جو ہر روز ان کے پاس محفل لگایا کرتے تھے...... شاعر، پروفیسر، استاد اور وکیل، سب سے پوچھ لیا...... نوکری چھوڑ کر لاہور چلے گئے تھے۔ اپنے بال بچوں میں۔ کہتے ہیں کسی سے نہیں ملتے۔ گوشہ نشین ہوگئے ہیں۔ جائیداد کی آمدنی پر گزارہ ہے۔"

ذرا توقف کرکے مشتاق مسکرایا اور دوبارہ بولا۔ "انہیں

گھر میں مہمان رکھنے کا نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ اس پر جناب سے انکار سوال نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے تمہاری ایسی بری لت لگی ہے کہ اب، چھوڑ کا جانا، برداشت نہ ہوگا۔ جس طرح تمہیں وہ بار بار یاد آتے ہیں، میرا دل کہتا ہے وہ بھی تمہیں دل ہی دل میں پسند کرتے تھے...... جس دن انہوں نے اکھڑا ہوا پودا اپنے ہاتھوں سے لگایا اور پانی دیا، تمہارے حسن کی تعریف کرکے میرے دل میں سوئی ہوئی تمہاری محبت جگا دی۔ ان کی میٹھی میٹھی باتوں میں جادو تھا۔ مجھ پر فوراً اثر ہوگیا۔ وہ جہاں بھی ہیں خوش رہیں۔ انہیں مہمان بلا کے میں کہیں اکیلا نہ رہ جاؤں اور ساری زندگی بیٹھا پچھتاؤں......"

"توبہ توبہ کرو! آخری عمر میں بھی بیوی پر اعتبار نہیں تھا۔ اسی لیے میں کہتی ہوں، خاوند پورے بے ایمان ہوتے ہیں...... ماسٹر صاحب کو دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ میرا باپ بھی شاید ایسا ہوگا۔ میں نے ابا کو دیکھا نہیں...... سنا ہے بڑے دراز قد، جوان اور شکل صورت والے تھے......"

بولتے بولتے ساجدہ پل بھر کو خاموش ہوئی اور شوہر کو جھپ مار کر دوبارہ بولی۔ "تمہارے جیسے بے کار شے کو ماسٹر صاحب نے دوست کیسے بنایا؟ ایسی سنا ہے کہ شہر کے بڑے بڑے اونچے لوگ ان کے پاس بیٹھتے تھے۔ کہاں وکیل اور افسر لوگ، کہاں ناکارہ، جو سوائے باپ والا پیشہ کرنے کے باقی سارے کام کرتا تھا۔ پائپ فٹ کرنا، پانی کی موٹریں لگانا، کمرے سازی کرنا، ویلڈنگ اور تھوڑی میں روٹیاں لگانا...... اور پتا نہیں کیا کیا کوئی پیسے دے اور جو مرضی ہے کروالے۔ اتنا الٹی بندہ، اللہ کی شان دیکھو اب مشتاق خان بن بیٹھا ہے۔ خان صاحب! کوٹھی کا مالک۔ میرے بھائی کو دعائیں دو۔ جس نے حبیب کو انگلینڈ بلایا اور وہ پاؤنڈ بھیجتا ہے۔"

بیوی کی ناک کو چٹکی سے پوروں میں لے کر مشتاق نے دبایا اور بولا۔ "شرم کرو شرم۔ حبیب تمہارا داماد بھی ہے۔ اب دل سے کینہ نکال دو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ناک چھڑائی اور چمک کر بول اٹھی۔ "بڑے بے غیرت ہو۔ تمہیں کب یقین آئے گا کہ حبیب کے خلاف میرے دل میں کبھی حسد نہ تھا۔ تم اس سے زیادہ محبت دکھاتے تھے، میں چڑ جاتی تھی۔ اللہ گواہ ہے وہ مجھے شروع سے اچھا لگا۔ دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ سالوں سے گھر بڑا ہے، کیا اچھا ہو، بڑا ہوکر میرا داماد بنے۔ جوان ہو کر ایسی چھب نکالی، اللہ بری نظر سے بچائے۔ لاکھوں میں ایک۔ تمہاری شکل نہ عقل...... صرف جنتری جنتر یا لالچ...... وہ تمہاری

طرح لالچی بھی نہیں۔ تینوں بہنوں کی شان دار طریقے سے شادیاں کیں۔ سگے بھائیوں سے زیادہ اچھا ثابت ہوا۔"

مشتاق نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی بری عادت بھی بندے کو فائدہ دے جاتی ہے۔ مجھے صحیح اندازہ نہیں کہ تمہاری دبی ہوئی محبت نے جوش مارا یا ماسٹر صاحب کا دیا ہوا لالچ کام کر گیا اور میں فیصلہ بدلنے پر مجبور ہوگیا۔ اس لیے تم مجھے لالچی ہونے کا طعنہ نہ دیا کرو۔ ورنہ اس روز اکھاڑا گیا پودا پڑا سوکھ جاتا تھا...... ماسٹر صاحب سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹیوں والے مرد کو بیوی کا غصہ برداشت کرلینا چاہیے لیکن طلاق کی کبھی نہ سوچے۔ ورنہ بیٹیوں کی زندگی برباد ہوجاتی ہے...... ویسے وہ مجھے عمر میں چار پانچ سال چھوٹے ہی ہوں گے۔ تمہارے برابر تقریباً۔ اس لیے مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو کہ تمہیں ان کی شکل میں باپ نظر آتا تھا۔ وہ اور بات ہے کہ انہوں نے چھوٹے ہوکر بھی ہم سے وہی سلوک کیا جو نیک ماں باپ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔"

شریر سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے مشتاق نے کہا۔ "ویسے سچی بات ہے کہ دنیا ماسٹر صاحب کی باتیں سن کر لٹنے میں آجاتی تھی لیکن مجھے نصیحت کرتے ہوئے جب تمہارا ذکر آتا تو وہ مجھے نشے میں لگتے اور کہتے...... مرد کی یہی شان ہے کہ بیوی کے ناز نخرے اٹھائے۔ اس سے مردانگی کم نہیں ہوتی...... مسکرا کر کہتے، خوب صورت عورت میں ناز نخرہ ہوتا ہی ہے۔ تمہاری بیوی میں اس کے ساتھ ذرا اکڑ بھی آ گئی ہے، کوئی بات نہیں۔ عورت باکردار ہو اور خوب صورت بھی تو اس کی اکڑ برداشت کر لینی چاہیے اور یہ نیلی نکتہ جہالت کی وجہ سے ہے۔ ورنہ دیکھو تم! اس کا بھائی کتنا روشن خیال ہوگیا، حالانکہ تعلیم اس کی میٹرک ہی ہے۔ جبکہ بعض لوگ پڑھ لکھ کر بھی جاہل رہتے ہیں......"

ساجدہ نے پھر وہی سوال دہرایا۔ "تم مجھے اس بات کا جواب دو کہ وہ تم جیسے گنوار کو پسند کیوں کرتے تھے؟ خان صاحب تو تم پچھلے دس سال میں بنے ہو، اس سے پہلے بلکہ بہت پہلے، میں پچیس سال، بالکل کوڑا کرکٹ ہوا کرتے تھے۔ شکل اچھی بری نہیں تھی، صرف رنگ ہی کالا تھا لیکن حلیہ اور لباس دیکھ کر دل کوئلہ ہو جایا کرتا تھا۔ تمہیں آگ لگا کر خود بھی مرجانے کو دل چاہتا۔ کہاں گئی وہ گری ہوئی اور کہاں کوا ہوائی۔"

مشتاق نے بیوی کی چٹکی لی اور کہنے لگا۔ "جب وہ نئے نئے ٹرانسفر ہوکر آئے تو اسکول کے لڑکے مجھے ان کے گھر کی ٹونٹیاں اور ڈونگی پمپ ٹھیک کروانے لے گئے تھے۔ کرائے کا مکان لیا تھا۔ بیوی اور ایک ہی بیٹی تھی وہ دونوں اگلے ہفتے آگئیں۔ انہیں جس کام کی ضرورت پڑی، میں نے کردیا۔ جیسے

ہوئی کر جو بھی کام ہوتا، مجھے ہی بلواتے۔ جب ان کے تینوں بچے اسکول جانے لگے تو بوڑھے والدین کو کسی بیماری لگ گئی۔ بیگم کی ساس ان کی خالہ لگتی تھی۔ لاہوری تھے۔ بیگم وہاں کسی لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتی رہی تھیں، اس لیے آبائی گھر چلے گئے۔ ماسٹر صاحب ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو ضرور جاتے۔ بچھڑے ہوئے پرانے دوستوں کی محفل ہر روز جمتی۔ میں فارغ ہو کر ان کے پاس چلا جاتا۔ سارے کام کرتا۔ چائے بنا کر مہمانوں کو پلاتا۔ پکوڑے تلتا، کھانا بھی پکا دیا کرتا۔ عالم فاضل لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر ان کی باتیں غور سے سنتا، مزہ آ جاتا۔ یہی سوچتا کہ بیوی کی بکواس سننے سے بہتر ہے، یہاں بیٹھ کر عقل اور دانائی کی اونچی اونچی باتیں سنو۔ لطیفے بھی ہوتے، ہنسی مذاق ہوتے، جن کی مجھے کم سمجھ آتی۔"

ساجدہ نے اچانک اس کی سنواری ہوئی مونچھوں کو مسل ڈالا، جس سے نکیلی نوکوں کے بال بکھر گئے۔ بھڑک کر بولی۔ "بے وفا ہو تو... کیوں اس بی کی کرتی تھی کہ حلیہ ٹھیک کرو۔ ایک تو شکل سے مسکین اور اوپر سے لباس بے ڈھنگا۔ اچھے بھلے پیسے کما کر بینک میں جمع اور ماسٹر صاحب کی اترن پہن لیتے تھے۔ کپڑے ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے لیکن کھلے اور لمبے۔ خدا کی قسم کارٹون لگتے تھے۔ میرا کلیجا جل جاتا۔ پہلا خاوند پیدا ہی چپڑاسی اور کام چور نکلا۔ گھر میں فاقے کرتا لیکن کام پر نہ جاتا۔ الٹا مجھ سے لڑائی شروع کر دیتا کہ عثمان بھائی انگلینڈ سے پیسا خرچ کیوں نہیں بھیجتے... میری قسمت دیکھو، دوسرا مقدر میں ایسا لکھا تھا کہ پہلے والے کی ساری کسریں نکال دیں۔ ہر وقت کام ہی کام۔ بندہ آرام بھی کر لیتا ہے۔ رات کے ایک بجے بھی وہ رنگ کر کے بیوی کے پاس سے اٹھ جانے والا مرد۔ اتنی بے قدری۔ صرف پیسے کی خاطر... ایسا خاوند دوبارہ قریب آئے، عورت کو چاہیے بیٹھ موڑے کمرے سے باہر نکال دے۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ بے قدری برداشت کرتی رہی..."

مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مشتاق نے ہاتھ روک لیے اور پچکار کر بولا۔ "پیسا تمہارے اور اولاد کے لیے ہی کماتا تھا۔ اتنا جمع کرنے سے ہی سارے کام ٹھیک ہوئے۔ بیٹے کی شادی کی، بیٹیاں پڑھ جائیں۔ پاؤنڈ بہت بعد میں آنے شروع ہوئے۔ یاد کرو، کتنا خرچہ ہوا تھا، جب عثمان کو انگلینڈ بھیجنے پر... اور پھر اس کی بیوی بچے کو بھی میں نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے بھیجا۔ کسی سے ایک روپیا ادھار نہ لیا۔ پیسا بچانے سے ہی کام نکلتے ہیں۔ تو میں نے اپنے اوپر بھی ایک پیسا نہ

ہو..."

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" مشتاق خان کو دل کا دورہ پڑ جائے، جب سے پیسا کمانے پر... ایسا کنجوس کبھی کوئی دنیا میں اور پیدا ہی نہیں ہوا۔ شہر میں ایک ماسٹر نہیں، کئی ماسٹر اسی لیے یار بنا رکھے تھے۔ کتنی کتابیں کھا گیا، کتنی چاٹ گئی۔ جہاں سے جو بھی ملی شٹل بی ٹیچ پر کر لی۔ مفت میں ملے پرانے سامان سے گھر بھر رکھا تھا۔ کباڑ کا مال، کبھی کولر اٹھائے آ رہے ہو، کبھی پنکھا، کبھی واشنگ مشین... یا اللہ! میں سوچ سوچ کر حیران ہوتی۔ ایک جیسی تین تین چیزیں پہلے ہی پڑی تھیں۔ شہر میں اور کوئی مستحق نہیں رہا۔ صرف میرا شوہر ہی رہ گیا۔ ریزہ چکھے کے شکا کر اس کا شرف نہیں کرتا... جس دن تم نے اتنی بھاری واشنگ مشین سر پر اٹھا رکھی تھی، مجھے اتنا غصہ آیا کہ پہلے ہی سنگل اور ڈبل، دو دو مشینیں گھر میں پڑی تھیں۔ کسی روز اس بندے کا منکا ٹوٹ جائے گا۔ تب اس کا لالچ ختم ہوگا۔ پہلے میں طلاق لے لوں گی، اب بیوہ ہو جاؤں گی۔ کیوں نہ خود اس کا کوالا کتا (گھٹنا اور گردن) توڑ دوں۔ چار دن آرام سے گھر بیٹھے۔ کبھی کباڑ کو کر کے روٹی کھا لیں گے..." وہ بولتے بولتے ہنس پڑی۔

مشتاق نے قہقہہ لگایا اور بیوی کی پتلی کمر میں بازو ڈال کر ایک ہی جھٹکے سے قریب کر لیا۔ وہ بیٹی اور بے طرح ہنسنے لگی۔ بولی۔ "ارے ارے! میری پسلیاں چٹخ گئی ہیں۔ بڑھاپے میں لاڈ سوجھنے لگے ہیں، اب اتنی جان نہیں رہی..." گرفت سے آزاد ہو کر ساجدہ ساتھ بیٹھ گئی۔ دونوں کی سانسیں پھول گئیں۔ مشتاق قدرے ہانپتے ہوئے بولا۔ "کوئی ایک چیز بیکار نہیں گئی۔ مرمت اور رنگ روغن اور صفائی ستھرائی کر کے بیچ دیتے تھے۔ محلے اور نئی آبادی کی عورتیں تمہاری کتنی احسان مند تھیں، جنہیں تم نے قسطوں پر چیزیں دیں... ویسے ایک بات سچ ہے۔ ماسٹر صاحب نے میاں محمد بخش کا کلام یاد کر رکھا تھا۔ بلھے والے کے علاوہ ایک اور شعر بھی اکثر سنایا کرتے۔ نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا، کیکر تے انگور چڑھایا تے ہر گچھا زخمایا... ایک بوڑھے پروفیسر صاحب کہا کرتے تھے کہ عورت ذات میں حوصلے اور صبر کی کمی ہوتی ہے۔ میں ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سنا کرتا۔ کچھ کہنے کی اوقات ہی نہ تھی لیکن بیٹھا سوچتا رہتا۔ تمہاری ہر وقت کی بک بک نے مجھے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عورت ذات بے صبر ہے۔ پہلے خاوند کی گردن دبا کر تم نے طلاق لی کہ وہ نکما تھا۔ مجھ سے ہر وقت تنگی

کر کسی کے دن رات کام کرتا ہوں... یہی آسیدہ کی بات ہے۔ رات کو کسی کا مسئلہ حل کرنے سے دلی خوشی... جس رات ایک بجے اٹھ بھاگنے کا طعنہ آج بھی دیتی ہو، وہ بڑی حبسی ہو گئی تھی۔ یاد کرو۔ چوہدری رزاق نے دروازے پر آواز دی تھی کہ بجلی کی لائن ٹوٹ گئی ہے اور پانی سیڑھیوں سے کمروں میں آ رہا ہے۔ اس لیے چھلانگ مار کے اٹھ گیا تھا کر اپنا کیا... گھر کا معاملہ ہے پھر سہی۔ مشکل گھڑی میں جب بھی کسی کا کام کیا، دہرا فائدہ اٹھایا۔ اگلے نے دہری مزدوری دی اور احسان مند بھی رہا، اور بچھا بچھا کے شکریہ ادا کیا۔ جب بھی کسی دفتر میں کام پڑا اس نے فوراً فون ملایا اور سفارش کی... افسوس تم نہیں سمجھیں۔ بات وہی ہے، نیچاں دی اشنائی کولوں فیض..."

ساجدہ نے شوہر کے سینے پر دو ہتڑ مار کر دھکیل دیا اور بولی۔ "دور ہو جاؤ... اتنی اونچی ذات کو نیچ کہتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی۔ مجھ میں صبر تھا تو تمہارے ساتھ گزارہ کیا۔ ورنہ سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ میں اندھیرا چھٹنے کا انتظار کر رہی تھی کہ دن کی روشنی میں ڈیم کی طرف جاتے ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔ فیصلہ کر لیا تھا کہ چاروں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے کے مروں گی تاکہ میرے بعد رل نہ جائیں۔ عجیب رات کو بڑی دیر سے گھر آیا کرتا تھا۔ اس دن تم صدر دروازے پر بیٹھے رہتے اور پچھلے پہر نہ آ جاتے تو تمہارے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ سوائے ہماری لاشوں کے... وہ بھی اگر قسمت اچھی ہوتی تو صحیح سلامت مل جاتیں..."

مشتاق نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا اور سرد آہ بھر کے بولا۔ "واہ! وہ گھڑی اپنی بات ہی تھی۔ ورنہ کیا سے کیا ہو جاتا۔ توبہ استغفار... پتھر پر لکیر کی طرح دل پہ لکھ لیا کہ طلاق دے دوں گا۔ ہر روز بیوی سے بے عزت نہیں ہوا جاتا۔ کیسے بدشکل، کالی کلوٹی برداشت سے باہر ہو گیا۔ یہی سوچا کہ بچے ہیں، مقدر والی بیٹیاں لے لوں گا۔ اصل میں ماسٹر صاحب نے میری اور سلیمہ کی باتیں سن لی تھیں۔ دسویں جماعت کا ایک لڑکا کوئی سبق پوچھنے آیا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اس سے باتیں کرتے ہوئے سو سو کے کچھ نوٹ دیے اور کہا... ذرا جلدی سے اچھی طرح پیک کروا کے لے آؤ..."

ذرا سا توقف کرتے ہوئے مشتاق نے سرد آہ بھری اور دوبارہ بولنے لگا۔ "بارش برس رہی تھی۔ ماسٹر صاحب نے برآمدے میں مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔ میاں بیوی کے تعلق کا پورا فلسفہ کھینچ دیا۔ بتایا کہ اس سے اچھا رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ والدین نہیں رہتے۔ بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو میاں بیوی ہی ایک دوسرے کے لیے رہ جاتے ہیں۔ کہنے لگے... اس عاشقانہ موسم میں بیوی سے دور رہنے والا کوئی مرد بدقسمت ہی ہوگا۔ یہ لڑکا واپس آ جائے تو میں بھی لاہور نکل جاؤں گا۔ وہاں بھی یہی موسم بنا ہوا ہے۔ بیوی سے پیار بھری باتیں کروں گا۔ دنیا میں محبت کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔ خوبصورت اور خوب سیرت بیوی سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہوتی۔ جو عورت اپنے شوہر کی اولاد پیدا کرے اور گھر کا انتظام چلائے، اس سے کیا گلہ شکوہ؟ اس بے چاری کے پاس اور کیا ہتھیار رہ جاتا ہے؟ جب اپنا آپ ہی سونپ دیتی ہے تو اس کے نازنخرے اٹھانے میں مردوں کی مردانگی کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ اصل مرد میدان کی نشانی یہی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں ڈٹ جائے لیکن عورت کی سخت بات سن کر صرف مسکرا دے بلکہ پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔"

ساجدہ مبہوت ہوئی کھلی آنکھوں سے سن رہی تھی۔ مشتاق پر بھی وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کہنے لگا۔ "اس وقت مستانی ہوا کے ساتھ پھوار پڑنے سے ہمیں برآمدے میں ہلکی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ ماسٹر صاحب نے میری آنکھوں کے سامنے عشق محبت بھری ایسی فلم چلائی کہ میرا دل اچھل اچھل کے باہر آنے لگا۔ تمہیں سینے سے لگا کے پیار کرنے کو تڑپ اٹھا۔ اتنے میں وہ لڑکا واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ شیر ہوٹل کا ملازم تھا۔ دونوں نے اخباروں میں لپٹے دو بنڈل اٹھا رکھے تھے، جن پر پلاسٹک بھی دیا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ یہ کڑاہی گوشت اور نان، گرم گرم گھر لے کے جلدی پہنچو۔ جاتے ہی سلیمہ بیٹی کا منہ چومو۔ تمہاری بیٹیاں بڑی معصوم اور پیاری ہیں۔ چاروں کو باری باری چومنا۔ وہ ہنس پڑے اور کہا۔ سب مل کے ایک ساتھ کھانا۔ کوئی گلہ شکوہ زبان پر نہ لانا۔ بلکہ معافی مانگ لینا۔ یہی انسان کی بڑائی ہے۔ جب بچیاں کھانا کھا کے سو جائیں تو باقی اللہ کارساز ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم دونوں برسات کی جاتی بہار کے مزے نہیں لوٹ پاؤ گے..."

ساجدہ کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔ اتنے میں گیٹ کی گھنٹی بج اٹھی۔ مشتاق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چل اٹھ، کڑاہی گوشت آ گیا ہے۔ کھائیں اور آج اسی برسات کی یاد تازہ کریں۔" تم آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ ساجدہ پر رقت طاری ہو گئی اور وفورِ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
"اللہ! اس کی بھولی دنیا جہان کی خوشیوں سے بھر دے۔"



آخرکار

مرزا امجد بیگ

تمام رشتے اللہ کی طرف سے انعام ہوتے ہیں مگر صد افسوس انسان نے انہیں امتحان بنا دیا ہے۔ اپنی ذات... اپنے مفادات کے گرداب میں الجھ کر اس نے ہر ڈوری کو اپنے لیے پھندا بنا کر خود کو کمزور کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر رشتہ بے اعتبار لگنے لگا ہے۔ جیون ساتھی... اتنا خوب صورت... تعلق اللہ نے دیا مگر دل پر چوٹ لگ جائے تو جیون اور ساتھی دونوں مخالف سمت میں چل کر اپنی اپنی وار سے نہ صرف تعلق بلکہ زندگی ہی ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگ جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ماجرا ان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ خطا کسی کی، سزا کسی کو... مگر بالآخر لاکھ پردوں کے باوجود مجرم کا چہرہ سامنے آ ہی جاتا ہے۔ شوہر کا اعتبار مجروح کرنے والی بیوی کی لالچ نے اچھے بھلے گھر کو بکھیر دیا۔

بیگ صاحب کی ڈائری سے ایک معتبر تعلق کا المناک انجام

وہ عورت اچانک ہی میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔ میں اپنے دوست سے ملنے گلبرگ کے علاقے میں آیا ہوا تھا۔ وہ چھٹی کا دن تھا اسی لیے میں نے گھر سے نکلنے کی ہمت بھی کر لی تھی ورنہ ایک وکیل اور ڈاکٹر کی زندگی میں فرصت کہاں۔ ان دونوں پیشوں کو انگلش زبان میں نوبل پروفیشن کہا جاتا ہے۔

میں نے فوراً بریک لگا کر اس عورت کو بچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں مجھے کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ تاہم اس کا جسم ہلکے سے میری گاڑی کے بونٹ سے ٹکرا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ زمین پر گر گئی تھی۔ میں گاڑی سے باہر نکلا اور اس عورت کی خبر گیری کے لیے آگے بڑھ گیا۔

اس دوران میں وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ درمیانے قد کی ایک خوش شکل عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وضع قطع اور پہناوے سے وہ مڈل کلاس نظر آتی تھی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"محترمہ! آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"

"بس اللہ نے بچا لیا ہے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"شاید آپ کا دھیان کہیں اور تھا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس لیے آپ بغیر دیکھے ہی مین روڈ پر چڑھ گئی تھیں۔ اگر میں نے بروقت بریک نہیں لگائے ہوتے تو آپ کو کوئی سنگین حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ کراچی کے بے ہنگم ٹریفک کا کوئی بھروسا نہیں۔ یہاں تو خود ہی خود کو بچانا پڑتا ہے۔ کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔"

"سوری..." وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں جانتی ہوں، غلطی میری ہے۔ آپ نے میری جان بچائی۔ اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔"

شرمندگی کا اظہار کر کے اس نے خود کے شریف النفس ہونے کا ثبوت دیا تھا ورنہ اس نوعیت کی صورت حال میں کراچی کا عام آدمی ہی زیادہ ہے۔ اس عورت کی جگہ اگر کوئی اور خاتون ہوتی تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے وہ الٹا مجھ پر

لے لیتے ہیں مگر چلانے کی تمیز نہیں ——— وغیرہ وغیرہ۔"

اور اس کا شور سن کر درجنوں مرد وہاں جمع ہو جاتے اور یہ دیکھے بغیر کہ قصور کس کا ہے، وہ بڑھ چڑھ کر اس عورت کی حمایت کرنے لگتے۔

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ اس وقت کسی پریشانی میں مبتلا ہیں۔" میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

"اگر کوئی حرج نہ سمجھیں تو مجھے اپنی الجھن کے بارے میں بتائیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے، میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں ———!"

پکی بات تو یہ ہے کہ اس نروس خاتون کو دیکھ کر مجھے اس سے ہمدردی ہوئی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے انتہائی معقولیت کے ساتھ جس طرح صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

"کوئی حرج نہیں ہے۔" وہ میرے استفسار کے جواب میں معتدل انداز میں بولی۔ "آپ کی گفتگو سے خلوص جھلکتا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں، ویسے بھی کہ میں سخت پریشان ہوں۔"

"جب تک آپ مجھے اپنی پریشانی نہیں بتائیں گی، مدد کی نوعیت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"دراصل میری پریشانی کی وجہ عابد ہے۔" وہ مصیبت زدہ لہجے میں بولی۔ "میں اسی سلسلے میں فرقان صاحب سے ملنے یہاں آئی تھی مگر پتا چلا کہ وہ لاڑکانہ گئے ہوئے ہیں۔ بس، میں مایوس ہو کر واپس جا رہی تھی کہ بے دھیانی میں آپ کی گاڑی کو نہ دیکھ سکی اور ٹکر ہو گئی۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بروقت اپنی گاڑی کو روک لیا اور میں اسپتال پہنچنے سے بچ گئی۔" بات کے اختتام پر اس نے مجھے ممنونیت بھری نظر سے دیکھا۔

"آپ احسان مندی کے اظہار، اپنی بے دھیانی اور کار سے ٹکر کو فی الحال بھول جائیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ بس میرے تین سوالات کے جواب دے دیں۔ باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔"

وہ الجھن آمیز استفساریہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "سوال نمبر ایک، آپ کا نام کیا ہے؟"

"نبیلہ!" اس نے جواب دیا۔

"آپ فرقان صاحب سے کس سلسلے میں ملنے آئی تھیں؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"فرقان صاحب ایک جانے پہچانے قسم کے انسان ہیں۔" اس نے بتایا۔ "عابد نے مجھے ان سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ عابد کو یقین ہے کہ فرقان صاحب مسئلے کا کوئی حل نکال سکتے ہیں۔"

"سوال نمبر تین بتاؤں...؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہ عابد کون ہے؟ اور سوال نمبر تین بھی ——— آپ اس کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے پریشان حال پھر رہی ہیں؟"

"عابد میرا شوہر ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور عابد اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ عابد نے مجھے فرقان صاحب سے ملنے کے لیے اس لیے کہا تھا کہ وہ عابد کے لیے کسی ماہر وکیل کا بندوبست کر دیں گے۔ یہ ہے سارا قصہ۔"

"اوہ ———!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "لیکن فرقان صاحب تو لاڑکانہ چلے گئے۔ ویسے پولیس نے آپ کے شوہر کو کس چکر میں پکڑ رکھا ہے؟"

"عابد پر قتل کا الزام ہے۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"پھر تو واقعی آپ کو اپنے شوہر کے لیے کوئی قابل وکیل کرنا پڑے گا۔" میں نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔ "قتل کا الزام کوئی معمولی بات نہیں۔ پولیس والے چھوٹے موٹے جرائم میں بھی انسان کی وہ درگت بناتے ہیں کہ وہ اپنا احوال کسی کو سنانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا۔"

"عابد پچھلے چار روز سے پولیس کسٹڈی میں ہے۔" اس نے بتایا۔ "ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد وہ اسے عدالت میں پیش کریں گے۔"

"میں نے سنا ہے، ریمانڈ کے دوران میں پولیس والے ملزم کو اس طرح دھو ڈالتے ہیں جیسے دھوبی گھاٹ پر کپڑے دھوئے جاتے ہیں۔"

"آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔" وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر آپ کی نظر میں کوئی قابل وکیل ہو تو اس کا پتا بتا دیں۔ وکیل تو ہر حال میں مجھے کرنا ہی ہے۔ آپ ایک ہمدرد انسان ہیں۔ یقیناً کسی اچھے وکیل کو جانتے ہوں گے۔"

"میں ایک وکیل کو جانتا تو ہوں۔" میں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اچھا بھی ہے، قابل بھی ہے اور ماہر بھی ہے لیکن ———"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ مضطربانہ انداز میں مستفسر ہوئی۔ "لیکن کیا بھائی صاحب؟"

"لیکن یہ کہ ———" میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ وکیل صاحب بہت اصول پرست ہیں۔ وہ کوئی بھی کیس لینے سے پہلے اچھی خاصی چھان بین کرتے ہیں۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہو جائے کہ کلائنٹ جرائم پیشہ ہے اور اپنی چرب زبانی سے وہ خود کو معصوم و بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو پھر وہ کیس کو چھوڑ دیتے ہیں۔"

"مجھے ایسے ہی ایمان دار اور اصول پسند وکیل کی تلاش ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ عابد بے گناہ ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "پلیز ——— آپ مجھے ان وکیل صاحب سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ بتا دیں۔ میں کل ہی جا کر ان سے تفصیلی ملاقات کروں گی۔"

میں نے نبیلہ کو اپنا وزیٹنگ کارڈ تھمایا اور "خدا حافظ" کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔

آئندہ روز وہ میرے روبرو آفس میں بیٹھی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوری توجہ سے اس کی روداد سنی۔ ہمارے درمیان میری فیس کے معاملات طے ہوئے۔ اس نے دو اقساط میں فیس ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا یعنی نصف ایڈوانس اور نصف اس وقت جب اس کیس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہو۔ جب اس نے مجھے آفس میں بیٹھے دیکھا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ گزشتہ روز جس شخص کی کار سے ٹکرائی تھی، وکیل کی حیثیت سے اگلے روز اسی سے ملاقات ہو گی۔ اس ملاقات پر اس نے اس حیرت کا اظہار کیا تھا جس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہ بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا کہ نبیلہ کی بیان کردہ کہانی کی روشنی میں عابد مجھے بے قصور نظر آیا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اس کا کیس لینے کی ہامی بھری تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ کہانی کے اگلے مراحل میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ جو باتیں میں نے دانستہ آپ سے چھپانے کی کوشش کی ہے جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں سامنے آ جائے گا۔

☆☆☆

ملزم عابد پیشے کے اعتبار سے ایک کارپینٹر تھا اور اس کی رہائش کراچی کے ایک متوسط علاقے گلشن آباد میں تھی۔ اس کی دکان بھی اسی علاقے میں تھی۔ عابد کی شادی کو لگ بھگ چار سال ہو گئے تھے۔ اس کی صرف ایک بیٹی تھی جس کا نام ... تھا۔ ... کی عمر کم و بیش تین سال رہی ہو گی۔ یہ مختصر سی فیملی خوش باش زندگی گزار رہی تھی کہ ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی اور عابد کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں تھا۔

مقتولہ خدیجہ نامی ایک عورت تھی اور وہ ملزم کی محلے دار تھی۔ مقتولہ کی فیملی بھی نہایت ہی مختصر تھی۔ میاں بیوی اور دو بچے۔ خدیجہ کا شوہر رؤف احمد ایک آئس کریم فیکٹری میں ملازم تھا۔ بڑی بیٹی ... میٹرک ... کر رہی تھی اور گھر کے اندر ہی ایک بیوٹی پارلر اور فٹنس جم بھی چلاتی تھی جہاں محلے کی فربہ اور بے ڈھنگی عورتیں اپنا وزن کم کرنے کے لیے کلاسز لیا کرتی تھیں۔ مقتولہ کا ایک سات سالہ بیٹا بھی تھا جس کی عمر سات سال تھی۔ عدیل نامی یہ بچہ محلے ہی کے ایک اسکول "پرنس گارڈن اکیڈمی" میں کلاس ٹو کا اسٹوڈنٹ تھا۔

واقعات کے مطابق وقوعہ سے چند روز پہلے مقتولہ اور ملزم کے بیچ ایک پھڈا ہو گیا تھا۔ ملزم عابد ایک غصہ ور اور گرم مزاج کا انسان تھا اور غلط بات پر وہ فوراً غضب ناک ہو جایا کرتا تھا۔ اس پھڈے سے پہلے بھی ایک دوسرے ایشو پر ان دونوں کے بیچ "تو تو، میں میں" ہو چکی تھی۔

آنٹی خدیجہ (مقتولہ اسی نام سے محلے میں جانی جاتی تھی) کو اپنے گھر میں لکڑی کا کچھ کام کروانا تھا اور اس نے عابد سے اس کام کا اسٹیمیٹ لگوایا تھا۔ عابد نے اپنے حساب سے خدیجہ کو ایک اماؤنٹ بتا دیا تھا۔ آنٹی خدیجہ بہت ہوشیار اور چالاک عورت تھی۔ اس نے محلے ہی کے ایک دوسرے کارپینٹر کو بلا کر اسی کام کے ریٹس لیے۔ اس کارپینٹر کا نام الیاس تھا اور عابد سے اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ الیاس کو کسی طرح یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ عابد اس سے پہلے خدیجہ آنٹی کو ریٹس دے چکا تھا لہٰذا اس نے گھر کے کام کا جو اسٹیمیٹ دیا وہ عابد سے کہیں کم تھا لہٰذا خدیجہ نے الیاس سے وہ کام کروا لیا اور عابد کے خلاف چہ میگوئیاں بھی کیں کہ وہ بے ایمان اور لٹیرا قسم کا بڑھئی ہے ——— وغیرہ وغیرہ ———!

ایک ہی محلے میں اس نوعیت کے مخالفانہ بیانات بہت تیزی سے سفر کرتے ہوئے متعلقہ شخص تک جا پہنچتے ہیں۔ آنٹی خدیجہ نے عابد کے خلاف جو زہر اگلا وہ من و عن بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر عابد تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ عابد نے فوری طور پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن اس کے دل و دماغ میں آنٹی خدیجہ کے لیے غم و غصہ بھر گیا تھا پھر چند روز بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ عابد کے غبارے کو پھٹنے کا راستہ مل گیا۔

آنٹی خدیجہ محلے میں بی سی (کمیٹی) ڈالا کرتی تھی۔ اب کی بار والی بی سی میں ایک کمیٹی عابد کی بھی تھی۔ یہ ایک

...ے وہ ان کی چونی کی بی سی تھی۔ اس بی سی کے کل دس
ممبرز تھے اور روزانہ سو روپے دیا جاتا تھا۔ اس طرح
ایک ماہ کے بعد تیس ہزار روپے کی بی سی کھلتی تھی۔ چند روز
پہلے جو بی سی کھلی اس پر عابد اور خدیجہ آنٹی کے بیچ اچھی
خاصی بدمزگی ہوگئی تھی۔

"ابھی مجھے یہ منظور نہیں کہ عدیل پرچی اٹھائے۔"
عابد نے اعتراض کیا۔ "یہ کام کسی اور بچے سے بھی تو کرایا
جاسکتا ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں، ہر بار کسی نئے بچے کو زحمت دی کرنا
چاہیے۔ ہمارے محلے میں بچوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔"

آنٹی خدیجہ کے پاس جو بی سی ڈالی تھی اس کی سالہا
سال سے یہ روایت رہی تھی کہ بی سی کی پرچی خدیجہ کا بیٹا
عدیل ہی اٹھایا کرتا تھا۔ عدیل پچھلے کئی سال سے پرچیاں
اٹھاتے اٹھاتے سات سال کا ہوگیا تھا اور آج تک کسی ممبر
نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

"پرچی تو میرا بیٹا ہی اٹھائے گا۔" آنٹی خدیجہ بھی
ضد پر اتر آئی تھی۔ "جب اور کسی ممبر کو تکلیف نہیں تو پھر کیا
مسئلہ ہے؟"

"میں بھی اس بی سی کا ممبر ہوں۔" عابد نے درشت
لہجے میں کہا۔ "اور مجھے سخت اعتراض ہے۔ آپ لوگ میری
بات کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔"

"آپ لوگ" سے عابد کی مراد وہ تمام خواتین
وحضرات تھے جو پرچی نکالنے کے موقع پر وہاں جمع تھے۔
ایک نے عابد سے پوچھا۔

"آپ کے اعتراض کا سبب کیا ہے؟"

"مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس بی سی میں گھپلا
ہو رہا ہے۔" عابد نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"گھپلا...!" ایک عورت نے حیرت بھرے
انداز میں پوچھا۔ "کیسا گھپلا عابد بھائی؟"

"آنٹی خدیجہ نے اپنے بیٹے کو ایک خاص انداز میں
ٹرینڈ کر رکھا ہے۔" عابد نے پُروثوق انداز میں کہا۔ "یہ اپنی
مرضی سے جس کی بھی چاہیں بی سی نکال سکتی ہیں۔"

"یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے۔" ایک دوسری
عورت خفگی بھرے انداز میں بولی۔ "انسان کو بے ایمانی تو
نہیں کرنی چاہیے نا...!"

بی سی سسٹم میں پرچی اٹھنے کے موقع پر عموماً وہی لوگ
جمع ہوتے ہیں جن کی بی سی ابھی نکلی نہیں ہوتی ورنہ جو لوگ بی
سی لے چکے ان کا وہاں کیا کام اور جو ہر ماہ بڑی آس امید
لے کر آتے ہوں اور انہیں پتا چلے کہ پرچی اٹھانے میں کوئی
گڑبڑ جاری ہے تو ان کا تشویش میں مبتلا ہونا
لازمی امر ہے لہٰذا عابد کے اعتراض اٹھانے پر وہاں
قسم قسم کی الٹی سیدھی باتیں شروع ہوگئیں۔ جن کی ابھی تک
بی سی نہیں نکلی تھی اور وہ ہر ماہ نامراد واپس لوٹ جاتے
انہیں عابد کی بات میں بہت وزن محسوس ہوا اور وہ اپنے
اپنے طور پر تبصرے کرنے لگے۔ گویا پرچی اٹھنے کا معاملہ
تعطل کا شکار ہوگیا۔

اس صورت حال نے آنٹی خدیجہ کو پریشان کردیا۔
اس نے عابد سے کہا۔ "اس شرانگیزی میں تمہارا زیادہ قصور
نہیں۔ سیانے جو کہہ گئے ہیں وہ غلط نہیں ہوسکتا۔ چور کی
داڑھی میں تنکا۔"

اتفاق سے عابد نے ہلکی پھلکی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔
اس معروف اردو محاورے کو اپنی ذات پر ایک سنگین حملہ سمجھا
اور چراغ پا ہوتے ہوئے وہ آنٹی خدیجہ سے مخاطب ہوا۔

"تم نے مجھے چور کہا...؟"

"تو اس میں کیا شک ہے۔" آنٹی خدیجہ نے اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی کراری آواز میں کہا۔
"چوروں کو سارے نظر آتے ہیں چور۔"

"آنٹی! میں نے تمہاری کون سی بھینس چرائی
ہے جو مجھے چور کہہ رہی ہو۔" عابد نے غصیلے لہجے میں احتجاج کیا۔

"صرف بھینس چرانے ہی سے انسان چور نہیں
کہلاتا۔" آنٹی خدیجہ نے ایک گہری چوٹ کی۔ "تین ہزار
کا کام پانچ ہزار میں کرنے والا شخص بھی ڈاکو ہی کہلاتا ہے
اور ڈاکو تو چور سے بھی آگے کی چیز ہے۔"

عابد آنٹی خدیجہ کے اشارے کو بخوبی سمجھ گیا تھا۔ اس
نے ان کا کارپینٹر کے تھرو کم پیسوں میں بکنے کا کام کر
کا حوالہ دیا تھا۔ عابد نے بڑی مشکل سے آنٹی خدیجہ کے طنز
کو برداشت کیا اور کہا۔

"اب میں کیا بولوں۔ تم عورت ذات ہو۔ اگر
میرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو سب مجھے ہی
بدتمیز اور نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔"

"اور تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہیں ایسی ویسی بات نکالنے
دوں گی۔" آنٹی خدیجہ نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "اس سے پہلے
ہی میں تمہارا منہ نہ توڑ دوں گی۔"

ان کے بیچ پندرہ منٹ تک تیز و تند فقروں کا
تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر میں آنٹی نے کہا۔

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بی سی میں بے ایمانی کر رہی
ہوں تو تم اپنی بی سی نکال لو۔ تم نے اب تک جتنے پیسے

...یں بھی لوٹا دوں گی۔"

"بعد میں نہیں۔" عابد نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اگر
ابھی اور اسی وقت میرے بھرے ہوئے پیسے لوٹا دو تو میں بی
سی چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

"ابھی تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمہیں چند ماہ
انتظار کرنا پڑے گا۔" آنٹی نے بیزاری سے کہا۔
"آج جس کی پرچی اٹھے گی اسے سب سے پہلے پے
منٹ کرنا ہوگی۔"

"مجھے تین دن کے اندر اپنی رقم چاہیے۔" عابد نے
دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "ورنہ میں تمام ممبرز کو بتا دوں گا کہ تم
اپنے بیٹے کی مدد سے کس طرح پرچی اٹھانے میں بے ایمانی
کرتی ہو۔"

"ارے بھائی! اس ایک کام کے لیے تین دن کا
انتظار کیوں۔" ایک دل جلی عورت بولی۔ اس بے چاری
کی بی سی ہمیشہ اینڈ پر نکلا کرتی تھی۔ "تم ابھی بتا دو کہ
آنٹی کس طرح کا گھپلا کر رہی ہے۔"

"ابھی بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" عابد نے سخت تیز
انداز میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں... کا کیا مطلب ہوا؟" عورت
نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ پرچی نکل چکی ہے۔" عابد نے کہا۔

"یہ کیا پہیلیاں ڈال رہے ہو؟" وہ عورت مزید الجھ
گئی۔ "کھل کر بتاؤ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو...؟"

عابد نے لوہا گرم دیکھا تو آنٹی خدیجہ کی راز کی
سازش کو منظرعام پر لے آیا۔ اس نے وہاں موجود بی سی
کے تمام حضرات ممبرز کو یہ کہانی سنا ڈالی۔

"اس فراڈ آنٹی نے اپنے بیٹے کو اچھی طرح ٹرینڈ
کر رکھا ہے۔ آنٹی نے جس کی بی سی نکالنا ہوتی ہے، عدیل
اسی ممبر کی پرچی اٹھاتا ہے۔ آپ سب کے ذہنوں میں اس
وقت ایک ہی سوال ہے کہ پرچیاں تو سب کی سب تہ شدہ
ہوتی ہیں پھر اس معصوم بچے کو کیسے پتا چلتا ہے کہ کس کی
پرچی اٹھانا ہے؟ یہی تو اس چال باز آنٹی کی سازش ہے۔
ٹھہریں، میں آپ کو بتاتا ہوں..." اس نے لمحاتی توقف
کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے
ہوئے بولا۔

"آنٹی دغاباز نے تمام ممبرز کی پرچیوں کو ایک ہی
انداز میں تہ کرکے بند کر رکھا ہے اور اوپر سے تمام تہ شدہ
پرچیاں ایک جیسی ہی نظر آتی ہیں۔ اب قصہ یہ ہے کہ آنٹی
نے جس ممبر کی بی سی نکالنا ہوتی ہے اس کی مخصوص پرچی وہ
تین گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیتی ہے اس طرح یہ پرچی
خوب ٹھنڈی ہوجاتی ہے پھر جب پرچی اٹھانے کا وقت آتا
ہے تو اس ٹھنڈی ٹھار شدہ پرچی کو باقی تہ شدہ پرچیوں میں
شامل کرلیا جاتا ہے۔ یہ تمام پرچیاں ایک تسلے میں ڈال کر
عدیل کے سامنے رکھ دی جاتی ہیں۔ عدیل چونکہ آنٹی کا
تربیت یافتہ ہے۔ وہ بڑے دوراندیشی انداز میں تسلے کے اندر
ہاتھ گھماتا ہے۔ سب ممبرز یہی سمجھتے ہیں کہ معصوم بچہ
پرچیوں کو اچھی طرح مکس کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ ٹھنڈی
ٹھار پرچی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ پھر جیسے ہی مطلوبہ پرچی
اس کے ہاتھ کو چھوتی ہے، وہ اسے دبوچ کر باہر نکال لیتا
ہے... یہ ہے سارا کھیل۔"

"لیکن اس میں آنٹی خدیجہ کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟"
ایک عورت نے بہت اہم سوال کیا۔ "وہ اتنا کھٹ راگ کس
لیے پھیلاتی ہے...؟"

"یہ سب کمیشن کا چکر ہے۔" عابد نے انکشاف انگیز
لہجے میں بتایا۔ "بعض ممبر آنٹی سے درخواست کرتے ہیں کہ
اگر وہ ان کی بی سی نکال دے تو وہ اسے دو، تین ہزار یا اس
سے زیادہ کا نذرانہ پیش کریں گے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بکواس کر رہے ہو۔" آنٹی
خدیجہ آپے سے باہر ہوگئی۔ "تم نے مجھ پر جو سنگین الزام
لگایا ہے، اس کا نتیجہ بھی بھگتو گے۔"

"میں نے کسی پر کوئی الزام نہیں لگایا بلکہ حقیقت
بیان کی ہے۔" عابد نے برہمی سے کہا۔ "اسی لیے تو نشیب
میں پانی بھر رہا ہے۔"

ان جملوں کے بعد ان دونوں میں شدید نوعیت کی
زبانی کلامی جنگ ہوئی۔ وہاں پر موجود لوگوں نے بیچ بچاؤ
کرادیا۔ یہ جھگڑا ان الفاظ پر اختتام پذیر ہوا۔

"اب تو میں خود تمہاری بی سی توڑ رہی ہوں۔" آنٹی
خدیجہ نے چنگھاڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور پیسے بھی دوں
گی آخری بی سی کھلنے کے ایک ماہ بعد۔"

"پیسے تو تمہیں تین دن کے اندر ہی دینا ہوں گے۔"
عابد نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ "ورنہ نتائج کی ذمے
داری بھی تم پر ہی ہوگی۔"

اور... اس تکرار کے پانچویں روز آنٹی خدیجہ کو قتل
کردیا گیا تھا اور اس وقت تک عابد کو پیسے نہیں ملے تھے۔

☆☆☆

واقعات کے مطابق جس وقت خدیجہ آنٹی کو قتل کیا

گیا۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کا شوہر رؤف اپنی ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ مہ جبیں کالج گئی ہوئی تھی اور عدیل اسکول میں تھا۔ وقوعہ یعنی آنٹی خدیجہ کا گھر اسی گلی کے رقبے پر تعمیر شدہ ایک دو منزلہ گھر تھا جس کی بالائی منزل پر صرف ایک ہال نما کمرا بنا ہوا تھا جسے مہ جبیں جیم کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ وہاں پر مہ جبیں نے ایکسرسائز کی چند مشینیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اس جیم تک پہنچنے کے دو راستے تھے۔ ایک تو گھر کے اندرونی حصے سے تھا اور دوسرا بالکل الگ تھلگ۔ اس راستے سے مہ جبیں کے پاس آنے والی عورتیں اوپر ہال تک پہنچتی تھیں۔ یہ راستہ ایک زینے کی شکل میں تھا جس کا دروازہ گھر کے داخلی دروازے کے برابر میں تھا۔ ایکسرسائز والے ہال میں مہ جبیں نے تازہ ہوا کی آمد و رفت کے لیے بڑی بڑی کھڑکیاں بنوا رکھی تھیں جن پر جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہال کے اندر سے بہ آسانی باہر دیکھا جا سکتا تھا تاہم باہر سے ہال کے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہ جالیاں بہترین پردے کا کام کرتی تھیں۔

مکان کی زیریں منزل پر صرف دو کمرے اور ایک صحن تعمیر کیا گیا تھا۔ کمروں میں سے ایک کو ڈرائنگ روم اور دوسرے کو بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان دو کمروں کی تعمیر کے بعد جتنی جگہ بچی تھی اسے صحن کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا جس کے اندر پھول دار پودوں والے گملے بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ بیڈ روم آنٹی خدیجہ اور رؤف احمد کے تصرف میں تھا جبکہ عدیل اور مہ جبیں نے ڈرائنگ روم پر قبضہ جما رکھا تھا۔ آنٹی خدیجہ کی لاش بیڈ روم کے اندر اس کے بیڈ پر پائی گئی تھی۔

لاش کی دریافت کا سہرا عدیل کے سر بندھتا تھا۔ عدیل کے اسکول کی چھٹی ڈیڑھ بجے ہوتی تھی اور چھٹی کے وقت خدیجہ اسے اسکول سے لے کر آتی تھی۔ وقوعہ کے روز یعنی آٹھ فروری کو جب خدیجہ عدیل کو پک کرنے اسکول نہیں پہنچی تو عدیل پریشان ہو گیا۔ پرنس گارڈن اکیڈمی عدیل کے گھر سے تین گلی کی مسافت پر تھا۔ یہ اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا کہ وہ اکیلا گھر نہ جا سکتا تھا لیکن وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی اسکول جانے آنے کا عادی تھا اس لیے وہ اسکول میں رک کر اپنی ماں کا انتظار کرتا رہا۔

جب اسکول سے عدیل کے علاوہ تمام بچے رخصت ہو گئے تو پرنسپل کو تشویش ہوئی۔ اسکول کی ایک ٹیچر کا اسی گلی سے گزر ہوتا تھا جہاں آنٹی خدیجہ کا گھر تھا۔ پرنسپل نے مذکورہ ٹیچر سے کہا۔

"...آج اس کی ماں اس کے ساتھ نہیں آئی تو کیا بات ہو گئی ہے جو وہ اپنے بچے کو لینے نہیں آئی۔ تم جاتے ہوئے اسے اس کے گھر تک چھوڑ دینا۔"

"او کے میڈم! میں عدیل کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔" سلمیٰ نامی اس ٹیچر نے کہا۔

سلمیٰ، عدیل کو گھر کے دروازے سے اندر کر کے آگے بڑھ چکی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد عدیل روتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور اس نے روتے ہوئے لوگوں کو بتایا۔

"امی اپنے بیڈ پر بے ہوش پڑی ہیں اور ان کے کپڑوں پر بہت سا خون لگا ہوا ہے۔ میں نے امی کو بہت ساری آوازیں دیں لیکن وہ اٹھ نہیں رہیں...."

آنٹی خدیجہ کا اس وقت سوتا یا بے ہوش ہونا اتنا تشویش ناک نہیں تھا لیکن عدیل نے جو یہ بتایا کہ اس کے کپڑوں پر بہت سا خون لگا ہوا ہے اس سنسنی خیز اطلاع نے ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کر دی اور تین چار خواتین و حضرات صورتِ حال کی خبر گیری کے لیے آنٹی خدیجہ کے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔

خدیجہ آنٹی اپنے بستر پر چت پڑی تھی اور اس کا بدن ساکت تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی سے دور جا چکی ہے۔ بستر پر سے اس کا لباس بھی خون سے تر تھا۔ یہ بہت ہی بھیانک اور ہنگامی صورتِ حال تھی لہٰذا فوراً اس واقعے کی اطلاع علاقے کے تھانے تک پہنچائی گئی اور ایک بندے کو رؤف کی فیکٹری کی جانب دوڑا دیا گیا۔

اسی اثنا میں مہ جبیں بھی کالج سے واپس آ گئی تھی۔ موجودہ سچویشن نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا تاہم اس نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور عدیل کو سنبھالنے کے ساتھ ہی اس نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صورتِ حال کو بھی اپنے قابو میں کر لیا تھا۔

پولیس اور رؤف لگ بھگ ایک ساتھ ہی جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ پولیس کی کارروائی لگ بھگ ایک گھنٹے تک چلتی رہی پھر انہوں نے رؤف کی نشاندہی اور راہنمائی میں عابد کو آنٹی خدیجہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ مقتول کے ورثا قاتل کے حوالے سے جس شخص پر اپنے شک کا اظہار کریں، پولیس اس بندے کو کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتی۔ رؤف اور مہ جبیں نے بہت زور دے کر پولیس کو بتایا تھا کہ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں سوائے ترکھان عابد کے۔ پھر انہوں نے پولیس کو وہ تمام واقعہ بھی سنا دیا تھا جس میں آنٹی خدیجہ اور عابد کی خاصی جھڑپ ہوئی تھی اور عابد نے

[illegible]

پولیس کو اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے اتنا سا اشارہ کافی تھا۔ انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر عابد کو اس کی دکان سے گرفتار کر لیا تھا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس وقت عابد عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں تھا۔ چند روز بعد چالان کے ساتھ عدالت میں پیش کرنے والے تھے۔ اس کے بعد مقدمے کا باقاعدہ آغاز ہوتا تھا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھی نبیلہ سے کہا۔

"آپ نے مجھے جو معلومات فراہم کی ہیں میری نظر میں وہ کافی ہیں لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ باقی کا تمام ہوم ورک میں خود کروں گا لیکن اس کے لیے مجھے کچھ آپ کے تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔"

"میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "بس آپ مجھے یہ یقین دلا دیں کہ عابد کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیا عابد نے آنٹی خدیجہ کو قتل کیا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں مانتی ہوں کہ عابد بہت غصے والا ہے۔ غلط بات اس سے برداشت نہیں ہوتی اور وہ فوراً آگ بگولا ہو جاتا ہے لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ اس نے خدیجہ کو قتل نہیں کیا۔"

"بس تو پھر آپ اس بات کا بھی پکا یقین رکھیں کہ اگر عابد بے گناہ ہے تو پھر اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔" میں نے نبیلہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اللہ کے فضل و کرم سے وہ اس مقدمے میں باعزت رہا ہوگا۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔" وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کی باتوں سے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے ورنہ میں تو خود کو ختم ہوتا محسوس کر رہی تھی۔"

"اچھے اور برے حالات انسان کی زندگی میں آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "قدرت نے جب کسی انسان کا امتحان لینا ہوتا ہے تو وہ اسے اچھے یا برے حالات میں گرفتار کر دیتی ہے اور اس آزمائش میں کامیابی کے لیے چند ایک نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ باقی کا کام خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"اور وہ اہم نکات کون کون سے ہیں؟" وہ عقیدت بھرے انداز میں مستفسر ہوئی۔

"جب انسان کا اچھا وقت چل رہا ہوتا ہے تو اس لہٰذا اس دوران میں اپنے آرام و آسائش کی خاطر بھی حد سے تجاوز نہ کرے۔ ایک گفت میں رہتے ہوئے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو بھی انسان سمجھیں اور ان کا حق ادا کرنے کا خیال رکھیں۔ یہ آپ کا انوسٹمنٹ ہے جو برے وقت میں مارک اپ کے ساتھ آپ کو واپس ملے گا۔"

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب انسان کا برا وقت چل رہا ہو تب بھی اسی بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ تکلیف عارضی ہے۔ مشکل وقت میں انسان کو صبر و تحمل اور برداشت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہی تین چیزیں انسان کی نیا کو پار لگاتی ہیں۔"

"میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس وقت میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں آپ کی دی ہوئی ٹپس پر ضرور عمل کروں گی۔"

"قدرت عموماً انسان کو تین طریقوں سے آزماتی ہے۔" میں نے اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "نمبر ایک۔ انسان کو کسی چیز سے محروم رکھ کر وہ اس کے ضبط اور صبر کا امتحان لیتی ہے۔ ہر محرومی میں صبر اور شکر کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ نمبر دو، کسی انسان کو اس کی اہلیت اور اوقات سے کہیں زیادہ نواز کر قدرت اس کے ظرف کی آزمائش کرتی ہے۔ کم ظرف آپے سے باہر نکل کر اپنی اوقات کو بھول جاتا ہے اور مخلوقِ خدا کو خود سے حقیر جان کر ان کے ساتھ ظلم و زیادتی پر اتر آتا ہے لہٰذا وہ امتحان میں فیل ہو جاتا ہے۔ نمبر تین.... قدرت کی یہ آزمائش سب سے زیادہ کڑی ہے یعنی قدرت کسی اہل اور قابل انسان کو زمانے بھر کی نعمتوں سے سرفراز کرے۔ عزت، دولت، صحت، شہرت.... سب کچھ اسے عطا کرے اور پھر اچانک یہ سب چھین لے۔ وہ انسان اپنی تمام تر قابلیت اور اہلیت کو استعمال کرنے کے باوجود بھی حالات کو قابو میں نہ لا سکے اور جھنجلا کر اللہ سے گلہ شکوہ شروع کر دے۔ برے وقت میں اچھے وقت کو فراموش کر کے وہ ناشکری پر اتر آئے تو سمجھو کہ وہ امتحان میں فیل ہو گیا۔"

"آپ کی باتیں دل میں ترازو ہو جاتی ہیں وکیل صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اگر آپ ڈاکٹر ہوتے تو مریض آپ کی باتیں سن کر اپنے مرض کو بھول

"اور جب ..." میں نے متفکر انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تمام میڈیکل اسٹورز والے سارا دن فارغ بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ..."

وہ میری بات پر کھلکھلا کر ہنس دی۔ مجھے یہ دیکھ کر خاصا اطمینان محسوس ہوا کہ میں اسے افسردگی کی کیفیت سے باہر نکال لایا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"آپ نے مجھ سے تعاون کرنے کے لیے کہا۔ مجھے بتائیں کہ کس قسم کا تعاون کرنا ہوگا؟"

میں نے نبیلہ کو اس کیس کے حوالے سے چند ضروری ہدایات دیں جن میں زیادہ تر کا تعلق مقتول کی فیملی اور ان کے گھریلو حالات سے تھا۔ اس کیس کو اپنے حسب منشا لانے کے لیے مجھے یہ تمام تر معلومات درکار تھیں۔ نبیلہ نے یہ تمام اہم معلومات مجھے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔

"میں آج یا کل کسی وقت متعلقہ تھانے جا کر عابد سے ملاقات کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے چند اہم سوالات کرنا ہیں اور بعض کاغذات پر اس کے دستخط بھی چاہئیں۔ اب ان شاء اللہ ہماری ملاقات عدالت کے کمرے میں ہوگی۔"

"ان شاء اللہ!" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ہمارے بیچ الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا پھر وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئی۔ جب وہ میرے آفس سے نکلی تو اس کے قدموں میں اعتماد نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ اس دوران میں، میں نے ملزم عابد سے ایک بھرپور ملاقات کر لی تھی۔ وہ ایک قوی الجثہ اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی کرختگی پائی جاتی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا۔ اگر اس کا ایک ہاتھ کسی کو پڑ جاتا تو اس کے دن میں تارے نظر آنے اور بے ہوش ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ عابد دیکھنے میں جتنا غصہ ور نظر آتا ہے، در حقیقت وہ ایسا تھا نہیں۔ اندر سے وہ مجھے ایک سچا، کھرا اور نرم دل انسان لگا تھا۔ اس کے دل و جگر میں ایک خاص نوعیت کا گداز پایا جاتا تھا۔ اسے انسانوں کی "فروٹ کیٹیگری" میں رکھا جا سکتا تھا یعنی اوپر سے سخت اور اندر سے نرم۔

ذکر کرتا چلوں۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتول آئی خدیجہ کی موت آٹھ فروری کی دوپہر دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور رپورٹ میں واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا کہ مقتول کو حالت نیند میں قتل کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ وہ سوتے میں اس کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے زندگی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی نسوں پر جو خون لگا ہوا ملا تھا وہ خالص نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ ... اس خون میں پانی یا کچھ اور ملا کر اسے پتلا کر دیا گیا تھا لیکن مقتول کے جسم میں موجود خون کا معائنہ بتاتا تھا کہ اس کی حالت نارمل ہے۔ صرف کپڑوں پر لگے ہوئے خون کی کیفیت اصلی خون کی بہ نسبت کافی پتلی تھی یعنی جسم سے خارج ہونے کے بعد خون کا مخصوص گاڑھاپن جاتا رہا تھا اور وہ اپنے فطری انداز میں لباس پر جم نہیں پایا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزم کی درخواست ضمانت دائر کر دی لیکن جج نے درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے آئندہ پیشی کے لیے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے دی۔

اس عدالتی کارروائی سے مجھے قطعاً کوئی مایوسی نہیں ہوئی تھی کیونکہ قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی اور یہ بات میں نے نبیلہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ وہ بھی مطمئن تھی۔ میں نے نبیلہ کو جس نوعیت کی معلومات اکٹھی کرنے کو کہا تھا وہ کام اس نے خاطر خواہ کر دیا تھا۔ آئندہ پیشی سے قبل کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی میں لگ بھگ دو ماہ لگ گئے۔ اس دوران میں مجھے ہوم ورک کرنے کا اچھا خاصا موقع مل گیا تھا۔ میں نے وہ تیاری مکمل کر لی تھی جو اس کیس کے لیے ضروری تھی۔

آئندہ پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو عدالت کا کمرا حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے میری ہدایات کی روشنی میں صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس "انکار" پر ملزم کا تفصیلی بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ میرے موکل نے میری ہدایات کو من و عن یاد رکھا تھا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے کم و بیش آٹھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی تھی۔ میں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیان میں کوئی اہم بات یا خاص نکتہ موجود ہوگا۔



کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔ اسے استغاثہ کا وارث بھی کہا جاتا ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ میں نے جج سے درخواست کی۔

"جناب عالی! اس سے پہلے کہ استغاثہ کا کوئی گواہ بیان دینے کے لیے کٹہرے میں آئے، میں معزز عدالت کی اجازت سے اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

میری اس استدعا پر وکیل استغاثہ نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا تاہم وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میری فرمائش میں قابل اعتراض کوئی بات نہیں تھی لہٰذا جج نے مجھے انکوائری آفیسر سے سوال و جواب کی اجازت دے دی۔

انکوائری آفیسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام مقصود علی تھا۔ وہ وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

"انسپکٹر صاحب!" میں نے اس کے عہدے میں سے "سب" کے لفظ کو خارج کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ "آپ ایک بہادر اور دلیر پولیس افسر ہیں جس کا ثبوت آپ کا دایاں ہاتھ ہے۔"

مقصود علی کا دایاں ہاتھ معذور تھا۔ ایک ڈاکو سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈاکو کی گولی چل جانے سے مقصود علی کا دایاں ہاتھ اس بری طرح زخمی ہو گیا تھا کہ کلائی پر سے اس کے کٹے ہاتھ کو کاٹنا پڑا تھا۔ انتہائی نزدیک یعنی ایک آدھ انچ کے فاصلے سے چلنے والی گولی نے مقصود کے ہاتھ کے پرخچے اڑا دیے تھے تاہم مزے کی بات یہ تھی کہ مقصود نے شدید زخمی ہونے کے باوجود ڈاکو کو فرار ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ جرأت مندی کے اس مظاہرے پر اسے فوراً اے ایس آئی سے ایس آئی (سب انسپکٹر) بنا دیا گیا تھا اور میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر زبانی کلامی ہی سہی مگر تھوڑی دیر کے لیے اسے انسپکٹر کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔

"تعریف کا شکریہ جناب۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"آئی او صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟"

"وہ کوئی مقتول کی گلی کا رہائشی تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "ہمیں بذریعہ فون اس افسوس ناک واقعے کی اطلاع دوپہر دو بجے دی گئی تھی اور ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم

"ویری گڈ!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ نے کن معلومات پر مشتمل جو چالان تیار کیا ہے اس میں لکھا ہوا ہے کہ جب آپ وقوعہ پر پہنچے تو مقتول آئی خدیجہ کی لاش اس کے بیڈروم میں بیڈ پر پڑی تھی اور بیڈروم کی چھت والا پنکھا فل اسپیڈ سے چل رہا تھا۔ اگر میں نے چالان کے اس حصے کو سمجھنے میں کوئی غلطی کی ہو تو آپ میری راہنمائی فرمائیں ...؟"

"نہیں ... آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے۔" وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ "واقعی مقتول کے بیڈروم کا سیلنگ فین آندھی اور طوفان کی رفتار سے چل رہا تھا۔"

"کیا اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہے کہ مقتول آئی خدیجہ کی موت آٹھ فروری کی دوپہر دس سے بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی؟"

"کوئی شک نہیں وکیل صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"فروری کا مہینا کراچی میں اتنا گرم نہیں ہوتا کہ اس قدر تیز پنکھا چلانے کی ضرورت پیش آئے۔" میں نے آئی او کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اور آٹھ فروری کو تو مطلع بھی ابر آلود تھا۔ صبح سے کوئٹہ کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی پھر ..."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ "ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے وکیل صاحب! بعض لوگوں کو بہت زیادہ گرمی لگتی ہے۔ میری بیوی تو دسمبر جنوری میں بھی پنکھا چلا کر سوتی ہے، چاہے شیٹ کیوں نہ اوڑھنا پڑے۔ وہ کہتی ہے کہ پنکھے کی پنکھڑیاں گھوم رہی ہوں تو دل کی تسلی ہوتی ہے۔"

"تو پھر یہ بھائی صاحب کا کوئی نفسیاتی معاملہ ہے لہٰذا ہم واپس مقتول کی طرف آ جاتے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "پوسٹ مارٹم کی میڈیکل ایگزامنر رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مقتول کے جسم سے خارج ہونے والا خون اس کے بدن کے اندر موجود خون کی بہ نسبت پتلا تھا یعنی وہ خون مقتول کی نسوں پر اس طرح نہیں جم پایا تھا جیسا کہ عام طور پر لہو کے جمنے کی خاصیت میں شامل ہے۔ اس نے مقتول کی نسوں کو رنگ دیا تھا ... کیا معما ہے؟"

"شروع میں یہ مجھے بھی معما ہی لگا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن بعد میں اس کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی تھی۔"

"یہیں تک وکیل صاحب!" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ مقتولہ کا بلڈ پریشر ہائی رہتا تھا اور وہ دل کی مریضہ بھی تھیں۔ اس نوعیت کے مریضوں کو ڈاکٹرز جو دوا استعمال کراتے ہیں ان میں ایک ٹیبلیٹ خون کو پتلا کرنے والی بھی ہوتی ہے تاکہ خون گاڑھا ہو کر دل کی شریانوں اور وریدوں میں کسی قسم کی گڑبڑ پیدا نہ کرے اور دل کے والوز متاثر نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے عموماً اسپرین دی جاتی ہے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتولہ اپنے دل کے معاملات کو درست رکھنے کے لیے کوئی ایسی میڈیسن لے رہی تھی جو گاڑھے خون کو پتلا کرنے کا موجب ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل!" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"اگر آپ کی بات کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ میڈیکل ایگزامنر نے اپنی رپورٹ میں ایسے کسی کیمیکل کی نشاندہی کیوں نہیں کی جو خون کو پتلا کرتا ہو۔ مطلب، اگر مقتولہ واقعتاً خون کو پتلا کرنے والی کوئی دوائی لے رہی تھی تو اس میڈیسن کو کیمیکل ایگزیم میں ٹریس ہو جانا چاہیے تھا؟"

"آپ اس بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں!" وہ بیزاری سے بولا۔ "میں نے تو اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ اگر آپ کو کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ پر کوئی اعتراض ہے تو اس کا جواب متعلقہ شعبہ ہی دے سکتا ہے۔"

"آپ مجھے میرے اس سوال کا جواب نہ دیں۔" میں نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن ایک خاص معاملے میں مجھے آپ کی رائے کی ضرورت ہوگی۔"

"کون سا معاملہ؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"میری تسلی کا معاملہ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میڈیکل سائنس نے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ہارٹ پیشنٹس کے لیے کوئی ایسی میڈیسن بنائی ہے جو جسم کے اندر موجود خون کو تو جوں کا توں گاڑھا رہنے دے لیکن بدن سے خارج ہونے والے خون کو فوراً پتلا کر دے۔۔۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے عین مطابق؟"

"میں بھلا اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ خفگی

"چلیں، آپ سے آلۂ قتل پر بات کر لیتے ہیں۔" میں نے اپنا کام سیدھا کرنے کی آڑ میں اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ "ایک تفتیشی افسر ہونے کے ناتے آپ کو اس بارے میں تو مکمل جانکاری ہونا چاہیے۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"کیا آپ نے آلۂ قتل برآمد کر لیا۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "آلۂ قتل کی تلاش جاری ہے۔"

"حیرت کی بات ہے۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ملزم آٹھ دس روز تک جوڈیشل ریمانڈ پر آپ کی کسٹڈی میں رہا۔ آپ نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے ہر قسم کے تفتیشی حربے استعمال کیے اور بالآخر اس کیس کے چالان کے ساتھ ملزم کو حوالۂ عدالت کر دیا اور آپ کہہ رہے ہیں آلۂ قتل کی تلاش ہنوز جاری ہے۔۔۔؟"

"ہم بہت جلد آلۂ قتل کو برآمد کر لیں گے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "انشاء اللہ اگلی پیشی سے قبل یہ کام کر لیا جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ ملزم نے آلۂ قتل کو کسی خفیہ مقام پر چھپا رکھا ہے یا پھر کسی گٹر میں پھینک دیا ہے کیونکہ اس کے گھر اور دکان کا تو ہم نے چپا چپا کھنگال ڈالا ہے۔"

"جب ملزم آپ کی کسٹڈی میں تھا تو آپ اس سے آلۂ قتل برآمد نہیں کرا سکے۔ اب تو وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل چلا جائے گا۔ خیر۔۔۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے آئی او کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔

"کیا آپ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ آلۂ قتل کوئی تیز دھار خنجر تھا؟"

"جی بالکل!" وہ سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اسی جانب اشارہ کرتی اور مقتولہ کے پیٹ کا گھاؤ بھی یہی کہانی سناتا ہے کہ آلۂ قتل کوئی خنجر یا خنجر جیسی کوئی تیز دھار چیز ہے۔"

میں نے ایک آدھ سوال کے بعد آئی او کو فارغ کر دیا۔

اگلے گواہ کا نام تھا سکندر جو "سکندر بھائی" کے نام سے مشہور تھا۔ سکندر بھائی ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک ڈرائیونگ انسٹرکٹر تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرایا پھر وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے نزدیک

"سکندر صاحب!" وکیل استغاثہ نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ "کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟"

"جی۔" گواہ نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ "یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔"

"واقعات کے مطابق، آپ نے وقوعہ کے روز ملزم کو مقتولہ کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔" وکیل استغاثہ نے چالاکی سے استفسار کیا۔ "آپ کو یقین ہے کہ آپ نے وقوعہ کے دن جس شخص کو مقتولہ کے گھر سے نکلتے دیکھا وہ ملزم ہی تھا؟"

"جی بالکل، وہ یہی تھا۔" گواہ بڑے وثوق سے بولا۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہے، آپ نے کتنے بجے ملزم کو مقتولہ کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا؟"

"لگ بھگ گیارہ بجے دوپہر۔" گواہ نے جواب دیا۔

"کیا آپ کی اس وقت ملزم سے کوئی بات ہوئی تھی؟"

"نہیں جناب!" گواہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اس وقت عابد خاصا گھبرایا ہوا اور بڑی جلدی میں تھا اور میں نے پیچھے سے آواز دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی ہمارے بیچ سلام دعا سے زیادہ مراسم نہیں ہیں۔"

وکیل استغاثہ نے جرح موقوف کی تو اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب چلا آیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"سکندر بھائی! آپ کی رہائش کراچی کے کس علاقے میں ہے؟"

"ایف بی ایریا میں۔" اس نے جواب دیا۔

"سکندر بھائی!" میں نے حسب دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ "ایف بی ایریا اور گلشن آباد میں اچھا خاصا فاصلہ ہے، کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ وقوعہ کے روز یعنی آٹھ فروری کو آپ مقتولہ کے علاقے میں کیا کر رہے تھے؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔ "کیا کسی ایف بی ایریا کے رہائشی کے گلشن آباد جانے پر کوئی پابندی عائد ہے یا کراچی کے ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانے کے لیے ویزا لینا پڑتا ہے؟"

استغاثہ کے گواہ سکندر بھائی نے بڑے تیز مزاجی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اسے کوئی سخت جواب دے سکتا تھا لیکن میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت ہی بردباری سے کہا۔

"کسی بھی دوسرے محلے میں بلکہ پاکستان کے ہر علاقے میں بغیر ویزا کے جایا جا سکتا ہے۔ معزز عدالت صرف وقوعہ کے روز جائے واردات پر آپ کی موجودگی کا سبب جاننا چاہتی ہے۔"

"وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر گلشن آباد میں خدیجہ کے گھر کے نزدیک میری خالہ رہتی ہے۔ میں اکثر خالہ سکینہ سے ملنے گلشن آباد جاتا رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، بات سمجھ میں آگئی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں ملزم کے حوالے سے بتایا ہے۔۔۔ یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔ کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے آنٹی خدیجہ کو قتل ہوتے دیکھا تھا یعنی کیا آپ اس قتل کے عینی شاہد ہیں۔۔۔؟"

"جی نہیں۔۔۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "میں نے ملزم کو قتل کی واردات کرتے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا۔"

"پھر آپ کے پُروثوق جواب کا سبب کیا ہے؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں نے عابد کو خدیجہ کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔" وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔

"گھر کے کون سے دروازے سے نکلتے دیکھا تھا؟" میں نے استفسار کیا۔ "مین گیٹ سے یا سیڑھیوں والے چھوٹے دروازے سے؟"

"جی سیڑھیوں والے چھوٹے دروازے سے۔"

"وہ زینہ جو سیدھا بالائی منزل والے جم تک لے جاتا ہے۔" میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "جہاں مقتولہ کی بیٹی محلے کی عورتوں کو صحت مند رہنے کے گُر سکھاتی ہے۔"

"جی بالکل۔ میں اسی دروازے کی بات کر رہا ہوں۔" وہ میری بات کے اختتام پر بول اٹھا۔ "جم سے ایک زینہ خدیجہ کے گھر کی زیریں منزل پر بھی اترتا ہے۔"

"آپ تو مقتولہ کے گھر کی تفصیل اس طرح بتا رہے ہیں جیسے آپ اس گھر کے اندر آتے جاتے رہتے ہوں۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"زیادہ تو نہیں مگر ایک آدھ بار جانا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "کس سلسلے میں؟"

"درحقیقت میں ایک ڈرائیونگ انسٹرکٹر ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "خدیجہ بھی مجھ سے

کے لیے گھر کے اندر بلایا تھا اور میں انکار نہیں کر سکا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اگر کوئی خلوص سے خاطر تواضع کی پیشکش کرے تو اس کا دل نہیں توڑنا چاہیے اور مقتول تو ویسے بھی آپ کی شاگرد تھی۔ اس پر تو آپ کا کچھ زیادہ ہی حق بنتا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا سکندر بھائی؟"

میں نے آخری جملہ ذو معنی انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ ایک لمحے کو متذبذب رہنے کے بعد ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں تو استاد کئی سال تک شاگرد سے اپنے گھر کا سارا کام کروایا کرتے تھے پھر کہیں جا کر تھوڑا بہت کچھ سکھاتے تھے۔ واقعی، شاگرد اگر ساری زندگی بھی استاد کی خدمت کرتا رہے تو وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔"

میں "استاد شاگرد" کے حقوق و فرائض کی بحث کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"تو وقوعہ کے روز آپ اپنی خالہ سکینہ سے ملنے گلشن آباد گئے پھر مقتول کے گھر کے قریب پہنچے تو آپ نے کم و بیش گیارہ بجے دوپہر ملزم کو مقتول کے گھر کے زینے والے چھوٹے دروازے سے نکلتے دیکھا اور آپ نے سمجھا کہ وہ زینے کے راستے بالائی منزل پر پہنچا ہوگا۔ پھر وہاں سے وہ زینہ اتر کر زیریں منزل پر آیا ہوگا اور پھر خدیجہ کو قتل کرنے کے بعد وہ اسی راستے سے واپس چلا گیا ہوگا۔"

"جی ۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا۔"

"سکندر بھائی! میری اور آپ کی بات میں "ہوگا، ہوگا" کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "اگر ہم مفروضوں کو خیر باد کہہ کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئیں تو آپ میرا ساتھ دیں گے۔"

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو تاہم اس نے مجھے مایوس نہیں کیا اور بڑی دلیری سے بولا۔

"بے شک! میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

"جب وقوعہ کے روز ملزم کو آپ نے مقتول کے گھر سے نکلتے دیکھا تو کیا ملزم کی آپ پر بھی نظر پڑی تھی؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "میرا مطلب ہے، آپ لوگوں کا آمنا سامنا ہوا تھا؟"

"جی نہیں۔ میں نے صرف عابد کو عقب سے دیکھا تھا۔"

خاصا گھبرایا ہوا تھا۔" میں نے پرکھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں یہی بتایا ہے نا؟"

"جی ہاں، میں نے یہی بتایا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور یہ اندازہ میں نے اس کی چال کو دیکھ کر لگایا تھا۔ ہمارا نہ تو سامنا ہوا اور نہ ہی ہمارے بیچ کوئی بات چیت ہوئی تھی۔"

"جب آپ نے ملزم کو گھبراہٹ آمیز انداز میں مقتول کے گھر کے چھوٹے دروازے سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھا تو کیا آپ کو ۔۔۔" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے اسے تولتی ہوئی نگاہ سے گھورا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ملزم کی پشت پر کوئی تختی لگی نظر آئی تھی ۔۔۔؟"

وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ کوئی ایسی تختی جس پر لکھا ہو ۔۔۔ میں خدیجہ آپا کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے موت کی نیند سلا آیا ہوں ۔۔۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ وقوعہ کے روز، بقول آپ کے، نہ تو آپ کا ملزم سے سامنا ہوا تھا اور نہ ہی آپ دونوں کے بیچ کوئی بات چیت ہوئی تھی لیکن آپ نے وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا ۔۔۔ یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔ اتنا پُر وثوق جواب تو وہی شخص دے سکتا ہے جس نے اول، اپنی آنکھوں سے قتل کی واردات ہوتے دیکھی ہو۔ دوم، اسے قاتل نے خود اپنے اس "کارنامے" کے بارے میں بتایا ہو۔ سوم، اس نے قاتل کی پشت پر لگی تختی پر اس کا اقبالِ جرم پڑھ لیا ہو ۔۔۔؟"

"آپ بالکل غلط سمجھے ہیں۔" وہ تنک آمیز انداز میں بولا۔

میں نے تحمل لہجے میں کہا۔ "آپ بالکل ٹھیک سمجھا دیں۔"

"میں نے وقوعہ کے روز ملزم کو گھبرائے ہوئے انداز میں مقتول کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پھر جب پولیس نے اسے خدیجہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تب مجھے معلوم ہوا کہ اس کی گھبراہٹ کا راز کیا تھا اور ابھی جو سرکاری وکیل نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تو میں نے کہہ دیا کہ یہ وہی بندہ ہے جس نے خدیجہ کو قتل کیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے ۔۔۔"

میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "سکندر صاحب! باقی باتوں کو چھوڑیں۔ صرف یہ بتائیں کہ وقوعہ کے روز جب آپ نے ملزم کو مقتول کے گھر سے نکلتے دیکھا تو اس نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟"

"شلوار قمیص۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کس رنگ کا شلوار قمیص؟"

"نیلے رنگ کا ۔۔۔" ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

"ہوں ۔۔۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "آپ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ ملزم نے وقوعہ کے روز بھورے رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ میری اس بات کی تصدیق انکوائری آفیسر بھی کریں گے کہ گرفتاری کے وقت ملزم کے بدن پر کس رنگ کا لباس تھا۔"

استغاثہ کا گواہ سکندر بھائی میری بات سن کر بغلیں جھانکنے لگا تو جج نے آئی او سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔ آئی او نے گواہوں والے کٹہرے میں آ کر میرے دعوے کی تصدیق کر دی۔ آئی او سچ بولنے پر مجبور تھا۔ اگر وہ ڈنڈی مارتا تو میں ملزم کے لباس کے حوالے سے دس افراد کو گواہ بنا کر عدالت میں پیش کر سکتا تھا۔ یہ بات آئی او بخوبی جانتا تھا لہٰذا اس نے سچ بولنے ہی میں بھلائی محسوس کی۔

جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔ "وکیل صاحب! آپ کو گواہ سے اور تو کچھ نہیں پوچھنا؟"

"جناب عالی!" میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "استغاثہ کے گواہ سکندر بھائی کو غلط بیانی پر میں ۔۔۔ درجہ اول ثابت کر چکا ہوں لہٰذا وہ تو میری طرف سے فارغ ہی ہے البتہ آئی او صاحب اتفاق سے وٹنس باکس میں آ ہی گئے ہیں تو میں ان سے صرف ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہوں گا۔"

جج نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "اجازت ہے۔"

"آپ کے پیش کردہ چالان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ مقتول کے بیڈ روم کے دروازے کے ہینڈل پر برادے کے ذرات لگے ہوئے ملے تھے۔" میں نے آئی او کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا مسٹری ہے انسپکٹر صاحب؟"

"وکیل صاحب! یہ مسٹری نہیں بلکہ ہسٹری ہے۔" وہ کراری آواز میں بولا۔ "جس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول کے بیڈ روم میں کوئی ایسا شخص داخل

کارپینٹر ۔۔۔!"

"جائے وقوعہ سے دو سو گز کے دائرے میں تین کارپینٹرز اپنی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں۔ عابد، الیاس اور افضل۔" میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ نے میرے موکل اور اس کیس کے ملزم عابد کو تختہ مشق بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا کوئی خاص سبب؟"

"بنیادی سبب تو ملزم اور مقتول کے درمیان پائی جانے والی چپقلش ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "پھر مقتول کے شوہر اور بیٹی نے بھی ملزم پر ہی اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔"

"لہٰذا آپ نے اس کیس کو طول جان کر میرے موکل کو گرفتار کر لیا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر کڑے انداز میں پوچھا۔ "جس دروازے کے ہینڈل پر آپ کو لکڑی کے برادے کے ذرات ملے تھے کیا آپ نے وہاں سے اس برادے والے ہاتھ کے فنگر پرنٹس اٹھانے کی زحمت کی تھی؟"

"نہیں ۔۔۔" وہ قدرے دفاعی لہجے سے بولا۔ "ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"اگر آپ اتنی سی زحمت کر لیتے تو اصل قاتل تک پہنچنے میں آپ کو مشکل پیش نہ آتی۔ خیر ۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کندھے اچکا دیے۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دا کورٹ از ایڈجارنڈ ۔۔۔!"

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ عبدالباسط کھڑا تھا۔ عبدالباسط کی عمر پچپن کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک پستہ قامت شخص تھا۔ باسط کے سر کے بیشتر بال اڑ چکے تھے۔ چندیا کے گرداگرد بالوں کی ایک جھالر سی نظر آتی تھی۔ وہ جب اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ نے اس پر ہلکی پھلکی جرح کی جس کا لب لباب یہ تھا۔

وقوعہ کے روز باسط اپنے کسی کام سے ملزم کی دکان پر گیا تھا۔ ملزم نے باسط کو دکان پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود کہیں غائب ہو گیا۔ آدھے پونے گھنٹے کے بعد جب ملزم واپس آیا تو خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ ملزم نے اس کا کام نہیں کیا اور اگلے دن آنے کو کہا وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ پھر تھوڑی

اس نے بعد میں جب ملزم کو خدیجہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تب باسط کو یقین ہو گیا کہ ملزم اسے اپنی دکان پر بٹھا کر آنٹی خدیجہ کو موت کے گھاٹ اتارنے گیا تھا۔

اپنی بات پر میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"باسط صاحب! آپ یہ گواہی محبت میں دے رہے ہیں یا بغض میں......؟"

"میں سمجھا نہیں!" وہ قدرے الجھ کر رہ گیا۔

میں نے اتنی آسان سی بات استغاثہ کے گواہ کو سمجھانا ضروری نہ سمجھا اور اگلا سوال کیا۔ "آپ اپنے کسی کام کے لیے ملزم کے پاس گئے تھے؟"

"میری بیوی نے کئی روز سے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اصل میں ہمارے فریج کا پٹرا (چوکی) ایک دو جگہ سے مرمت مانگتا تھا۔ پٹرے کی اس خرابی کی وجہ سے فریج بجتا رہتا تھا۔ میں اسی پٹرے کو ٹھیک کرانے اس کی دکان پر گیا تھا۔" بات کے اختتام پر اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ بھی کردیا۔

"باسط صاحب! آپ کس دن اپنا پٹرا مرمت کرانے ملزم کی دکان پر پہنچے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"جس روز آنٹی خدیجہ کا قتل ہوا۔" گواہ نے بتایا۔

"اس روز کوئی تاریخ بھی تو ہوگی......؟"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی، وہ آٹھ فروری کا دن تھا۔"

"ویری گڈ!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "بالکل درست تاریخ بتانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ کیا میں آپ سے اس دن کے حوالے سے چند باتیں پوچھ سکتا ہوں؟"

"ضرور پوچھیں جناب۔" وہ سادگی سے بولا۔ "میرا حافظہ واقعی بہت اچھا ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ شاید میں بچپن میں بہت زیادہ بادام کھایا کرتا تھا......"

"آپ کے بارے میں آپ کی بیوی کے فتوے کو میں چیلنج نہیں کروں گا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "ابھی اچھی طرح سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز ملزم نے کس رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا؟"

"بھورے رنگ کا شلوار قمیص۔" اس نے جواب دیا۔

"اور اس دن خاصی تیز دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "ہیں نا......؟"

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس دن تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی پھلکی برسات بھی ہوئی تھی۔ موسم خاصا خنک ہو رہا تھا۔ شاید یہ کوئٹہ کی ہواؤں کا اثر تھا۔"

"آپ کی بیوی کی ذہانت کو ماننا پڑے گا باسط صاحب۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کے بارے میں بھابی کی رائے بالکل درست ہے۔ واقعی آپ کا حافظہ بلا کا ہے۔"

"بس جناب!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "کبھی غرور نہیں کیا۔"

میں نے باتوں باتوں میں عبدالباسط کے منہ سے چند ایسی باتیں اگلوا لی تھیں جن کی روشنی میں سکندر بھائی کی دروغ گوئی اور آئی او کے بیان کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔

"غرور کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔" میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ "باسط صاحب! آپ وقوعہ کے روز کتنے بجے اپنے فریج کا پٹرا ٹھیک کرانے ملزم کی دکان پر پہنچے تھے؟"

"یہی کوئی گیارہ بجے کے قریب۔" اس نے جواب دیا۔

"ملزم نے آپ کو دکان پر بٹھایا اور خود اپنے کسی کام سے کہیں چلا گیا۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا۔ "کیا آپ جانتے ہیں وہ کہاں گیا تھا؟"

"آنٹی خدیجہ کو قتل کرنے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "آپ تو ملزم کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ سبزی سودا دینے اپنے گھر گیا ہو......"

اور حقیقت بھی یہی تھی عابد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ باسط کا کام کرنا ہی نہیں چاہتا تھا لہٰذا اسے دکان کی رکھوالی پر بٹھا کر خود اپنے گھر سبزی وغیرہ دینے چلا گیا تھا۔ واپس آکر اس نے باسط سے کہا تھا کہ وہ پٹرا اس کی دکان پر چھوڑ جائے۔ وہ بعد میں ٹھیک کردے گا۔

"اگر وہ سبزی سودا دینے اپنے گھر گیا ہوتا تو پولیس اسے آنٹی خدیجہ کے قتل کے چکر میں گرفتار کیوں کرتی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "چند روز پہلے آنٹی خدیجہ سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا اور اس نے آنٹی کو خطرناک نتائج کی دھمکی

"تم کہیں اس واقعے کا ذکر تو نہیں کر رہے جو بی سی کی وجہ سے رونما ہوا تھا؟" میں نے پوچھنے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی جی، وہی......" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ملزم نے اس روز آنٹی سے بہت بدتمیزی کی تھی اور اسے الٹی سیدھی دھمکیاں بھی دی تھیں۔"

"کیا تم نے بھی مقتولہ کے پاس بی سی ڈال رکھی تھی؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ ٹھنڈی پرچی کا کیا معاملہ ہے۔ کیا واقعی ٹھنڈی پرچی کو اس بے ایمانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ سب ملزم کے دماغ کا فتور ہے۔ وہ آنٹی خدیجہ سے جھگڑا کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے پرچی کو بہانہ بنایا۔ ہم سالہا سال سے آنٹی کے پاس بی سی ڈال رہے ہیں اور ہمیں آنٹی سے کبھی شکایت...... نہیں ہوئی۔ اگر ملزم اپنے دعوے میں سچا تھا تو پھر اس نے پرچی کو کھلنے ہی کیوں دیا۔ اسے چاہیے تھا کہ ٹھنڈی پرچی نکال کر سب کو دکھاتا۔ اس کی بات میں کوئی صداقت نہیں تھی اس لیے اس نے جان بوجھ کر اتنا وقت گزار دیا تاکہ وہ لوگوں سے کہہ سکے کہ اب تو پرچی نارمل ہو چکی۔ دراصل، وہ لوگوں کو آنٹی کی طرف سے بدگمان کرنا چاہتا تھا۔"

"یہ بات تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں بھی مانتا ہوں کہ میرے موکل نے پرچی کو کھلنے کا موقع دے کر سنگین غلطی کی تھی۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "اسے چاہیے تھا کہ پہلے وہ فریج میں لگی ہوئی ٹھنڈی پرچی کو تھیلے میں سے نکال کر لوگوں کو اس کی ٹھنڈک محسوس کراتا پھر جھگڑا شروع کرتا۔"

"جناب! ٹھنڈی پرچی والا کوئی چکر تھا ہی نہیں۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "اس کی بی سی نہیں نکل رہی تھی اور آنٹی خدیجہ کے لیے اس کا دل و دماغ پہلے ہی غصے سے بھرا ہوا تھا اس نے اسی لیے یہ سارا ناٹک کیا تھا۔"

"ویسے آپس کی بات ہے......" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "مقتولہ اور ملزم کے بیچ میں اصل جھگڑا تھا کیا؟ کیونکہ آپ پرچی والے واقعے کو تو ایک بہانہ قرار دے رہے ہیں۔"

لیے معمولی سا بہانہ چاہیے ہوتا ہے اور ملزم ایسا ہی انسان ہے۔ غصے کا تیز، بددماغ اور جھگڑالو۔" وہ ناپسندیدہ نظر سے میرے موکل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اصل مسئلہ اس سے پہلے اس وقت شروع ہوا تھا جب آنٹی نے اپنے کچن کے کسی کام کے لیے ملزم سے رابطہ کیا تھا لیکن اس نے دو گنا کا اسٹیمیٹ دیا۔ بعد ازاں وہی کام آنٹی نے ایک دوسرے کارپینٹر سے ملزم کے بتائے ہوئے پیسوں سے آدھے میں کروا لیا تھا۔ آنٹی چونکہ دل اور نیت کی صاف تھیں اس لیے لگی لپٹی نہیں رکھتی تھیں۔ بعض لوگ انہیں منہ پھٹ بھی کہتے تھے۔ بہرحال......" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"آنٹی نے ملزم کی بے ایمانی کے حوالے سے ادھر ادھر بہت باتیں کی تھیں جو ظاہر ہے، ملزم تک پہنچ گئی تھیں۔ اس نے کئی لوگوں سے کہا کہ وہ بہت جلد آنٹی کو عبرت ناک سبق سکھائے گا پھر بی سی والے تنازع کے موقع پر تو اس نے یہاں تک دھمکی دے ڈالی...... اگر تین روز کے اندر آنٹی نے اس کی بی سی والے پیسے واپس نہیں کیے تو نتائج کی ذمے داری انہی پر ہوگی...... پھر اس واقعے کے پانچویں روز جو نتیجہ برآمد ہوا اس کی وجہ سے آنٹی تو کئی منوں مٹی کے نیچے اور یہ کم بخت قتل کے مقدمے میں پھنسا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے...... برے کام کا برا نتیجہ!"

عبدالباسط نے ابھی مجھے جو تفصیلی معلومات فراہم کیں، میں یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

"باسط صاحب! ابھی آپ نے کسی دوسرے کارپینٹر کا ذکر کیا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو وہ بڑھئی کا نام الیاس ہے......"

"جی آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔" وہ جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "الیاس نے آدھے پیسوں میں آنٹی کے کچن کا بڑا شاندار کام کر دیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ الیاس نہایت ہی ایمان دار اور اپنے فن کا ماہر شخص ہے۔" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل...... ایسا ہی ہے۔"

"اور ملزم آپ کی نظر میں ایک بے ایمان اور جھگڑالو شخص ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سابقہ جواب دہرا دیا۔ "جی بالکل۔ ایسا

بھر گیا لہجہ ہے نے...... میں نے اس کی آنکھوں
میں دیکھتے ہوئے قدرے ترش لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ ایک ایمان دار اور کارگر کارپینٹر کو چھوڑ کر ایک بدتمیز اور بے ایمان بڑھئی کے پاس اپنے فرنیچر کا چھوٹا سا مرمت کرانے پہنچ گئے تھے؟"

ایک لمحے کے لیے وہ گڑبڑا گیا لیکن جلد ہی سنبھلتے ہوئے بولا۔ "وہ بات دراصل یہ ہے کہ الیاس ان دنوں کراچی میں تھا نہیں لہٰذا مجبوراً مجھے ملزم کے پاس جانا پڑا کیونکہ میری بیوی بڑھئی کی مرمت کے لیے صبح و شام میرے کان کھاتی رہتی تھی......"

"لیکن......" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے تو دونوں کان مجھے ایک دم سلامت نظر آ رہے ہیں۔ ان پر دانتوں سے کاٹنے کا کوئی نشان بھی دکھائی نہیں دے رہا......؟"

"آپ سمجھیں نا جناب۔ یہ بات میں نے محاورتاً کہی ہے۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میرا مقصد یہ تھا کہ بیوی میرا دماغ کھاتی رہتی...... میرا مطلب ہے وہ بار بار بڑھئی کو لے کر میرا دماغ خراب کرتی رہتی تھی۔"

"سمجھ گیا!" میں نے اس کے سر کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "وہ آپ نے الیاس کے کراچی سے باہر جانے کی بات بھی محاورتاً تو نہیں کی؟"

"نہیں جناب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "الیاس واقعی اس روز کراچی میں نہیں تھا۔"

"وہ کہاں گیا ہوا تھا؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

عبدالباسط نے جواب دیا۔ "حیدرآباد۔"

"کیا وہ خیریت سے حیدرآباد گیا تھا؟"

"جی وہاں کوئی شادی تھی۔" اس نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے وہ کافی خرچہ کرکے حیدرآباد گیا تھا......"

"ظاہر ہے جناب! شادی بیاہ کے مواقع پر انسان کا خرچہ تو ہوتا ہی ہے نا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور اگر شادی کسی قریبی رشتے داری کی ہو تو کچھ زیادہ خرچہ ہو سکتا ہو گا۔"

"اور اس کے ساتھ ہی اگر اس انسان کی پی سی بھی نکلی ہوئی ہو تو پھر سمجھ لو کہ خرچہ تین گنا......؟" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"پی سی" کے ذکر پر عبدالباسط نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "آپ کو

ان کم بختوں کی خبریں موکلات بھی مجھ تک پہنچاتے ہیں......"

میں نے "موکل" کا بڑا پراسرار استعمال کیا تھا۔ عابد میرا موکل تھا جو اس وقت جیوڈیشل ریمانڈ پر تھا۔ اس کے ناتے خلیفہ بھی ایک طرح سے میری موکل ہی تھی لہٰذا میں نے استغاثہ کے گواہ عبدالباسط سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ میں نے "موکل" کی اصطلاح ہی کے حوالے سے استعمال کی تھی کیونکہ مقتول کے تمام تر معاملات کی خبریں انہی نے مجھے فراہم کی تھیں۔

باسط میری بات کو کسی اور طرف لے گیا۔ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "آپ وکیل ہیں یا کوئی پہنچے ہوئے عامل کامل جو موکلات سے کام لیتے ہیں؟"

"پیشے کے اعتبار سے تو میں ایک وکیل ہی ہوں اور اس وقت عدالت میں بیٹھا ہوا ہوں۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن جب کسی کیس کے برتن میں سے سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا تو میں موکلات کی انگلی کو ٹیڑھا کرکے کام چلا لیتا ہوں۔ زیرِ سماعت کیس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔"

"جناب! آپ کی باتیں میرے دماغ میں سما نہیں رہیں۔" وہ الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کا سبب بھی میں جانتا ہوں۔" میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے سبب؟" وہ بے حد سنجیدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے روبرو یہ انکشاف کیا تھا کہ آپ کی بیوی نے آپ کا دماغ کھا لیا ہے یا خراب کر دیا ہے۔" میں نے سنجیدہ انداز میں غیر سنجیدہ بات کہہ ڈالی۔ "اس نوعیت کی دماغی حالت میں تو عام سی باتیں بھی جگہ نہیں بنا پاتیں، میری مشکل باتیں بھلا کہاں سما پائیں گی......"

"جناب! آپ مذاق کر رہے ہیں نا......؟" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کے پاس موکلات وغیرہ تو نہیں ہیں نا......؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے بہ الفاظ دیگر میری تفریح کا کباڑا کرتے ہوئے احتجاجی لہجے میں نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ "میرے فاضل دوست کافی دیر سے ایسی بے سروپا باتیں کر رہے ہیں جن کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا مقصد استغاثہ کے معزز گواہ کو ہراساں کرنا ہے۔ علاوہ



اور بے جا ...... عدالت کے ...... ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

جج نے وکیل استغاثہ کو مایوس نہیں کیا۔ اس کی فرمائش کو فوراً پورا کرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! استغاثہ کے گواہ پر آپ کی جرح مکمل ہو گئی یا مزید کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

"جرح تقریباً مکمل ہو چکی۔" میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ "بس جناب! آخری ایک دو سوال ہیں اور...... نہایت ہی اہم سوالات۔"

"بیگ صاحب!" جج سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "پلیز پروسیڈ۔"

"باسط صاحب!" میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "کیا ہمارے درمیان مذاق کا کوئی رشتہ ہے؟"

"نہیں جناب...... بالکل نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے بولا۔

"بس تو پھر سمجھ لیں کہ میں بے حد سنجیدہ ہوں۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "جس طرح مجھے یہ خبر ملی کہ الیاس کارپینٹر پی سی والے کئی ہزار روپے خرچ کرنے ایک قریبی عزیز کی شادی میں حیدرآباد گیا ہوا ہے اسی طرح میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ وہی پی سی تھی جس کے کھلنے کے موقع پر "ٹھنڈی پڑ جا" والا تنازع کھڑا ہوا تھا۔ دو روز بعد مقتول نے از راہِ عنایت یہ پی سی الیاس کارپینٹر کو دے دی تھی اور جب آٹھ فروری کا قتل ہوا اس روز الیاس کارپینٹر حیدرآباد میں شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھا۔"

"لیکن......" وہ بے حد الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "الیاس کے حیدرآباد جانے والی بات تو میں نے آپ کو بتائی ہے......؟"

"تو میں نے کب اس حقیقت سے انکار کیا ہے۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "اس وقت تم نے بھی میرے لیے ایک موکل کا کردار ادا کیا ہے۔ تم کیا سمجھ رہے تھے کہ میرے پاس وہ چلے اور وظیفے سے قابو کیے جانے والے موکل ہوں گے؟ نہیں جناب! میرے موکل تو گوشت پوست کے چلتے جاگتے انسان ہی ہیں جو آپ کی طرح مجھے کچھ نہ کچھ بتا کر چلے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی مجھے ایک موکل نے خبر دی ہے کہ آپ......"

میں نے اس کے دماغ کو جھٹکا پہنچانے کے لیے بات ادھوری چھوڑی تو وہ ماہی بے آب کے مانند تڑپ کر مستفسر

"آپ حیدرآباد کیوں نہیں گئے۔ یہ شادی تو آپ کے عزیزوں کی بھی تھی......؟"

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی......؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"میرے انکشافات پر حیران ہونا چھوڑ دیں باسط صاحب۔" میں نے گہری نظر سے اسے گھورا۔ "آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ میرے موکلات غلط اطلاعات فراہم نہیں کرتے۔ آپ رشتے میں الیاس کارپینٹر کے سالا صاحب ہیں نا......؟"

میرے آخری جملے نے گویا اس پر ایٹم بم گرا دیا تھا۔ وہ اتنی بڑی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا لہٰذا مری سی آواز میں بولا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب لیکن حیدرآباد میں جو شادی چل رہی تھی ان لوگوں سے میری کچھ ناراضی ہے اس لیے رشتے داری کے باوجود بھی اس شادی میں شرکت کرنے نہیں گیا۔"

"یہ آپ کا خاندانی معاملہ ہے اور اس کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں بنتا چنانچہ اس ایشو پر بات کر کے میں عدالت کا وقت برباد نہیں کروں گا۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے تپانے والی نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اب تو "محبت بھرا تعلق" والی بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی باسط صاحب...... آپ کی ملزم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں لیکن چونکہ آپ الیاس کارپینٹر کے سالے صاحب ہیں اور الیاس کارپینٹر مقتول آفتاب خدیجہ سے ان دنوں بہت قریب چل رہا ہے اس لیے آپ نے سوچا کہ اگر آپ کی گواہی سے یہ معاملہ حل ہو جاتا ہے تو یہ کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ بات بھی آپ اپنے موکلوں سے پوچھ لیں نا......"

"تو کیا آپ میرے موکل نہیں ہیں......؟" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔ "آپ نے پہلے بھی تو مجھے بہت کچھ بتایا ہے...... بتایا ہے کہ نہیں؟"

وہ سٹ پٹائے ہوئے انداز میں بولا۔ "آپ کا موکل وہ رہا......" اس نے ملزموں والے کٹہرے میں

"بیٹھا۔۔۔" میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میں پچھلے تین ماہ سے اپنے موکل کی باعزت بریت کے لیے ہی کوشاں ہوں اور الحمدللہ، اس حد تک وہ مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آپ کے تعاون کے لیے میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔"

قبل اس کے کہ عبدالباسط میری اس بات کے جواب میں کچھ کہتا عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"یور آنر اس کیس کی گاڑی اب پٹری پر دوڑنے لگی ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ کم سے کم وقفے کی تاریخ دے کر اس کیس کو جلد از جلد نمٹا دیا جائے۔"

"عدالت کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ کوئی کیس جو انکوائری طوالت اختیار نہ کرے۔" جج نے کہا۔ "حقائق اگر تعطل کا شکار ہو جائیں تو ان کا حلیہ بگڑنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔"

ان کلمات کے بعد جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ ملزم عابد کی بیوی نبیلہ جو پیشی پر عدالت میں موجود ہوتی تھی۔ ہم عدالت کے کمرے سے باہر نکلے تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"وکیل صاحب! آپ اب تک کی عدالتی کارروائی سے مطمئن ہیں نا؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اسی سے سوال کر ڈالا۔ "آپ بھی تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں؟"

"میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ ہم دھیرے دھیرے کامیابی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔" وہ میرے ساتھ کوریڈور میں چلتے ہوئے بولی۔ "لیکن ہماری رفتار کافی سست ہے۔ میں چاہتی ہوں، ہم جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔"

"میں آپ کی اس خواہش کو غلط نہیں کہوں گا کیونکہ آپ کے گھر کا سربراہ پچھلے تین ماہ سے پولیس اور عدالت کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر میں سمجھتا ہوں، ایک حوالے سے آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

"کس حوالے سے۔۔۔؟" وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ "اور کیسی غلط فہمی؟"

"اس کیس کو عدالت میں لگے ابھی بہ مشکل تین ماہ ہوئے ہیں۔ اس قلیل مدت میں، میں نے کوشش کر کے کیس کو ایک خاص سمت میں ڈال دیا ہے ورنہ قتل کے مقدمات میں تو سال چھ ماہ ویسے ہی نکل جاتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔" وہ سادگی سے بولی۔ "میرا ابھی عدالتی جھمیلوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ پہلا تجربہ ہے۔"

"انسان تجربات ہی سے سیکھتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور تلخ تجربات کچھ زیادہ ہی پختہ کار بنا جاتے ہیں۔"

"اس میں بھی ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ابھی تک جتنی عدالتی کارروائی ہوئی ہے اس میں میری جرح کے نتیجے میں استغاثہ کی کمزوریاں اور اس کے گواہوں کی غلط بیانیاں عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو چکی ہیں۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "ہمیں اپنے بندے پر فوکس رکھنا چاہیے۔ استغاثہ میں جتنے زیادہ ویٹ پڑیں گے، عابد کی بے گناہی اتنی ہی مضبوط اور مسلم ہوتی چلی جائے گی۔ میری یہ کوشش ہے کہ آپ کا شوہر اس کیس سے باعزت بری ہو جائے۔ آنٹی خدیجہ کو کس نے قتل کیا ہے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے اور اگر۔۔۔" میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "اگر اس کوشش میں قاتل بھی بے نقاب ہو جاتا ہے تو یہ اس کیس کا بونس ہوگا اور۔۔۔ پولیس والوں پر ہمارا احسان بھی۔ میری بات آپ کی سمجھ میں آ رہی ہے نا؟"

وہ اثبات میں گردن ہلا کر بولی۔ "جی، سمجھ گئی!"

☆☆☆

آیندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے مقتولہ کی بیٹی مہ جبیں کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ مہ جبیں واجبی سی شکل صورت کی مالک ایک سانولی سی لڑکی تھی۔ اس کی عمر بیس کے قریب رہی ہوگی۔ ہم مالی بے فکری اور ان کی بدولت وہ بیس سے کم کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مہ جبیں کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس اللہ کی بندی نے گھر کی بالائی منزل پر سٹنگ اینڈ بیلی جم صرف اور صرف اپنی خاطر بنوایا تھا۔

مہ جبیں کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے چند سوالات میں اسے فارغ کر دیا۔ وکیل مخالف کی جرح کا فوکس ملزم کی تفصیلی فطرت اور جھگڑالو طبیعت پر تھا۔ خاص طور پر اس نے ملزم کی خطرناک دھمکی کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس کیس کا ایک نازک پہلو تھا۔

اگر کوئی شخص کسی کو قتل کی دھمکی دے اور اس طیش بھری دھمکی کی سماعت کے گواہ بھی موجود ہوں پھر چند روز بعد بکر کو قتل کر دیا جائے تو زید کی ذات کو شک کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی صورت حال میں پولیس سب سے پہلے زید ہی کو حراست میں لے گی۔ عابد کے معاملے میں بھی یہی سب ہوا تھا اور سونے پر سہاگا یہ کہ مقتولہ کے ورثا نے باقاعدہ میرے موکل کو اس واردات کا ذمے دار بھی ٹھہرایا تھا۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا پھر کٹہرے میں کھڑی مہ جبیں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کیسی ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پچھلے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "آپ کا جم کیسا چل رہا ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک۔" اس نے دوبارہ مختصر بات کی۔

"آپ جم میں کس قسم کی ٹریننگ دیتی ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بنیادی طور پر میں یہاں آنے والی خواتین کو صحت مند اور تندرست رہنے کی تربیت دیتی ہوں۔" وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگی۔ "اس میں ڈائٹنگ، ایروبکس اور یوگا سب شامل ہے۔"

"اوہ۔۔۔ تو آپ یوگا کی کلاسز بھی لیتی ہیں؟" میں نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"ایک ذاتی نوعیت کا سوال ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو پوچھ لوں۔۔۔؟"

مہ جبیں کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے اپنی ذات کو چھونے کی اجازت نہیں دے گی لیکن چند لمحات کے تذبذب کے بعد وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"جی پوچھ لیں۔"

میں نے پوچھا۔ "مہ جبیں جی! آپ اس وقت گریجویشن کر رہی ہیں۔ اس حساب سے آپ کی عمر بیس کے آس پاس ہونا چاہیے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں اس وقت اکیسویں سال میں ہوں۔" وہ معاندانہ بھرے لہجے میں بولی۔ "میرے میٹرک اور انٹر کے بیچ میں ایک سال کا گیپ ہے لیکن میں ابھی تک آپ کے سوال کے مقصد تک نہیں پہنچ پائی۔"

"میں پہنچاتا ہوں۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا پھر اپنے مقصد کی سمت بڑھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ "اگر میں اکیس غلطی نہیں کر رہا تو آپ اپنی جسامت سے پچیس سے اوپر کی لگتی ہیں۔ کیا آپ کو خود پر توجہ دینے کا وقت نہیں ملتا؟"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل سرکار نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "عدالت میں اس وقت خدیجہ مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست یہاں جم کھولے بیٹھے ہیں۔ میں ان کی چال کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ جج وکیل استغاثہ کے جواب میں کچھ کہتا، میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور خاصے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"میرے محترم! کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ میں کس نوعیت کی سازش کرنے میں مصروف ہوں اور میری اس سازش سے زیرِ سماعت کیس پر کون سے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں کیونکہ آپ نے ابھی دعویٰ کیا ہے کہ آپ میری چال کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔۔۔"

"آپ استغاثہ کی گواہ کو غیر متعلقہ اور غیر ضروری

شوخیاں

☆ ہر فرد کسی نہ کسی کے لیے عجیب کے زمرے میں آتا ہے۔

☆ دوسروں کی غلطی سے سبق سیکھنا چاہیے کیونکہ یہ تمام غلطیاں آپ خود مختصر سی زندگی میں نہیں کر سکتے۔

☆ مشکل میں بھی اگر کوئی مسکرا رہا ہو تو جان لیں کہ اس کو مسئلے کا ذمے دار ٹھہرانے کے لیے کوئی اور مل گیا ہے۔

☆ جب کسی احساس کا قتل ہو جائے تو لاش کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ اسے وقت کے قبرستان میں دفنا کر گھر واپس چلے آؤ۔

☆ جو لوگ ہنسنا بھول جاتے ہیں وہ کھنڈر ہو جایا کرتے ہیں... ویران اور اجاڑ کھنڈر۔

☆ تین خواتین میں راز اس وقت راز رہ سکتا ہے جب ان میں دو انتقال کر جائیں۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، مغل ہزارہ

چاہتے ہیں۔'' وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''اگر استغاثہ کی گواہ کو جو چند برس ساعت کسی سے چند لمحات کے لیے ہٹ جائے گی تو اس سے میرا کیا بھلا ہو گا؟'' میں نے ترکی بہ ترکی سوال کیا۔ ''اور آپ کو کون سا نقصان پہنچ جائے گا؟''

وکیل استغاثہ میرے سوالات کے جوابات دینے کے بجائے کاٹ دار آمیز انداز میں حاضرین عدالت کو دیکھنے لگا۔ جج نے اس موقع پر مداخلت کرتے ہوئے براہ راست مجھ سے استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! کیا جم کے ذکر کا موجودہ کیس سے کوئی کنکشن ہے؟''

''بڑا مضبوط کنکشن ہے یور آنر!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک، استغاثہ کی گواہ مہ جبیں صاحبہ کا جم جائے وقوعہ کے عین اوپر بالائی منزل پر ہے۔ نمبر دو، جس وقت یہ واقعہ پیش آیا آپ مہ جبیں گھر میں موجود نہیں تھی...'' میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کو خلط ملط کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''نمبر تین، جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ گھر میں اکیلی تھی۔ نمبر چار، مقتول ہائی بلڈ پریشر اور عارضہ قلب میں مبتلا تھی لیکن مہ جبیں کی بتائی ہوئی کسی بھی ترکیب پر وہ عمل نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ مہ جبیں پر بھروسا نہیں کرتی تھی۔ نمبر پانچ...''

''بیگ صاحب!'' جج نے میری بات پوری ہونے سے پہلے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں۔ ایک ماں اپنی بیٹی پر بھروسا کیوں نہیں کرے گی...؟''

''جناب عالی! یہ بڑا نازک اور اہم نکتہ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے ڈرامے میں رنگ بھرتے ہوئے پُراسرار لہجے میں کہا۔ ''اور میں اس کی وضاحت کرنے ہی والا تھا کہ وکیل استغاثہ نے بیچ میں ٹانگ پھنسا دی...'' بات کے اختتام پر میں نے خفگی بھرے انداز میں وکیل مخالف کو گھورا۔

میری چال کامیاب رہی۔ میرا چلایا ہوا تیر عین نشانے پر جا کر بیٹھا تھا۔ جج نے معتدل انداز میں کہا۔

''بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔''

''مہ جبیں صاحبہ!'' میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''آپ اپنے وزن کی وجہ سے چار پانچ سال بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ آپ دوسری عورتوں کو سلم اینڈ

خود پر توجہ دینا چاہیے۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو آپ مجھے ٹوک دیجیے گا اور اگر آپ کو میرا سوال برا لگا ہو تو آپ مجھے روک دیجیے گا۔''

''آپ کے سوال سے مجھے کوئی ایشو نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''باقی جہاں تک خود پر توجہ دینے کا معاملہ ہے تو یہ بات مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا لیکن میں اپنی دو کمزوریوں کے باعث مجبور ہو جاتی ہوں اور وزن کو کنٹرول میں رکھنا میرے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔''

''ماشاء اللہ! آپ کمزور دکھتی تو نہیں ہیں۔'' میں نے معنی خیز نظر سے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تیر عدالت آپ کی ان دو کمزوریوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہے جن کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے؟''

''ایک تو مجھے کھانے پینے کا بہت شوق ہے۔'' وہ قدرے ندامت آمیز لہجے میں بتانے لگی۔ ''مجھے بھوک بہت زیادہ لگتی ہے اور جب بھوک لگتی ہے تو پھر مجھ سے صبر نہیں ہوتا اور میں تمام حدود کو پھلانگ جاتی ہوں۔ اس ناپسندیدہ عادت کی وجہ سے ہفتوں کی محنت اکارت جاتی ہے۔ میں نے کڑی کوشش سے دو ہفتوں میں جتنا وزن کم کیا ہوتا ہے وہ ایک دو بار کی بدپرہیزی سے ٹھکانے لگ جاتا ہے۔''

''کھانا جن لوگوں کی کمزوری ہوتی ہے ان بے چاروں کے ساتھ یہ مسئلہ تو رہتا ہی ہے۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ایک کمزوری عدالت کے ریکارڈ پر آ چکی۔ اب آپ اپنی دوسری کمزوری کے بارے میں بھی بتا دیں؟''

''دوسری کمزوری میرا فیملی ایشو ہے۔'' اس نے کہا۔

''فیملی ایشو...!'' میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''پلیز... آپ آسان الفاظ میں اس کی وضاحت کر دیں۔''

میں نے نبیلہ کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں مقتول کے گھرانے پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی تھی اور مہ جبیں سے پوچھے گئے ہر سوال کے پیچھے میرا ایک خاص مقصد چھپا ہوا تھا۔ میں استغاثہ کے گواہ کی زبان سے عدالت کے ریکارڈ پر ایسے حقائق کو محفوظ کرانا چاہتا تھا جو کسی بھی حوالے سے میرے موکل کے لیے مفید اور ممد ثابت ہوں۔ وکلا حضرات عموماً اپنے گواہوں اور ان کے فراہم کردہ ثبوت وشواہد پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں لیکن میری



مخالف پارٹی کے گواہوں کو اس طرح الجھاتا ہوں کہ ان کی زبان سے اپنے حق میں باتیں اگلوا لیتا ہوں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں نے ان کے ساتھ کون سا ہاتھ کر دیا ہے۔ اس وقت میں استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی بیٹی مہ جبیں پر بھی یہی حربہ آزما رہا تھا۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا۔

''میرے ننھیال میں اوور ویٹ کا مسئلہ پایا جاتا ہے...''

''ایک منٹ!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور مصنوعی الجھن چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کو موٹاپے کی خاصیت والدہ کی طرف سے ملی ہے؟''

''جی بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ننھیال کا مطلب والدہ اور اس کا خاندان ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے...!'' میں نے اپنی جرح کو سنسنی خیزی کا تڑکا لگاتے ہوئے کہا۔

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''میری معلومات کے مطابق آپ کی والدہ یعنی مقتول خدیجہ تو ایک دھان پان سی عورت تھی۔'' میں نے حیرت کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اسے کسی بھی قیمت پر فربہ یا مائل بہ فربہی نہیں کہا جا سکتا تھا۔''

''آپ کی معلومات ادھوری ہیں وکیل صاحب۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''شاید نہیں بلکہ یقیناً آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ خدیجہ آنٹی میری سگی ماں نہیں تھیں۔'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''کک... کیا...؟'' میں نے اپنی اداکاری جاری رکھی۔ ''یہ تو آپ نے بڑی عجیب اور انہونی بات کر دی۔''

مہ جبیں کے سنسنی خیز انکشاف نے جج، وکیل استغاثہ، آئی او سمیت تمام حاضرین عدالت کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور وہاں موجود لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ اس موقع پر جج کو مداخلت کرنا پڑی۔

''آرڈر، آرڈر...'' جج نے بہ آواز بلند کہا۔ ''عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔ خاموشی پلیز...''

جج کی تحکمانہ اپیل پر اگلے ہی لمحے عدالت کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جج نے وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ...!''

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں خشوع وخضوع کے ساتھ استغاثہ کی گواہ مہ جبیں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تو آپ معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتی ہیں کہ مقتول آنٹی خدیجہ آپ کی سگی والدہ نہیں تھیں؟''

''یہی حقیقت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میری ماں کا نام یاسمین تھا۔''

''تھا... کا تو یہ مطلب ہوا کہ یاسمین صاحبہ اب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، پانچ سال پہلے میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''میری ماں کافی فربہ تھیں۔ ان کے انتقال کے ایک سال بعد ابو نے ایک بیوہ عورت سے شادی کر لی تھی یعنی آنٹی خدیجہ سے۔ آنٹی خدیجہ کا شوہر فرقان علی چھ سال پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔''

''مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میں نے یاسمین صاحبہ کا تذکرہ چھیڑ کر آپ کو غم زدہ کر دیا ہے۔'' میں نے مہ جبیں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ میرے پیشے کی مجبوری اور عدالتی کارروائی کا تقاضا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔

''آپ شرمندہ نہ ہوں۔''

''مقتول آنٹی خدیجہ سے لگ بھگ چار سال پہلے آپ کے والد نے شادی کی تھی۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''عدیل کی عمر اس وقت کم وبیش سات سال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عدیل آپ کے والد کی اولاد نہیں ہے...''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''عدیل مقتول آنٹی خدیجہ اور مرحوم فرقان علی کی اولاد ہے۔ جب ابو نے آنٹی خدیجہ سے شادی کی تو عدیل محض تین سال کا تھا۔''

''مہ جبیں صاحبہ!'' میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ اپنے جم میں یوگا کی کلاسز بھی لیا کرتی ہیں؟''

''جی، میں نے اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔'' اس نے کہا۔

''جہاں تک میری معلومات ہیں، یوگا انسان کے جسم کو صحت، توانائی اور خوب صورتی دینے کے علاوہ اس کے ذہن کی

ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے کہا۔ "باقاعدہ یوگا کرنے والے انسان کی آنکھوں میں مقناطیسی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی صورت میں ملائمت اتر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی روح پاکیزہ اور دل آئینے کے مانند صاف و شفاف ہو جاتا ہے یعنی وہ ایک سچا اور کھرا انسان بن جاتا ہے... ریاکاری سے پاک، ہر حال میں سچ بولنے والا اور سچائی کا ساتھ دینے والا۔"

"آپ کی معلومات صد فیصد درست ہیں وکیل صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "یوگا انسان میں ایسا ہی بدلاؤ لاتا ہے۔"

"یہ تو ہم ایک عام یوگا کرنے والے انسان کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی بات کر رہے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ "اور اگر کسی یوگا ماسٹر کا ذکر کیا جائے تو ان خصائل کو سو سے لازمی ضرب دینا ہوگا... ہیں نا...!"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ "آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ میرا اشارہ اسی کی جانب ہے اسی لیے میری بات سنتے ہی اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

"مجھے ایک سیریس معاملے میں آپ کا تعاون درکار ہے... سچا اور کھرا تعاون، ہر مصلحت سے پاک... دروغ گوئی سے کوسوں دور...!"

"آپ کس سیریس معاملے کی بات کر رہے ہیں؟" وہ متلاشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کھل کر بتائیں، میں پوری دیانت داری سے آپ کو جواب دوں گی۔"

"یہ پی سی والی ٹھنڈی ٹھار پر چپی کا کیا قصہ ہے؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "معزز عدالت حقائق جاننا چاہتی ہے۔"

"اس حوالے سے ملزم عابد کا مؤقف درست ہے۔" وہ بے خوف و خطر مستحکم لہجے میں بولی۔ "آنٹی خدیجہ نے واقعی عدیل کو ڈیٹ کر رکھا تھا۔"

میں نے اچانک استغاثہ کی گواہ سے ایک عجیب سوال پوچھ لیا۔ "کیا آپ کو ڈرائیونگ آتی ہے؟"

"جی!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے سوال کیا۔ "کیا آپ نے بھی سکندر بھائی ہی سے ڈرائیونگ سیکھی تھی؟"

اس مردود کا نام سنتے ہی وہ اچانک بھڑک اٹھی۔ "میں اس کمینے سے شدید نفرت کرتی ہوں...!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

☆☆☆

وٹنس باکس میں استغاثہ کا آخری گواہ یعنی مقتولہ آنٹی خدیجہ کا شوہر رؤف احمد کھڑا تھا۔ رؤف کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس وقت رؤف کے چہرے پر گہری سنجیدگی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا اور یہ سنجیدگی پریشانی، فکرمندی اور تذبذب کا مجموعہ نظر آتی تھی۔ میں نے رؤف سے جرح کے لیے بڑی خاص الخاص تیاری کی تھی۔ وکیل استغاثہ نے مقتولہ کے شوہر کو فارغ کیا تو میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! میں مقتولہ کے شوہر سے بنیادی طور پر صرف ایک سوال کروں گا لیکن اس خاص سوال سے پہلے میں معزز عدالت کے روبرو ایک دلچسپ ڈیمو دینا چاہتا ہوں۔ مذکورہ ڈیمو انتہائی غیر متعلق اور غیر ضروری دکھائی دے گا لہٰذا فاضل وکیل سے میری درخواست ہے کہ وہ دوران اس مظاہرہ مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کریں۔"

جج نے وکیل استغاثہ کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "مجھے منظور ہے جناب عالی۔"

"بیگ صاحب!" جج نے مجھ سے کہا۔ "آپ ڈیمو شروع کر سکتے ہیں لیکن عدالت کے قیمتی وقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے...!"

"آف کورس یور آنر۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میری یہ کوشش عدالت کا وقت بچانے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

پھر میں اپنے بیگ کی جانب بڑھ گیا۔ اس روز میں اپنے ساتھ بریف کیس کے علاوہ ایک چھوٹا سا پلاسٹک بیگ بھی لے کر آیا تھا جس کے اندر ڈیمو کا مخصوص سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے مذکورہ سامان کو باہر نکال لیا اور وٹنس باکس کے قریب چلا آیا۔

"یہ ڈو کلے (Dough Clay) ہے۔" میں نے آٹے کی طرح گندھی ہوئی ایک مخصوص مٹی استغاثہ کے گواہ رؤف احمد کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟"

"زیادہ نہیں۔" وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں نے بچوں کو اس مٹی سے کھیلتے دیکھا ہے۔"

میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ مٹی انتہائی بے ضرر ہے کیونکہ ننھے منے بچوں کے لیے ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے۔"

"جی، میں نے دیکھا ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "بچے مختلف سانچوں میں اس مٹی کو بھر کر اسی سانچے کی ساخت کے کھلونے تیار کرتے ہیں۔"

"واہ بھئی واہ...!" میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے تو میری مشکل ہی آسان کر دی۔ لگتا ہے، آپ بھی میری طرح عدالت کا وقت بچانے کا ارادہ باندھ کر گھر سے نکلے ہیں۔ میں تو آپ کو سانچوں میں ڈو کلے بھر کر اس کھلونا سازی کا عملی مظاہرہ دکھانا چاہتا تھا۔ اس بیگ کے اندر کئی سائز اور ساخت کے پلاسٹک کے بنے ہوئے سانچے موجود ہیں...!" لمحاتی توقف کر کے میں نے مذکورہ بیگ میں سے درجن بھر سانچے نکال کر گواہ کی آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر انہیں دوبارہ ڈو کلے سمیت واپس بیگ کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اب اس ڈیمو کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ سانچوں اور ان کے اندر ڈھالی گئی اشیا کے عمل سے گہری واقفیت رکھتے ہیں... ہیں نا؟"

"یہ کون سی راکٹ سائنس ہے وکیل صاحب!" وہ ایک گہری اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "کسی سانچے میں جو بھی چیز بھری جائے گی، وہ اسی شکل کی تیار ہو کر نکلے گی۔ کیک، موم بتی، قلفی، صابن کی ٹکیا... الغرض بے شمار چیزیں اسی عمل سے مختلف اشکال میں ڈھال کر تیار کی جاتی ہیں۔ سانچے ان اشیا کی تیاری میں قالب کا کردار ادا کرتے ہیں۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے رؤف صاحب۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "آپ تو ماشاء اللہ خاصے سمجھ دار انسان ہیں۔"

"اب وہ اکلوتا سوال...؟" وکیل استغاثہ سے رہا نہ گیا۔ اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہ بول ہی پڑا۔ "ڈیمو کی تو ضرورت نہیں رہی...؟"

"ہاں، وہ اکلوتا سوال...!" میں نے خشمگیں نگاہ سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر اس کے پیٹ میں اٹھنے والے مروڑ کا شافی علاج کرنے کی خاطر میں استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"رؤف صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر اپنے وعدے کے مطابق سوال کیا۔ "آپ کی بیٹی بھی اس شخص سے شدید نفرت کرتی ہے۔ پچھلی پیشی پر ملزم نے اس شخص کے لیے "مردود اور کمینے" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ آپ کو یہ بندہ کیسا لگتا ہے؟"

"میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"حیرت کی بات ہے، یقین نہیں آ رہا۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جس شخص کو آپ ناپسند کرتے ہیں اور آپ کی بیٹی جس سے نفرت کرتی ہے وہ بندہ آپ کی بیوی کو ڈرائیونگ سکھاتا رہا اور اب اس کا نام استغاثہ کے گواہوں میں شامل ہے...؟"

"خدیجہ نے مجھے بتائے بغیر اس کے ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے خدیجہ کو روک دیا تھا اور جہاں تک استغاثہ کے گواہوں کی فہرست کا معاملہ ہے تو یہ سوال آپ جا کر پولیس سے کریں۔ میں نے ہرگز انہیں ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔"

"پولیس کے پاس جا کر پوچھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ پولیس تو چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہے۔" میں نے تفتیشی افسر مقصود علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا پھر رؤف سے پوچھا۔ "آپ کے بقول آپ نے مقتولہ خدیجہ کو سکندر بھائی سے ڈرائیونگ سیکھنے سے روک دیا تھا لیکن یہ بندہ تو اس کے بعد بھی آپ کے گھر پر آتا رہا ہے...؟"

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ بولنا شروع کیا۔ "میرا موکل ایک بے گناہ شخص ہے۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔ پولیس کے پیش کردہ چالان میں موجود چند ایک سقم کی میں نشان دہی کر چکا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تاحال پولیس آلۂ قتل برآمد نہیں کر سکی۔ علاوہ ازیں استغاثہ کے گواہوں کے بیانات میں بھی بعض مقامات پر دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے جو میں مختلف پیشیوں پر وقتاً فوقتاً عدالت کے ریکارڈ پر لا چکا ہوں جس سے استغاثہ کی بدنیتی ظاہر ہوتی ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ وہ ملزم عابد کو باعزت بری کرنے کے احکامات صادر کرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملزم عابد بہت غصہ ور

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملزم نے آنٹی خدیجہ کو قتل نہیں کیا۔ ہاں البتہ۔۔۔" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے جج کی طرف دیکھا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

"اگر معزز عدالت کی اجازت اور تفتیشی افسر کی خواہش ہو تو میں آلۂ قتل کے سلسلے میں کچھ مدد کرسکتا ہوں۔"

انکوائری آفیسر، وکیلِ استغاثہ اور جج نے بیک وقت چونک کر کھوجتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ جج نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"بیگ صاحب! آپ کس قسم کی مدد کی بات کررہے ہیں؟"

"یور آنر! میں یہ عرض کررہا ہوں کہ۔۔۔" میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ "قاتل نے جس خنجر کی مدد سے آنٹی خدیجہ کو موت کے گھاٹ اتارا اسے کبھی تلاش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ تحلیل ہوچکا ہے۔۔۔"

"عدالت کو تفصیل سے بتائیں۔" جج نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "آپ کی بات اگرچہ عجیب سی محسوس ہورہی ہے لیکن اس کے اندر وزن ہے۔"

"جناب میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آلۂ قتل پانی کا بنا ہوا تھا۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "اسی لیے مقتول کے سینے سے خارج ہونے والا خون تیزی سے پتلا ہوگیا تھا کیونکہ اس خون کے اندر آلۂ قتل کا پانی بھی شامل ہوگیا تھا۔"

"بات سمجھ میں نہیں۔۔۔" جج کی استفساریہ نگاہ مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ "عدالت جاننا چاہتی ہے کہ پانی سے بنا ہوا آلۂ قتل مقتول کے سینے میں کیسے اترا۔۔۔؟"

"اس نازک اور حساس سوال کا جواب دورِ حاضر کے ایک بے نام سائنس داں سے پوچھتے ہیں۔" میں نے اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس سنسنی کی ہسٹری وہی بتاسکتے ہیں۔"

عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی اور ماحول پر سکوت طاری تھا۔ تکنیکی اعتبار سے اس نوعیت کی خاموشی کو "پن ڈراپ سائلنس" کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے بیگ کے اندر سے ایک بڑے سائز کا سانچا نکال کر استغاثہ کے وکیل اور ذوالفقار احمد کی نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اس سانچے کو پہچانتے ہیں؟"

میرے ہاتھ میں موجود مذکورہ سانچے کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "یہ۔۔۔ آپ کو کہاں۔۔۔ سے ملا۔۔۔؟"

ذوالفقار کے اضطراری اور اضطرابی ردِعمل نے اس کیس کا پاسا پلٹ دیا۔ خنجر کے سائز اور ساخت کا وہ سانچا میں نے بدستور اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

"یہ سانچا جائے وقوعہ پر تمہارے سامان کے اندر سے ملا ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ مریل سی آواز میں بولا۔ "میں نے تو اسے گٹر میں پھینک دیا تھا۔"

"تو پھر مجھ کو تمہارا پھینکا ہوا سانچا ابھی تک اسی گٹر میں کہیں پڑا ہوگا یا پانی میں بہہ کر سمندر کی گود میں سماچکا ہوگا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اور تمہاری زبان کھلوانے کے لیے مجھے یہ ڈراما رچانا پڑا۔"

"پ۔۔۔ پانی۔۔۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"تمہیں پانی پلانے کے لیے واٹر بورڈ کے آفس فون کروادیا گیا ہے۔" میں نے کاٹ دار آواز میں کہا۔ "اب تم جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر خوب پانی پینا اور اگر کوئی سانچا مل جائے تو برف کے کھلونے بھی تیار کرنا۔۔۔"

پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور اس کیس کو فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! مقتول کا شوہر ایک آئس کریم فیکٹری میں کام کرتا ہے لہٰذا یہ فریزنگ کے قواعد وضوابط سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہ اپنی بیوی کی بے وفائی سے آگاہ ہوگیا تھا۔ اس نے بہت سوچا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ برائی کی جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکے۔ ایک سکندر بھائی کو ختم کرنے سے کوئی دوسرا سکندر بھائی پیدا ہوسکتا تھا۔ اس نے آنٹی خدیجہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے سخت برف کا ایک خنجر تیار کیا۔ پھر اپنا کام کرنے کے بعد اس نے سیلنگ فین کو فل اسپیڈ پر آن کردیا تاکہ برف کا خنجر جلد از جلد پگھل کر پانی کی صورت اختیار کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس آلۂ قتل کو برآمد کرنے میں ناکام رہی اور مقتول کے لباس پر لگا ہوا خون اس کے اصل خون سے کافی پتلا تھا۔ میں نے اس کیس کو اتنا آسان کردیا ہے کہ پولیس ایک گھنٹے کے اندر مقتول کے شوہر سے اقبالِ جرم کرواسکتی ہے۔ دیٹس آل یور آنر۔۔۔!"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل عابد کو باعزت بری کردیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

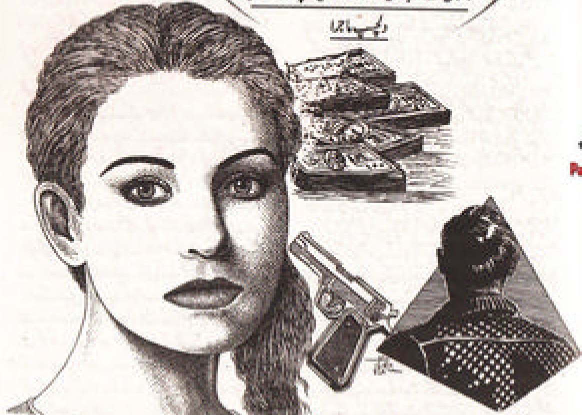
شکنجہ

انجم فاروق ساحلی

بے شک علم بہت بڑی نعمت ہے مگر... کیا کیا جائے جب قانون کے رکھوالے ہی اپنے علم اور عمل کے تضاد پر فخر محسوس کریں... اسے بھی سب معلوم تھا کہ کیسے جرم اور مجرم کو پکڑا جاسکتا ہے اور کیسے انہیں تحفظ دیا جاسکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر بار ہی اس کے کامیابی قدم چومتی... اور اس بار تو جب اپنے ہی دوستوں نے مجرمانہ کارروائیوں کی جانب اٹھنے والے تمام قدموں میں زنجیر ڈالی تو حیرت سے وہ گنگ رہ گیا۔

قانون کے شکنجے میں پھنسنے والے ایک پولیس آفیسر کا

دلچسپ ماجرا



ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتے ہی پرانی کار نے ایک زوردار جھٹکا لیا اور پکی سڑک پر مڑ گئی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس نے ہیڈ لائٹس جلادیں۔ 93ء ماڈل کی سیکنڈ ہینڈ مزدا تمام تر قوت سے ناہموار زمین پر دوڑ رہی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ کار کی رفتار تیز ہوتے ہی وہ غیر ارادی طور پر مطمئن ہوگیا۔ آگے سوچوں کا گنجان سلسلہ تھا۔

"مجھے افسوس ہے ڈیئر!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش میرے پاس اتنی رقم ہوتی کہ تمہارے لیے کوئی قیمتی گھڑی خرید سکتا۔"

"چھوڑو بھی۔" شیلا ناگواری سے بولی۔ "تم جیسے شخص سے شادی کرنا میری سب سے بڑی حماقت تھی۔ شادی سے پہلے کتنی ڈینگیں مارا کرتے تھے کہ تمہارے لیے آسمان کے تارے بھی توڑ لاؤں گا۔ مگر اب تو۔۔۔"

کے آثار ابھرے۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔
"میں بے حد مجبور ہوں شیلا۔" سام ویلڈرسن کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ "ویسے میں جلد ہی تمہیں ایک رسٹ واچ گفٹ کروں گا۔"
"میں تو وہی گھڑی لوں گی جو "اسکائی لارک" میں دیکھی تھی۔" شیلا نے ترش روئی سے کہا۔
"لیکن ذرا میری مجبوری پر بھی ——"
"تم تو ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنی ازلی مجبوری کا دکھڑا لے کر بیٹھ جاتے ہو۔"
"ڈارلنگ! یہ حقیقت ہے۔"
"تم جیسے پیدائشی کاہلوں سے کوئی توقع نہیں۔" شیلا نے منہ بنایا اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
"اپنی گندی زبان بند کرو۔" سام جھلا کر چیخا۔ "ذرا اپنے متعلق بھی سوچ لو۔ نہ کام نہ کاج، نہ سلیقہ نہ تمیز —— ہر وقت ٹی وی دیکھنا اور کچن پر توجہ نہ دینا تمہارا واحد مشغلہ ہے۔"
"تمہاری یہ بک بک سن کر تو میرے کان پک گئے ہیں۔" شیلا چلا کر بولی۔ "بڑے بنتے تھے کامیاب بزنس مین۔ ہونہہ —— صرف ایک سو اسی ڈالرز کی ادنیٰ گھڑی بھی نہیں خرید سکتے۔"
جواب میں سام نے اسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا اور سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ کار گھنے جنگل میں سے گزر رہی تھی۔ ہر طرف پھیلا ہوا سناٹا مسلط تھا۔ خنک ہوا کھڑکی سے گزر کر اس کے رخسار تھپتھپانے لگی۔ وہ دونوں پکنک کیمپنگ کے بعد اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ ساری تفریح غارت ہو کر رہ گئی۔ شاید وہ وقت کی چھٹیاں کسی معقول ہوٹل میں گزارنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔ اس صورت میں اخراجات زیادہ ہوتے، سام کی آمدنی تھوڑی تھی۔ بیچ وڈ ہائٹس سٹی میں رہائش ہونے کی بنا پر وہ یوں بھی اخراجات کے بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔
وہ جنرل موٹرز میں دس سال سے سیلز مین کی حیثیت سے کام کر رہا تھا لیکن محنتی اور ذہین ہونے کے باوجود وہ کسی عہدے میں ترقی نہ کر سکا۔ وہ اکثر بزنس کے خواب دیکھا کرتا مگر سرمایہ نہ ہونے کی بنا پر دل مسوس کر رہ جاتا۔ پکنک کیمپنگ کے لیے بے حد دشواری سے ضروری سامان کا انتظام ہوا تھا۔ اس کے ایک دوست نے اس کی تنگ دستی پر ترس کھا کر یہ اشیا اسے عاریتاً دے دیں۔ ان میں ایک چھوٹا

کیمپ میں شیلا نے کھانا پکانے کے سامان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ جل کر کہنے لگی کہ اگر تفریح کے دوران بھی وہ چولہا ہانڈی کرتی رہی تو پکنک کا کیا خاک مزہ آئے گا۔ اگر ہوٹل کے اخراجات اٹھانے کی سکت نہیں تو وہ خود ہانڈی چولہے سے نمٹ لے اور کیمپ کا خیال رکھے۔ وہ تو مزے سے اس ہاتھ کا لطف اٹھائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا بھی۔ وہ پکنک کے تمام عرصے میں مسلسل غسل آفتابی کے مزے لوٹتی رہی۔ سورج کی چمکیلی کرنیں دل کے نہاں خانوں کو منور کرتی رہیں۔
سام ایک فرماں بردار شوہر کی طرح کھانا پکانے کے چکروں میں مصروف رہا۔ وہ باقاعدگی سے کیمپ گھر جاتا، برتن دھوتا اور اپنی قابلیت کے مطابق کھانا پکاتا۔ وہ ان معاملات میں بالکل اناڑی تھا، لہٰذا کھانے میں کمی کوتاہی ہوتی رہی۔ اشیا یا تو ادھ پکی رہ جاتیں یا پھر جل جایا کرتیں۔ شیلا کو ان باتوں کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ سمندر کے کنارے، بھیگی ہوئی ریت پر لیٹی بگلوں آسمان پر اڑتے ہوئے آبی پرندوں کا نظارہ کرتی یا اٹھلاتی ہوئی شفاف موجوں کے درمیان دوڑتی ہوئی دور تک نکل جاتی۔ یہاں تک کہ وہ پانی کے تیز بہاؤ میں تیراکی کا مظاہرہ کرنے لگتی۔ رات کو بھی وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں سرِ شام ہی گھس جاتی اور سام حسین بیوی کی دلفریب قربت سے شادکام ہونے کی تمنا دل ہی میں لیے رہ جاتا۔
شیلا دلکش اور سڈول جسم کی مالک ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے جنسی طور پر بھی سرد مہر ثابت ہوئی۔ کوئی پندرہ ماہ پہلے سام ویلڈرسن کیڈی لاک کی ڈیلیوری کے لیے میامی کے ایک ذی حیثیت گاہک کے پاس گیا تھا۔ واپسی پر اسے اس امیر آدمی کی اولڈ ماڈل سیڈان کار جزوی قیمت کے طور پر ساتھ لانی تھی۔ میامی سے وہ سیڈان لے کر چلا تو کامیاب سودے کی خوشی میں وہ شب بسری کے لیے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ دس بجے رات کو وہ عمدہ کھانے کے بعد اپنے کیبن میں سونے کے لیے چلا گیا۔ نرم اور آرام دہ بستر پر سفر کی تھکن اسے لوریاں دینے لگی۔ اس نے نیم غنودگی کی حالت میں لائٹ آف کی اور کروٹ بدل کر سو گیا لیکن اسے سونا نصیب نہ ہوا۔ ساتھ والے کیبن میں کسی نے ریڈیو آن کر دیا اور کسی قسم کی موسیقی بلند آہنگ آواز سے نشر ہونے لگی۔ اس نے جھلائی اور جسم پر گاؤن پہنتے پڑوسی کے کیبن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
ہلکا نیلا سویٹر اور ایک مختصر سا اسکرٹ پہنے شیلا دروازہ کھول کر سامنے آئی تو سام اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ مکمل

لباس کرتے ہوئے سام سے تیز آواز میں ریڈیو بجانے پر معذرت کی اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ بستر پر اس طرح نیم دراز ہو گئی کہ اس کی سڈول رانیں نمایاں ہو کر قیامت ڈھانے لگیں۔
اپنے تیز تیز دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سام ویلڈرسن للچائی ہوئی نظروں سے اس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتا رہا۔ چند ہی باتوں کے بعد ہی شیلا اس سے بے تکلف ہو گئی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ سام بھی بیچ وڈ ہائٹس سٹی جا رہا ہے تو اس نے بھی ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ سام نے فوراً رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ رات شیلا کی صحبت میں بسر کرنے کے بعد دوسری صبح سام، شیلا کو لے کر بیچ وڈ ہائٹس سٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں آٹھ ڈالر فی ہفتہ کے کرائے کے کمرے میں شیلا کو ٹھہرا کر سام کام پر چلا گیا۔ شام کو منیجر سے اجازت لے کر وہ سیدھا اپنے بہترین اور جدید تراش کے سوٹ میں شیلا کے پاس پہنچا۔
سٹی کے مضافات میں واقع ایک خوب صورت اور معیاری ریسٹورنٹ میں "سی فوڈ" سے معدے کی تواضع کی گئی۔ شیلا اس گمان میں رہی کہ وہ ایک اولوالعزم اور کامیاب بزنس مین سے معاشقے میں کامیاب رہی ہے۔
شیلا کے والدین جب بارہ سال کی عمر میں اسے شہر کی مرکزی شاہراہ پر چھوڑ کر چلتے بنے تھے —— اس وقت سے لے کر اب تک وہ بڑی عجیب سی زندگی گزارتی آ رہی تھی۔ اس وقت وہ بائیس سال کی عمر میں مختلف شعبوں سے منسلک ہونے کے بعد بالآخر میامی کی کال گرل بن گئی تھی۔ ایک سو پچاس ڈالرز میں سے جب اس کے پاس دس ڈالرز رہ گئے تو اس نے سام ویلڈرسن سے شادی کر لی لیکن اس شادی سے دونوں کو مایوسی ہوئی۔
شیلا کو پہلے دن ہی معلوم ہو گیا کہ سام نہ تو امیر ہے اور نہ ہی کامیاب بزنس مین —— وہ تو باپ کے چھوڑے ہوئے ایک چھوٹے اور خستہ حال بنگلے میں رہتا ہے۔ سام ویلڈرسن سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ شیلا ایک تند خو اور ہوس پرست لڑکی ہے۔ گھر گرہستی کے قطعی لائق نہیں۔ یوں ہی روتے روتے ایک سال گزر گیا۔ شیلا کو گھر کی پناہ اور باقاعدہ خوراک میسر تھی اور سام کو ادھیڑ عمری میں ایک خوب صورت بیوی جسے دیکھ کر دوست اس کی قسمت پر رشک کیا کرتے۔
سام نے ایک طویل جماہی لی۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ اس نے سامنے کی طرف دیکھا، گھنے جنگل کا سلسلہ ہنوز باقی تھا۔ چڑھائی آتے ہی کار کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ اس نے

ہوا۔ اس نے گیئر بدل کر پھر کوشش کی لیکن نتیجہ صفر رہا۔ وہ گھبرا گیا۔ اگر گاڑی خراب ہو گئی تو شیلا زندگی اجیرن کر دے گی۔
"مسٹر کامیاب آدمی!" شیلا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں جنگل کے مناظر پسند ہوں تو ہوں، میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی ہوں بھئی —— ذرا رفتار بڑھاؤ۔"
سام نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دل ہی دل میں جھنجلاتا رہا۔ کار اب چڑھائی عبور کر کے ڈھلوان پر رینگ رہی تھی۔ یہ علاقہ "اسکوپ" کے مضافات میں سے تھا۔ کار جھٹکے کھاتی، لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔
فاصلہ کسی نہ کسی طرح رینگ کر طے ہوتا رہا۔ ایک جگہ چھوٹی سی چڑھائی پر سام نے ایکسلریٹر کو پریس کیا تو وہ زور سے چیخ کر خاموش ہو گیا۔
"اب کیا ہوگا؟" شیلا نے ڈرتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں باہر پھیلے ہوئے مہیب اندھیرے پر جمی ہوئی تھیں۔
"انجن جواب دے گیا ہے۔"
"بس یہی کسر رہ گئی تھی۔" شیلا دانت پیس کر بولی۔ "تمہارے ساتھ باہر نکلنا خود کو جان کنی میں ڈالنا ہے۔"
"زیادہ عقل نہ بگھارو۔" سام نے جھنجلا کر کہا۔ "میں نے خود سے تو گاڑی خراب نہیں کی۔"
کار کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ اس نے گلوو کمپارٹمنٹ سے ٹارچ نکالی اور نیچے اتر آیا۔ صبح و شام اس کا واسطہ کاروں سے رہتا تھا۔ لہٰذا بونٹ اٹھاتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فیول پمپ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مایوس ہو کر اس نے کار کا بونٹ گرا دیا اور خلا میں پلک جھپکائے بغیر گھورنے لگا۔
"ہم یہاں پھنس کر رہ گئے ہیں۔" سام نے شیلا کو پاس آتے دیکھ کر کہا۔ "پمپ بیکار ہو گیا ہے، ہائی وے یہاں سے پانچ میل دور ہے۔ تم اگر یہاں ٹھہرو تو میں آخری بس پکڑ سکتا ہوں۔"
"یہاں ——؟" شیلا کے لہجے میں حیرت تھی۔ "اس جنگل میں —— میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔"
"تو پھر میرے ساتھ چلو۔"
"پیدل پانچ میل؟"
"ہاں، اب ہمارے لیے یہاں ٹیکسی کہاں سے آئے گی؟"
"واہ —— واہ۔" شیلا نے تنک کر کہا اور ایک طرف جھاڑیوں کے پاس بڑھتی چلی گئی۔ سام غصے سے کھول کر رہ

کھانے لگا۔ اس کے پاس چار ویلیز بھی تھے۔ دفعتاً شیلا
حیرت سے چیخ پڑی۔ سام چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
وہ جھاڑیاں ہٹاتے اسے اشارے سے بلا رہی تھی۔ وہ
دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا پھر اس کی آنکھیں حیرت سے
پھیل گئیں۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک جدید ماڈل کی
سیاہ بیوک کھڑی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت و صامت کھڑا بیوک
کو دیکھتا رہا۔ "یہ بیوک یہاں کیسے آئی؟" اس نے حیرانی
سے کہا۔ وہ ابھی تک اس منظر کو خواب ہی سمجھ رہا تھا۔

"پتا نہیں، میں کیا جانوں۔" شیلا نے کندھے
اچکائے۔ "ذرا دیکھو تو سہی یہ کار آباد بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ گاڑی چل سکتی ہے تو ہم اس میں۔۔۔"
اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ ہمیں ایسا کرنا چاہیے ہو سکتا ہے کوئی؟"

"میں کہتی ہوں بند کرو یہ اخلاقیات کی باتیں۔" شیلا
چیختی ہوئی آگے بڑھی۔ "آگے بڑھ کر دیکھو کہ یہ بیوک چل
سکتی ہے یا نہیں بھلے۔ ہمیں کسی قیمت پر بھی رات یہاں نہیں
گزارنی ہے۔" اس کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

سام نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور جیب
سے چابیوں کا سیٹ نکالا۔ ماسٹر کی۔۔۔ اس میں موجود تھی۔

☆☆☆

اینڈریو نے جھلا کر اپنے آپ کو ایک گندی سی گالی دی
اور انتہائی مشکل سے گھسٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ شدت درد
سے اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس کا تمام جسم پسینے سے تر ہو رہا
تھا۔ ہونٹوں پر پیڑیاں جم گئی تھیں۔ غار سے یہاں تک کا
فاصلہ بمشکل بیس گز تھا لیکن اس کی قوت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ
مزید گھسٹنے سے قاصر تھا۔ داہنے بازو کے زخم سے خون زیادہ
بہہ جانے کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی۔ اس
نے اپنے حواس ایک بار پھر مجتمع کیے اور کسی نہ کسی طرح
سامنے کی جانب سرکنے لگا۔ اسے ہر قیمت پر سڑک کے
قریب پہنچنا تھا۔ بس چند قدموں کی دوری حائل تھی۔ وہاں
پہنچ کر ہی وہ کار کا بغور جائزہ لے سکتا تھا۔ آخر یہ کس کی کار
تھی اور کون لوگ تھے؟ جو اس کی سیاہ بیوک لے کر وہ غائب
ہو گئے تھے۔ بیوک کا خیال آتے ہی وہ خون کے گھونٹ بھر
کر رہ گیا۔ اگر وہ لوگ اس کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ ان کی
تکا بوٹی کر کے رکھ دیتا۔ انہوں نے اس کے کیے کرائے پر
پانی پھیر دیا تھا۔ اسے اپنا منصوبہ خاک میں ملتا ہوا نظر آیا۔
کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آخر اس ویران اور اجاڑ جنگل میں
کون ایک پڑا تھا۔ اس کی جھلاہٹ مزید بڑھ گئی۔

اس نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا لیکن بازو میں
اٹھنے والی شدید ٹیس نے اسے نڈھال کر دیا۔ وہ تکلیف سے
بلبلا اٹھا۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ سانس رک رک کر
آنے لگا۔ منہ سے دبی دبی چیخیں نکلنے لگیں۔ وہ ہولے
ہولے کراہتا رہا۔ اس کی آستین خون سے سرخ ہو رہی تھی۔
بیوک کو روانہ ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ پتا نہیں وہ اس
وقت کہاں ہوں گے اور بیوک کی ڈکی میں وہ آہنی بکس تھا جس
میں کیسینو سے اڑائے ہوئے بیس لاکھ ڈالرز کے کرارے
نوٹ بند تھے۔ اس خطیر رقم کے حصول کے لیے اسے کتنے
عجیب اور خطرناک حالات سے گزرنا پڑا تھا مگر آج وہ
دولت کسی اور کی دسترس میں تھی۔

زندگی میں پہلی بار اس کا جی چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ
کر روئے۔ اپنی بوٹیاں آپ ہی نوچ ڈالے۔ اب تک اس
کا سارا پروگرام حسب منشا کامیاب ہوا تھا۔ کیسینو میں سخت
پہرے کے باوجود وہ اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ رقم
اڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پولیس کے نرغے میں اپنے
چاروں ساتھیوں کو چھوڑ کر وہ تنہا ہی رقم لے کر فرار ہو گیا اور
جانے پہچانے طے شدہ راستوں سے ہوتا ہوا اس جنگل کی
طرف بڑھتا چلا آیا۔ بھاگتے وقت اس کا تعاقب کیا گیا تھا
اور سیکیورٹی کی ٹولی نے اسے زخمی کر دیا تھا لیکن وہ چالاکی
سے انہیں ڈاج دے کر نکل آیا۔ اس گھنے جنگل میں اس نے
سامنے والے غار میں پناہ لی تھی۔ بازو کا زخم ناقابل
برداشت ہو چکا تھا۔ وہ غار کے اندر کمبلوں کے بستر پر چت
لیٹ گیا۔ یہ اس نے ایک مسافر سے چھینے تھے۔ بہر حال وہ
ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا تھا اور رات بھر آرام کر سکتا تھا۔ یہ
غار بھی اس کے پلان کا ایک حصہ ثابت ہوا۔ ڈکیتی کے
معاملات سرد ہونے تک یہاں پڑے رہنا ایک دانش
مندانہ فعل تھا۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ کبھی کبھی بازو کا درد
اسے کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپنے پر مجبور کر دیتا۔ ایسے
میں ہاتھ لب بام رہ جانے پر اسے کند توقع ہوتی دکھائی
دیتی۔ بازو کے زخم کے ساتھ دل کا درد بھی پریشان کر رہا
تھا۔ رات آئی تو وہ بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ ہاتھ پاؤں
بالکل بے جان محسوس ہو رہے تھے۔ دماغ سائیں سائیں کر
رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محسوس کیا
جیسے کوئی اس کی بیوک کا دروازہ کھول کر اگنیشن میں چابی لگا

شاید پولیس پہنچ گئی ہے۔۔۔ اس نے سوچا کیا وہ اس
کی کار لے جائیں گے اور وہ منزل پا کر بھی قسمت کا مارا
جواری کی طرح ساری عمر پولیس والوں سے منہ چھپاتا رہے
گا؟ اپنی بے بسی پر وہ بری طرح جھنجھلا گیا تھا۔ وہ بڑی دقت
سے اٹھ پایا۔ گھسٹتا ہوا غار کے دہانے تک آیا۔ چاند کی مدھم
روشنی میں اسے دو دھندلے ہیولے دکھائی دیے۔ غالباً ان
میں ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ وہ بیوک کا جائزہ لے رہے
تھے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور نکال لیا۔
مجھے فوراً دونوں کو ہلاک کر دینا چاہیے۔ وہ ان کا نشانہ لینے
لگا۔ سیفٹی کھینچتے ہی اس کا دل زور سے دھڑکا۔ پھر سینے میں درد کا
بگولا سا اٹھا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے اپنی حالت پر قابو
پانے کی کوشش کی۔ دل بے بس پنچھی کی طرح پسلیوں کے
قفس سے سر مار رہا تھا۔ پسینے کے بے شمار قطرے اس کے
چہرے پر پھوٹ پڑے۔ اس نے سامنے نگاہ ڈالی۔ کوئی
بیوک کا دروازہ کھولے کچھ کھوج رہا تھا۔ اس نے پھر ریوالور کا
رخ اس آدمی کے خاکے کی طرف کر دیا۔ ٹریگر پر اس کی
کانپتی ہوئی انگلی آئی۔ اچانک درد کا ایک دوسرا بگولا اٹھا۔ وہ
درد سے دوہرا ہو گیا۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش میں ایک
ہاتھ سے سینے کو دبا رکھا تھا۔

اسی وقت بیوک کا انجن جاگا اور کار لہراتی ہوئی آگے
بڑھ گئی۔ وہ بے جان سا ہو کر غار کے ٹھنڈے فرش پر گر پڑا۔
غم و غصے سے سلگتا ہوا وہ پھر آگے کی سمت کھسکنے لگا۔ سرخ
سرو قریب آچکی تھی۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔
اس کا سر چکرا گیا۔ وہ لڑکھڑایا گرنے سے بچنے کے لیے اس
نے بے ساختہ کار کا سہارا لیا۔ سانس بحال ہوئی تو وہ
اسٹیئرنگ وہیل کی طرف آیا۔ شیشے پر چپکا ہوا نوٹ پڑھ کر
اسے کچھ اطمینان ہوا۔ ان لوگوں کی کار خراب ہو گئی تھی اور
وہ کار مستعار لے گئے تھے لیکن وہ واپس آئیں گے اس نے
سام ہینڈرسن کا پتا غور سے پڑھا۔ سام ہینڈرسن۔ 136۔
ڈبل پوائنٹ ایونیو۔ ساؤتھ اسکوائر ہیڈ کوارٹر سٹی۔ اس نے
طویل سانس لی اور اپنی حالت میں کچھ افاقہ محسوس کیا۔ دفعتاً
نرم نرم گھاس پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آواز
اس کی پشت سے آئی تھی۔ وہ چونک کر مڑا۔

☆☆☆

بیوک برق رفتاری سے کوسٹل کی سڑک پر پھسل رہی تھی۔
ایک جگہ انہیں کافی دیر گاڑی روک کر راستہ صاف ہونے کا
انتظار کرنا پڑا۔ ایک تیز رفتار کار ایک آئل ٹینکر سے ٹکرا گئی
کر ریڈیو لگا دیا۔ فضا میں ایک اناؤنسر کی آواز ابھری۔

"چاروں مطلوبہ ڈاکوؤں کا سراغ مل گیا ہے لیکن
پانچواں شخص ابھی تک لاپتا ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ وہی
شخص ان کا سربراہ ہے۔ اس کا نام اینڈریو لاک ہے۔
پولیس بڑی تندہی سے اس کی تلاش میں ہے۔ تمام راستوں
کی ناکا بندی کی جا چکی ہے۔ اس کا بچ نکلنا محال ہے۔ امید
ہے اسے جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ اینڈریو کا حلیہ یہ ہے۔
عمر چالیس سال۔۔۔ قد پانچ فٹ دس انچ، بھورے بال
اور بھوری آنکھیں، چہرہ داڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز۔
پولیس کو یقین ہے کہ آئی بی ایم کے مخصوص نشانات والی تھیلی
اس کے پاس ہے۔ تھیلی میں کیسینو سے لوٹے ہوئے بیس
لاکھ ڈالرز مالیت کے نوٹ ہیں۔ ہر خاص و عام کو مطلع کیا
جاتا ہے کہ اینڈریو کو دیکھتے ہی ہیڈ کوارٹر سٹی پولیس 7776 پر
فوراً رابطہ قائم کیا جائے۔"

اچانک بیوک ڈول کر رہ گئی۔ اوور ٹیک کرتی ایک کار
نے زور سے ہارن بجایا۔ سام ہینڈرسن نے سنبھل کر بیوک کو قابو
کیا۔ اس کے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جم کر رہ گئے۔ دل بری
طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت شیلا سے چھپی نہ رہ سکی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" شیلا جھنجھلا کر بولی۔ "ابھی ٹکر
ہو جاتی تو؟"

"چپ رہو۔" سام حلق کے بل چیخا۔ اس کے
چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ سانس
تیزی سے چلنے لگی۔ اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپنے لگے۔

"خدا کے لیے ریڈیو بند کر دو۔" وہ آہستہ سے بولا۔
اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔

"آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" شیلا نے جھلا کر ریڈیو
بند کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کار کیسینو کے ڈاکوؤں کی ہی
ہے۔" سام نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "رقم شاید ڈکی میں پڑی
ہے۔ بہت جلد ہم کسی مصیبت کا شکار ہونے والے ہیں۔"

"کہیں دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟"

"ڈکی میں آئی بی ایم کے نشانوں والی تھیلی پڑی
ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کار جنگل میں چھپائی گئی تھی۔ اب کیا کیا
جائے؟" وہ دہشت سے ہکلا کر بولا۔ شیلا نے کوئی جواب
نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی کار ہے؟" گہرے
سناٹے کو چیرتے ہوئے شیلا نے سوال کیا۔

کرلیا۔ "یہ تو کسی اتفاق سے اسی وقت ڈکی میں رکھی ہوئی تھی۔
مجھے دکھائی دی تھی۔ بہتر ہے کہ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر چلیں۔"

"ہم ہر صورت گھر جائیں گے۔" شیلا نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "اگر وہ ابھی ڈکی میں رقم ہے تو ہم پولیس کو نہیں دیں گے ۔۔۔ سمجھے تم؟"

سام کا منہ احتجاجاً کھلا پھر بند ہوگیا۔ ٹریفک کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ وہ چونک پڑا۔ "پتا نہیں کیا بات ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ "آگے روڈ بلاک ہے، ہر آنے جانے والی گاڑی کی چیکنگ ہو رہی ہے۔"

شیلا نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ "شاید ڈاکوؤں کی کار کی چیکنگ کے لیے ناکابندی کی گئی ہے۔"

"بہتر ہے کہ ہم انہیں سب کچھ بتا دیں۔" سام نے پھر سمجھایا۔ اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔

"اُف! چپ بھی رہو۔ پہلے ہم گھر جائیں گے۔ آخر پتا تو چلے کہ ڈکی میں رقم ہے بھی یا نہیں۔"

ٹریفک روڈ بلاک کے قریب جاکر رک گئی۔ اس نے دیکھا کہ پٹرول آفیسر جارج وہائٹ ہیڈ ناکے میں داخل ہونے والی گاڑیوں کو چیکنگ کے بعد گزرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ایک بار میں اکثر ساتھ پینے پلانے کی وجہ سے جارج اور سام میں کسی حد تک دوستانہ تعلقات بن گئے تھے۔ وہ اس سے بے تکلفی سے ملتا اور کئی مرتبہ تفریح کے لیے بھی اسے ہوکر ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ "تم کار میں ہو؟" جارج انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ "اور سناؤ ۔۔۔ چھٹیاں کیسے گزریں؟"

سام کا حلق خشک ہوگیا۔ چہرے پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ شیلا نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک جبری مسکراہٹ طاری کرلی اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولی۔ "ہیلو جارج! بہت عرصے سے تمہیں دیکھا نہیں ۔۔۔ کیسے ہو؟"

جارج نے چندھیائی ہوئی نگاہوں سے شیلا کو دیکھا۔ وہ اس کے گداز اور سڈول جسم کا ابتدا سے ہی دیوانہ تھا۔ اس نے مسکرا کے اس کے سراپا پر اپنی نظریں جما دیں۔ "تمہاری صحت تو پہلے سے بہت بہتر ہوگئی ہے۔ کہو چھٹیاں کیسے گزریں؟"

"بہت اچھی ۔۔۔ ٹھیک ہو۔" شیلا سیٹ پر اٹھلائی اور ایک لگاوٹ بھری مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ "تم ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟"

"بس ذرا فرصت کم ملتی ہے۔" جارج نے مسکراتے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔

مگر اس مختصر سی گفتگو کے دوران اس کی نگاہ بار بار ڈکی کا طواف کر رہی تھی۔ اسے شک تھا کہ وہ کار بھی چیک کرے گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔ سام جیسے احمق شخص سے اسے کسی چالاکی کی توقع نہیں تھی۔

"سام! کیا یہ کار نئی خریدی ہے؟" اس نے اچانک پوچھ لیا۔

"نہیں، میری کار خراب ہوگئی تھی۔ یہ کسی دوست سے مانگ کر لایا ہوں مگر یہ ہنگامہ کیا ہے؟"

"ہنگامہ ۔۔۔ کیا اخبار نہیں پڑھتے؟" جارج نے حیرت سے کہا۔ "بڑے کیسینو پر ڈاکا پڑا ہے۔ ڈاکو بیس لاکھ ڈالرز لے اڑے ہیں۔ اس لیے چیکنگ ہو رہی ہے۔" پتا نہیں سام جیسے بدھو شوہر سے شیلا کس طرح نباہ کرتی ہوگی۔ اس نے سوچا۔

"بیس لاکھ ڈالرز؟" شیلا نے حیرت ظاہر کی اور کھڑکی پر جھک آئی۔ اس کا گریبان دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ جارج، سام کی قسمت پر رشک کرنے لگا۔ کتنی حسین بیوی ملی ہے اسے۔ ہر رات کی قربت کے مزے۔ اُف دل آویزیاں۔

"گاڑی چیک کرنا ہو تو کرلو۔" شیلا نے ایک دل آویز مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا۔ "ہم بے حد تھکے ہوئے ہیں ۔۔۔ جلد گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔"

"ارے اب اس کار کی کیا چیکنگ کروں؟" جارج مسکرایا۔ "سام! کار آگے بڑھاؤ۔"

"ٹھیک ہے جارج۔" سام نے گاڑی آگے بڑھائی۔ جارج دوسری گاڑی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے ساتھی بھی متحرک تھے اور مختلف سواریوں کی چیکنگ میں مصروف عمل تھے۔

شیلا خوابوں کے حسین دھندلکوں میں پرواز کرنے لگی۔

☆☆☆

کرائے کی نشست میں پہنچ کر شیلا نے بیگ کا ڈھکنا اٹھایا۔ کرارے نوٹوں کی بے شمار گڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سام تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔

"ہم نے کبھی خواب میں بھی اتنی کثیر دولت نہ دیکھی ہوگی۔" ٹک ٹک کرتی آنکھوں سے وہ نوٹوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز میں خوشی کی بے پایاں جھلک نمایاں تھی۔ اس نے بے اختیار نوٹوں کی ایک گڈی کو چومے

"ہم اس کو ہضم نہیں کرسکیں گے۔" سام نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ آنکھوں میں بے یقینی کے سائے لہرائے۔ شیلا نے غور سے سام کی گھبراہٹ کا اندازہ کیا۔ وہ گڈی کو بیگ میں پھینک کر کچن کی طرف گئی اور مشروب کے دو جام بنا کر ایک اسے دیا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ ٹھنڈے ہوچکے تھے مگر سام پر اب بھی خوف طاری تھا۔ وہ ہر وقت مشتعل اور مضطرب نظر آتا۔ حالانکہ رقم سے بھری ہوئی بیگ گیراج میں پڑی رہی اور کوئی مسئلہ نہ ہوا۔ نہ پولیس کا کوئی آدمی پوچھ گچھ کے لیے آیا۔ آج وہ بڑی مشکل سے سام کو رضامند کر کے بیگ کھلوا سکی تھی۔

"ہضم کیوں نہیں کرسکیں گے؟" اس نے سام کے شانے تھپتھپائے۔ "چلو یہ ہم اسے مشروب کے جام کی طرح ہضم کرلیں گے۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے۔ ذرا سی دانش مندی سے دولت ہمارے پاس رہ سکے گی۔"

"فرض کرو ہم اسے رکھ لیتے ہیں، پھر بھی ہم اسے خرچ نہیں کرسکیں گے۔ ہماری مالی حالت کے بارے میں ہر ایک جانتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا؟" مشروب کے دو چار گھونٹوں نے سام کو تقویت پہنچائی۔

"چند ماہ کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اتنی دیر ہم صبر کرلیں گے۔" شیلا نے بھی مشروب کا ایک گھونٹ بھرا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اب بھی وقت نہیں گزرا۔ ہم پولیس اسٹیشن کو فون کردیں تو بہتر ہے۔"

"اے مسٹر! کان کھول کر سن لو۔" شیلا نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ "تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔ ایک سال تمہارے ساتھ رہ کر ہر اچھی چیز کو ترس گئی ہوں۔ اب اتفاق سے یہ خزانہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے جس کا کسی اور کو علم نہیں۔ ہم اسے ایمانداری کے نام پر دقیانوسی اصولوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیں گے۔ سمجھ گئے؟ اس کا ہر ڈالر ہمارا ہوگا۔"

سام اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ شیلا کے سامنے وہ اپنے آپ کو مغلوب سا محسوس کر رہا تھا۔

"جیسی تمہاری خوشی۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن یہ بتاؤ کہ تم اپنے لیے خود قبر کھود رہی ہو۔ آخر اسے رکھا کہاں جائے گا؟"

"ہم اسے مکان کی کھڑکی کے قریب دفن کردیں گے۔"

ٹھیک اسی وقت صدر دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ شیلا تھے۔ "اس وقت کون ہوسکتا ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جاؤ جاکر دیکھو۔" سام جلدی سے بولا۔ اس کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔

"دیکھتی ہوں۔" شیلا نے بے پروائی سے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی راہداری طے کرنے لگی۔ مین گیٹ کے پاس پہنچتے ہی اس نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر پولیس آفیسر جارج کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر ابھی تک سرکاری وردی تھی۔ شاید وہ اب بھی ڈیوٹی پر تھا۔ "ارے جارج تم؟" شیلا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "اندر آجاؤ۔ کہو اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"تم لوگوں کا خیال یہاں کھینچ لایا۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "کہیں اس وقت میں مخل تو نہیں ہوا ۔۔۔ سام کہاں ہے؟" شیلا کی جان میں جان آئی۔

"وہ اندر ہے، آؤ چلیں۔" شیلا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ اب تو خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ جارج باہر ہی کھڑا تھا۔ "میں دراصل اس رقم کے لیے آیا ہوں مسز پیڈرسن جو تم چرا لائی ہو۔" اس نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ شیلا کا جسم پتھرا گیا۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کردیا۔" جارج نے شیلا کے ردعمل سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" شیلا نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ ہکلا کر رہ گئی۔ اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر جارج خود ہی اندر آگیا اور سٹنگ روم کی طرف بڑھا۔ شیلا بے خیالی میں اس کے پیچھے چلنے لگی۔

سام نے بیگ کو بند کر کے سٹنگ روم کے ایک گوشے میں پرانے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے چھپا دیا تھا۔ جارج کمرے میں پہنچا تو وہ اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی سام تیزی سے آگے بڑھا۔

"ارے تم ۔۔۔" وہ مشتعل انداز میں مسکرایا۔ "کہو اس وقت کیسے آنا ہوا، شاید تم ڈیوٹی سے آرہے ہو؟"

"وہ بیس لاکھ ڈالرز کی رقم کہاں چھپا رکھی ہے؟" جارج کی بات سن کر سام کا دل اچھل کر حلق میں آگیا لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور بولا۔ "بیس لاکھ ڈالرز ۔۔۔ اس رقم سے ہمارا کیا تعلق؟"

"ڈارلنگ! انہیں شبہ ہے کہ یہ رقم ہم اڑا لائے ہیں۔" شیلا نے سام کے کندھے سے لگ کر کہا۔

"پتا نہیں ۔۔۔ تم کس رقم کی بات کر رہے ہو؟" سام

"احمق نہ بنو۔" جارج نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اس رقم کی بات کر رہا ہوں جو بینک کی ڈکی میں بند تھی اور وہ بینک تم یہاں لے آئے ہو۔" وہ باری باری دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

"بینک میں ایسی کوئی رقم نہیں تھی۔" شیلا نے نظریں چرائیں۔ "ہم اسے مار کر یہاں لے آئے تھے۔"

"سیدھی طرح مان جاؤ ورنہ ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔" جارج کا لہجہ کرخت ہو گیا۔ "وہ بیگ کہاں ہے؟"

"وہ اس کونے میں پڑا ہے۔" سام نے فوراً بتا دیا۔ شیلا نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ جارج اٹھ کر اس گوشے کی طرف گیا اور پرانے کپڑوں کے ڈھیر الٹنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے آئی بی ایم بینک کے نشانوں والی تھیلی اس کے سامنے تھی۔ اس نے جلدی سے اسے اٹھایا اور فرطِ مسرت سے نوٹوں کی گڈیوں کو ہاتھ میں لے کر اچھالنے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ہاہاہا۔۔۔ اب یہ دولت کثیر بلاشرکت غیرے میرے قبضے میں ہے۔" اس نے دیوانوں کی طرح زور سے قہقہہ لگایا۔ "اس کے لیے میں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔" وہ ہنستا رہا۔ شیلا کا چہرہ بجھ کر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جارج کو دیکھ رہی تھی۔

"چلو اسے تھانے پہنچا دیں۔" سام نے خوش دلی سے کہا جیسے اس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

"تھانے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ تھانے میں ہم رپورٹ لکھوائیں گے کہ یہ رقم ہمیں کہاں سے ملی۔ اس میں ہمیں تمہاری مدد بھی چاہیے۔"

"خوب۔۔۔ تمہاری سادگی کا بھی جواب نہیں۔ اگر اس رقم کو پولیس کے حوالے کرنا ہوتا تو میں تنہا ہی آتا۔ میرے ساتھ پولیس چیف تو ضرور ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" سام نے پھر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔

"ارے۔۔۔ تم کس قدر بھولے ہو۔" جارج ہنس پڑا۔ "بھائی یہ رقم تو میں نے ہی کسینو سے چوری کروائی تھی۔ اب بھلا میں اسے تھانے کے سپرد کیوں کرنے لگا؟" اس نے تھیلی سے ایک گڈی اٹھائی اور پیار سے اسے بوسہ دیا۔

"اور۔۔۔ وہ۔۔۔ اینڈریو لاک۔۔۔ وہ ریڈیو پر اعلان؟" شیلا فرطِ حیرت سے ہکلا کر رہ گئی۔

"وہ سب میرے ادنیٰ کارندے تھے۔" جارج پھر ہنسا۔ "پلاننگ اور کامیاب منصوبہ بنانے والے ابھی منظر عام پر نہیں آتے، کیا سمجھے؟" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

"لیکن اینڈریو اور چار دوسرے ساتھی؟"

"کہا تو ہے کہ وہ سب میرے ساتھی تھے جو مار ڈالے گئے۔" اس نے خوش دلی سے اعتراف کیا۔ "چاروں پولیس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گئے جبکہ اینڈریو زخمی حالت میں خود میرے پستول کا نشانہ بنا۔ میں اسے ہلاک کر کے ایک شارٹ کٹ راستے سے چیکنگ پوائنٹ (ناکے) پر آپہنچا۔ تم لوگ سڑک پر پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے رکے ہوئے تھے۔ میں کسی شہادت کو سرے سے باقی رکھنے کا قائل ہی نہیں۔ تم نے ذاتی استعمال کے لیے چند نوٹ نکالے تو نہیں؟"

"بالکل نہیں۔" سام جلدی سے بول اٹھا اور سامنے چھوٹی میز پر رکھے قلم دان کو دیکھنے لگا۔

"بہت اچھا۔" جارج نے کہا۔ "اس پیٹی کو بحفاظت جنگل سے نکال کر یہاں لانے کا شکریہ۔ دراصل اسے یہاں لانا بے حد دشوار تھا۔ اگر نہ لائی جاتی تو پولیس تلاش کرتے ہوئے خود وہاں پہنچ جاتی۔ اب اطمینان سے میں اسے اپنی گاڑی میں لے جاؤں گا۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ دو دن میں معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ گرائی ختم ہو چکی ہے۔ اب میں ملازمت ترک کر دوں گا اور اس دولت کو لے کر بہت دور نکل جاؤں گا جیسے ہوائی یا جزیرے۔ وہاں باقی زندگی ایک دولت مند شخص کی طرح حسین دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں بسر کروں گا۔"

"چلو اب جلدی سے دور ہو جاؤ۔" شیلا جل کر بولی۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ وہ پھر محرومی کی دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔

جارج نے شیلا کی کیفیت کو بھانپ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "ابھی اتنی بھی جلدی نہیں۔۔۔ میں صبح سویرے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔ میں اس کے عوض تمہیں چند ڈالر دے دوں گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" سام بھی ہنسا۔ "ابھی تمہارے استقبال کو بھی چند ہزار لوگ پہنچنے والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ اسے اس وقت سام کا لہجہ غیر مانوس سا لگا۔

"کھیل ختم ہو گیا جارج۔" سام ہینڈرسن نے انتہائی سرد لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ اب اس کے داہنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا جس کا رخ جارج کی طرف تھا۔ "تم خود اپنے جال میں پھنس گئے۔"

شیلا اچھل پڑی۔ یہ احمق اور بزدل سام کی آواز تو نہ تھی۔ وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ "پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، دولت کے لالچی۔" اس نے بائیں ہاتھ سے پتلون کی جیب سے ایک۔۔۔ کارڈ نکالا اور جارج کے سامنے پھینک دیا۔

"میرا تعلق ایف بی آئی کے لوکل کرائم انویسٹی گیشن سے ہے۔ میں مدت سے اس گینگ کے پیچھے تھا جو بڑی کامیابی سے دن دہاڑے بینکوں اور ہوٹلوں کو لوٹ رہا تھا مگر ابھی تک ایک فرد بھی پولیس کی گرفت میں نہ آسکا تھا۔ پولیس چیف نے تنگ آکر ایف بی آئی کی خدمات حاصل کیں۔ اس کیس کا انچارج مجھے بنایا گیا۔ میں نے ہر لحاظ سے اس معاملے میں رازداری برتی اور چپکے چپکے ایک ہوز کمپنی میں سیلز ایجنٹ کی حیثیت سے اپنے طور پر تفتیش کرتا رہا۔ چیک اسپاٹ پر ہی مجھے کسینو کے ڈاکے کی اطلاع ریڈیو ٹرانسمیٹر پر ملی۔ واپسی پر جب تم نے بینک کو مشکوک۔۔۔ میں دیکھ کر بھی چیک نہ کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم اسے نظرانداز کر رہے ہو۔ چنانچہ میں شیلا کے سامنے ایک بے وقوف شوہر اور بزدل شخص کی اداکاری کرتے ہوئے اس پیٹی کو اپنے گھر میں رکھنے پر رضامند ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ معاملہ ٹھنڈا ہو جانے پر تم خود ادھر کا رخ کرو گے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔"

"یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔" سام زور سے بولا۔ "میں ابتدا سے ہی تمہارے پیچھے لگا رہا۔ مجھے تم پر اس وقت شبہ ہوا تھا جب تم مجھے بار میں ملا کرتے تھے اور بہت فراخ دلی سے خرچ کیا کرتے تھے۔ ایک معمولی پیٹرول آفیسر کی تنخواہ بھلا اتنی کہاں ہوا کرتی ہے کہ یوں بے دردی سے پیسا خرچ کرے۔ میں نے زمانے کی نظروں سے بچنے کے لیے خود پر حماقت اور غیر معمولی بزدلی کا خول چڑھا لیا اور شیلا کیا تم جیسا مکار بھی دھوکا کھا گیا۔"

شیلا حیران نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ یہ اس کا احمق شوہر تو ہرگز نہیں تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا کہ کہیں یہ خواب تو نہیں ہے۔ "بولتے رہو، تمہاری اس بکواس پر کون یقین کرے گا؟" جارج حقارت سے ہنسا۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے جارج۔" سام نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "تم اب کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے۔"

"ہاہاہا۔۔۔ تم قیامت تک یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ میں ہی ڈاکوؤں کا سرغنہ ہوں۔" جارج مسکرایا۔ "اول تو میں نے اب تک کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑا جو مجھے ڈکیتی کے اس کیس میں شہادتی طور پر ملوث کر سکے۔ دوم اگر بالفرض محال کوئی شبہ بھی ہوا تو سرکار کی دی ہوئی پوزیشن اور وردی میری حفاظت کے لیے کافی ہوگی۔ ابھی تم میری امانت تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے درجنوں ڈاکے ڈالے ہیں مگر پولیس میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔"

"تم ہار گئے جارج۔" سام کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "یہ تمہارے سامنے موجود۔۔۔ چھوٹی میز پر جو قلم دان رکھا ہوا ہے، وہ حقیقت میں قلم دان نہیں بلکہ ایک ننھا سا طاقتور ٹرانسمیٹر ہے۔ اس کے ذریعے ہماری گفتگو براہِ راست ایف بی آئی ہیڈ کوارٹر کے کرائم انچارج کے کمرے میں ریکارڈ کی جا رہی ہے۔ احمق کہیں کے! تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ آخر اس میز پر قلم دان کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ جب شیلا تمہیں دروازے پر ریسیو کر رہی تھی، اسی وقت میں نے اسٹڈی روم سے یہ قلم دان لا کر اس میز پر رکھ دیا تھا تاکہ تمہاری باتوں کو ریکارڈ کیا جا سکے۔ بہرحال تم دھوکا کھا گئے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ چالاک سے چالاک مجرم بھی قانون کے شکنجے میں آ ہی جاتا ہے۔"

شیلا نے جارج کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بار بار اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ خود شیلا کی حالت بھی غیر تھی۔ وہ بوکھلا کر سام کو تکے جا رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی ازلی بے وقوف سام ہے جسے وہ بات بات پر چٹکیوں میں اڑا دیا کرتی تھی۔ تو کیا وہ سب فریب تھا؟ وہ حماقت محض ایک اداکاری تھی؟

اسی وقت پولیس کار کے سائرن کی آواز قریب آتی سنائی دی۔ سام آواز کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اس کے پستول کا رخ اب بھی جارج کی طرف تھا اور ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی کسی وقت بھی حرکت میں آسکتی تھی۔

"شیلا! ذرا جا کر دروازہ کھول دو۔ یہ لوگ ایف بی آئی کے آدمی ہوں گے۔"

سام نے نرمی سے اسے ہدایت کی مگر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ جارج نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ دفعتاً اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ وہ دو چار بار لہرایا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

محفل شعر و سخن



⊛ بادیہ ایمان، ماہا ایمان ...... فورٹ عباس
رات کے سناٹے میں ہم نے کیا کیا دھوکے کھائے ہیں
اپنا ہی جب دل دھڑکا تو ہم سمجھے وہ آئے ہیں

⊛ بابر عباس، مسز بابر عباس ...... گلیانہ، کھاریاں
میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں
کہ حیرتوں سے بھرا اک جہان ہے یہ بھی
کچھ اس طرح میرا غم اٹھائے پھرتا ہوں
کہ جیسے دھوپ میں سائبان ہے یہ بھی

⊛ محمد یونس چودھری ...... سلطان پورہ، لاہور
ہجر کی ماری ان آنکھوں کو اشکوں کی شبنم مبارک
جن آنکھوں میں تم بستے ہو ان آنکھوں کو عید مبارک



⊛ پری، فضل عباس ...... گلیانہ، کھاریاں
شام ڈھلے جب سارے پرندے لوٹتے ہیں رو پڑتے ہیں
اس کی قسمیں اس کے وعدے سوچتے ہیں رو پڑتے ہیں
اجڑا کمرا، بکھری چیزیں، بوجھل دل اور گیلی پلکیں
اپنی حالت دیکھ کے ہنستے ہیں رو پڑتے ہیں

⊛ محمد ہمایوں تنولی ...... مانسہرہ
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

⊛ محمد اشفاق سیال ...... شورکوٹ سٹی
اس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہر گز کمی
جس نے جو مانگا وہی اس نے مہیا کر دیا

⊛ سعید منظور ...... یوحنا آباد، لاہور
نصیب جن کو تیرے رخ کی دید ہوتی ہے
وہ خوش نصیب ہیں خوب ان کی عید ہوتی ہے

⊛ عبدالجبار رومی انصاری ...... گکھڑ منڈی
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

⊛ ریاض محمود بٹ ...... حسن ابدال
تلخیاں بڑھ گئیں جب زیست کے پیمانے میں
گھول کے درد کے ماروں نے پیا عید کا چاند

⊛ مسز اینڈ مسٹر محمد منظور معاویہ ...... خانیوال
اس کی دیوار پہ حیران کھڑا ہے کب سے
چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا

⊛ چلبلی عبیر ...... جھنگ صدر
میں تماشا ہوں مجھے دیکھ رہی ہے دنیا
تم تو اپنے ہو مجھے داد کیوں نہیں دیتے

⊛ حسنین عباس، کیلی عباس ...... گلیانہ، کھاریاں
مت پوچھ کہ میرے صبر کی وسعت کہاں تک ہے
تو آزما کے دیکھ لے تیری طاقت کہاں تک ہے
وہ اور ہوں گے جنہیں تم سے امید وفا ہو گی
ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

⊛ زرین خان آفریدی ...... حیدر آباد
اس نے تو میری شاعری سمجھی ہے
گر میں نے رہا رکھا خوشبودار لوگوں سے

⊛ ادریس احمد خان ...... ناظم آباد، کراچی
کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

⊛ محمد شاہد نواز ...... عبدالحکیم، ضلع خانیوال
ہواؤں کے ساتھ کہیں بھی دیے ہیں تھکے میں
یہیں ہی کہا تھیں سیلاب کو خدا حافظ
زمیں پہ یہ ہرا آخری تماشا تھا
تمام حلقۂ احباب کو خدا حافظ

⊛ احمد عالم ...... اسلام آباد
بہتے ہوئے اشکوں کی روانی میں مرے ہیں
کچھ خواب مرے عین جوانی میں مرے ہیں
کرداروں میں کہیں ہم کو کتابوں میں اتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

⊛ رمضان پاشا ...... گلشن اقبال، کراچی
ہوا نہ ہے تب غم ہجراں میں مومن
دیکھے وہ دن بس اب فضل خدا ہوتا ہے

⊛ فضل محمود ...... کوئٹہ
ایک موہوم عقیدت کے علمبرداروں
ایک بے رحم صداقت کا گنہگار ہوں میں
ایک خوابیدہ مشیت کے پرستار ہو تم
ایک تابندہ حقیقت کا خریدار ہوں میں

⊛ زوہیب احمد ملک ...... گلستان جوہر، کراچی
دوستو رخت سفر باندھ کے نکلو کہ یہاں
ہم پڑاؤ کے لیے رکتے ہیں، رک جاتے ہیں
تپتی ہوئی دھوپ سے بچ کر کوئی سایہ ڈھونڈیں
خوب ابھرے نہیں پاتے ہیں کہ جھک جاتے ہیں

⊛ ایم شفیق حسین ...... سندھی ہوٹل، کراچی
اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرعام رکھ دیا

⊛ انیلہ رشید سیال ...... خیرپور میرس
وہ اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

⊛ ذیشان نیازی ...... راولپنڈی
یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

⊛ دانش عبیر ...... گلشن اقبال، کراچی
محو تھی کسی کی تمنا میں زندگی میں نے
وہ کون ہے جسے دیکھا نہیں کبھی میں نے
بڑا خیال تو ہے پر ترا وجود نہیں
ترے لیے تو یہ محفل سجائی تھی میں نے

⊛ کمال انور ...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
جو تھے دشمن تیری آنکھوں کے
کب انہیں ہے گرفت چھوڑا ہے
ہم نے اپنے درشت لہجے سے
آمروں کا غرور توڑا ہے

⊛ محمد آریز ملک ...... گلستان جوہر، کراچی
نہ وہ خلوص تصور کہ لو تم آ ہی گئے
نہ زخم دل کی ہے سوزش کوئی جو سہتی ہو
نہ کوئی وعدہ دیوانوں کی شام ہی نہ سحر
نہ شوق کی ہے کوئی داستاں جو کہتی ہو

⊛ وزیر محمد خان ...... بل جبرادہ
شور کرتی ہے جب بھی خاموشی
بھیڑ میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں

⊛ مدحت ...... کراچی
نہ پوچھو عہد الفت بس اک خواب پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لاتے نہ دل کا مدعا سمجھے

⊛ جنید احمد ملک ...... گلستان جوہر، کراچی
آنسو بہا بہا کر بھی ہوتے نہیں کم
کتنی امیر ہوتی ہیں آنکھیں غریب کی

⊛ محمد اقبال ...... سرگودھا
مجھے وہ کیف گوارا نہیں جو فانی ہو
کوئی بتائے کہ اب کون سا گناہ کروں
گلی گلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو
کسے گلے سے لگاؤں کسے تباہ کروں

⊛ محمد یوسف ...... کوئٹہ
بربادیوں کا جائزہ لینے کے واسطے
وہ پوچھتے ہیں حال میرا کبھی کبھی

ہر حقیقت فریب تھی
جب کوئی اعتبار کو بیٹھے

⊛ صغیر احمد ..... بہاولپور
بچھے میں اک تڑپ ہو تو مرنے میں اک وقار
انسان کا نکھار اسی رقص تو میں ہے

⊛ حفیظ الرحمٰن ..... فیصل آباد
جن کی تخلیق سے ہے حسن کی قدروں میں دوام
ان کے ہاتھوں کی لکیریں تو ستاروں میں چلے

⊛ طارق نصیر ..... کراچی
یہ پوچھتا ہے کب آدم زمیں پہ اترے گا
جو لے چلے کوئی کامل، خدا کے پاس ہمیں

⊛ افشاں گل ..... حیدرآباد
جانے حسن کہاں لے چلی، خدا جانے
امنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں

⊛ مہتاب احمد ..... حیدرآباد
حال یہ ہے کہ خواہش پرسش حال بھی نہیں
اس کا خیال بھی نہیں اپنا خیال بھی نہیں

⊛ اسماء ممتاز ..... کراچی
ایک تو اتنا حبس ہے پھر میں سانسیں روکے بیٹھا ہوں
ویرانی نے جھاڑو دے کے گھر میں دھول اڑا دی ہے

⊛ منیر شگفتہ ..... وہاڑی
جو کچھ تو نے سمجھا ہے اوروں کو سمجھایا کیا
بال بکھیرے بیٹھا ہے، ڈوب گیا سرمایہ کیا

⊛ افشین نیازی ..... پشاور
آج ہم خواب میں مل سکتے ہیں
نیند کرنے کی مشقت کرلو

⊛ مہوش کنول ..... منڈی بہاؤالدین
بس یونہی دل کی سہولت کے لیے
کرلیے دکھ بھی گوارا میں نے

⊛ ..... منڈی بہاؤالدین
دیکھ کر شہر کی ویرانی
مجھ کو تو دشت بھی گھر سا لگا

⊛ شگفتہ ادریس ..... نواب شاہ
دور سے کر کے سفر آئے ہیں
ان پرندوں کو اڑا مت دینا

⊛ محمد علی ..... میانوالی
میں شہر کر نیند سے باہر آ
خواب آنکھوں پہ حکومت کرے

⊛ میمونہ ..... گوجرانوالہ
کچھ اس طرح میں ترا غم اٹھائے پھرتا ہوں
کہ جیسے وہ کہیں سائبان ہے یہ بھی

⊛ کہکشاں علی ..... سیالکوٹ
کب تک یوں پردے پردے میں حسین محبت کو جھٹلاؤ گے
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چھپتے دکھلاؤ سامنے آؤ

⊛ لبنیٰ احمد ..... کوئٹہ
سنا ہے آج مشیت پہ وار ہے کتنا
وہ آدمی جو ازل سے ستم رسیدہ رہا

⊛ یونس احمد ..... چنیوٹ
وہ آئے بھی تو جھونکے کی طرح آئے گئے
چراغ بن کے جلے جن کے انتظار میں ہم

⊛ سرفراز علی ..... کراچی
گلوں کے اڑتے ہوئے رنگ کی تلاش میں ہوں
کبھی نہ ہو مرے ذوقِ جمال کا انجام

⊛ امبر نعیم ..... ملتان
خدا کا شکر، ہرا رستہ معین ہے
کہ کارواں بھی تھی، میر کارواں بھی تھی

⊛ برہان شکیل ..... اسلام آباد
آرزو کے کنول کھلنے ہی نہ دیتے
قرض کرو کہ ہم لے ہی نہ دیتے

کوپن
برائے شمارہ
اگست 2018

محفلِ شعر و سخن

نام:..............................

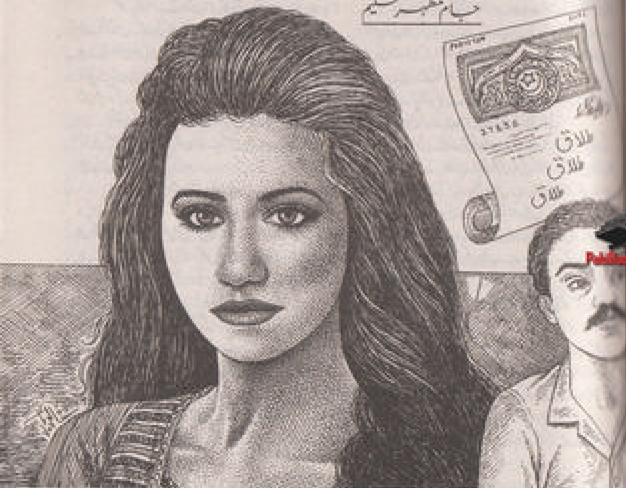
پتا:..............................

کا اتنا بڑا سہارا بن جاتا ہے کہ زندگی کی نیا پار لگ جاتی مگر... افسوس کبھی کبھی انسان احساس برتری میں مبتلا ہو کر اس کی ٹوٹی ہوئی دل کو یکسر نظرانداز کر دیتا ہے اور بس یہی وہ پل ہوتا ہے جب قدرت کا انداز نظر بدل جاتا ہے۔ وہ بھی جب قدرت کی اس آزمائش میں قید ہوا تو احساس ہوا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

دھتکارے ہوئے لوگوں پر احسان جتانے والے ایک کم ظرف کی روداد

دھتکار

حسام مظہر سلیم



شام کو شکیلہ اور راشد کی پیالی میں داخل رہا تھا۔ شکیلہ نے ایک ایک کر کے تہ سے رکھے ہوئے کپڑے اٹھائے اور انہیں تہہ کرنے لگی۔ راشد کے کپڑے تہہ کر کے اس نے الماری کھول کر راشد کے استعمال کی چیزیں ترتیب سے ایک طرف رکھیں، پھر کپڑے الماری میں رکھنے لگی تو ایک بھاری لفافہ شکیلہ کے پیروں میں آن گرا۔ اس نے سرسری انداز میں لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں کچھ پرانی تصویریں تھیں۔ شاید راشد کے کالج کے وقت کی۔ پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر بھی تھی کسی لڑکی کی۔ شکیلہ نے تصویر کا رخ پلٹ کر دیکھا تو وہاں لکھا ہوا تھا ——— فیور راشد فرام سیما!

"راشد کی دوست ہوگی کوئی۔" وہ سوچ کر مسکرا دی۔ راشد ویسے بھی اتنا تو تھا کہ کوئی بھی لڑکی اس سے محبت کر سکتی تھی۔ اس نے کبھی شکیلہ سے اپنے کسی افیئر سے متعلق بات نہیں کی تھی۔ "پتا نہیں کون ہے وہ۔" اس نے سوچا۔

کی تھے۔ اس کے چہروں نے ساتھ ... جاتا تو
اس کپڑے کو اپنا کچھ لگ ... کسی دوسرے کپڑے کو لگ جاتا تو راشدہ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کہتا تو وہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن کافی دیر وہ چپ چاپ سا رہتا اور وہی خاموشی شکیلہ کے لیے سوہان روح ہوتی۔ وہ سوچتی کتنا پیارا لگتا ہے وہ جب مسکراتا ہے۔ مسکراتے وقت اس کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل اس کی وجاہت کو دو چند کر دیتے لیکن وہ کبھی کھل کر نہیں ہنستا تھا۔ بس مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے رکھتا تھا۔

شکریہ ادا کرتے وقت اس کا رنگ کتنا سیندوری ہو جاتا تھا۔ اگر اس کے بال کالے نہ ہوں اور وہ شکر جیسی میٹھی اردو نہ بولے تو گمان ہوتا دیکھنے والے اسے انگریز سمجھتے۔ شکیلہ الماری میں چیزیں ترتیب سے رکھتے ہوئے راشد کے خیالوں میں گم ہو گئی۔

شکیلہ کی جان پہچان والی لڑکیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ کتنا اچھا شوہر ملا ہے انہیں ـــــ وہ بھی دوسری بار جیسے اس کی قسمت کھل گئی ہو۔

اسے خود بھی یقین نہیں آیا تھا جب راشد نے اسے دیکھتے ہی رشتے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ ہلکا سا مسکرایا تھا وہ اور شکیلہ کے دل میں کلیاں کھل اٹھی تھیں۔ کیسا رنگ روپ تھا اس کے چہرے پر۔ لمبا قد، بھرا بھرا جسم، ہر وقت مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ پیشانی کو چھوتی ہوئی بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے کو اور بھی چوڑا بنا رہی تھیں۔ مضبوط قد کاٹھ کا وہ دوبنا پایا ہیرو تھا۔ شکیلہ اس کے سامنے بچی لگتی تھی۔ اس وقت وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی جب گھر سے رخصتی کے وقت وہ باپ کے گلے لگ کر رو رہی تھی اور راشد نے اسے بچوں کی طرح اٹھا کر کار کی سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔

"چند میل کا فاصلہ نہیں ہے اور خواہ مخواہ سارے گھر کو دکھی کر رکھا ہے۔" راشد نے کہا تو برات میں موجود لوگوں کے قہقہے بکھر گئے۔

شکیلہ کو اچھا لگا تھا، راشد کا یوں بانہوں میں اٹھانا۔

اسے لگا تھا جیسے وہ پھولوں کی طرح ہلکی ہو اور اس کے تن من کا سارا بوجھ راشد نے ایک پل میں ختم کر دیا ہو۔

وہ بس شکیلہ بھی نہ بھول سکی۔ اسے یاد تھا اس کی ماں نے ایک بار کہا تھا۔ "بیٹی! آدمی ڈھنگ کا ہو تو عورت کے لیے یہ دنیا ہی جنت ہے۔"

شکیلہ کو پہلے ماں کی یہ بات بہت ہی فضول اور بے معنی لگی تھی۔ آدمی کا ذکر ہوتے ہی اس کے سامنے دانش کا چہرہ

دانش ـــــ وہ شخص جس نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ ماں باپ کی ضد اور بہن بھائیوں کی نصیحتوں کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ وہ ان پڑھ ... ہی اس رشتے کی بات پکی کر دی گئی تھی۔

"تمہیں پڑھا لکھا دیا یہی کافی ہے۔" اس کی ماں نے کہا تھا۔ "ہم نے کون سا تم سے نوکری کروانی ہے۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ تو ہماری فکریں ختم ہوں۔" ماں اسے سمجھاتے ہوئے کہتی۔

اس نے گھر کے تمام افراد سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی اس کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا جیسے اس کی شادی کے انکار میں بیٹھے ہوں۔ سب بہن بھائی اس پر جان دیتے تھے لیکن شادی کے معاملے میں ایک دوسرے سے ملے ... والدین نے اپنا ہم پلہ دولت مند گھرانا دیکھ کر بہت شان و شوکت سے اس کی شادی کر دی تھی۔

سب خوش تھے کہ بیٹی کو رخصت کر کے سرخروئی حاصل ہوئی۔ شادی کے بعد چھ ماہ تو خوشی خوشی گزر گئے پھر دانش کا اصل روپ سامنے آ گیا۔ دانش چہرے کے پیچھے تاریک ذہن عیاں ہو گیا۔ وہ کئی کئی دن گھر نہ آتا۔ پھر جب آتا تو ... کے فون آنا شروع ہو جاتے۔ شکیلہ سے کئی بار دبی زبان کہہ چکی تھی کہ جہاں اس کی جاب ہے۔ وہ اس کے ... جانا چاہتی ہے لیکن ہر بار دانش ٹال جاتا۔

اس سالگرہ والے دن بھی وہ گھر نہ آیا تو شکیلہ اسے سرپرائز دینے کے لیے اس کے ہوٹل پر چلی گئی جہاں دانش بطور منیجر کام کرتا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے دانش کے پارٹمنٹ کے بارے میں پوچھا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے ڈور ناب پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پھولوں کا گلدستہ اس نے اپنے پیچھے چھپا لیا۔

اس نے سوچا پہلے وہ دانش کا ہاتھ پکڑ کر چومے گی پھر گلدستہ پیش کرے گی۔

دانش نے تیسری گھنٹی پر تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس کا بالائی جسم برہنہ تھا۔ وہ شکیلہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"او ہو!" وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو مائی لو۔" شکیلہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

"ہو از دیئر مائی ڈارلنگ؟" دانش کے عقب میں خمار آلود ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

دانش نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اتنی دیر میں شکیلہ کمرے

میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر شکیلہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ وہ تحیر آمیز انداز میں کبھی دانش کو دیکھتی اور کبھی اس لڑکی کو۔ دروازہ کھلنے سے پہلے والے منظر کا تصور اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ رہا تھا۔ اس کے اعتماد کی عمارت میں دراڑ پڑ گیا تھا۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" شکیلہ نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو بیڈ کی چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر بھونچکی بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

"میری دوست ہے۔" دانش نے آنکھیں چرا لیں۔

"دوست ہے تو تمہارے بیڈ پر کیا کر رہی ہے؟" اس نے دانش کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"ریسٹ کر رہی ہے، تھکی ہوئی تھی اور تم کوئی آئی او جی ہو جو تفتیش کر رہی ہو۔" دانش کے حلق سے مشکل آواز نکلی۔

"تم جیسی نہیں ہوں میں کہ بیوی گھر میں کیک لیے بیٹھی رہے اور تم یہاں تھرڈ کلاس غیر لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہو۔" شکیلہ پوری قوت سے چیخی۔

"تھرڈ کلاس یہ نہیں، تم ہو جو بن بلائے یہاں آ گئیں۔" دانش سے اس لڑکی کی تذلیل برداشت نہ ہوئی۔

"میں تو بن بلائی ہوں، کیا اس لڑکی کو برات یہاں لائی ہے؟" شکیلہ نے نفرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

"یہ تو شروع سے ہی میرے ساتھ ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔" دانش نے بے فکری سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"جب تمہارے پاس پہلے ہی ایک عورت تھی تو تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟" غم و غصے کی شدت سے شکیلہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تمہارے گھر والے ہی پیچھے پڑ گئے تھے۔" دانش نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے یہ فرسودہ خیالات کی لڑکیاں پسند نہیں۔ بہت بے عزتی کر لی میری اب دفع ہو جاؤ۔" اس نے سگریٹ کے تین چار طویل کش لیے اور باقی رہ جانے والا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"بے عزتی ان کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہو اور تم جیسے تھرڈ کلاس بندے کو بے عزتی کی کیا پروا؟ ہر وقت تمہاری گرل فرینڈز کی کالز آتی رہتی ہیں۔ کبھی کسی بندے کا فون نہیں آیا کیا بات ہے تمہارا کوئی مرد دوست نہیں ہے؟" شکیلہ نے پھولوں کا گلدستہ فرش پر دے مارا۔

"پلیز لیو یور سیلف... تم جیسی پینڈو لڑکی کے ساتھ میں نہیں

کے عالم میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکا دیا۔

"دانش! میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو ہر حالت میں مرد کے ساتھ چپکی رہتی ہیں۔ تم تو سوچو گے لیکن میں نے سوچ لیا ہے۔ آج سے میرا تمہارا رشتہ ختم۔ طلاق کے کاغذات بھیج دینا ورنہ میں خلع کے لیے عدالت تک جاؤں گی۔" وہ شدید غصے کی حالت میں باہر نکل گئی۔

سسرال جانے کے بجائے وہ سیدھی اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔

"میں اس کے گھر واپس نہیں جاؤں گی ابو!" وہ باپ کے گلے لگ کر رو پڑی۔

"نہ جاؤ بیٹا لیکن پہلے مجھے یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔ ایسے اچانک گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس کا باپ شاید مزید کچھ کہتا لیکن اس کی ماں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

گھر والوں کے خیال میں ایسے ہی پچھتا رہے ہیں دونوں میاں بیوی...... لیکن ایک ہفتہ بیت گیا، نہ دانش آیا، نہ اس نے فون کیا اور نہ اس کے گھر والوں نے کوئی خبر خیر لی۔ شکیلہ کے باپ نے اس کے سسر کو فون کر کے بات کرنی چاہی تو انہوں نے کہا۔

"وہ خود گھر چھوڑ کر گئی تھی ہمیں بتائے بغیر۔ آپ چھوڑ جائیں، ہم میں سے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر دانش کے باپ نے کال کاٹ دی۔

"بہت دکھ کی بات ہے۔ چند ماہ پہلے ہی تو شکیلہ کی شادی ہوئی تھی۔" اس کے باپ نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

جب اس کے دونوں بھائیوں کو پتا چلا تو وہ خاموش ہو گئے۔

"اگر تم لوگوں کو شرمندگی ہوتی ہے تو میں خود شکیلہ کو چھوڑ آتا ہوں یا پہلے ان سے بات کر کے آتا ہوں۔" اس کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس میں ہزاروں درد پوشیدہ تھے۔ جب بیاہتا بیٹی ازدواجی مسائل سے دلبرداشتہ ہو کر میکے میں بیٹھ جائے تو والدین کی پریشانیاں فزوں تر ہو جاتی ہیں۔

شکیلہ آگے بڑھ کر باپ کے گلے سے لگ کر رو پڑی۔ آنسو اس کے دامن کو تر کر رہے تھے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں مر جاؤں گی اگر آپ میرے لیے کسی کی چوکھٹ پر بھیک مانگنے کے لیے گئے تو۔ غلطی دانش کی ہے معافی اسے مانگنی چاہیے اور اس کے باپ کو۔ آپ کیوں جائیں گے اس کے گھر؟" وہ آنسو اور شدت غم سے نڈھال اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ایک دن شکیلہ فریج سے پانی کی بوتل لینے کے لیے کچن میں گئی تو لاؤنج میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ اس سے پہلے کہ وہ جا کر ریسیور اٹھاتی، اس کی بھابی نے کال ریسیو کر لی۔ شکیلہ کچن میں چلی گئی۔ اسے اپنی بھابی کی باتوں کی آواز کچن میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ پہلے تو اس نے کوئی توجہ نہ دی لیکن جب بھابی کی زبان سے اپنا نام سنا تو کچن سے واپس آتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔ "لڑکیوں کو بڑے دکھ کاٹنے پڑتے ہیں۔" بھابی کہہ رہی تھی۔ "ایسا تو نہیں ہوتا کہ چھوٹی سی بات پر گھر چھوڑ دیا جائے۔ کیا سسرال میں ہمیں باتیں نہیں سننی پڑتیں۔ ابھی تک ساس سسر کے طعنے سہہ رہے ہیں... چائے کا ایک کپ بنا کر پینے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ شکیلہ اسے تو بھائیوں نے سر پر چڑھا رکھا تھا۔ مجھے تو پہلے ہی پتا تھا یہ چار دن بھی مشکل سے گزارے گی سسرال میں۔ جس کے ماں باپ کے گھر میں کسی سے مزاج نہیں ملتے وہ سسرالیوں کو کیسے برداشت کرے گی۔" بھابی نے لمحاتی توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "چلو اچھا ہے میرے ساتھ ظلم ہوتا تھا یہاں، اب معلوم ہوگا جب اپنی بیٹی کی طرف دیکھیں گے یہ لوگ۔" شکیلہ، بھابی کی باتیں سن کر سکتے کی کیفیت میں آگئی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ زبان سے پیار کرنے والی بھابی پیٹھ پیچھے یوں زہر اگلے گی۔

وہ اپنے کمرے میں آکر صوفے پر ڈھے سی گئی۔ عجیب سی اداسی نے اسے گھیر لیا۔ اس دن کسی سے بات کرنے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ اسے لگتا تھا جیسے گھر کا ہر فرد اس سے نظریں چرا رہا ہو، کسی کے پاس اس سے کہنے کے لیے ایک لفظ تک نہیں تھا۔ جیسے وہ بہت بڑا گناہ کر بیٹھی ہو۔

ایسی کون سی عورت ہے جو اپنے مرد کا شادی پر برداشت کرے؟ "کیا میں اتنی بے وقعت ہوں کہ میری جگہ کسی اور کو بڑی آسانی کے ساتھ دے دی دانش نے اور اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اسے پشیمانی کا احساس نہیں ہوا۔" اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔

ماں باپ کے گھر میں افرادِ خانہ کی خاموشی بے حسی کے لبادے میں لپٹی محسوس ہوتی تھی تو دانش کی بے وفائی اور اس کی یادیں سوہانِ روح تھیں۔ ان خارزار یادوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ بڑی بہن کے پاس کچھ دن کے لیے لندن آگئی۔ بہن کے بچے عمر میں اس سے چند سال

... ہوئی عورت ہے۔ سارا دن مجھے لگاتی اور باہر سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتی۔ بہن کا گھر اس کے لیے کوئی جنت تھا۔ شاید نرسری میں پڑھتی تھی جب اس کی بہن کی شادی ہوئی اور بہنوئی اسے اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جب ان کے بچے ہوئے تو وہ بچوں کی دوست زیادہ اور خالہ کم تھی۔

شکیلہ نے بہن کو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ واپس دانش کے پاس نہیں جائے گی۔

"کوئی بات نہیں مت جاؤ... تمہارے لیے رشتوں کی کمی ہے؟" آپی نے کہا۔ "چھوڑو اسے اگر نہیں مانتا تو ہم ڈھونڈیں گے تمہارے لیے اچھا سا رشتہ۔ تم ہمارے بچوں کی طرح ہو۔" آپی کے لہجے میں ممتا کی حلاوت تھی۔ شکیلہ کے دل سے بھاری پتھر ہٹ گیا۔ اس نے دانش سے طلاق لے لی۔ طلاق ہو گئی تو یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

اس کے لیے رشتے داروں سے ملنا جلنا مشکل ہو گیا۔ کسی خوشی غمی کے موقع پر لوگ جان بوجھ کر اس سے پوچھتے۔ "ایسا کیا ہوا تھا کہ علیحدگی ہو گئی؟"

اس کا دل چاہتا وہ چیخ چیخ کر ساری دنیا سے کہے "مجھے میرے شوہر نے نہیں چھوڑا، میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔" لیکن کس کس کے منہ پر ہاتھ رکھتی۔ کیسے سمجھاتی کہ عورت بھی مرد کو چھوڑنے کا اتنا ہی حق رکھتی ہے جتنا ایک مرد رکھتا ہے۔ لیکن وہ چپ ہو جاتی۔

وقت کچھوے کی سی چال میں گزرتا رہا۔ گھر والوں نے اس کے لیے کئی رشتے دیکھے لیکن شکیلہ جو دودھ کی جلی تھی، چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پی رہی تھی۔ ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی بات کھٹکتی۔ وہ کسی کی نگاہ میں جچ نہ رہی تھی، نہ اس کی نگاہ میں کوئی جچ رہا تھا۔ ہر بار بات بیچ میں رہ جاتی۔ گھر والے اس سے تنگ آگئے تھے۔

"خود کو سنبھالو شکیلہ اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ پہلے تم کنواری تھیں اور بات تھی اور اب تمہارے دامن پر طلاق کا داغ لگ چکا ہے۔" ایک دن ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"داغ؟ کیا میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوں؟ کسی بینک میں ڈاکا ڈالا ہے یا کوئی میرے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے؟ میری ایک ہی اس شخص کے ساتھ بات ختم ہو گئی۔" شکیلہ نے توجیہہ پیش کی۔

"تم تو اپنی بات کرکے بے فکر ہو جاتی ہو ہر طرف سے باتیں تو مجھے سننی پڑتی ہیں۔"

... کرتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے سب پتا ہے کہ تم کیا کرتی پھرتی ہو اور غلط کام سے روکنے پر اس نے مجھے آوارہ اور بدچلن کہہ دیا اور بھائی کہتے ہیں ایسی کیا آفت آگئی تھی۔" وہ رو پڑی ہوگی۔

ماں کافی دیر چپ بیٹھی رہی پھر آنچل کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ "ویسے تو تمہاری مرضی ہے بیٹا! لیکن تمہاری بہن کہتی ہے شکیلہ میرے گھر گرہستی آباد کرے... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں شکیلہ! تمہارے سب بہن بھائی اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ چار چار جوان لڑکیاں میرے بیٹوں کے گھر میں راج کر رہی ہیں اور تم تنکوں کی طرح در در بھٹک رہی ہو... اپنے گھر میں خوش ہوتیں تو مجھے آرام ملتا اور تمہارے ابو کے سر سے بھی بوجھ اترتا۔" اس کی ماں کا لہجہ بھیگ گیا، آواز سسکیوں میں بدل گئی۔

شکیلہ نے پہلی بار محسوس کیا بات اتنی چھوٹی بھی نہیں جتنی وہ سمجھ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے ماں کتنی پریشان اور دکھی ہے، اسے اندازہ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے امی! آپ کا جس لڑکے کے ساتھ دل چاہے میری شادی کر دیں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گی۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔" ماں کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی اور آپی کی بات سوچ کر کافی دیر روتی رہی۔

شکیلہ کی زبان سے ہاں سن کر اس کی ماں خوش تو ہو گئی لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ خوشی کی اوٹ میں چھپے غم نے شب خون مارا اور اس کی ماں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ہارٹ اٹیک نے اسے زیادہ جینے کی مہلت نہ دی اور وہ بیٹی کا گھر بسنے کی آس لیے ہی منوں مٹی تلے جا سوئی۔ وہ روح سے عاری ماں کے جسدِ خاکی سے لپٹ لپٹ کر روتے ہوئے کئی بار بے ہوش ہوئی تھی۔

ماں چلی گئی، گھر کے در و بام اداسی کی لپیٹ میں آگئے۔ شکیلہ اپنے کمرے میں پڑی روتی رہتی۔ افرادِ خانہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے مگر اس کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔

"لڑکیوں کے بڑے بوجھ ہوتے ہیں ذہن پر۔ بیا اس کے مرنے کے دن تو نہیں تھے... ابھی تو صحت مند تھی، لڑکی کا غم کھا گیا۔" پرسے کے لیے آنے والی ہر عورت یہی بات کرتی اور وہ احساسِ ندامت سے پانی پانی ہو جاتی۔ وہ خود کو ماں کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

آپی کی بات احساس کو کچوکے لگاتی کہ اس نے کہا تھا

سکون ہوتی ہے۔

اگر کسی سے اس کا بات کرنے کو دل چاہتا تو وہ اس کے چھوٹی تھے جو اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک شکیلہ نہ کھا لیتی۔

چھ ماہ گزر گئے۔ دونوں کی جدائی کے غم سے سنبھل گئی تو گھر والوں نے پھر سے رشتے دیکھنے شروع کر دیے لیکن ماں کے انتقال کے بعد جیسے شادی کا لفظ ہی اس کے لیے اذیت بن گیا تھا۔

آپی نے اپنے سسرالی خاندان میں ایک لڑکے کا رشتہ دیکھا تھا لیکن اس نے پھر کر بات ختم کر دی۔ "مجھے نہیں پسند۔"

"کیوں نہیں پسند؟ آخر مجھے بھی تو پتا چلے میری گڑیا کو کیسا لڑکا پسند ہے؟" آپی نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔

"ذکی بھائی جیسا۔" شکیلہ نے شرارت سے کہا۔

"پھر ان کے ساتھ ہی کر لو۔ میں تو تمہاری خاطر یہ قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔" آپی ایک دم غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"آپی...!" شکیلہ چیخ مار کر بہن سے چپک گئی۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

"چیخ کیوں رہی ہو؟ چھوڑو اور سیدھی ہو۔" آپی کے بچے بھی گھبرا آئے۔ اس کے دونوں بچے ماں کی آواز سن کر اندر آ گئے۔

"بچو...! آج سے شکیلہ تمہاری ممی ہے۔ تمہارے پاپا کے ساتھ اس کی شادی ہو گی۔" دونوں ادھر سے سر ہلانے لگے۔

"آپی...!" شکیلہ چیخ مار کر بہن کے پاس بھاگی۔ دونوں بچے اس سے لپٹ کر تجسس سے اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے وہ ان کی سوتیلی ماں ہو۔

وہ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لیے اٹھی اور وضو کر کے دعا کر کے مجھے لے جائیں۔

شکیلہ کو تیری اولاد سمجھنے والی آپی نے جھوٹے منہ بھی نہیں کہا تھا: "شکیلہ تم نہ جاؤ۔" بچے خدا حافظ تک نہیں کہنے آئے۔ وہ دل پر بوجھ لیے گھر واپس آ گئی۔

شوہر کے سامنے احتجاج، اس کا جرم بن گیا تھا۔ ایک دن اس کی ایک دوست اس سے ملنے کے لیے آئی جو دوران تعلیم اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ شاہین نام تھا اس کا۔ وہ کسی این جی او سے وابستہ تھی جو غریب اور نادار لوگوں کے لیے کام کرتی تھی۔ شکیلہ اسے مرجھائی مرجھائی سی لگی تو وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ شکیلہ اس کے ساتھ جا کر کچھ دیر کے لیے اپنا غم بھول گئی۔ کئی ماہ بعد اس کے لب مسکرائے تھے۔

شکیلہ جو کالج میں شاہین کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ "یار اسموت ہو رہی ہے۔ مجھے تمہاری والدہ کے انتقال کا بہت افسوس ہے لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا۔"

"میری ماں بھی دوبار پیچھے رہ گئیں۔ میری طلاق نے ان کی جان لے لی... میں اپنی ماں کی قاتل ہوں۔" وہ شاہین کے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

شاہین نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں یقین ہر عورت مار کھا جاتی ہے۔ خاص طور پر مشرقی عورت خواہ وہ ہندوستان میں رہتی ہو یا پاکستان میں، طلاق کو بھی قبول نہیں کرتی... دانش جب بھانت بھانت کی لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتا رہتا تھا اور تمہیں پوچھتا تک نہیں تھا تو تم کیا کرتیں؟" شاہین نے پوچھا۔

شکیلہ نے ایک پل کے لیے نظریں اٹھا کر شاہین کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکاتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولی۔ "شاہین! مجھے لگتا ہے میں سیکنڈ ہینڈ ہو گئی ہوں۔ اب سب لوگ مجھے ہی قصوروار سمجھتے ہیں۔ اہل خانہ بھی مجھے ہی قصوروار سمجھتے ہیں۔ میری ہی کمی ہے۔ میں ہی اپنے شوہر کو نہیں سنبھال سکی۔ مجھے سنبھالنا نہیں آیا۔"

"سب سے پہلے اپنی سوچ بدلو پھر کسی اور کی سوچ میں تبدیلی لاؤ۔ اگر تمہیں طلاق ہو گئی ہے تو کیا ہوا۔ جو شخص تمہارے لائق تھا ہی نہیں اس کا کیا افسوس کرنا۔ تم کون سا بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچی ہو کہ تمہارے رشتے نہیں آئیں گے یا اس دنیا سے مرد ختم ہو گئے ہیں۔" شاہین نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم بس اپنے بارے میں اچھا سوچو اور یہ افسردگی کا لبادہ اتار پھینکو۔"

شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

"گھر سے باہر نکلو۔" شاہین نے کہا۔ "ٹھیک ہے جاب نہ کرو۔ خدمت خلق تو کر سکتی ہو؟" شاہین نے کہا۔ "ہمارے سینٹر میں آ جایا کرو۔ وہاں غریب اور نادار لوگوں کے دکھ بانٹ لینے سے تم اپنے غم بھول جاؤ گی۔ مجھے امید ہے تمہیں وہاں سکون ملے گا۔"

شکیلہ کو یہ تجویز اچھی لگی۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ شادی کے بعد جن دوستوں سے رابطہ کٹ گیا تھا ان سے ملنے لگی۔ وہ بھانت بھانت کی عورتوں سے ملتی، بزرگوں کا حال احوال دریافت کرتی، بچوں سے کھیلتی۔

ان کے دکھ بانٹتے بانٹتے وہ اپنے دکھ بھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ زندگی کی رونقوں کی طرف لوٹ رہی تھی۔ وہ سینٹر میں منعقد ہونے والی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔

شاہین کے زور دینے پر اس نے دوبارہ پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمت اور قابلیت کی بنیاد پر سینٹر میں اسے سوشل ورکر کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ وہ زندگی سے خوشیاں کشید کر رہی تھی۔ کبھی مصروفیات اور سینٹر کے معاملات کی دیکھ بھال میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ کبھی اس پر بھی غم کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ شاہین ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ایک اچھی مخلص دوست ثابت ہوئی تھی۔

ایک دن اسے ایک فرم کی طرف سے پرکشش تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ روپے پیسے کی پہلے بھی اس کے پاس کمی نہیں تھی لیکن اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔ اس نے ملازمت کی پیشکش قبول کر لی۔ اس کی شخصیت میں سنجیدگی اور وقار آ گیا تھا۔

اسے دانش کی حرکتیں بہت چھوٹی لگتیں جب اس سے ملنے والی بے سروسامان خواتین اسے بتاتیں کہ ہم سے چار چار بچے پیدا کروا کر ہمارے مرد دوسری شادی کر کے سوتنیں ہمارے سروں پر مسلط کر دیتے ہیں یا پھر وہ دوسری عورتوں سے ملتے ہیں۔ شکیلہ کو لگتا کہ اس کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

شاہین سچ ہی تو کہتی تھی۔ "تمہارا کیا بگڑا ہے؟ تمہاری ذات کا نقصان تو تب ہوتا جب تم اپنی ہار مان کر دانش کے پاؤں پکڑ لیتیں۔ اس کے دو چار بچے پیدا کرتیں اور ساری عمر ان بچوں کو پالتیں اور خون کے آنسو روتیں۔"

شکیلہ سوچتی کتنا اچھا کیا تھا میں نے کہ ایک دم ہی دانش کو چھوڑ دیا تھا۔

اس کے بھائیوں نے دبے دبے لفظوں میں کئی بار شادی کی بات کی تھی۔

اسی لیے شکیلہ کو گھر کا ماحول پھر سے بوجھل لگنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ گھر کی فرد ہو کر بھی گھر والوں پر بوجھ ہے۔ وہ گھر کا حصہ نہیں رہی۔

وہ مجبوری کے تحت گھر میں رکھے ہوئے سامان کی طرح خود کو محسوس کرنے لگی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی شیلٹر ہوم میں رہ رہی ہو جس کے مالک اسے رکھنا بھی نہ چاہتے ہوں اور جانے کے لیے بھی نہ کہتے ہوں۔

کتنا فرق آ گیا تھا اس کی پوزیشن میں۔ ایک وقت تھا جب اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تھا اور اب وہ گھر میں پڑے کاٹھ کباڑ جیسی تھی جسے کوئی بھی اٹھا کر ایک کونے سے دوسرے کونے میں رکھ دے۔

قسمت ہے ایسی زندگی گزارنے پر...؟ اس نے کئی بار سوچا۔

جلد ہی اس نے اپنے آفس کے قریب ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ اہل خانہ سے یہی کہا کہ یہاں سے آفس دور پڑتا ہے۔ ویسے اسے یہ بات کسی سے کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی کا ہر رخ وہ دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے اچھی خاصی تنخواہ ملتی تھی۔ وہ ایک آرام دہ اور پرسکون زندگی گزار سکتی تھی۔

گھر والوں سے اس نے تقریباً ناتا ختم کر لیا۔

گھر والوں کی دیکھا دیکھی اس کی جان پہچان کے لوگوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی ہوتا تھا۔ جو لوگ اسے دیکھتے ہی اس کی ذاتی زندگی سے متعلق سوال کرنے لگتے تھے۔

ایک دن...... اس کے آفس کی جھاڑ پونچھ کرنے والی عورت آفس آئی تو اس کی ایک آنکھ کے نیچے چوٹ کا نشان تھا۔ شکیلہ نے چوٹ دیکھ کر پوچھا۔ "سکینہ! یہ تمہاری آنکھ کے نیچے زخم کیسے لگا؟"

شکیلہ کے ہمدردی کرنے پر اس عورت کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ "باجی! یہ تو روز کی بات ہے۔ میرا بندہ مجھے روز مارتا ہے۔"

"روز مارتا ہے لیکن کیوں؟" شکیلہ نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"بس جی باجی! بات صرف اتنی ہے کہ ادھر فیصل آباد میں میری ماں بیمار ہے۔ میں نے وہاں جانے کے لیے کرائے کے پیسے مانگے تو گالیاں نکالتا اور مجھے مارنے لگا۔"

"تم اپنی تنخواہ کے پیسوں سے چلی جاؤ نا۔" شکیلہ نے تجویز دی۔

سکینہ آنچل کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میری ساری تنخواہ وہ لے لیتا ہے۔ میں تو اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی۔"

شکیلہ کو سکینہ پر بڑا ترس آیا۔ اس نے اپنے بیگ سے کچھ پیسے اسے نکال کر دیے اور دفتر سے کچھ دن کی چھٹی بھی لے کر دی۔ سکینہ اسے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی اور پندرہ دن ماں کے پاس رہ کر واپس آ گئی۔

کئی ماہ گزر گئے۔ ایک دن شکیلہ شام کے وقت آفس سے نکل کر خارجی راستے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رک گئی۔ سکینہ اور دفتر کی ایک دوسری ملازمہ باتیں کر رہی تھیں۔ شکیلہ قدرے تاریکی میں کھڑی ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"شکیلہ نے شادی کیوں نہیں کی؟" سکینہ کے ساتھ کام

کرتی۔
"سیما اکیلی کیوں آتی ہے دفتر، اسے کوئی چھوڑنے کیوں نہیں آتا؟ کوئی بھائی بند نہیں ہے کیا؟" ملازمہ نے دوسرا سوال کیا۔
"تو بیٹا! اکیلی کو کیا ہوتا ہے۔" سکینہ نے کہا۔ "بہت بڑی افسر لگی ہوئی ہے۔ میں پھرتے ہیں آگے پیچھے۔ اکیلی کہاں سے ہو گئی۔ مجھے ایک چھوڑ کر دوسرا پکڑ لے۔ کوئی تمہارے میرے جیسی تھوڑی ہے کہ اپنے بندے سے مار کھائے اور ان کے بچے بھی پالتی رہے۔"
"شکل تو نہیں ہے اس کی۔" ملازمہ کو یقین نہ آیا۔
"ایسی لڑکیاں نقصان میں نہیں رہتیں۔" سکینہ بولی۔ "ایک باس چھوڑ کر دوسرے کو اپنے بس میں کر لیں۔ نہ باسوں کی کمی ہوتی ہے نہ نوکریوں کی۔ مجھے تو لگتا ہے نوکری بھی ایسے ہی ملی ہوگی۔ ان کو تو نوکری بھی مسکرانے پر مل جاتی ہے۔ بات تو ہم جیسوں کی ہے۔"
"نہ بھئی اب ہمیں نہ ملائے ایسی نوکری۔" ملازمہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔
"شوہر چاہے صبح شام مارتا رہے پر آدمی تو اپنا ہے۔"
شکیلہ کو احساس ہوا ان کی سوچ اور حالات بدلنے کے باوجود لوگوں کی سوچ وہی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ دھتکاری ہوئی عورت ___!
وہ کئی دن اداس رہی۔ ایسے کئی پل تھے جنہیں بار بار کوشش کے بھی وہ بھلا نہیں پائی۔ جب بستر پر لیٹتی تو لوگوں کی باتوں کی بازگشت اس کی سماعتوں کو مجروح کرتی۔
اس کی ہر سوچ کے آگے بے بسی سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہو جاتی۔
اس نے تو ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ بھی عام لڑکیوں جیسی بے فکری کی زندگی بیتے گی۔ سیدھا سادہ سا ایک پیار کرنے والا شوہر ہوگا جس کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزر جائے گی لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ حالات اس کی مٹھی سے ریت کے ذروں کی طرح نکل گئے۔
"یہ دنیا بھی کیا چیز ہے۔" وہ افسردگی سے سوچتی اور شادی تو جیسے معاشرے میں رہنے کا سرٹیفکیٹ تھی۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ شادی سے پہلے لوگ آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ کر خوش ہوتے ہیں اور شادی کے بعد بیتے لمحوں کو یاد کر کے روتے ہیں۔

چلتی رہتی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسے جیسے ہی عارضے کی اطلاع ملی تو وہ سب کام چھوڑ کر گھر کی طرف بھاگی۔ ابو بہت کمزور ہو گئے تھے۔ شکیلہ نے ان کی حالت دیکھی تو رو پڑی۔
"شکیلہ بیٹی! تمہاری ماں تمہارے گھر بسنے کا ارمان لیے منوں مٹی تلے جا سوئی اور اب میں بھی ___" ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔
"نہیں ابو ایسا مت کہیں۔" وہ ابو کے سینے پر سر رکھ کر کافی دیر روتی رہی۔
"بیٹی میرے دوست کا بیٹا انگلینڈ سے پاکستان آیا ہوا ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے رشتے کی بات کروں؟" ابو نے جیسے آخری خواہش کا اظہار کیا۔ شکیلہ چپ بیٹھی رہی۔
"اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔" ابو نے کہا۔ "وہ لوگ بہو، بیٹیوں، بیویوں کی عزت کرتے ہیں۔ راشد تمہیں دانش کی طرح ہرگز دکھ نہیں دے گا۔"
"جیسا دل میں آئے کریں ابو۔" شکیلہ زبردستی مسکرائی۔ وہ ماں کا دکھ بھولی نہیں تھی۔ اب باپ کی بیماری نے اسے سرتاپا لاچار کر دیا تھا۔ وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی کہ کل کو لوگ اسے باپ کا بھی قاتل کہیں۔
اس وقت شکیلہ کے لیے وقت رک گیا تھا جب اس نے راشد کو دیکھا۔ وہ بولی کچھ نہیں تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ شرمائی تھی اور پہلی بار اس کے اندر کی عورت بیدار ہوئی تھی۔ پھر اس کا دل مل گیا۔ اس کے خیالات بدل گئے۔ اس کی زندگی میں کلیاں کھل گئی تھیں۔ اداسیاں خواب و خیال بن گئیں۔ شادی کے بعد راشد اسے اپنے ساتھ انگلینڈ لے آیا تھا۔
راشد میں سب کچھ انوکھا تھا۔ نہ زیادہ بولنا، نہ زیادہ عام مردوں کی طرح ہر وقت حکم دیتے رہنا۔ وہ منتظر رہتی کہ راشد اسے کسی کام کے لیے کہے۔ اس کے ساتھ کبھی خفا ہو جائے اور وہ اسے منائے لیکن اس کا تو خمیر ہی کسی اور مٹی سے اٹھا تھا۔ شکیلہ اس کی عادات پسند ناپسند جان گئی تھی۔ اس کے کچھ کہے بغیر ہی اس کے تمام کام کر دیتی تھی۔ راشد کے علم میں لائے بغیر وہ ڈھیر ساری چیزیں پاکستان میں اس کے بہن بھائیوں کے پاس بھیجتی رہتی تھی۔
راشد نے اپنی کمائی سے دو بہنوں کی پاکستان میں شادی کر دی تھی۔ چھوٹے بھائیوں کو پڑھا رہا تھا اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے وہ گھر والوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ شکیلہ نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے راشد کی ایک عادت بڑی پسند

تھی۔ وہ کبھی کسی کو جواب نہیں کرتا تھا۔
کام کے وقت شکیلہ کی پیشانی پر پسینہ بھی اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھلا وہ اپنی قسمت پر نازاں کیوں نہ ہوتی۔
آج وہ راشد کی الماری میں کسی لڑکی کی تصویر دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ جیسے اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس کا ہے۔ صرف اس کا۔
رات کو جب وہ گھر آیا تو شکیلہ کے چہرے پر عجیب سی شرارت تھی۔ راشد نے لباس تبدیل کیا اور کھانا کھا کر حسب عادت کتاب پڑھنے لگا۔ شکیلہ نے چائے بنا کر کپ بیڈ کے ساتھ رکھی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ راشد نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔
"میں نے آپ کے کپڑے دھو کر الماری میں رکھ دیے ہیں کہ کہیں آپ خود نہ دھونے بیٹھ جائیں۔" شکیلہ کے لبوں پر شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ راشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"آپ بولتے کیوں نہیں؟" وہ اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔
"ہاں بولو۔" راشد نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔
"کیا بات ہے؟ بڑے اداس ہیں آج۔ کیا سیما یاد آرہی ہے؟" شکیلہ نے بدستور شرارت کے انداز میں کہا۔
راشد نے اچانک کتاب سے نظریں ہٹا کر شکیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر کتاب پڑھنے لگا۔
"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" شکیلہ پھر چہکی۔
"کیا جواب دوں ___؟" راشد نے آہستگی سے کہا۔
"سیما کی یاد آگئی کیا؟" اس نے راشد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔
"سیما ___ بھولی ہی کب تھی کہ یاد آئے گی۔" راشد نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔
"آپ کو یاد ہے وہ؟" شکیلہ نے پوچھا۔ "آپ نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا۔" خوش فہمی کا فانوس ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔
"میں نے کبھی تمہارے بارے میں تم سے پوچھا؟" وہ زیر لب مسکرایا۔
"میرے بارے میں تو آپ سب جانتے ہیں۔" شکیلہ کی آواز میں آنسوؤں کی کڑواہٹ گھل گئی لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔
"میرے بارے میں بھی تمہیں پتا تو ہے۔ مزید کیا جاننا چاہتی ہو؟" راشد نے چائے کا کپ اٹھا کر ایک سپ

لیتے ہوئے پوچھا۔
"یہ سیما کون تھی؟ کیوں چھوڑ دیا آپ نے؟ کیا قصور تھا اس کا؟ اس نے کسی اور سے شادی کر لی؟" شکیلہ نے ایک ہی سانس میں متعدد سوال کر دیے۔
"کسی نے کسی کو نہیں چھوڑا شکیلہ! زندگی کی کچھ مجبوریوں کا عذر تھا۔ مجھے انگلینڈ آنا پڑا۔"
"مجبوریاں ___ کیسی مجبوریاں؟" شکیلہ کو حیرت ہوئی۔
"مسائل کے انبار میں دب گیا تھا میں اور وہ کسی خیال کی طرح وہیں رہ گئی۔ ایک مڈل کلاس فیملی میں، میں کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھوم رہا تھا۔" راشد نے کہا۔ "بہنوں کی شادیاں کیں، بھائیوں کو پڑھایا۔ مکان بنوایا، تمہارے سامنے کتنے کام کیے انگلینڈ آنے کے بعد۔ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ سرکاری ملازمت مل جاتی یا کسی پرائیویٹ فرم میں لگ جاتا۔ اس سے دو وقت کی روٹی تو مل جاتی لیکن دیگر مسائل تلوار کی طرح سر پر لٹکتے رہتے۔ پھر والد صاحب کب تک کام کرتے۔" راشد نے پہلی بار اپنی زندگی کے کچھ گوشوں سے پردہ سرکایا۔
"اس کا مطلب ہے آپ کو انگلینڈ پسند نہیں ہے۔ ایسے ہی مجبوری میں آپ یہاں رہ رہے ہیں؟" شکیلہ کو راشد کی باتیں ان کرد چھو گئی تھیں۔
"مجبوریاں ہی تو مارتی ہیں شکیلہ! ورنہ کون کسی دھتکاری ہوئی عورت سے شادی کرتا ہے۔" راشد نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"دھتکاری ہوئی عورت۔ کیا مطلب دھتکاری ہوئی عورت؟" شکیلہ نے اٹھ کر حیرانی سے پوچھا۔
"ہاں چھوڑی ہوئی، سیکنڈ ہینڈ سامان جیسی ___ استعمال شدہ چیز، جسے صرف سمجھوتا کرتے ہوئے بحالت مجبوری قبول کیا جا سکتا ہے۔" راشد نے چائے کا خالی کپ سائیڈ پر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔
"آپ کو محسوس ہوا ہے میرے بارے میں؟" شکیلہ کی آواز جیسے پاتال کی گہرائیوں میں سے آئی۔
"محسوس تو ہوا ہے۔ انسان ہوں میں بھی ___ ایک کمزور سا انسان۔" راشد نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔
شکیلہ کو یوں محسوس ہوا جیسے راشد نے اپنا سر نہیں کوئی بھاری پتھر اس کے دامن میں رکھ دیا ہو۔ ایک ایسا بھاری پتھر جس کا وزن راشد سے شادی کے بعد اسے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

قسط نمبر: 16

وقت

حسام بٹ

"موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دل ربا طویل داستان"

...باوجود بھی وقت ... کوئی شکل اور معاشرہ آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نواز دیتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا ہی ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی اسے ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لے۔۔۔ کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ تو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔





[illegible]

[illegible]

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس عورت نے جس طرح براہ راست میرا نام لے کر درخواست کی تھی، اس نے میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ اس وقت ہم جس نوعیت کے سنگین حالات میں گھرے ہوئے تھے اس میں مذکورہ عورت کا یہ عمل رگ و پے میں سنسنی دوڑا دینا تو رہا ایک طرف، دماغ کی چولیں ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ اسے میں ہرگز نہیں جانتا تھا۔ تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ میری شناسا کیسے ہو گئی؟ میں نے اس کی التجا پر توجہ دیے بغیر قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"کون علی....؟"

میں نے آنکھوں پر سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ ایک لمحے تک بڑی گہری اور تولنے والی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ "سوری بھائی! گھبراہٹ میں میرے منہ سے شوہر کا نام نکل گیا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کے شوہر کا نام علی ہے؟"

"میرے شوہر کا نام ریاض علی ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن میں انہیں 'علی' کہہ کر ہی مخاطب کرتی ہوں۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری!" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں نے پریشانی میں آپ کو 'علی' کہہ دیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" پینا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر اس عورت سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شائلہ ہے۔" اس نے بدستور میری جانب دیکھتے ہوئے پینا کے سوال کا جواب دیا۔

شائلہ درمیانی عمر کی ایک دلکش اور حسین عورت تھی تاہم اس وقت حواس باختگی نے اس کی دلکشی کو گہنا رکھا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں بے پناہ اضطراب اور تشویش دکھائی دی۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"شائلہ! آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟"

"ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟" پینا نے بھی اضافہ کیا۔

"میرا بچہ نہیں مل رہا...." وہ روہانسی ہو گئی۔

مجھے اس دکھیاری ماں پر بڑا ترس آیا۔ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کا بچہ مل جائے گا.... انشاء اللہ!"

پینا نے استفسار کیا۔ "تمہارا بچہ کہاں گم ہوا ہے؟"

"وہ ادھر ہی تو کھیل رہا تھا...." وہ ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی پھر متلاشی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے خود کلامی کی۔ "پتا نہیں، کاشف کہاں چلا گیا۔"

تھا۔ ساحل کے اس حصے میں لوگوں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار فیملیز موجود تھیں۔

"آپ کے بچے کی عمر کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کاشف پانچ سال کا ہے۔" اس نے بتایا۔

بینا نے قدرے برہمی سے سوال کیا۔ "تم نے اسے اکیلا کیسے چھوڑ دیا؟"

"ہم ماں بیٹا اکثر ادھر آتے رہتے ہیں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "لیکن پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔" اس نے ایک مرتبہ پھر بے چین انداز میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی پھر دہائی دینے والے انداز میں بولی۔ "ہائے میرا بچہ...!"

"آپ نے مجھ سے کہا... پلیز، میری مدد کرو۔" میں نے ایک نہایت ہی اہم اور برمحل سوال کیا۔ "بتائیں، اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"دراصل میں چاہ رہی تھی کہ... میرا مطلب ہے، اپنے شوہر ریاض کو کاشف کی گمشدگی کی اطلاع دینا چاہتی ہوں لیکن میرے موبائل میں بیلنس ختم ہوگیا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اگر آپ اپنے موبائل سے فون کرکے ریاض سے میری بات کروا دیں تو بہت احسان ہوگا۔"

"اوکے! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" بینا نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم مجھے اپنے شوہر کا نمبر بتاؤ۔ میں ابھی اس سے تمہاری بات کروا دیتی ہوں۔"

شائلہ کی درخواست جائز تھی لہٰذا بینا نے بھی موقع محل کی مناسبت سے متعاون ردعمل کا اظہار کیا تھا۔

"ٹھہریں، میں ابھی آپ کو ریاض کا نمبر بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور نمبر دیکھنے لگی۔

چند سیکنڈ کے بعد شائلہ نے اپنے شوہر کا کانٹیکٹ نمبر بینا کو بتا دیا۔ بینا نے اپنے سیل فون سے ریاض کا نمبر ملایا پھر دوسری جانب کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس دوران میں شائلہ متلاشی نگاہ سے اپنے گرد و نواح کو کھوج رہی تھی۔

رابطہ ہونے پر بینا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہیلو! ریاض صاحب بات کر رہے ہیں؟"

دوسری جانب سے یقیناً تصدیقی جواب دیا گیا ہوگا جبھی بینا نے کہا۔

"لیں... آپ اپنی وائف سے بات کریں۔"

پھر بینا نے اپنا سیل فون شائلہ کی طرف بڑھا دیا۔

شائلہ نے ... پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کاشف کی گمشدگی کا احوال اپنے شوہر ریاض علی کو سنانے لگی۔ دوسری جانب ریاض اس سے کیا کہہ رہا تھا وہ سب ہماری سماعت کی پہنچ میں نہیں تھا۔ لگ بھگ ایک منٹ کے بعد شائلہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

"آپ جلدی پہنچیں، میں بہت پریشان ہوں۔"

پھر وہ بینا کا سیل فون اسے واپس کرتے ہوئے تشکرانہ انداز میں بولی۔ "بہن! آپ کا بہت شکریہ۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔"

"آپ کے شوہر نے کیا کہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس، وہ ریاض چند منٹ میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔" وہ مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

"شائلہ! میری دعا ہے کہ کاشف جلد از جلد آپ کو مل جائے۔" میں نے صدق دل سے کہا۔

وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ "اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔"

"آمین...!" بینا نے کہا۔

ریاض سے بات ہو جانے کے بعد شائلہ کی پریشانی میں کافی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ کرے اس کا بچہ مل جائے۔ بے چاری بہت پریشان ہے۔"

"ظاہر ہے... یہ بات ہے ہی پریشانی والی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "چھوٹے بچوں کا معاملہ بڑا حساس ہوتا ہے۔ ذرا سی کوتاہی اور بے پروائی کوئی بڑی مصیبت کھڑی کرسکتی ہے۔"

ہم تھوڑی دیر تک شائلہ اور اس کے گم شدہ بچے کاشف کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے پھر سیل فون اسکینڈل زیر بحث آگیا۔

غروب آفتاب کے بعد ہم نے واپسی کی راہ لی کیونکہ اس وقت تک ساحل ویران ہو چکا تھا اور اس کا سبب تھا، ماہِ رمضان۔ عام دنوں میں یقیناً یہاں دیر تک چہل پہل رہتی ہوگی۔

"میرا خیال ہے، ڈنر کرکے ہی چلتے ہیں۔" بینا نے تجویز پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

"نیک خیال ہے۔" میں نے گردن کو تائیدی جنبش

دیتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھوک تو مجھے بھی کوئی خاص نہیں ہے۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔ "لیکن کھانا تو بہرحال کھانا ہے نا۔"

"چلو، کوئی لائٹ سی چیز لے لیتے ہیں۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

باہمی اتفاق کے بعد ہم ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں آبیٹھے۔ بینا نے کہا۔ "اس ریسٹورنٹ میں کوئی فیملی واش روم ہے۔"

"تم آرڈر کرو۔ میں واش روم کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"اپنے پرس میں سے پرفیوم والی بوتل بھی نکال کر مجھے دو۔" میں نے اس کی الجھن کو رفع کرتے ہوئے کہا۔ "تاکہ میں اس جرمن شیفرڈ کے اور اپنے بیچ میں دیوار برلن کھڑی کرسکوں۔"

"دیوارِ برلن تو کب کی گرائی جاچکی ہے۔" بینا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"دیواریں اٹھانے اور گرانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

بینا کی معنی خیزی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ "سوائے ایک دیوار کے...!"

"تم کون سی دیوار کی بات کررہی ہو...؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"وہی ایک دیوار جس کے گر جانے سے مستقبل قریب میں اسد علی اور زلیخا بھی کسی گول میز کانفرنس میں ایک دوسرے کے کان سے منہ لگائے سرگوشیاں کرسکتے ہیں۔" اس نے شرارت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے... آمین!" میں نے اس کے ہاتھ سے کولون والی بوتل لیتے ہوئے زندہ دلی سے کہا۔ "کیونکہ میں نے تو اب چٹا چھوڑ دیا ہے... بینا! تمہارا شکریہ۔"

اس نے مجھے پیار سے گھورنے پر اکتفا کیا۔ جواباً میں بھی مسکراتے ہوئے واش روم کی سمت بڑھ گیا۔

چائنیز ڈنر کے دوران میں ہمارے بیچ ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ اچانک مجھے نادیہ کا خیال آگیا۔ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "بینا! نعیم کی بیٹی نادیہ اور میری ... کی کوئی خیر خبر ہے؟"

"کیا نادیہ کی یاد آرہی ہے...؟" وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"اس کی یاد تو جب آئے گی نا جب وہ گئی ہوگی۔" میں نے بینا کی مدھ شالا آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "نادیہ اسلام آباد گئی لیکن اس کی یاد...!"

"اس کی یاد کیا؟" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولی۔

میں نے اپنے سینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ "نادیہ کی یاد یہاں کروٹیں بدل رہی ہے۔"

"بدتمیز کہیں کے۔" وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "سڑیل کہیں کی..."

"ایسا کرو مجھے بھول جاؤ... اور جو بھی کرنا ہے اسی کے ساتھ کرو۔" وہ نیم برہمی سے اپنا سیل فون میری جانب کھسکاتے ہوئے بولی۔ "اس میں نادیہ کا نمبر موجود ہے۔ تم خود اس کا حال چال معلوم کرلو۔"

"اس کا نمبر میرے سیل فون میں بھی فیڈ ہے اور مجھے زبانی بھی یاد ہے۔" میں نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں ریفرنس کا پاس کرنا جانتا ہوں۔ نادیہ سے بات ہوگی تو تمہارے ہی توسط سے ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔"

"اگر تمہاری بکواس ختم ہوچکی ہو تو گھر چلیں؟" وہ میٹھی ناراضی سے مستفسر ہوئی، پھر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"غصہ مجھ پر آرہا ہے تو معدے کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "کھانا جاری رکھو۔ میرا کیا ہے، چھیڑنا تو میری ہابی ہے۔"

"تمہاری ہابی گئی پانی میں، میں تمہاری باتوں سے اب چڑنے والی نہیں ہوں۔" وہ بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔"

"ویری گڈ...!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ شرما کر رہ گئی۔

☆☆☆

رات اپنا نصف سفر طے کرچکی تھی۔ میں دن کے ابتدائی حصے میں کم و بیش دس گھنٹے سو چکا تھا لہٰذا نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی لیکن بینا کو دن بھر سونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ گفتگو میں میرا ساتھ تو دے رہی تھی لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اضمحلال کا شکار ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"اگر تمہیں نیند آرہی ہے تو نادیہ والا بیڈ روم خالی ہے۔ تم وہاں جاکر آرام سے سوسکتی ہو۔"

"اور تم...؟" اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

جواب دیا۔

"کیا کرنے کا ارادہ ہے......؟"

"کچھ نہیں...... جب نیند آئے گی تو سو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تب تک حالات حاضرہ پر غور و فکر کروں گا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر ایک خمار آلود جمائی کا اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا سونے کے لیے میرا دوسرے بیڈ روم میں جانا ضروری ہے؟"

"یہ کوئی ایشو نہیں ہے۔ میں تو تمہارے آرام کے لیے کہہ رہا تھا۔"

"مجھے تمہاری قربت میں آرام ملتا ہے۔" وہ بوجھل آواز میں بولی۔ "میں تمہاری عادی ہو گئی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ادھر ہی سو جاتی ہوں۔"

"میں اعتراض کرنے والا بھلا کون ہوتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ تمہارا اپارٹمنٹ ہے۔ اس کی ہر چیز تمہاری ہے۔ اس کے جس حصے میں تمہارا دل چاہے، تم سو سکتی ہو۔"

وہ میرے نزدیک بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔ "لائٹ آف کرنے سے تمہاری سوچ بچار میں کوئی خلل تو واقع نہیں ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "غور و فکر کرنے کے لیے بصارت کی نہیں، بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے میں اٹھا اور بیڈ روم کی لائٹ آف کر دی پھر جینا کے پہلو میں نیم دراز ہو گیا۔

وہ میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے یہاں سونا ہے۔"

"او کے...... نو ایشو۔" میں نے کہا۔

"علی! تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا کہ یہ میرا اپارٹمنٹ ہے۔ اس کی ہر چیز میری ہے؟"

"ہاں...... اس میں کوئی شک نہیں۔" میں نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"تم بھی تو اس اپارٹمنٹ کے اندر ہی ہو۔" وہ مخمور لہجے میں بولی۔ "کیا تم میرے نہیں ہو......؟"

اس نے ایک نازک موقع پر ذہانت بھرا سوال کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "بے شک اس وقت میں بھی تمہارا ہی ہوں۔"

"صرف اس وقت نہیں، میں ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنا بنا کر رکھنا چاہتی ہوں۔" وہ جذبات سے لبریز آواز میں

"میں تمہارے وجود میں زندہ ہوں جینا۔" میں نے اس کی درخشندہ پیشانی پر ایک بھرپور بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ "اگلے لمحے میں کیا ہونا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ یہ صرف میرا مالک جانتا ہے لہٰذا میں تم سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا جو میرے بس میں نہ ہو۔ میں اپنے مالک کے سامنے بے اختیار ہوں۔"

"قدرت پر کسی کا اختیار نہیں چلتا علی۔" وہ کسمساتے ہوئے مخمور آواز میں بولی۔ "میں تو تمہارے وجود کی بات کر رہی ہوں۔ اپنے لمحات کا تو وعدہ کر سکتے ہو نا......"

"وعدہ!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "جس لمحے میں تمہیں میسر رہوں گا، تمہارے تصرف میں رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

سینے پر سر رکھے رکھے اس نے بڑی کاریگری کے ساتھ اپنے ایک بازو کو میری کمر کے پیچھے سے گزارا اور بڑے اعتماد سے گویا ہوئی۔ "ان شاء اللہ میں اس نوعیت کے وجود کی لائق رہوں گی۔"

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چپ چاپ لیٹا اس کے بدن کی ہیجان خیز تپش کو اپنے وجود میں جذب کرتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنی کمر پر سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ جینا میرے پیچھے دبے ہوئے، اپنے ہاتھ سے کسی پراسرار کارروائی میں مصروف تھی۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ کیا کر رہی ہو......؟"

"اس منحوس کی کرتوت چیک کر رہی ہوں۔" وہ بکھری ہوئی سانسوں کے ساتھ بولی۔

"کون منحوس؟" اس کے جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"وہی نامراد سپاہی جو تمہیں خنجر سے زخمی کر رہا تھا۔" وہ اپنی پراسرار کارروائی کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی ضروری ہے نا......"

وہ میری مذاق میں کہی ہوئی بات کو سچ سمجھ بیٹھی تھی۔ میں نے اسے چڑانے کے لیے لطیفہ کے حوالے سے ایک فیک واقعہ سنایا تھا۔ میں نے اپنے تشنہ لبوں کو جینا کے شگفتہ ہونٹوں میں پیوست کر دیا۔ اس نے چشم زدن میں دوسرا بازو میرے اوپر سے گزار کر مجھے اپنی بانہوں کی گرم جوش گرفت میں جکڑ لیا پھر میری پیاس بجھانے کے لیے اس نے باڑ پر آئی ہوئی ندی کا روپ دھار لیا۔ میں اس کے دھارے میں بے سمت بہتا چلا گیا۔

وقت گویا ایک جگہ تھم گیا تھا۔ حالات و واقعات کا پہیا ایک مقام پر پہنچ کر رک گیا تھا۔ صرف ہماری سانسیں چل رہی تھیں، رگوں میں لہو رواں تھا اور سینے میں دل دھڑک رہا تھا۔

شاید وقت یونہی ٹھہرا رہتا اور ہم وہاں سے گزر جاتے کہ بینا کے سیل فون کی گھنٹی نے ہمارے کیف و سرور کے کانچ کو کرچی کرچی... کر ڈالا۔

"اس وقت کس کی کال ہو سکتی ہے؟" وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

میں خود بھی متعجب ہوا تھا۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ بیڈ پر دراز ہونے سے پہلے ہم نے اپنے سیل فون کو سائیلنٹ موڈ پر سیٹ نہیں کیا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے، یہ دادی کی کال ہو..."

"اماں جیل!" وہ پوری قطعیت سے بولی۔ "یہ نمبر میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔" اس نے سیل فون کے اسکرین کو تکتے ہوئے کہا۔ "اجنبی نمبر..." وہ بڑبڑائی۔

اچانک میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ میں نے کہا۔ "یہ شائستہ کا فون ہوگا۔"

"کون شائستہ؟" اس نے پوچھا۔

"ارے یار... وہ پریشان حال عورت جس کا بچہ غبارہ خریدتے ہوئے گم ہوگیا تھا۔" میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔ "ممکن ہے، اس کا بچہ مل گیا ہو اور اس نے تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے کال کیا ہو۔ اس نے تمہارے سیل فون سے اپنے شوہر کو فون کیا تھا۔ اس طرح تمہارا نمبر اس کے شوہر کے پاس چلا گیا تھا۔"

"ہاں، یہ ممکن ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر مجھ سے پوچھا۔ "کیا میں کال اٹینڈ کروں؟"

اسی دوران میں وہ کال مسلسل آ رہی تھی۔ لگتا تھا، کالر نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد اسے ری ڈائل کے آپشن پر ڈال دیا تھا۔ بینا کے سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔

"کال اٹینڈ نہیں کرنا، فون مجھے دو۔"

اس نے اپنا سیل فون میری جانب بڑھا دیا۔ اسی وقت وہ کال آنا بند ہوگئی۔ شاید کالر مایوس ہوگیا تھا۔ اگر وہ مایوس نہیں بھی ہوا تو میں نے اس کی کال کو کاٹ کر پہلے یہ چیک کرنا تھا کہ یہ اسی مصیبت کی ماری عورت کا فون ہے یا نہیں۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا، وہ کر ڈالا اور پتا یہ چلا کہ یہ کوئی اور نمبر تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ ممکن ہے، یہ اسی پریشان حال عورت کا فون ہو کیونکہ اس کے فون میں اس وقت بیلنس نہیں تھا جبھی اس نے بینا سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اب جو بھی تھا، فون خاموش ہو چکا تھا۔

ادھر میں نے یہ سوچا، ادھر بینا کے نمبر پر دوبارہ وہ کال آنے لگی۔ اب اس کالر سے گفتگو ضروری ہوگیا تھا۔ میں نے کال کاٹ کر اسے ٹیکسٹ میسج کیا۔

"آپ کون؟"

فوراً اس کا جوابی میسج موصول ہوا۔ "تمہارا ایک خیرخواہ۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔" میں نے لکھا۔ "تم نے میرا نمبر کہاں سے حاصل کیا؟"

"تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس کا جواب آیا۔ "میں تمہارا ہمدرد خیرخواہ ہوں... تمہارا دوست ہوں۔ دوستوں کے نمبر حاصل کرنا کوئی مشکل تو نہیں ہوتا۔"

"تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" ہمارے درمیان باقاعدہ ٹیکسٹ چیٹنگ شروع ہوگئی۔ "جانتے ہو تو بتاؤ، میں کون ہوں؟"

"تمہارا نام اسد علی ہے۔" وہ مجھ پر ایٹم بم گراتے ہوئے بولا۔ "تم سرکاری کے یہاں آئے ہو۔ تمہارے پیچھے عیار لوگ اور خطرناک کتے لگے ہوئے ہیں۔ تم اپنی ایک دوست کے ساتھ اس وقت چاکیواڑہ کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ میں موجود ہو... اتنا کافی ہے یا کچھ اور بھی بتاؤں؟"

بینا بھی میرے ساتھ ہی یہ ٹیکسٹ میسج پڑھ رہی تھی۔ اس خدا کے بندے نے ہم دونوں کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک لفظ بھی غلط نہیں تھا لیکن میں جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ میں اپنے سائے پر بھی اعتبار نہ کروں۔ یہی بات میں نے ٹیکسٹ میسج کی صورت میں اسے بھیج دی۔

"تم جو کوئی بھی ہو، میں آنکھیں بند کر کے تم پر بھروسا نہیں کرسکتا۔"

"آنکھیں کھول کر مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

اس کے ہر ٹیکسٹ سے بلا کا اعتماد جھلکتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے لیکن میرے لیے حیرت اور تشویش کی بات یہ تھی کہ مجھے کراچی میں قدم رکھے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے پھر وہ میرے بارے میں اتنی گہری معلومات کیونکر رکھتا تھا؟ ایک لمحے کے لیے میرا دھیان تنظیم کی طرف بھی گیا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ تنظیم مجھ سے اس نوعیت کا مذاق نہیں کر سکتی تھی اور وہ بھی رات کے اس پہر اور پھر ہمارے بیچ ٹیکسٹ چیٹنگ بینا والے سیل فون پر ہو رہی تھی... اگر وہ

واقعتاً میرا دوست اور ہمدرد خیرخواہ تھا تو اس نے اپنے دعوے کے مطابق میرے بجائے بینا کا نمبر کیوں حاصل کیا تھا؟

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے اس نامعلوم مہربان کے ٹیکسٹ کا جوابی پیغام ان الفاظ میں کیا۔

"میں سارے کام آنکھیں کھول کر ہی کرتا ہوں۔ تمہارے سوال کا جواب تو اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب تم میری نظر کے سامنے... میرے روبرو موجود ہو گے۔"

پھر میں نے بینا سے کہا۔ "بینا، یہ کوئی دوست نہیں ہوسکتا۔ لگتا ہے، ہمارے ساتھ کوئی ہاتھ ہوگیا ہے اور اب... کوئی شدید نوعیت کا ہنگامہ برپا ہونے والا ہے۔"

"تم کس قسم کے ہاتھ کی بات کر رہے ہو؟" وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"شاید وہ عورت ہرگز پریشان نہیں تھی۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس نے اپنے بچے کی گمشدگی کا ڈراما رچا کر تمہاری ہمدردی حاصل کی اور تمہارے سیل فون سے اس نے کسی کو کال کی۔ اس طرح تمہارا نمبر اس بندے کے پاس پہنچ گیا جو مجھ سے خیرخواہی کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر تمہاری جان کو خطرہ ہے علی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اس قسم کی ڈرامے بازی کوئی دوست نہیں کرسکتا۔" بات کے اختتام پر اس نے اپنا پرس اٹھایا اور اس کے اندر کچھ تلاش کرنے لگی۔

اسی وقت سیل فون کے اسکرین پر اس بندے کا ٹیکسٹ ابھرا۔ "اگر میرے دوست کی یہی خواہش ہے تو میں پانچ منٹ میں تمہارے سامنے ظاہر ہو جاتا ہوں۔"

"یہ تمہارے لیے ممکن نہیں ہوگا۔" میں نے لکھا۔ "کیونکہ میرے بارے میں لگائے گئے تمہارے سارے اندازے درست نہیں ہیں۔ تم کسی بھی طرح پانچ منٹ میں میرے پاس نہیں پہنچ سکتے۔"

"میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے اسد علی!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ "ہاں واوے، تمہارے خیال میں، میرا کون سا اندازہ درست نہیں ہے؟"

بینا پرس میں سے چیونگم کی ٹکیاں نکال کر میری جانب بڑھایا کرتی تھی، اب کی بار اس نے پرس کے اندر سے ایک خوب صورت سلم ماڈل گن نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسے تم اپنے پاس رکھو... یہ پوری طرح لوڈ ہے۔ میں نے بھی حالات کی سنگینی کو محسوس کر لیا ہے۔"

بات کے اختتام پر وہ الماری کی سمت بڑھ گئی۔

"تمہارے بیان کے مطابق میں اس وقت کراچی میں ساحل سمندر پر واقع ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں اپنی ایک دوست کے ساتھ قیام پذیر ہوں۔" میں نے اس نامعلوم شخص کے استفسار کے جواب میں لکھ دیا۔ "تمہارا یہ اندازہ سراسر غلط ہے کیونکہ میں اس وقت اسلام آباد میں ہوں۔ کراچی کو خیرباد کہے تو کئی گھنٹے گزر گئے۔"

"تم جس شیرزوز کو الّو بنا سکتے ہو لیکن مجھے نہیں۔" اس کے ٹیکسٹ سے سنجیدگی جھلک رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، بینا گھبرائی ہوئی بیڈروم کے اندر داخل ہوئی پھر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "علی! میں نے گیلری کے ایک کونے سے جھانک کر نیچے دیکھا ہے۔ بلڈنگ کے گیٹ پر ایک پولیس موبائل کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو ایجنسی کی گاڑیاں بھی موجود ہیں۔"

"ایجنسی کی گاڑیوں کی موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔" میں نے بستر چھوڑتے ہوئے ریڈ الرٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن پولیس موبائل کی آمد تشویش ناک ہے۔ لگتا ہے، ڈی ایس پی سکندر کی مراد بر آئی ہے۔"

پھر میں نے ٹیکسٹ کا جواب کر دیا۔ "اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو تم پھر بیٹی کی منت کر کے اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاؤ اور پانچ منٹ میں کراچی سے اسلام آباد آ جاؤ۔ پھر ملتے ہیں۔"

"اگر ڈی ایس پی سکندر نے دھاوا بولا ہوتا تو جس شیرزوز والا بھی اس کے ساتھ ہوتی۔" بینا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔"

"میرا ذہن تو انٹرپول کی طرف جا رہا ہے۔" میں نے بینا کے دیے ہوئے پستول کا میگزین چیک کرتے ہوئے کہا۔ "ٹیکسٹ میسج کرنے والے کی معلومات صد فیصد درست ہیں۔ ہمارے پاس صرف چار منٹ ہیں۔ ایکشن کے لیے ریڈی ہو جاؤ... اس نے میرا پاسپورٹ ٹریک کر لیا ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کرسکتی۔" بینا پورے یقین سے بولی۔

بینا کے لہجے میں موجود بے پناہ اعتماد نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "وہ ایسا کیوں نہیں کرسکتی؟"

"کیونکہ میں نے تمہارا پاسپورٹ لاک کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔

"میں نے ۔۔۔" وہ میری جانب انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "تمہارے پاسپورٹ کو ۔۔۔ جلا کر ۔۔۔ اس کی راکھ کو ۔۔۔ فلش میں بہا دیا تھا ۔۔۔ اور وہ مائیکرو چپ سمیت ۔۔۔"

"لعنت ۔۔۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟" میری حیرت میں غصے کی آمیزش تھی۔

"تاکہ وہ انسانی شکل والی کتیا، منحوس چڑیل ڈیلفینا تم تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ اس کے انداز سے دیوانگی ٹپک رہی تھی۔ "میں تمہارے تحفظ کی خاطر ایک پاسپورٹ تو کیا، پوری دنیا کو بھی آگ لگا سکتی ہوں۔"

اس کے الفاظ کی سچائی نے میرے اندر دہلا کر رکھ دیا۔ ان لمحات میں بینا ایک بپھری ہوئی شیرنی دکھائی دے رہی تھی جو میری حفاظت کی خاطر موت سے بھی ٹکرانے کا عزم رکھتی تھی۔ وہ ایسا سوچ رہی تھی کہ میں اس کی "کارروائی" پر کوئی لمبی چوڑی بحث چھیڑ کر بیٹھ جاتا۔ اس نے جو بھی کیا تھا، میری محبت میں کیا تھا اور اس کی جاں نثاری کے بارے میں جی ایم سر نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میں حیرت اور دلچسپی سے بینا کو دیکھ ہی رہا تھا کہ بینا والے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔ میں پچھلے چند منٹ سے اسی فون پر دوستی کے دعوے دار اس پراسرار اجنبی سے ٹیکسٹ چیٹ کر رہا تھا۔

"میں تمہارا دوست ہوں اور دوست ہی رہوں گا۔" اس کا ٹیکسٹ موصول ہوا۔ "اگرچہ میں تمہارے دشمنوں کے اندر چھپا ہوا ہوں۔ تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ فوراً سے پیشتر اپارٹمنٹ چھوڑ دو ۔۔۔"

"اس اپارٹمنٹ میں کوئی ایمرجنسی ایگزٹ ہے؟" میں نے بینا سے سوال کیا۔

"نہیں!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اپارٹمنٹ میں انٹری اینڈ ایگزٹ کے لیے بس یہی ایک مین ڈور ہے۔"

"بلڈنگ کا انٹرکام سسٹم کام کر رہا ہے؟" میں نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔

"ابھی چیک کر کے بتاتی ہوں ۔۔۔" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

"ٹیم ارائیوڈ ۔۔۔" میرے خیر خواہ نے ٹیکسٹ کے ذریعے مجھے اطلاع دی۔ ۔۔۔

اسی لمحے بینا گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور سراسیمہ لہجے میں بتایا۔ "بلڈنگ کا انٹرکام سسٹم ڈیڈ پڑا ہے۔"

"اوہ ۔۔۔" میں نے تشویش بھرے انداز میں ایک گہری سانس خارج کی۔ "انٹرکام سسٹم ڈیڈ، نو ایمرجنسی ایگزٹ اینڈ ٹیم ارائیوڈ۔"

"ٹیم ارائیوڈ؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

دوستی کے دعوے دار اس شخص کا آخری ٹیکسٹ بینا کی نظر سے نہیں گزرا تھا اسی لیے اس کی آنکھوں میں "ٹیم ارائیوڈ" کے حوالے سے متعدد سوالات سر اٹھائے کھڑے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پوری بلڈنگ کا انٹرکام سسٹم ڈیڈ نہیں ہوگا۔ یہ امتیازی سلوک صرف بینا والے اپارٹمنٹ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ میں نے بینا کے استفسار کا جواب دینا ضروری نہیں جانا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہم اس وقت اپارٹمنٹ بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر ہیں۔ اس سے اوپر اور کتنے فلور ہیں؟"

"تین!" اس نے جواب دیا۔ "یہ گیارہ فلورز کی رہائشی عمارت ہے۔"

"اور لفٹس؟"

"دو لفٹس ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ایک یہی جس سے ہم اوپر نیچے آتے جاتے ہیں اور دوسری بلڈنگ کے دوسرے حصے میں ہے۔"

"تم اپنا سیل فون میرے پاس چھوڑ دو اور میرا فون تم لے جاؤ۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنا بچاؤ کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔"

وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں کہاں چلی جاؤں؟"

"تم اپنے اپارٹمنٹ سے نکل کر زینوں کے ذریعے ٹاپ فلور پر چلی جاؤ۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "پھر راہداری سے گزرتے ہوئے تم بلڈنگ کے اس حصے میں پہنچ جاؤ گی جہاں دوسری لفٹ ہے۔ تم ادھر گیلری میں کھڑے ہو کر میری کال کا انتظار کرو گی۔ میں اس مصیبت سے نمٹنے کے بعد تم سے رابطہ کروں گا۔" پھر میں نے گن اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ "یہ تم اپنے پاس رکھو۔"

"ہرگز نہیں!" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اٹل لہجے میں بولی۔ "ہمارا جینا اور مرنا ایک ساتھ ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ تمہاری طرف آنے والی

گولی میرے سینے سے گزرنے کے بعد ہی تم تک پہنچ پائے گی ۔۔۔"

بینا کا انداز اس قدر حتمی اور فیصلہ کن تھا کہ جی ایم سر کے الفاظ میری سماعت میں تازہ ہو گئے۔ "آپ کے ساتھ جو میڈم آئی ہیں۔" انہوں نے بینا کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔ "انہیں آپ کے ساتھ وہی کچھ ہو گیا ہے جو آپ کو اپنی گزشتہ دوست کے ساتھ ہو چکا ہے۔ محبت کرنے والے لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ کسی کی خاطر جان دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔"

جی ایم سر کے الفاظ سونے کے قلم سے لکھے جانے کے قابل تھے۔ ان نازک لمحات میں بینا کا عزم اس امر کا بین ثبوت تھا۔ وہ جاں نثاری کی آخری منازل کو چھونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے اس سے کوئی بحث نہیں کی اور آنکھیں بند کر کے جی ایم سر کی اس ہدایت پر عمل کرنے لگا۔

"آپ جب بھی کسی ہنگامی صورت حال سے دوچار ہوں تو اپنے ماحول اور سچویشن کو فیل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو موقع محل کی مناسبت سے فوراً جواب مل جائے گا۔"

پانچ سیکنڈ کے اندر ایک خاکہ تو نکل آئی۔ میں نے محسوس کیا، دو مسلح افراد ایک نوعمر بچے کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر آٹھویں فلور کی طرف آ رہے ہیں۔ میرے محسوسات نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ تینوں افراد ہمارے دشمن ہیں اور ان کی منزل بینا کا اپارٹمنٹ ہی ہے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور بینا کو ہاتھ سے پکڑ کر اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ لفٹ اور گراؤنڈ سے آٹھویں فلور تک پہنچنے میں چند سیکنڈ ہی لگنا تھے۔ اسی قلیل مدت میں، میں نے آنے والوں کے استقبال کا بندوبست کر لیا۔ میں نے سلم ماڈل گن بینا کو تھماتے ہوئے اسے ایک ایسی جگہ پر کھڑا کر دیا جہاں سے وہ بہ آسانی آنے والوں سے مقابلہ کر سکتی تھی لیکن وہ چوبی داخلی دروازے کے فریم سے لگ بھگ آٹھ انچ دور دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ یہ دیوار کا وہ حصہ تھا جدھر سے دروازہ کھلتا تھا۔

"ابھی اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجے گی۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تم نے ردعمل ظاہر کرنے میں اتنا وقت لگانا ہے کہ محسوس ہو، گھنٹی کی آواز پر تم بیڈ روم سے نکل کر داخلی دروازے تک پہنچی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو؟"

"سمجھ گئی۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی پھر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "اور تم ۔۔۔؟"

"میں بھی تمہارے نزدیک ہی موجود ہوں گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کسی بھی قیمت پر تم نے دروازہ نہیں کھولنا اور غلطی سے بھی آئی گلاس کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کرنا کہ باہر کون کھڑا ہے ۔۔۔ اوکے؟"

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر بولی۔ "اوکے!"

"گن کو پرس میں رکھنے کا مطلب ہے تم اسے چلانا بھی جانتی ہو۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "لیکن اگر حالات ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں تو تم اپنی حفاظت کی خاطر اس گن کو بے دریغ استعمال کر سکتی ہو۔"

"تم فکر نہ کرو۔ ایسا ہی ہوگا۔" وہ گن کو ریڈی موڈ پر لاتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔

بینا نے جتنے اعتماد کے ساتھ این پی تھری فور سلم ماڈل نائن ایم ایم پسٹل کو کاک کیا تھا، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے اگر اپنی حفاظت کے پیش نظر اس گن کو اپنے پرس میں رکھا ہوا تھا تو ضرورت پڑنے پر وہ اس کے استعمال میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گی اور نہ ہی کوئی کوتاہی برتے گی۔ بینا کو ہدایات دینے کے دوران میں، میں کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسٹور روم سے ایلومینیم کی فولڈنگ گھوڑی (سیڑھی) بھی اٹھا لایا تھا۔ اس فولڈنگ سیڑھی کی اونچائی آٹھ فٹ تھی۔ گزشتہ روز میں نے مذکورہ سیڑھی اسٹور روم میں پڑی دیکھی تھی۔

میں نے سیڑھی کو کھول کر اردو کے ہندسے آٹھ کی شکل میں بے آہستگی ایک دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ یہ وہی دیوار تھی جس پر الیکٹرک بورڈ لگا ہوا تھا۔ اگر دروازہ کھولا جاتا تو وہ آ کر اسی دیوار کے ساتھ لگتا لیکن دروازہ کھلنے کی صورت میں فولڈنگ سیڑھی دروازے کے پیچھے چھپ جاتی۔ میں چونکہ سیڑھی کی ٹاپ پر نشست جمانا چاہتا تھا اس لیے دروازے سے اندر داخل ہونے والے کسی شخص کی نگاہ میں فوری طور پر نہیں آ سکتا تھا اور جب تک اس کا دھیان میری طرف آتا، میں اپنا کام کر چکا ہوتا۔

میں ایلومینیم کی فولڈنگ سیڑھی کے بالائی حصے پر ہر نوعیت کے سنگین ایکشن کے لیے ایک دم تیار تھا کہ اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بج اٹھی۔

میری فیل کے مطابق دو مسلح افراد ایک نوعمر بچے کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر ہمارے اپارٹمنٹ کی طرف آئے تھے۔ میں نے سانس روک لی اور آنکھوں کے اشارے سے بینا کو حرکت میں آنے کا سگنل دے دیا۔ دس سیکنڈ کے بعد دوبارہ گھنٹی بجی۔ بینا نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے بھرائی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

اس نے ظاہر بھی کیا تھا۔ پیچھے وہ بیڈ سے اٹھ کر داخلی دروازے تک پہنچی ہوتا ہم اس نے اپنی آواز کو قدرے بلند رکھا تھا۔ بینا کے سوال کے جواب میں باہر ایک بچے کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

”آنٹی! میں عدنان ہوں..... پلیز دروازہ کھولیں.....“

بینا نے ایک لمحے کے لیے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا پھر باہر موجود بچے سے پوچھا۔ ”کون عدنان؟“

”آنٹی..... ہم آپ کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔“ عدنان نام بتانے والے اس بچے نے فریادی لہجے میں کہا۔ ”ڈیڈی اس وقت گھر میں موجود نہیں ہیں اور ہمارے کچن میں آگ لگ گئی ہے۔ ممی کی جان خطرے میں ہے۔ پلیز..... آپ ہماری مدد کریں۔“

بینا نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”بیٹے! تم نیچے جا کر سیکیورٹی گارڈ کو اطلاع کرو۔“ بینا نے عدنان نامی اس لڑکے سے کہا۔ ”وہی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“

بینا کے چپتے جواب کے بعد اس لڑکے نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ایک لمحے کے لیے باہر کوریڈور میں خاموشی چھا گئی۔ اگلے ہی لمحے مخصوص ”ٹھک“ کی آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کے وسط میں نصب آئی گلاس کے مقام پر ایک خوف ناک سوراخ ہو گیا۔

دروازے کے باہر سے سائلنسر لگی گن کی مدد سے آئی گلاس پر فائر کیا گیا تھا۔ فائر کرنے والے کو یقین تھا کہ بینا اپارٹمنٹ کے اندر آئی گلاس سے آنکھ لگائے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ میری ہدایت کے سبب بینا محفوظ رہی تھی ورنہ اس وقت وہ اپنی ایک آنکھ سے محروم ہو چکی ہوتی اور عین ممکن تھا کہ بے آواز گولی اس کی آنکھ کے راستے سے گزر کر سیدھی اس کے دماغ میں جا گھستی اور اس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیتی۔

فائر کرنے والے نے محض آئی گلاس کو اڑانے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ اس کا اگلا نشانہ دروازے کا لاک تھا۔ آنے والے ہر قیمت پر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے اور ان کا مطلوب شخص میں تھا۔ اب اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ بالآخر دشمنوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا تھا۔ آگے بڑی کارروائی اسی کے ایما پر کی جا رہی تھی۔ اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ وہ لوگ میری جان نہیں

دروازے کے لاک پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے گئے اور یہ دونوں گولیاں سائلنسر لگی گن سے چلائی گئی تھیں۔ نتیجے کے طور پر لاک کا کباڑا ہو گیا۔ اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ سٹنگ روم میں کھلتا تھا۔ میں نے بینا کو اشارہ کیا کہ وہ ایک صوفے کے پیچھے پناہ لے لے۔ اس نے فوراً سے پیشتر میری خاموش ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دو اسٹیپ نیچے اتر کر الیکٹرک ڈسٹری بیوشن بورڈ میں موجود مین سوئچ کو آف کر دیا۔

اپارٹمنٹ کے اندر ایک دم تاریکی چھا گئی۔ اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دو گن بردار افراد اپارٹمنٹ کے اندر گھس آئے۔ کوریڈور میں لگے بلب کی روشنی اپارٹمنٹ کے اندر بھی پہنچ رہی تھی لہٰذا وہ مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے تاہم روشنی سے اندھیرے میں آنے کے بعد وہ بوکھلا گئے تھے۔ بینا صوفے کے پیچھے پوزیشن لے چکی تھی اور میں فولڈنگ سیڑھی کے وسط میں دروازے کے پیچھے موجود تھا۔ اگر سٹنگ روم کی لائٹ آن بھی ہوتی تو تب بھی آنے والے فوری طور پر ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔

وہ دونوں تھوڑا فاصلہ رکھ کر محتاط قدموں سے بیڈروم کی سمت بڑھنے لگے۔ انہیں کسی کارروائی کی مہلت دینا عقل مندی نہیں تھی۔ میں نے لات مار کر دروازہ بند کیا اور ایلومینیم کی فولڈنگ سیڑھی کو اٹھا کر ان پر حملہ آور ہوا۔

میں نے ان کی پوزیشن کو ذہن نشین کر لیا تھا لہٰذا دروازہ بند ہو جانے کے بعد بھی میں اندھیرے میں ان کی لوکیشن سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ میں نے سیڑھی کو فضا میں ہیلی کاپٹر کے پنکھے کے مانند حرکت دے کر ان پر وار کر دیا۔ وہ اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد سے نروس ہو گئے اور انہوں نے بے دریغ مجھ پر فائرنگ کر دی۔ ان کی گن پر چونکہ سائلنسر لگے ہوئے تھے لہٰذا سٹنگ روم کی فضا میں محض ”ٹھک ٹھک“ کی آوازیں ابھریں اور اس ٹھک ٹھک کے اختتام پر فائرنگ کرنے والے دونوں افراد کے حلق سے تکلیف دہ چیخیں برآمد ہوئیں۔ میں ان کی خاموش گولیوں کی زد میں نہیں آیا تھا کیونکہ ان پر سیڑھی کا وار کرنے کے بعد میں نے جھٹ فرش پر لوٹ لگا دی تھی اور رولنگ کرتے ہوئے ان کے بہت قریب پہنچ گیا تھا لیکن وہ میرے وار کی زد میں آ گئے تھے اسی لیے اذیت ناک انداز میں چلائے تھے۔

میں نے پھر انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ایلومینیم کی سیڑھی کے خوف ناک وار نے انہیں گن سے محروم کر دیا تھا۔

ان کے ہاتھ پاؤں کا ... شروع کر دی۔ اسی دوران میں بینا نے صوفے کے پیچھے سے نکل کر مین سوئچ کو آن کر دیا تھا۔ اپارٹمنٹ کے سٹنگ روم میں روشنی ہوئی تو وہاں کا ماحول مجھ پر آشکار ہو گیا۔ بینا حملہ آوروں کی ایک گن کے نشانے پر دروازے کے ایک جانب کھڑی تھی۔ وہ دونوں بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ میرے لات گھونسے نے ان کی ناک اور منہ سے خون جاری کر دیا تھا۔ وہ نفرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی گن میرے قدموں میں پڑی تھیں۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے مذکورہ گن کو بینا کے نزدیک پہنچا دیا پھر ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے خون خوار لہجے میں استفسار کیا۔

”کون ہو تم..... تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

انہوں نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ مشکوک انداز میں اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کسی کی آمد کی توقع کر رہے تھے۔ یقیناً ان کے پیچھے ٹیم کے دوسرے افراد بھی موجود ہوں گے۔ میں ایسا احمق نہیں تھا کہ میں ان دو کے ساتھ ”کبڈی، کبڈی“ کھیل کر ان کے مددگاروں کی آمد کا انتظار کرتا اور انہیں خود پر حاوی ہونے کی سہولت فراہم کرتا۔ میں نے بینا کے قریب پہنچ کر فرش پر سے سائلنسر لگی ایک گن کو اٹھایا پھر ”ٹھک ٹھک“ کی یکے بعد دیگرے آوازوں کے ساتھ ان دونوں کے گھٹنوں کا ستیاناس مار دیا۔ وہ چلاتے اور کراہتے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔ میں نے انہیں ایسی حالت میں پہنچا دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر ہمارا تعاقب نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے گن کو ادھر ہی پھینکا اور بینا سے کہا۔

”ہمارے پاس چند سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اپارٹمنٹ سے جو بھی اٹھانا ہے، اپنے پرس میں رکھ لو۔ ہم فوراً یہاں سے نکل رہے ہیں۔ اگر ان کے ساتھی یہاں پہنچ گئے تو کوئی ہماری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکے گا۔“

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور میرے ساتھ بیڈروم کی جانب بڑھ گئی لیکن ہمیں بیڈروم کے اندر داخل ہونے کا موقع نہیں ملا۔ ہم بیڈروم کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ کوریڈور میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ یقیناً وہ ان دونوں کے ساتھی تھے۔ اگلے ہی لمحے میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

”سفیان..... زوبی.....“ کسی نے بآواز بلند پکارا۔

... نے جواب نہیں دیا تو ہم دروازہ توڑ کر اندر آ جائیں گے۔“

وہ جس دروازے کو توڑنے کی بات کر رہے تھے، وہ بے چارہ تو پہلے ہی زخم خوردہ اور ستم رسیدہ تھا۔ یقیناً سفیان اور زوبی ہی وہ دونوں افراد تھے جنہیں میں نے زمین پر لٹا دیا تھا..... بلکہ لٹا دینے کے مرحلے سے کئی قدم آگے گزر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ درد کی شدت نے ان کے ہوش و حواس چھین کر انہیں ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ باہر موجود اپنے ساتھیوں کی آواز پر لبیک کہنے کی حالت میں نہیں تھے۔ یہ بہت ہی واہیات اور خطرناک صورت حال تھی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اندر والوں کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر باہر والے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ کسی بھی گن نے اپنا دہانہ کھول دیا تھا۔ خوف ناک گرج کے ساتھ گولیاں چوبی دروازے کو چھید کر سٹنگ روم میں پہنچنے لگیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ ان نازک لمحات میں ہم دروازے کے سامنے یعنی فائرنگ رینج میں نہیں تھے ورنہ دروازے کی تقلید میں ہمارے جسم بھی چھلنی ہو چکے ہوتے۔

اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے میں لاتعداد سوراخ نمودار ہو چکے تھے۔ میں نے تشویش بھری نظر سے بینا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خوف زدہ انداز میں مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ہمارے پاس کھونے اور بچنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ بینا نے سراسیمہ نگاہ سے چھلنی دروازے کی طرف دیکھا پھر تھرتھراتی ہوئی میری جانب بڑھ آئی۔

میں نے سلم ماڈل نائن ایم ایم گن کو دروازے کی سمت سیدھا کرتے ہوئے سانس روک لی۔ وہ ایسے سنگین لمحات تھے کہ اپنی بقا کے لیے دشمن کی جان سے کھیلنا ہم پر لازم ٹھہرا تھا۔ اس سوراخ دار دروازے سے ہماری موت کو نمودار ہونا تھا اور میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود گن کا میگزین پوری طرح لوڈ تھا اور میں اسے استعمال کرنے میں کوئی غلطی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اگلے ہی لمحے میری توقع پر پانی پھر گیا۔ میں امید کر رہا تھا کہ چھلنی دروازہ ایک دھکے سے کھلے گا اور مسلح افراد بھاگ کر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو جائیں گے لیکن اس کے برعکس دروازے کے سوراخوں میں سے پے در پے تین شیل فائر کیے گئے جنہوں نے اندر پہنچتے ہی تیز رفتاری سے دھواں خارج کرنا شروع کر دیا تھا۔ یقیناً یہ بھی گیس کے شیل

میرا ایک اور اندازہ بھی غلط ہو گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ آنسو گیس کے شیل ہیں جن کا دھواں ہماری آنکھوں میں مرچیں بھر دے گا اور ہمارے آنسو اس فراوانی سے جاری ہوں گے کہ ہم ایک انچ دور کی چیز دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہیں گے لیکن نہ تو مجھے اپنی آنکھوں میں مرچوں کی جلن محسوس ہوئی اور نہ ہی دم گھٹنے کا احساس۔ یہ دھواں کسی اور ہی نوعیت کا تھا۔ اس گیس میں دماغ کو غفلت کی وادیوں میں دھکیلنے والا کوئی کیمیکل شامل تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کو سن ہوتا محسوس کیا۔ یوں لگتا تھا، مجھ پر خوف ناک نیند نے حملہ کر دیا ہے۔ میرے ہاتھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ میں گن کا ٹریگر دبا سکتا۔ اس زہریلے دھوئیں نے میرے اعصاب کو جامد اور حواس کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ بس میری ایک ہی خواہش تھی کہ دھڑام سے فرش پر گروں اور صدیوں کے لیے گہری نیند میں چلا جاؤں۔

بیتا کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مدہوشی کے عالم میں کسی کٹے ہوئے درخت کے مانند مجھ پر گری۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو لپٹے ہوئے صوفے کے پشتے سے ٹکرائے پھر سٹنگ روم کے فرش پر جا گرے۔ میں نے اپنے دماغ کو غروب ہوتا محسوس کیا۔ یوں لگ رہا تھا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔۔۔ زندگی کے خاتمے کا وقت!

عالم ہوش کی سرحد پر میری سماعت نے جو آخری آواز وصول کی وہ ایک خوف ناک وحشت طاری کر دینے والی غراہٹ تھی۔ "غوں۔۔۔ بھوں، بھوں!"

یہ سفاک تھوتھنیوں اور نکیلے دانتوں والے جرمن شیفرڈز کی للکار تھی۔ یہ گلی محلے کے آوارہ کتے نہیں تھے جو میرے "بھش" کرنے سے دم دبا کر بھاگ جاتے۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ ان لمحات میں میرے اندر "بھش" کرنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ میں نے اس اصل حسب نسب جوڑی کو بہت دھوکے دیے تھے۔ وہ میرے ایک ایک عمل کا حساب چکتا کرنے آن پہنچے تھے۔

چشم تصور سے میں نے جرمن شیفرڈز کو خود پر جھپٹتے اور اپنا تیا پانچا کرتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔!

ڈوبنا اور ابھرنا انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض حالات آجاتی ہیں جبکہ بعض چیزوں کے ڈوبنے سے ماحول پر تاریکی چھا جاتی ہے اور ان کے ابھرنے سے فضا میں اجالا بھر جاتا ہے۔ انسانی ذہن بھی انہی میں سے ایک قسم کی چیز ہے۔ جب انسانی ذہن عالم بے ہوشی سے ہوش مندی کی طرف آتا ہے تو اس کے حواس فٹ کام کرنے لگتے ہیں اور غنودگی سے پہلے بصارت حرکت میں آتی ہے۔ انسان آنکھ کھول کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پر پایا۔ یہ بیتا کا اپارٹمنٹ نہیں تھا۔ میری نگاہ کے سامنے ایک تختوں والی چوبی چھت تھی اور میں کسی بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میں نے نگاہ گھما کر دائیں بائیں کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ چوبی چھت والا ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔۔۔ یعنی مذکورہ کمرے کی چھت، دیواریں اور سب کچھ لکڑی کے چھوٹے بڑے تختوں کی مدد سے تیار کیے گئے تھے۔ اس نامانوس ماحول نے مجھے الجھا کر رکھ دیا اور یکبارگی میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

اگلے ہی لمحے میری یہ سعی ناکام ہو گئی۔ یہ محسوس کرنے میں مجھے ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ میرے جسم کو اس بستر پر باندھ کر رکھا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں یہ جان چکا تھا کہ میرے بدن پر دو بندشیں تھیں۔ چمڑے کی ایک بیلٹ کی مدد سے میرے سینے کو بیڈ کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک دوسری بیلٹ کو میری رانوں کے اوپر سے گزار کر بیڈ کے ساتھ کس دیا گیا تھا۔ دونوں بیلٹ کی گرہیں یا بکل بیڈ کے نیچے کسی مقام پر تھے۔ اگرچہ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے تاہم ان بیلٹ کو اتنی مضبوطی کے ساتھ کس کر باندھا گیا تھا کہ میں اپنے بدن کو واضح کوئی حرکت دینے کے قابل بھی نہیں تھا لہٰذا ان بیلٹ کو کھولنا فی الحال میرے بس کی بات نہیں تھی۔

بیڈ کے اوپر اپنی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے میں نے جتنی حرکت کی، اس کے نتیجے میں مجھے ایک تکلیف سے گزرنا پڑا اور اس درد کا مرکز میرا پیٹ تھا۔ مجھے اپنے پیٹ کے زیریں حصے میں ٹیسیں سی اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ بے اختیار میرا ایک ہاتھ اذیت کے مقام تک چلا گیا۔ میں گردن اٹھا کر اس مقام کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن میرے ہاتھ نے چشم زدن میں یہ پتا چلا لیا کہ میرے پیٹ کے اس حصے پر ایک وائڈ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ گویا میرے بدن کا وہ حصہ

نتیجے میں وہاں ٹیسیں اٹھی تھیں۔ اپنی اس تکلیف کو سردست بھول کر میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ میرے لیے مقام شکر تھا کہ میں زندہ تھا اور سوچنے سمجھنے کے قابل بھی۔ میرا دماغ ورکنگ آرڈر میں تھا، صرف میرے پیٹ کے زیریں حصے پر کوئی چوٹ لگی تھی۔

اس چوبی کمرے کا ماحول گرم تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ مصنوعی حرارت سے اس کمرے کو گرم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بیتا والے اپارٹمنٹ میں جو ہنگامی حالات پیش آئے تھے، ان کا ایک ایک سین، ایک ایک شاٹ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ حملہ آوروں نے اس اپارٹمنٹ کے سٹنگ روم میں ایسے شیل فائر کیے تھے جن سے خارج ہونے والے دھوئیں نے ہمیں اور ہمارے حواس کو بے بس کر کے عالم بے ہوشی میں پہنچا دیا تھا۔ میری سماعت نے جو آخری آواز سنی تھی وہ جرمن شیفرڈ کپل کی غراہٹ بھری "غوں۔۔۔ بھوں، بھوں" تھی۔ بلاشبہ پولیس ڈاگ کے۔ نائن (K-9) نے مجھے ڈھونڈ نکالا تھا۔ حملہ آوروں سے نمٹنے کے دوران میں مجھے اچھی خاصی کسرت کرنا پڑی تھی۔ اس دھینگا مشتی میں میرے جسم کے مساموں نے ڈھیروں پسینا اگلا تھا جس کی وجہ سے بدن اور لباس پر اسپرے کی گئی خوشبویات کا اثر زائل ہو گیا تھا۔ تبھی زبردست سونگھنے کی صلاحیت رکھنے والے جی ایس ڈی (جرمن شیفرڈ ڈاگز) نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔

جرمن شیفرڈز کی وہ جوڑی اور اسپیشل دوشیزہ ڈاہلیا کا آپس میں گہرا ربط ضبط تھا۔ ڈاہلیا کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان آپوں آپ بیتا کی طرف چلا گیا۔ اس کمرے میں، میں اکیلا ہی تھا۔ بیتا کو اپنے پاس نہ پا کر مجھے گہری تشویش نے آگھیرا۔ میں نے بڑی شدت سے بیتا کو مس کیا۔ ان لمحات میں بیتا کے لیے میرے جو جذبات تھے وہ میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیے تھے۔ کسی بھی چیز کی عدم موجودگی اور عدم دستیابی اس کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ بیتا میری زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ کمرے کے باہر مجھے کسی کی آمد کا احساس ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرا یہ احساس حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ ایک مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے گرم سوٹ کے اوپر ایک گرم جیکٹ بھی پہن رکھی تھی اور ایک ہاتھ میں اس نے ایک اٹیچی کیس اٹھا رکھا

تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے کے بعد میری جانب دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا۔

"ویل کم ٹو دی راس آئی لینڈ۔۔۔!"

"راس آئی لینڈ۔۔۔" میں نے زیر لب دہرایا پھر الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "یہ نام پہلے کبھی سنا نہیں۔"

"اس وقت دنیا کی آبادی لگ بھگ سات بلین ہے۔" وہ شخص ایک کرسی کھینچ کر میرے بیڈ کے نزدیک بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے بتانے لگا۔ "لیکن ان سات بلین افراد میں سے بہ مشکل سات سو افراد نے اس جزیرے کا نام سنا ہوگا مگر دیکھا شاید سات افراد نے بھی نہ ہو۔ راس آئی لینڈ (Ross island) اس دنیا کے نقشے پر ستتر اعشاریہ تین صفر ڈگری عرض البلد جنوب اور ایک سو اڑسٹھ ڈگری طول البلد مشرق میں واقع ہے۔ ہم تمہیں راس آئی لینڈ کو اچھی طرح دیکھنے اور کچھ عرصہ یہاں گزارنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔"

اس شخص کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔ اس کے چہرے کی جھریاں بتاتی تھیں کہ وہ بچپن اور پچپن کے بیچ کہیں کھڑا ہے۔ گوری رنگت، نیلی آنکھیں اور شاندار شخصیت کے مالک اس شخص کی آنکھوں اور چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ وہ سرد و گرم چشیدہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے بیزاری بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"تم کون ہو اور مجھے جزیرہ راس پر کیوں لے کر آئے ہو؟"

"میرا نام نیل کریمر ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"تو کیا تم میرے دوست ہو؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال میں تمہارا دوست بھی نہیں ہوں۔" اس نے گول مول جواب دیا۔ "لیکن اگر تم دانش مندی کا ثبوت دو تو ہمارے بیچ پائیدار دوستی کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔"

وہ پوری طرح کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ "تم نے میرے سوال کا ادھورا جواب دیا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "صرف نام بتا دینے سے تعارف مکمل نہیں ہو جاتا اور تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم مجھے راس آئی لینڈ پر کس مقصد سے لے کر آئے ہو؟"

"مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں اس پرسکون جزیرے پر بیٹھ کر غور وخوض کرنے کا موقع دیا جائے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور جہاں تک میرے تعارف کی بات ہے تو اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ میرا تعلق "انکل اینڈ

"اور ـــــ" میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ساری کہانی میری سمجھ میں ٹھیک ٹھیک بیٹھ گئی تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "تو یہ سب ڈیلفیا کا کیا دھرا ہے؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ "ڈیلفیا کہاں ہے؟"

"کیا تمہیں ڈیلفیا کی یاد آرہی ہے؟" میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

میں نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی بھلا کوئی بھولنے کی چیز ہے۔"

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہاری توانائی بحال ہو رہی ہے۔" نیل کریمر نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ "تم ہماری دوستی کا ہاتھ تھام کر ہمارے ہو جاؤ، ڈیلفیا تمہاری ہو جائے گی۔ ایک ڈیلفیا پر ہی کچھ موقوف نہیں ہے۔ ہماری سوسائٹی کو جوائن کرنے کے لیے تم "برادر ہڈ" کے سرکل میں شامل ہو جاؤ گے۔ برادر ہڈ (بھائی چارے) کا حصہ بننے کے بعد تم جس حسینہ پر ہاتھ رکھو گے، سمجھو وہ تمہاری ہو گئی۔"

پرسٹن ہالو (ویلس) والے بنگلے پر ربی آرک بارورخ لاؤڈ نے بہتر سمجھنے کے لیے ڈیلفیا کو جس مقصد کے لیے سائے کی طرح میرے ساتھ لگایا تھا، نیل کریمر بھی اسی طرح کی بات کر رہا تھا۔ پرسٹن ہالو میں، میں ڈیلفیا کی پیشکش کو جوتے کی نوک پر مار آیا تھا۔ تبھی سے وہ میرے تعاقب میں تھی اور بالآخر مجھے چھاپنے میں سرخرو بھی ہو گئی تھی لیکن جزیرہ راس پر نیل کریمر میرے ساتھ کیا کرنے والا تھا، اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ راس آئی لینڈ دنیا کے کس حصے میں واقع تھا۔ نیل کریمر نے لاگی جیوڈ اینڈ لیفی [illegible] کی مدد سے راس آئی لینڈ کی لوکیشن واضح کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ بات میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ تاہم چند خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے کہا۔

"ڈیلفیا کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ وہ میرے پیچھے امریکا سے پاکستان آئی تھی اور کراچی پہنچ کر اس نے مجھے گھیرنے کے لیے ایک بزنس [illegible] کا سہارا لیا تھا۔"

"اور اس نے تم کو خوب دھوکے دیے۔" وہ معنی خیز نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ "تم ایک ذہین اور باہمت نوجوان ہو اسی لیے تو ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔"

نیل کریمر کو گھورتے ہوئے میں اپنے پیٹ کے اس حصے پر ہاتھ پھیرنے لگا جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسی دوران میں میرا ذہن تیز رفتاری سے ایک خاص زاویے پر سوچ رہا تھا۔

"ہم اتنے ظالم نہیں ہیں کہ تمہارا گردہ نکال لیں ـــــ"

نیل کریمر کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی تو میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ان لمحات میں واقعتاً میں بھی سوچ رہا تھا کہ کہیں ان کم بختوں نے آپریشن کر کے میرا گردہ تو نہیں نکال لیا۔ میری چوری پکڑی گئی تو میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری انداز میں دریافت کیا۔

"کیا تم سوچ پڑھنا جانتے ہو؟"

"نہیں ـــــ" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اپنے گردے کے بارے میں سوچ رہا ہوں؟" میرے لہجے میں بے پناہ الجھن بھری ہوئی تھی۔

"میں قیافہ شناس ہوں۔ فیس ریڈنگ کرتا ہوں۔" اس نے متحمل انداز میں جواب دیا۔ "میں نے تمہارے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ قائم کیا تھا۔"

"زبردست!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ "تمہارا علم لاجواب ہے۔"

اس نے کرسی چھوڑ دی پھر میرے نزدیک آکر بولا۔ "میں تمہاری بندشیں کھول رہا ہوں۔ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔"

وہ بڑی مہارت کے ساتھ میرے سینے اور رانوں کے اوپر بندھی چمڑے کی بیلٹ کو کھولنے لگا تو میں نے پوچھا۔ "کیا تم لوگوں کو میرے فرار کا خطرہ تھا جو یوں مجھے بیڈ پر جکڑ کر رکھا گیا ہے؟"

"نہیں ـــــ ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے نفی میں جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ "یہ سب انتظام تمہاری حفاظت کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ تم بے ہوش تھے اور تمہیں بالکل خبر نہیں تھی کہ تمہارے پیٹ پر ایک گہرا گھاؤ ہے۔ تم ہوش میں آنے کے بعد اپنے بدن کی کسی الٹی سیدھی جنبش سے اس گھاؤ کو خراب کر سکتے تھے۔"

"مجھے یہ چوٹ کیسے لگی؟" میں نے پوچھا۔ "میرے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا جو یہ چوٹ کر پڑی؟ جب میں بے ہوش ہوا تھا تو جب تک تو مجھے ایسا کوئی زخم

نہیں آیا تھا۔"

"یہ انہی لمحات کا واقعہ ہے۔" وہ مجھے دونوں بندشوں سے آزاد کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "چند روز پہلے جب تمہیں ہماری ایک ٹیم نے کراچی کے ایک ساحلی اپارٹمنٹ سے پکڑا تو بے ہوش ہونے سے پہلے تم ایلومینیم کی سیڑھی پر اس بری طرح گرے تھے کہ سیڑھی کا ایک کونا تمہارے پیٹ میں لگا اور وہاں ایک گہرا زخم آگیا۔ ہم نے تمہیں حاصل کرنے کے بعد تمہارے زخم کو اعلیٰ درجے کا ٹریٹمنٹ دیا ہے۔ چند روز میں تمہارا گھاؤ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میری یادداشت میں بے ہوش ہونے کا منظر کچھ اس طرح نقش تھا۔ بیتا بے ہوشی کے عالم میں کٹے ہوئے درخت کے مانند مجھ پر گری تھی۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے صوفے کے پشتے سے ٹکرائے تھے پھر سٹنگ روم کے فرش پر جا گرے تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنے دماغ کو غروب ہوتا محسوس کیا تھا۔ اس تناظر میں تو نیل کریمر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کیونکہ جس ایلومینیم کی سیڑھی کا اس نے ذکر کیا، وہ سٹنگ روم کے فرش پر ہی پڑی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اسی سیڑھی کی مدد سے سفیان اور زوبی نامی دونوں آدمیوں پر ایک خطرناک وار کیا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ درست مگر نیل کریمر کی ایک بات نے مجھے گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ اسی حوالے سے میں نے پوچھا۔

"تم نے ابھی بتایا کہ چند روز پہلے میں تم لوگوں کے ہتھے چڑھا تھا مگر مجھے تو وقت گزرنے کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔"

"تم بے ہوش تھے۔ اسی دوران میں ہم نے تمہاری ایک مائنر سرجری کی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ چار پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے۔"

"میری ساتھی کہاں ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"کون سی ـــــ" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "شارو یا بیتا؟"

"شارو تو ہوانا (کیوبا) میں ہے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "میں نے بیتا کے بارے میں پوچھا ہے۔ کراچی کے ساحلی اپارٹمنٹ میں وہ میرے ساتھ تھی۔"

"اب نہ تو بیتا کراچی میں ہے اور نہ ہی شارو ہوانا میں ہے۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "اس وقت تمہاری وہ دونوں ساتھی ہماری تحویل میں ہیں۔"

"کیا وہ دونوں بھی راس آئی لینڈ پر ہی ہیں؟" میرے لہجے سے بے پناہ بے قراری چھلک رہی تھی۔

"نہیں!" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میرا اضطراب سوا ہو گیا۔ "پھر وہ کہاں ہیں؟"

"وہ جہاں بھی ہیں ان کی جان سلامت اور عزت محفوظ ہے۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "وہ ہماری ذمے داری ہیں اور تمہاری ایک امانت کی حیثیت سے ہمارے پاس ہیں اور اس بات کا یقین رکھو کہ سوسائٹی نہ تو امانت میں خیانت کرتی ہے اور نہ ہی خیانت کرنے والوں کو معاف کرتی ہے۔ ہمارے ہاں بے وفائی اور بدعہدی کا ایک ہی مطلب ہے ـــــ بھیانک موت!" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بیتا اور شارو پر ہم بعد میں بات کریں گے، پہلے میں تمہیں راس آئی لینڈ کے حوالے سے چند اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں کیونکہ تم نے یہاں پر چالیس دن گزارنا ہیں۔"

اس نے "چالیس دن" کا ذکر اس انداز میں کیا تھا جیسے مجھے راس آئی لینڈ پر چالیس دن کا کوئی چلہ کاٹنا ہو یا پھر اسکل اینڈ بونز والوں نے میرے چہلم کے لیے اس جزیرے کا انتخاب کیا ہو۔ بہرحال، جو بھی صورت تھی، میں جذب بہ نظر سے نیل کریمر کو دیکھتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ گمبھیر سنجیدگی سے بتانے لگا۔

"راس آئی لینڈ بنیادی طور پر چار آتش فشانی چٹانوں کے اوپر واقع ہے یا یوں سمجھو کہ چار آتش فشانوں کے دہانوں سے نکلنے والے لاوے نے اس جزیرے کو تشکیل دیا ہے۔ اس جزیرے کا کل رقبہ دو ہزار چار سو ساٹھ مربع کلومیٹر ہے۔ پورا جزیرہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس برفانی پہاڑ کی چوٹی کی اونچائی تین ہزار سات سو چوہتر میٹر ہے۔ ایریبس ایک ایکٹیو والکینو (مستعد آتش فشاں) ہے۔ راس آئی لینڈ کی آبادی موسم گرما میں لگ بھگ ایک ہزار اور موسم سرما میں کم و بیش ڈیڑھ سو نفوس ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت کم از کم منفی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ اور زیادہ سے زیادہ دس ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ اس جزیرے کا ٹائم جی ایم ٹی (GMT) سے بارہ گھنٹے آگے ہے۔ یعنی لندن کے ٹائم میں بارہ گھنٹے جمع کریں تو راس آئی لینڈ کا وقت نکل آتا ہے (پاکستان کا ٹائم جی ایم ٹی سے پانچ گھنٹے آگے ہے۔ اس حساب سے راس آئی لینڈ کا ٹائم پاکستان کے ٹائم

سرحد نہیں تھی۔ یہاں سے نزدیک ترین ملک ارجنٹائن اور چلی ہے۔ دوسرا قریب ترین ملک نیوزی لینڈ ہے۔ نیوزی لینڈ کے شہر کرائسٹ چرچ سے پانچ گھنٹے کی فلائٹ راس آئی لینڈ لے آتی ہے۔ میں تمہیں جو معلومات فراہم کر رہا ہوں، اس کا ایک ایک پوائنٹ ذہن نشین کرلو کیونکہ تم آئندہ چالیس دن اس جزیرے پر گزارنے والے ہو اور قدم قدم پر تمہیں ان معلومات کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس میں سے ایک بھی لفظ بے معنی اور غیر ضروری نہیں ہے۔" وہ چند لمحات کے لیے ٹھہرا، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"راس آئی لینڈ کے ایک کنارے پر امریکا کا سب سے بڑا ریسرچ سینٹر ہے جس کا نام میکمرڈو (Mcmurdo) ہے۔ یہ ایک انٹیکٹر ریسرچ اسٹیشن ہے جو گرما اور سرما دونوں موسموں میں اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ امریکا یہاں پر نیشنل سائنس فاؤنڈیشن (NSF) کے تحت تجرباتی کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ میکمرڈو اسٹیشن پر زیادہ تر تابکار عناصر کے تجربات کیے جاتے ہیں یعنی خطرناک ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور چیکنگ وغیرہ۔ انہی انکشافات کی وجہ سے قطب جنوبی کی برف پگھلنے کے خطرات پوری دنیا کے ملکوں کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ کیونکہ ان تجربات کے نتیجے میں ایک تو دنیا کے سمندروں کی سطح خوفناک حد تک بلند ہو جائے گی۔ دوسرے اوزون لیئر (Ozone Layer) کے متاثر ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ بہرحال ہونے والی چیز کو کون روک سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر نیل کریمر خاموش ہوا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "راس آئی لینڈ کا تعارف مکمل ہو گیا؟"

"ہاں!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔ باقی تم خود دریافت کرلو گے۔"

"تو پھر اب چالیس دن اور شارلو کی بات کریں؟"

"نہیں ۔۔۔ ابھی نہیں۔"

"پھر کب؟" میں بے کل ہو گیا۔

"چند ضروری باتیں کرنا ابھی باقی ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شارلو کا ذکر آخر میں آئے گا۔" میں تفصیلات کا طالب علم تھا اور نیل کریمر خود کو تفصیلات کا استاد ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ میرے نازک پہلوؤں سے بخوبی آگاہ تھا لہٰذا وہ بڑی آسانی سے میرے جذبات کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کون سی ضروری باتیں؟"

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنا بریف کیس کھول لیا پھر اس میں سے ایک چپٹی رسٹ واچ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔ "یہ گھڑی اعلیٰ نسل اور کام کی چیز ہے۔ حالات اور ماحول چاہے کتنا بھی ناسازگار کیوں نہ ہو، اس کی کارکردگی میں سر مو فرق نہیں آتا۔ یہ ایک وقت، دن، تاریخ، مہینا، سال بتاتی ہے اور درست وقت بتانا تو اس کی خوبی میں شامل ہے۔ اس گھڑی کی مدد سے تم چالیس دنوں کے روز و شب کا حساب رکھ سکو گے کیونکہ موسم اور وقت کے لحاظ سے تو راس آئی لینڈ کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک پرسکون سانس خارج کی۔ میں نے اس بار نیل کریمر کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ چند لمحات کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"راس آئی لینڈ پر صرف دو موسم ہوتے ہیں یعنی موسم سرما اور موسم گرما۔ ان دونوں موسموں کی کیفیت بھی انوکھی ہی ہے۔ جب دنیا کے بیشتر ممالک میں موسم گرما ہوتا ہے تو یہاں موسم سرما ہوتا ہے جیسا کہ آج کل یہاں ونٹر (موسم سرما) ہے۔ اس جزیرے پر چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے تاہم نہ تو دن ہی روشن اور چمک دار ہوتا ہے اور نہ رات گہری تاریک۔ تم دن کو میلا اجالا اور رات کو ہلکی تاریکی کہہ سکتے ہو۔ موسم سرما کے وسط میں یعنی جون، جولائی کے مہینوں میں دو ہفتوں کے لیے سورج کا نام و نشان نظر نہیں آتا یعنی یہ مکمل تاریکی کے دو ہفتے ہوتے ہیں۔ اسی طرح موسم گرما کے وسط میں یعنی دسمبر، جنوری کے مہینوں میں سورج مسلسل چوبیس گھنٹے آسمان پر موجود رہتا ہے۔ یعنی یہ مکمل اجالے کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں۔ اب تم خود اندازہ لگا لو کہ میں نے تمہیں جو گھڑی دی ہے وہ ان حالات میں کتنی مفید ثابت ہوگی؟"

"واقعی ۔۔۔" میں نے متفکرانہ نظر سے نیل کریمر کی طرف دیکھا۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ ہٹ تین کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک بیڈروم جہاں تم اس وقت موجود ہو، اس کے پہلو میں ایک اسٹور روم ہے جہاں پر تمہارے چالیس دن کا راشن موجود ہے۔ اگر تم زیادہ خوش خوراکی کا مظاہرہ نہیں کرو گے تو یہ راشن بڑے آرام سے چالیس دن چل جائے گا۔ اسٹور کے اندر ہی مختلف قسم کا اسلحہ بھی رکھا

ہے جو کسی ہنگامی صورت حال میں تمہارے کام آئے گا۔ اگلا کمرا کچن ہے جہاں تمہیں اپنے لیے خود کھانا تیار کرنا ہوگا۔ اس کچن کے اندر ہی کیروسین آئل کا بھی اچھا خاصا اسٹاک موجود ہے جو کھانا پکانے اور بیڈروم کو گرم رکھنے کے کام آئے گا۔ اس بیڈروم میں تم بڑے آرام سے لیٹے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ باہر کس بلا کی ٹھنڈ ہے۔۔۔"

"اور واش روم؟" میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"راس آئی لینڈ پر واش روم کا کوئی تصور نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "کسی بھی طرف منہ اٹھا کر چل پڑو۔ جہاں من چاہے، تھوڑی سی برف کو کھود کر گڑھا سا بنا کر فارغ ہو جاؤ اور اپنے بدن اور حاجت کے بوجھ کو اتار پھینکو۔ جب تک تم واپس ہٹ میں پہنچو گے، برف زدہ ہوائیں تمہارے بول و براز کو بڑی مستعدی سے ڈھک چکی ہوں گی۔"

"رفع حاجت کا یہ خاصا بے ہودہ طریقہ ہے۔" میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "جیسا دیس ویسا بھیس۔"

"ایک بات سچ سچ بتاؤ نیل کریمر!" اس بار میں نے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اتنی تفصیلات بتاتے وقت تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ اندازہ نہیں ہوا یا یہ خوف محسوس نہیں ہوا کہ میں تمہیں زیر کرکے یہاں سے فرار ہو جاؤں گا؟"

"پہلی بات تو یہ کہ ہمیں تمہاری جانب سے اس قسم کا کوئی خوف یا اندیشہ لاحق نہیں ہے۔" وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ "ہم نے تم پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے۔ علاوہ ازیں، میں نے ابھی تمہیں اس جزیرے کی جو تفصیل بتائی ہے، اس کی روشنی میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بالفرض محال، تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور تم کسی جان لیوا مہم جوئی کا ارادہ باندھ لیتے ہو۔ تم مجھے زیر کرکے یا قتل کرکے اس ہٹ سے فرار ہو جاتے ہو تب یہ سوال پیدا ہوگا کہ تم جاؤ گے کہاں؟" اس نے لمحاتی توقف کرکے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

"راس آئی لینڈ آئس شیٹس، آئس شیلفز اور آئس برگ کے ایک طویل سلسلے کے ذریعے سفاک براعظم انٹارکٹیکا سے جڑا ہوا ہے جن میں سے بعض آئس شیٹ، آئس شیلف اور آئس برگ سیکڑوں کلومیٹر طویل ہیں اور ان برفانی چٹانوں کی موٹائی دو سے چار کلومیٹر تک ہے۔ یوں سمجھو کہ راس آئی لینڈ، انٹارکٹیکا کا ہی ایک حصہ بن چکا تھا اور انٹارکٹیکا ۔۔۔" اس نے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "انٹارکٹیکا کا رقبہ ایک کروڑ چالیس لاکھ مربع کلومیٹر ہے یعنی چودہ ملین مربع کلومیٹر۔ اس خوفناک براعظم کا قطر پانچ ہزار پانچ سو کلومیٹر ہے۔ اگر تم نے یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا بھی لیا تو تمہیں انٹارکٹیکا کو عبور کرنا پڑے گا۔ اگر تم نے ناک کی سیدھ میں زیادہ سے زیادہ پانچ کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے سفر جاری رکھا تو اس براعظم کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے تمہیں ایک ہزار ایک سو گھنٹے لگیں گے یعنی چھیالیس دن لیکن تم کسی بھی صورت میں نہ تو مسلسل چھیالیس دن اس برف زار میں سفر جاری رکھ سکتے ہو اور نہ ہی تمہاری رفتار پانچ کلومیٹر فی گھنٹا ہو سکتی ہے۔ اگر تم نے اس مہم جوئی کا ارادہ کر ہی لیا تو میرے محتاط اندازے کے مطابق اس برف زار میں تم اپنی موت کو دعوت دو گے۔ ایک ایسی عبرت ناک موت کہ جس پر شاید کسی ذی روح کے ہاتھ کھڑے ہوں گے اور نہ ہی کہیں تمہارا مزار تعمیر ہوگا۔ دنیا کے دیگر ملکوں میں تو خاکی انسان خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے لیکن انٹارکٹیکا کی نگری میں خاکی انسان کو برف میں مل کر برف ہونا پڑتا ہے۔ ویسے اگر تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا شوق چرا رہا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ میرا کام تھا تمہیں سمجھانا اور میں نے اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔ آخر میں بس میں تمہیں ایک مخلصانہ مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔۔۔" نیل کریمر نے ایک بار پھر توقف کیا اس کے بعد بولا۔

"ان چالیس دنوں میں تم نے ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہماری دوستی کو قبول کرکے تم نے شاہانہ زندگی بسر کرنا ہے یا اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے اس آئی لینڈ پر حسرت ناک موت مرنا ہے۔ تمہارے پاس کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے۔ میری صلاح یہی ہے کہ ہمارا برادر ہڈ (Brother Hood) جوائن کرلو۔"

اگرچہ نیل کریمر نے اپنے لہجے کو خاصا نرم رکھا تھا تاہم وہ جو کہنا چاہتا تھا، وہ مجھ تک پہنچ گیا تھا۔

"میں تمہاری آفر کے بارے میں چالیسویں دن سوچوں گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اس سے پہلے کے انتالیس دن میں معصوم پینگوئنز کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلوں گا۔"

"زندہ دلی اچھی چیز ہے۔" وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولا۔ "لیکن تمہیں پتا نہیں کہ بعض پینگوئن کتنے وحشی اور خطرناک ہوتے

ہیں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ اس سرزمین سے صرف اور صرف ہم ہی تمہیں نکال سکتے ہیں۔ باقی جہاں تک پیچیدگیوں کے ساتھ نمٹنے کا معاملہ ہے تو اگر تم نے یہ بات مذاق میں کہی ہے تو میں بھی اسے مذاق ہی سمجھوں گا۔"

"ابازیکا کے بارے میں مجھے کافی کچھ پہلے سے معلوم ہے لیکن راس آئی لینڈ کے حوالے سے پہلی بار سنا ہے۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "تم نے میری بھیانک اور حسرت ناک موت کی منظر کشی کرکے مجھے ڈرانے کی کوشش کی ہے۔ سمجھو کہ میں ڈر گیا۔ اب بتاؤ کہ تم لوگوں نے مجھ پر کس قسم کی ریسرچ کررکھی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے ایسی کوئی بات کی تھی۔"

"ہمیں جس نوجوان کی تلاش تھی، اب تک کے زمینی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ وہ تم نہیں ہو۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "ہمارے ساتھ تو وہی معاملہ ہوا کہ.... آگ کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے اور پیغمبری مل گئی۔"

"میں سمجھا نہیں؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں نیل کریمر کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ تم ہمارے مطلوبہ نوجوان تو نہیں ہو...." اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "لیکن تم مذکورہ نوجوان سے بہت آگے کی چیز ہو۔ گویا ہم جس چیز کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے اس سے کئی گنا زیادہ مل گیا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی بات کی تہ میں پہنچتے ہوئے کہا۔ "لیکن 'اب تک کے زمینی حقائق' سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تم میرے حوالے سے جس نتیجے پر پہنچے ہو، وہ آگے چل کر بدل بھی سکتا ہے؟"

"ہم ہمیشہ اچھے کی امید رکھتے ہیں اور ہر وقت کسی بھی گڑبڑ کے لیے تیار رہتے ہیں۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "فی الحال جو زمینی حقائق ہمارے سامنے ہیں، وہ ہمارے بعض اکابرین کو ہضم نہیں ہو پارہے۔ ان کا خیال ہے کہ تم ہی وہ نوجوان ہو جس کی ماں فریدہ کا تعلق راولپنڈی کے ایک بیوروکریٹ خاندان سے تھا اور جو پورے تیئیس ماہ تک سان ڈیاگو (کیلی فورنیا) کے "سیون الیون" اسٹور کی فرنچائز منیجر رہی ہے۔ اسی فریدہ نے ایک عیسائی مرد الفریڈ سے شادی کی اور تم ان کی واحد اولاد ہو جس کی ہمیں تلاش تھی۔ جب تم ایک سال کے تھے تو میڈم فریدہ اور الفریڈ تم سمیت اچانک غائب ہوگئے اور...."

"تمہارے بعض اکابرین اب بھی اس انداز میں کیوں سوچتے ہیں؟" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"جبکہ فلپس نے راولپنڈی اور اسلام آباد کی خاک چھانی.... یہ رپورٹ پیش کردی ہے کہ فریدہ اور الفریڈ اب.... میں باقی نہیں رہے اور یہ کہ جب وہ پاکستان آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا۔ علاوہ ازیں میرے حوالے سے تمام حقائق بھی تم لوگوں کے علم میں آچکے ہیں۔ میں.... اور سکی حیدر کا اکلوتا بیٹا ہوں اور ظاہر ہے، میں وہ نوجوان نہیں ہوں جس کی تلاش میں تم لوگ برسوں سے دشت.... کے پیچھے بھاگتے پھر رہے ہو؟"

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی پھر.... انداز میں بولا۔ "پہلی بات تو یہ کہ ہم اپنے اکابرین کو کسی مخصوص انداز میں سوچنے پر نہ تو مجبور کرسکتے ہیں اور نہ ہی روک سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ ایسا سوچ رہے ہیں تو اس سلسلے میں ان کے پاس ٹھوس دلائل بھی ہیں۔"

"کیسے دلائل؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"وہ کہتے ہیں، ممکن ہے تمہارے حوالے سے کوئی ڈیل ہوگئی ہو...."

"ڈیل.... کیسی ڈیل؟" میں نے الجھن زدہ نظروں سے نیل کریمر کو دیکھا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"ان کا خیال ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ میڈم فریدہ اور الفریڈ نے امریکا چھوڑنے سے پہلے جاوید عامر بیگ یا پھر علی سلطان کو بھاری رقم دے کر کوئی ڈیل کرلی ہو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "یعنی میڈم سکی اور حیدر علی کے امریکا پہنچائے جانے والے ایک سالہ بچے کو میڈم فریدہ اور الفریڈ کے ایک سالہ بچے سے تبدیل کردیا گیا ہو۔ یعنی علی سلطان نے انیس سال تک جس کی پرورش اور نگہداشت کی وہ ہمارا مطلوبہ بچہ ہی ہو اور پاکستان سے امریکا پہنچائے جانے والے بچے کو کہیں ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔"

"اگر تمہارے بعض اکابرین ایسا سوچتے ہیں تو میں ان کی اس سوچ پر اظہار افسوس ہی کرسکتا ہوں۔" میں نے بیزار کن انداز میں کہا۔ "جبکہ حقیقت یہی ہے کہ میں سکی حیدر اور حیدر علی کا بیٹا ہوں۔"

اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ایک بریف کیس کو کھول کر اس کے اندر سے ایک لیپ ٹاپ برآمد کرتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔ "بیٹا اس وقت آسٹریلیا کے ملبورن میں ہے اور شارہ بویریا (Bavaria) کے میونخ (Munich) میں۔ تمہاری یہ دونوں دوست کسٹڈی میں انتہائی خوش اور محفوظ ہیں۔ میں نے تمہاری....

.... ہے جو ان دونوں نے ویڈیو کلپ ریکارڈ کیا ہے.... تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

اپنی بات کے اختتام پر اس نے اٹھ کر دوبارہ لیپ ٹاپ.... کے سامنے کردیا۔ میں نے دیکھا پہلے ویڈیو کلپ.... بورن کے ایک "سیون الیون" اسٹور میں کھڑی تھی۔.... اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے ہیلو کہا تھا۔ "علی! میں.... ٹھیک ہوں لیکن تمہارے بغیر زندگی ادھوری ہے.... تک پہنچنے کا کوئی راستہ نکالو...."

.... دوسرے ویڈیو کلپ میں شارہ مجھے بویریا کے صدر.... میں دکھائی دی۔ آسٹریلیا اور ملبورن کا نام ہر.... کے لیے شناسا ہے لیکن بویریا کے بارے میں.... کم معلومات رکھتے ہوں گے۔ بویریا دراصل.... کی سب سے بڑی اسٹیٹ ہے اور جرمنی کے اندر اس.... ایک آزاد ریاست کی ہے۔ سیکرٹ سوسائٹیز نے.... اسی آزاد جرمن ریاست کے بطن سے جنم لیا تھا۔.... "سکل اینڈ بونز" کا نام بھی سن لیں۔ میونخ، تنظیم.... بویریا کا کیپٹل ہے۔ شارہ، میونخ کی ایک تاریخی.... کے صدر دروازے پر کھڑی انگلش میں مجھے.... رہی تھی۔

"ہیلو ڈارلنگ.... میرے دوست، آئی لو یو، آئی.... ہم بہت جلد ملیں گے۔"

.... شارہ کے چہرے پر نظر آنے والے اطمینان بھرے.... اور اس کی آواز میں موجود اعتماد نے مجھے یقین دلا.... وہ بویریا.... کے قبضے سے نکل آئی ہے اور اس وقت.... ہاتھوں میں ہے۔ میں شارہ کے بارے میں سوچ رہا.... نیل کریمر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بے حد.... لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"چالیس دن کی سوچ بچار کے بعد اگر تم ہم سے.... فیصلہ کرلیتے ہو یعنی ہمارے برادرہڈ کا حصہ بن.... تو بیٹا اور شارہ کو تمہارے سپرد کردیا جائے گا لیکن.... سے پہلے ہم تمہیں ایک ایسا تحفہ دینے والے ہیں جسے.... کر تم باغ باغ ہوجاؤ گے۔"

"کیا تحفہ؟" میں نے استفساریہ نظر سے نیل کریمر.... کو دیکھا۔

"تحفے کی بات بعد میں...." وہ سسپنس پھیلاتے.... انداز میں بولا۔ "پہلے یہ دیکھو۔"

اس کے بعد نیل کریمر نے لیپ ٹاپ کے ڈیسک پر.... ویڈیو دکھائی اور پوچھا۔ "اسے جانتے ہو؟"

پیر صاحب کا جواب

مشہور مصنف محترم، احمد ندیم قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں ایک پیر صاحب کے پاس بیٹھا تھا جو کہ ایک کسان کو اولاد نرینہ کے لیے تعویذ لکھ کر دے رہے تھے۔ کسان کے جانے کے بعد میں نے پیر صاحب سے پوچھا کہ اگر اس کسان کے ہاں بیٹا پیدا نہ ہوا تو کہیں آپ کے خلاف انتقامی کارروائی نہ کر بیٹھے۔ پیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ہر قسم کی صورت حال کا حل موجود ہے۔ اگر بیٹا پیدا ہوگیا تو ہمارے وارے نیارے اور اگر نہیں ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ اس نے تعویذ باوضو ہوکر نہیں باندھا ہوگا اور تعویذ بندھے ہونے کی صورت میں بری باتوں سے اجتناب نہیں کیا ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا کاروبار ہمارے آباؤ اجداد کے دور سے ایسے ہی چل رہا ہے اور آئندہ صدیوں تک ایسے ہی چلتا رہے گا۔"

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

نفرت کا نشانہ

شہر میں ہندوؤں اور سکھوں میں فساد برپا تھا۔ ہندوؤں کو ایک علاقے میں ایک سکھ مل گیا۔ اس پر انہوں نے خوب تشدد کیا۔ سر، داڑھی کے بال اور مونچھیں کاٹ دیں۔ اسے بے عزت کرکے چھوڑ دیا۔

اسی شام ایک ہندو سکھوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اسے بھی سکھوں نے کھمبے سے باندھ کر خوب مارا۔ وہ چیخ چیخ کر پکارتا رہا کہ میں ہندو نہیں سکھ ہوں مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔

اگلے روز دونوں علاقوں کے اخبار میں ایک ہی تصویر لگی تھی اور دونوں تصویریں ایک ہی آدمی کی تھیں۔

مرسلہ۔ محمد افضل شاہین، ہارون آباد

پڑتے ہی انتظار اری لہجے میں کہا۔ ''اس خوب صورت عورت کا نام شائستہ ہے۔ جس رات مجھے چھپایا گیا، اس شام ساحل سمندر پر شائستہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا پانچ سالہ بیٹا گم ہو گیا تھا۔ اس نے بیٹا کے سیل فون سے اپنے شوہر سے بات بھی کی تھی۔''

''نہ تو اس کا نام شائستہ ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے کیونکہ یہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔'' نیل کریمر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمارے سسٹم کا ایک معمولی سا پرزہ ہے جسے ہم نے ایک غیر معمولی انسان یعنی تمہیں ٹریپ کرنے کے لیے استعمال کیا تھا اور اس نے کامیابی سے اپنا کام کر دکھایا۔''

''اور وہ بندہ کون تھا جو خود کو میرا خیر خواہ ظاہر کر رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ فلیٹ بلڈنگ کی مدد سے مجھے خطرات سے آگاہ کر رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میں فی الفور وہ اپارٹمنٹ چھوڑ دوں؟''

''وہ بھی ہمارے سیٹ اپ کا آدمی ہے اور تمہیں اپارٹمنٹ سے باہر نکالنا ہمارا 'پلان A' تھا۔'' نیل کریمر نے کہا۔ ''ہم اپارٹمنٹ کے اندر ہنگامہ آرائی کے حق میں نہیں تھے۔ تم اگر اس شخص کی بات پر بھروسا کر کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آتے تو فوراً دھر لیے جاتے۔ تم نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا لہٰذا ہمیں 'پلان B' کو بروئے کار لانا پڑا اور مجبوراً زبردست مار دھاڑ کے بعد تم ہمارے ہاتھ لگ گئے۔''

یہ کم بخت میری سوچ سے زیادہ میرے معاملات کے بارے میں جانتا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ لیپ ٹاپ کو ڈاؤن اسکرول کرتے ہوئے اس نے مجھے ایک اور فوٹو دکھائی اور پھر وہی سوال دہرایا۔ ''اس بندے کو پہچانتے ہو؟''

''یہ خبیث الاخبث، ملعون؛ تصدق نادر شاہ ہے۔'' میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اس حرام الدہر کو کیسے نہیں پہچانوں گا۔ اس کے اشارے پر میری ماں کی ٹارگٹ کلنگ کی گئی——''

''تم نے بھی اس کے ساتھ بڑا ناگوار سلوک کیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کی دائمی اپاہجی اور ابدی محتاجی دیکھنے والوں کو درس عبرت دیتی رہے گی۔ خیر——'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لیپ ٹاپ کے ڈھکنے کو ڈاؤن

اگلے ہی لمحے فرانت چہرے والے ایک [illegible] کی فوٹو میری نگاہ کے فریم میں آ گئی۔ میں نے الجھن [illegible] لہجے میں استفسار کیا۔ ''یہ کون ہے؟''

''کیا تم اسے نہیں جانتے؟'' نیل کریمر نے [illegible] پوچھا۔

''نہیں——بالکل نہیں۔'' میں نے نفی میں جواب [illegible] ''میں نے اپنی زندگی میں اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہیں ایک تحفہ دینے کا ذکر کیا تھا——''

''ہاں، ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''یہ شخص ہی وہ تحفہ ہے۔'' وہ انکشاف انگیز [illegible] میں بولا۔

''مگر یہ ہے کون——؟'' میری الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

جواب دینے سے پہلے نیل کریمر نے لیپ ٹاپ [illegible] ڈھکنا (ڈھکنے) بند کیا اور دوبارہ اسی کرسی پر جا بیٹھا جہاں تھوڑی دیر پہلے بیٹھا وہ مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس [illegible] بڑے اطمینان اور سلیقے سے لیپ ٹاپ کو واپس اپنی بغل [illegible] میں رکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے ذرا [illegible] میں بولا۔

''یہ تمہاری ماں کی بربادی کا ذمے دار [illegible] باپ کا قاتل——چنگیز خان ہے۔''

''کیا——؟'' میں یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس ہیجانی جنبش کے نتیجے میں میرے پیٹ کے زیریں حصے میں ایک ٹیس اٹھی اور درد کی شدت کا اثر [illegible] صورت میرے چہرے سے جھلکنے لگی۔ نیل کریمر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''ریلیکس——تمہارا زخم ابھی کچا ہے۔ غصے کو [illegible] میں رکھو۔ تمہیں اپنے اعصاب اور جذبات پر بھی [illegible] کنٹرول رکھنا ہے تاکہ تم اپنی جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

نیل کریمر کے انکشاف نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ مجھے اپنے پورے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ چنگیز خان کی فوٹو کو دیکھ کر میرے دل و جگر کے داغ جل اٹھے تھے۔ اٹھیں سال پرانے [illegible] زخم ہرے ہو گئے تھے اور ان دائمی زخموں کے ساتھ [illegible] میرے پیٹ کی موجودہ تکلیف کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں دوبارہ بستر پر چت لیٹ گیا اور نیل کریمر سے سوال کیا۔

''میری معلومات کے مطابق تو چنگیز خان ترکی [illegible]

[illegible] نہیں تھا——''

''کسی بھی شخص کو جیل میں ڈلوانا اور نکلوانا ہمارے لیے بچوں کا کھیل ہے۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''چنگیز خان تمہارا دشمن نمبر ون ہے۔ تم اسے اپنی مرضی اور اپنی پسند کی موت مارنے کے لیے آزاد ہو۔''

''مگر چنگیز خان اس وقت ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے ترکی کی جیل سے نکال کر بیونس آئرس (ارجنٹائن) پہنچا دیا گیا ہے۔'' نیل کریمر نے بڑی رعونت سے کہا۔ ''آئندہ دو روز کے اندر کسی بھی وقت اس بندے کو اس آئی لینڈ پر لا کر چھوڑ دیا جائے گا۔ تمہارے ہٹ کے قریب کسی بھی مقام پر——'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سا سانس خارج کی پھر معتدل انداز میں بولا۔

''تحفے تحائف کا تبادلہ دوستی کے رشتے کے لیے آکسیجن جیسی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ چنگیز خان کا تحفہ تمہیں پسند آئے گا۔''

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر ہٹ کے باہر ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز سنائی دی۔ نیل کریمر اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جیکٹ کی جیب کے اندر سے ایک لفافہ نکال کر کرسی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے جانا ہوگا۔ میری سواری آ گئی ہے۔ اس لفافے کے اندر تمہارے لیے کچھ اہم معلومات ہیں۔ تمہیں جب بھی فرصت ملے، اس لفافے کو کھول کر پڑھ لینا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ اپنا بریف کیس اٹھا کر دوستانہ انداز میں بولا۔

''اگر میری رخصت کا نظارہ کرنا چاہتے ہو تو تھوڑی ہمت کر کے اس کھڑکی تک پہنچو۔'' اس نے [illegible] کی ایک دیوار گیر کھڑکی کی سمت اشارہ کیا۔ ''مجھے یقین ہے، منظر تمہیں بہت پسند آئے گا۔''

ہیلی کاپٹر کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی برفیلی ٹھنڈی فضا میں اس کے انجن کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر مجھے ہٹ کے باہر ہیلی کاپٹر کے رکنے کا احساس ہوا۔ نیل کریمر نے مجھ پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی پھر اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''آل دی بیسٹ مسٹر علی——!''

اپنی بات کے اختتام پر وہ ہٹ سے نکل گیا۔

اس طویل میٹنگ کے دوران میں نیل کریمر نے مجھ سے جتنی بھی گفتگو کی تھی، اس میں ایک لفظ بھی فضول یا فالتو نہیں تھا۔ میں نے اس کے کہے ہوئے ایک ایک جملے کو توجہ سے سنا تھا کیونکہ یہ میری زندگی کے گزرے ہوئے

[illegible] سامنے آ گئے تھے۔ اس لق و دق برف زار یعنی جزیرے والے پر میری موجودگی انہی کا ایک اسائنمنٹ تھا۔ گویا میں اب ان کے 'کنٹرول' پر تھا۔ یہ بڑی سنسنی خیز اور حیرت آمیز صورت حال تھی۔ نیل کریمر کی آخری فرمائش میرے حافظے سے چپک کر رہ گئی تھی۔ اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ میں اٹھ کر کھڑکی کے راستے اس کی رخصتی کا منظر دیکھوں۔ یقیناً وہ مجھے اس بہانے کوئی خاص الخاص چیز دکھانا چاہتا تھا ورنہ جب وہ اس کمرے سے نکلا تھا تو میرے لیے یہ اس کی رخصتی کا منظر ہی تھا۔

میں نے احتیاط کے دامن کو مضبوطی سے تھاما اور تھوڑی سی کوشش کر کے آہستگی سے بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ اس عمل میں مجھے کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ اس کا مطلب تھا، میرے زخم کی حالت تسلی بخش تھی۔ اگر میں کوئی الٹی سیدھی یا اوگی بوگی حرکت نہیں کرتا تو زخم کے معاملات کو نارمل ہی رہنا تھا۔ اگر نیل کریمر نے مجھے دعوت نظارہ دی تھی تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ جب تک میں کھڑکی کھول کر اسے دیکھ نہیں لیتا، اسے وہاں سے رخصت نہیں ہونا تھا۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے مذکورہ کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ کھڑکی پر اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ ہٹ کے باہر ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بہ سہولت کھڑکی کی کنڈی ہٹائی اور اس کے دونوں پٹ وا کر دیے۔

اگلے ہی لمحے یخ بستہ برفیلی ہوا کا ایک تھپیڑا میرے منہ پر لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے کی مدد سے میرے چہرے پر ایک طوفانی ضرب لگائی ہو۔ میرے چہرے کے عضلات سن ہو کر رہ گئے۔ منفی پینتالیس ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت بڑا قیامت خیز ہوتا ہے۔ پانی کا نقطۂ انجماد صفر درجہ سینٹی گریڈ ہے یعنی اس درجہ پر پانی جم کر برف میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور منفی پینتالیس درجے کا مطلب ہے نقطۂ انجماد سے بھی پینتالیس درجے آگے۔ پھر میں بیڈ روم کے گرم ماحول سے اٹھ کر اچانک باہر کے رگوں میں خون منجمد کر دینے والے ٹھنڈے ٹھار ماحول سے آشنا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا، اگر میں مزید چند سیکنڈ کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا تو اس آئی لینڈ کی طلسماتی ہوا کے اثر سے برف کا ہو جاؤں گا۔

میں جس مقصد سے وہاں آ کر کھڑا ہوا تھا، اسے حاصل کیے بغیر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ میں

دیکھا جو عرصے سے ہیلی کاپٹر کی آواز آرہی تھی۔ برف پوش بستہ فضا میں مجھے وہ ہیلی کاپٹر نظر آگیا۔ جب میری نگاہ ہیلی کاپٹر پر پڑی تو وہ دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہا تھا۔ میں نے ہیلی کاپٹر کے اندر نظر دوڑائی اور نیل کریمر کی دعوت کا راز مجھ پر آشکار ہوگیا۔

نیل کریمر تو ہیلی کاپٹر کے اندر موجود تھا ہی، میرے لیے حیرت اور تعجب کا باعث ہیلی کاپٹر کو اڑانے والا انسان تھا۔ پائلٹ کی مخصوص سیٹ پر ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس کے کانوں پر مخصوص ہیڈ فون اور آنکھوں پر سیاہ گاگلز تھے۔ وہ کوئی اور نہیں۔۔۔ فتنہ پرداز، ہنگامہ پرور اور حشر برپا کردینے والی اسپینش دوشیزہ ڈیلفینا عرف اینجل تھی۔

ڈیلفینا نے گردن گھما کر فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا اور ہیلی کاپٹر کو دھند بھری فضا میں بلند کردیا۔ ڈیلفینا کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ نے مجھے اندر باہر سے جلا کر رکھ دیا تھا۔ اس مسکراہٹ میں جیت کا نشہ تھا اور اکسانے والا چیلنج جیسے وہ بزبان مسکان مجھ سے کہہ رہی ہو۔ ”کیچ می اف یو کین؟“

میں چونکہ ایسا نہیں کرسکتا تھا اس لیے میں نے زور سے کھڑکی کو بند کیا اور بیڈ پر چت لیٹ کر ہانپنے لگا۔ ڈیلفینا نے مجھے اس سرد خانے راس آئی لینڈ میں پہنچا کر اپنی پرسلن باؤل والی انسلٹ کا بدلہ لے لیا تھا۔ بزبان خاموشی وہ مجھے یہ کہہ گئی تھی۔۔۔ کیوں حیران ہوتے ہو انکل ایکا کے دھندوں میں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے ابھی جو تھوڑی بہت کسرت کی تھی اس نے مجھے نڈھال کردیا تھا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا کافی کمزوری محسوس کررہا تھا۔ پچھلے پانچ چھ روز میں میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے، میں ان سے آگاہ نہیں تھا۔ نیل کریمر کے مطابق میں نے یہ عرصہ گہری بے ہوشی میں گزارا تھا۔ نیل کریمر کی بات پر اعتبار کرنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کیونکہ میری یادداشت کے مطابق میں جینا والے اپارٹمنٹ واقع کراچی، پاکستان میں ان کنٹرول ہوا تھا اور آج جب میری آنکھ کھلی تو میں نیل کریمر کے ہمراہ راس آئی لینڈ نامی اس فریزر نما جزیرے کے ایک ہٹ میں تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

اچانک مجھے نیل کریمر کی دی ہوئی رسٹ واچ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک قیمتی سوس گھڑی تھی۔ وقت گھڑی کا ڈائل نصف شب یعنی رات کے بارہ بجے کے تئیس منٹ کا وقت بتا رہا تھا اور تاریخ تھی تیس۔ یہ تاریخ تئیس منٹ پہلے شروع ہوئی تھی اور گویا وقت میں نے نیل کریمر کے ساتھ گفتگو کی تھی۔ گویا وہ جولائی کے آغاز پر اس کمرے میں داخل ہوا تھا اور دن کے لیے مجھے اس جزیرے پر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ نادیہ تیرہ جولائی بروز اتوار کراچی سے اسلام آباد روانہ ہوئی تھی اور اس سے اگلے دن چودہ جولائی بروز پیر کی رات جینا کے اپارٹمنٹ پر نصف شب کے بعد میں ہنگامی حالات سے گزر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا۔ اگر واقعتاً اس گھڑی کا وقت، دن، سب کچھ درست تھا تو پھر اس حساب سے میں سولہ دن اپنے ماحول اور حالات سے بے خبر رہا تھا۔ زندگی میں اس سے پہلے میں نے کبھی اتنے دن خود فراموشی میں نہیں گزارے تھے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرا دماغ دکھنے لگا۔ اس وقت گھڑی آدھی رات کے بعد کا وقت بتا رہی تھی اور یقیناً یہ راس آئی لینڈ کا مقامی وقت تھا۔ میں اتنی دیر تک سویا رہا تھا کہ اس وقت نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں ایک برف زار اور برف زار جزیرے پر تن تنہا پڑا تھا۔ اکیلے پن کے احساس نے مجھے قدرے اداس کردیا لیکن میں نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا کیونکہ اگر کچھ دیر تک یہ کیفیت مجھ پر طاری رہتی تو یہی اداسی، مایوسی میں بدل جاتی اور مایوسی میرے نزدیک ایک سنگین گناہ ہے جو انسان کو یا تو بے راہ روی کی طرف لے جاتا ہے اور یا پھر خودکشی پر مائل کردیتا ہے۔

میں نے اپنے ذہن کو بٹانے اور اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے بستر کو چھوڑ دیا اور سبک قدموں سے چلتے ہوئے اس ہٹ کا جائزہ لینے لگا۔ جس کمرے میں میری آنکھ کھلی تھی، وہ ایک طرح کا بیڈروم تھا۔ میں بیڈروم سے نکل کر کچن کی جانب بڑھ گیا۔ کچن کے اندر دو اسٹوو اور ضرورت کے تمام برتن موجود تھے۔ مسالا جات کے مختلف ڈبے اور امور خانہ داری میں استعمال ہونے والا سامان بھی ادھر ہی رکھا تھا۔ وہیں پر دو ڈرم کے اندر کیروسین آئل کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا جو اسٹوو جلانے اور لالٹین وغیرہ کو روشن کرنے کے کام آسکتا تھا۔ کچن کے

ایک ... فریزر بھی پڑا ہوا دکھائی دیا۔ ڈیپ فریزر کو اس ہٹ میں پاکر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ جس مقام پر درجۂ حرارت اتنا زیادہ گرا ہوا ہو کہ وہاں کی فضا اور ماحول بھی برف مکانی ہو چکے ہوں تو ایسی جگہ پر ڈیپ فریزر کا کیا کام اور وہ بھی بجلی کی عدم موجودگی میں—

میں نے اندرونی تجسس سے مجبور ہوکر اس ڈیپ فریزر کا ڈھکنا اٹھا کر اندر جھانکا۔ امید تو یہی تھی کہ ڈیپ فریزر کے اندر برف سے سامنا ہوگا لیکن اس وقت میری امید پر پانی پھر گیا جب میں نے ڈیپ فریزر کے اندر نصف درجن کے قریب پانی سے بھرے ہوئے کین رکھے دیکھے۔ اس ڈیپ فریزر کے ڈھکنے کے اندرونی طرف نوٹ نما ایک چھوٹی سی عبارت بھی لکھی نظر آئی۔ پرمانٹ مارکر کی مدد سے یہ الفاظ درج تھے— "جس چیز کو بچنے سے بچانا ہو اسے اس ڈیپ فریزر میں ڈال دیں اور پھر آن نہ کریں۔ آپ جس شے کو جس حالت میں ڈیپ فریزر کے اندر رکھیں گے وہ ہمیشہ اپنی حالت برقرار رکھے گی۔"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پانی سے بھری بوتلوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے ہر ٹن سائز بوتل یعنی کین کے اوپر "ڈرنکنگ واٹر" لکھا ہوا تھا اور یہ الفاظ بھی درج تھے۔ "اس جزیرے کی برف ہر قسم کے جراثیم سے پاک ہے لہٰذا اس برف کو پگھلا کر ڈرنکنگ واٹر تیار کیا جاسکتا ہے۔" میں نے ڈیپ فریزر کا ڈھکنا بند کیا اور اسٹور روم میں گھس گیا۔

اسٹور روم کے اندر تو دالیں، دلیا، چاول اور اسی طرح کے مختلف خشک اناج کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ علاوہ ازیں شیشے کے مرتبانوں میں بادام، اخروٹ، مونگ پھلی، کاجو اور چھوہارے بھی بھرے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ تمام ڈرائی فروٹس جسم کو توانائی بہم پہنچانے کا ایک عمدہ ذریعہ تھے۔ ان تمام خشک میوہ جات کو باقاعدہ چھیل کر کانچ کے ان مرتبانوں میں محفوظ کیا گیا تھا۔ اس ذخیرۂ خوراک کے علاوہ مذکورہ اسٹور روم میں مختلف سائز اور کیلیبر کا آتشیں اسلحہ بھی موجود تھا۔ اس ہٹ نے تو دلی طور پر مجھے یہ اطمینان دلا دیا کہ میں بھوکا پیاسا بے بسی اور بے کسی کی موت تو ہرگز نہیں مروں گا۔

میں دوبارہ بیڈروم میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ نیل کریمر کی عطا کردہ گھڑی کو میں نے کلائی پر باندھ لیا تھا۔

والے تھے۔ یہ گھڑی میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ مجھے نیند تو نہیں آرہی تھی تاہم میں اچھی خاصی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور جینا شارہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر ڈیلفیا بھی چپکے سے میری سوچ میں داخل ہوگئی۔ اس کا فرار اور ... آتشیں حسینہ نے اپنی ذہانت اور طاقت کے بل بوتے پر مجھے عارضی شکست سے ہمکنار کر دیا تھا۔ ڈیلفیا کے تصور نے میری سوچ میں کڑواہٹ بھر دی۔ قبل اس کے کہ میں خیالوں ہی خیالوں میں ڈیلفیا کو کھری کھری سناتا، ایک عجیب سی آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کرلی۔

"آووو— ہاووو— ہووو—!"

اس صدا میں بلا کا درد اور کرب پایا جاتا تھا۔ میں پہلے بھی جانوروں کی آوازوں سے آشنا تھا۔ ان میں یہ آواز بھیڑیے کی آواز سے گہری مشابہت رکھتی تھی لیکن میری مستند معلومات کے مطابق قطب جنوبی یعنی انٹارکٹیکا پر پولر بیئرز، رینڈیئرز اور بھیڑیے بالکل نہیں پائے جاتے تھے۔ تو پھر یہ بھیڑیے جیسی "آووو—" کس جانور کی تھی؟

نیل کریمر کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں میرا ذہن قطب جنوبی کے پاس تمام خطرناک جانوروں کو دہرانے لگا— اسکوا، وانڈرنگ البٹراس، لیگرڈ سیل، ڈالفن، ایلیفینٹ سیل اور سالمن شارک— ان میں سے کون تھا جو رات کے اس پہر بھیڑیے سے مشابہ آواز میں نوحہ گری کر رہا تھا؟

میرے لیے سب سے زیادہ تشویش کا پہلو یہ تھا کہ مذکورہ منحوس آواز لمحہ بہ لمحہ میرے ہٹ کے قریب آرہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا یا تھی، اس سے مجھے تو نپٹنا ہی تھا اور اس "نپٹنا" کے لیے اس ہٹ کے اسٹور روم میں ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ نیل کریمر نے کہا تھا، یہ اسلحہ کسی بھی نوعیت کی ہنگامی صورت حال میں تمہارے کام آئے گا اور شاید— ہنگامہ برپا ہونے کا وقت آگیا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور پرعزم انداز میں اسٹور روم کی جانب بڑھ گیا—!

امنگوں، حوصلوں اور امیدوں کے بیچ رواں، کہیں محبتوں اور چاہتوں کے منظر، گم گشتہ منزل کی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

کاغذات کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ یہ ایک کریم رنگ کا باریک لفافہ تھا جو کافی مہنگا معلوم ہوتا تھا۔ آلسٹن نے اسے چھوڑا اور باقی کاغذات کو کھول کر دیکھنے لگا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کام کے دوران سب سے اہم چیز وہ آخر میں دیکھنا پسند کرتا تھا۔ اس نے نہایت سلیقے سے چاقو سے اس لفافے کو ایک طرف سے کاٹا۔ اندر سے ایک سنہری رنگ کے حاشیے والا کارڈ برآمد ہوا جس کے درمیان میں بڑے بڑے حروف میں اس کا نام رومن زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

ساتھ "مسٹر آلسٹن ڈرینفیلڈ— جو ایک ثابت شدہ پرکشش شخصیت ہے، کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنا مہمان بناتے ہوئے ہم انہیں ہفتہ کی رات ... سے آٹھ بجے تک کے لیے کھانے پر مدعو کرتا ہے۔ رابطہ بعد میں کیا جائے گا۔"

وہ چونکا ہوگیا۔ یہ کوئی مارکیٹنگ کا نیا طریقہ ہو سکتا تھا کیونکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے اسے گاڑیوں اور فرنیچر کے ڈیلرز نے نہایت چالاکی کے ساتھ پارٹیوں میں بلایا تھا۔ دعوت

باریک بین

زبیر حسن

اتنی خوب صورت کائنات تخلیق کر کے بھی اللہ نے اس میں ایک ادھوراپن رکھ چھوڑا ہے مگر ایک انسان ہے کہ... اسے اپنے ہر کام، اپنی ذات پر کچھ ایسا اندھا بھروسا ہوتا ہے جیسے وہی ایک کامل ہنرمند ہے... اور اس کا کیا ہوا ہر کام پرفیکٹ ہے۔ اسے بھی خود پر کچھ ایسا ہی گمان تھا مگر پھر اس ایک نقص نے اس کی زندگی کی بازی ہی مات کر ڈالی۔

اپنی ہر سوچ پر خوب صورتی سے عمل کرنے والے ایک پرشکوہ شخص کا قصہ



قریب سے جانتا ہی نہیں تھا۔ اس نے دعوت نامے کو بار بار پڑھا۔ اسے اپنے لیے استعمال کیے گئے الفاظ پسند آئے۔ ثابت شدہ پرفیکشنسٹ...... کیونکہ وہ تھا ہی ایسا۔ ہر چیز میں پرفیکشن تلاش کرنے والا۔ اور اسے یہ بار بار پڑھ کر اچھا لگ رہا تھا لیکن دعوت نامے پر کسی کلب کا نام یا پتا نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ پریشان بھی تھا۔ کیونکہ وہ ایک محتاط شخص تھا جو کہیں آنے جانے سے پہلے ایسی چیزوں کو بغور دیکھتا تھا۔

شام آٹھ بج کر تیس منٹ کے قریب اس نے ایک کال ریسیو کی۔ بہت ہی خوبصورت اور بھاری بھرکم آواز میں اس کا نام پکارا گیا۔

"جی......؟"

"آپ نے یقیناً اکتیس جنوری کو کھانے کا ایک دعوت نامہ موصول کیا ہوگا۔"

"کون سا دعوت نامہ؟" ڈکنس نے جواب دیا جیسے وہ پہلے ہی بہت سے دعوت نامے وصول کر چکا ہو۔

"سنہرے حاشیے والا کارڈ...... جس پر آپ کو ایک ثابت شدہ پرفیکشنسٹ قرار دیا گیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اسے ضرور قبول کریں گے۔"

"آپ لوگ کون ہیں...... مجھے سچ بتایئے گا؟"

"ہم کچھ لوگ ہیں...... بالکل آپ جیسی ذہنیت رکھنے والے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ ہم میں بالکل فٹ رہیں گے۔"

"کیا یہ کوئی شعبدہ بازی ہے؟ مجھے کوئی شوق نہیں ہے فارغ لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا۔"

"ہم فارغ نہیں ہیں مسٹر ڈکنس۔"

"تم لوگوں نے میرا نام کہاں سے لیا؟"

"آپ کا نام کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا اور آپ ایک مضبوط امیدوار کے طور پر ابھرے ہیں۔"

"سچ میں؟" اس کو اب غصہ آ رہا تھا۔ "کیا آپ وضاحت کریں گے؟"

"اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ کو کچھ بیچنے جا رہا ہوں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"میں تقریر نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہم بھی تقریروں میں الجھنے والے نہیں ہیں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ آپ کو گاڑی بھی بھجوائی جائے گی۔"

"آپ اپنا نام بتانے کی زحمت کریں گے؟"

ہوں کہ آپ اس لیے جا رہے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔" ڈکنس نے سوچا۔ "ٹھیک ہے مسٹر ہوپکر۔"

"بہت خوب۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ پونے آٹھ بجے تک تیار ہو جائیں گے کیونکہ آپ ایک پرفیکشنسٹ ہیں۔ اگر آپ کچھ پریشان ہیں تو میں آپ کو بتادوں کہ یہ صرف کھانا ہے اور آپ کالا کوٹ اور کالی ٹائی پہنیں گے۔ میں آپ کو لینے خود آؤں گا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ آپ مجھے صرف ڈیوڈ بلا سکتے ہیں۔"

کال کے بعد ڈکنس اس سوچ میں تھا کہ کیسے اس ڈیوڈ ہوپکر کو ڈھونڈا جائے۔ فون ڈائریکٹری اور میڈیکل رجسٹری کی مدد سے وہ تین ڈیوڈ ہوپکر کے نمبر تلاش کر چکا تھا اور جب ان سے فون پر بات ہوئی تو تینوں کی آوازوں میں اور پہلے والے ڈیوڈ ہوپکر کی آواز میں بہت فرق تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر کس نے اس کا نام کمیٹی کے سامنے رکھا ہوگا۔ اور یہ بہت دلچسپ ہوگا جب وہ مسٹر ڈیوڈ ہوپکر کو بذات خود دیکھے گا۔

یہ جنوری کا آخری جمعہ تھا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ ہوپکر ایک دبلا پتلا اور گہرے رنگ کا آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب اور قد درمیانہ تھا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔

"کیا آپ مجھے اپنے ساتھ کچھ لے جانے دیں گے۔ ایک مشروب کی بوتل ہی سہی۔"

"نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں مسٹر ڈکنس۔"

مسٹر ڈیوڈ کی شخصیت نے اسے متاثر کیا تھا۔ اب وہ ایک خاص شام کی امید لگائے بیٹھا تھا۔

وہ دونوں جب باہر نکلے تو باوردی ڈرائیور کے ساتھ ایک کالے رنگ کی کار ان کی منتظر تھی۔

"ہم وہاں مشروب سے لطف اندوز ہوں گے مسٹر ڈکنس...... اور یہ بھی غلط ہوگا اگر میں کہوں کہ ہم وہاں صرف مشروب پینے ہی جا رہے ہیں۔"

جب وہ دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے تو ڈیوڈ نے ایک بٹن دبا دیا جس سے گاڑی کی تمام کھڑکیاں، ڈرائیور اور ان کے درمیان کالے رنگ کا شیشہ حائل ہو گیا۔ ڈکنس اب باہر نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی ڈرائیور کو۔

"یہ آپ کے فائدے کے لیے ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"ہم اپنے مہمانوں کو ہمیشہ کلب کی پرائیویسی کو احترام کی نظر سے دیکھنے کا کہتے ہیں۔ اگر آپ یہ نہیں جانتے کہ ہم

کہاں جا رہے ہیں تو آپ کسی کو بتا بھی نہیں سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ہم اکیلے ہیں اور میں ساتھ آنے پر رضامند بھی ہوں۔ کیا اب آپ کچھ اور بتانا پسند کریں گے؟"

"تھوڑا بہت۔ اصل میں ہم آپ جیسے ہی ہیں۔"

"پرفیکشنسٹ؟"

"یہ ہماری چند خاصیتوں میں سے ایک ہے۔" وہ مسکرایا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیوں بلوایا جا رہا ہے...... کیا میں کسی کلب کے رکن کو جانتا ہوں؟"

"مجھے نہیں لگتا۔"

"پھر کیسے؟"

"جو کچھ آپ نے حاصل کیا یہ اس کی وجہ سے ہے۔"

ڈکنس سوچنے لگا کہ اس نے آخر ایسا کیا حاصل کر لیا جس کی وجہ سے وہ ان کی نظروں میں آ گیا۔ وہ سول سروس میں اپنا ایک اچھا ماضی رکھتا تھا۔ وہ دوران ملازمت ملنے والے اپنے انعامات کو بھی سوچ رہا تھا کہ شاید ان میں سے کسی وجہ سے اس اعلیٰ کلاس کلب کی اس پر نظر پڑی ہو۔

"کلب میں اور کتنے رکن ہیں؟"

"ہمارے معیار پر بہت کم لوگ اترتے ہیں۔"

"لیکن ابھی کتنے ہیں؟"

"ابھی پانچ ہیں۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔"

"ہم کم ہیں لیکن خاص ہیں۔"

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں نے مجھے کیوں دعوت دی۔"

"جلد معلوم ہو جائے گا۔"

کچھ اور چھوٹے چھوٹے سوالوں کے جوابات حاصل کرنے میں ڈکنس کامیاب رہا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کلب سو سال پرانا ہے۔ وہ صرف اسی صورت میں کلب کو جوائن کر سکتا تھا جب کلب کے باقی ارکان اس کی منظوری دیتے۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہ کوئی احمق لوگ ہی نہ نکل آئیں۔ پھر تقریباً ایک گھنٹے سے پہلے ہی گاڑی رک گئی اور ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ گاڑی سے نکلتے ہی ڈکنس نے فوراً ڈرائیور کو دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا لیکن یہ بات تو ڈکنس پر واضح تھی کہ وہ لندن شہر میں ہی ہیں۔ وہاں گھروں کے باہر درخت لگے ہوئے تھے۔ ڈکنس جگہ تو پہچان نہ پایا کیونکہ لندن میں کئی جگہیں ایسی ہی تھیں۔

"سیدھا چلتے ہیں۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "دروازہ کھلا ہے۔"

اور ہر طرف رنگ برنگی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ڈکنس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ڈیوڈ نے اس کا بازو پکڑا...... اور ساتھ ہی ایک اور دروازہ کھول کر اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

"میرے معزز ساتھیو!" ڈیوڈ نے اونچی آواز میں کہا۔ "میں پیش کرنے جا رہا ہوں آپ کے سامنے مسٹر ڈکنس ورتھنگ کو......"

یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ چار آدمی ہاتھوں میں مشروب کے گلاس لیے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ چالیس سال کے قریب تھے جبکہ دو قدرے بوڑھے تھے۔ ایک قدرے جوان شخص نے ایک لمبا سا چوغہ پہن رکھا تھا۔ ایک بوڑھے شخص نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا۔ "جوئے فریک...... میں یہاں کا صدر ہوں جو کہ ایک خاص طریقہ کار کے بعد ہی نئے لوگوں کو دعوت دینے کے بعد بلاتا ہوں۔"

ان سب کے چہروں پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ تھی۔ جوئے فریک آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ "میں اس سال کا تھا جب ابھی ہو چکا تھا کہ میں نے اس کلب کی ممبرشپ حاصل کی۔ لیکن کلب قوانین کے مطابق میں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کلب کو جوائن کیا۔"

ڈکنس کے پاس کھڑے ڈیوڈ نے کچھ نہ کہا۔

"اور یہ میرے ساتھ کھڑے اس کلب کے باقی ممبران ہیں۔" جوئے فریک بولا۔ "یہ مسٹر ویلے ونڈروپ وہ پہلے شخص جنہوں نے رائسن زہر کو ایک منافع بخش کاروبار بنایا اور اب یہ ایک بہت ہی کامیاب کاروباری شخص پورے یورپ میں چھا رہے ہیں۔"

"کیا آپ رائس یعنی چاول کی بات کر رہے ہیں؟" ڈکنس نے پوچھا۔

"نہیں رائسن...... یہ ایک دیسی مہلک زہر ہوتا ہے۔"

یہ ایک مشکل کام تھا۔ زہر اور کامیاب کاروباری شخص کے تعلق کو سمجھنا۔ ویلے ونڈروپ نے ڈکنس سے ہاتھ ملایا۔

جوئے فریک نے چوتھے والے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیں ایلیکس سمتھی۔ ہمارے سب سے نوجوان ممبر۔ جو اس کلب کو سب سے زیادہ عطیہ دیتے ہیں۔ تقریباً سات سال سے یہ ہمارے ساتھ ہیں۔...... کیوں ایلیکس؟"

"تقریباً آٹھ ہی......" ایلیکس نے کہا۔

ایلیکس کا کاروبار ایک نہایت خوبصورت اور دلکش چاقو

"اور اب وقت ہے مسٹر مائیکل پیٹ اسٹرونتھر سے ملنے کا۔ دنیا کے مانے ہوئے مارشل آرٹ کے ماہر۔ ذرا دھیان سے مسٹر مائیکل سے ہاتھ ملائیے گا۔"

ہر طرف ہلکے پھلکے قہقہے بلند ہوئے اور پھر مائیکل کے ہاتھ ملانے کے طریقے سے ہی ڈکنس کو اس کی مہارت کا اندازہ ہو گیا۔

"اور آپ ہمارے آخری ممبر ڈاکٹر ڈیوڈ ہو بیکر سے پہلے مل چکے ہیں۔ جن سے اچھا چلتا ڈاکٹر دنیا میں موجود نہیں۔"

ڈکنس نے ایک بار پھر سب کو دیکھا اور بولا۔ "کتنے ماہر لوگ جمع ہیں یہاں لیکن آپ سب میں مشترک یا متعلق بات کیا ہے؟ جس کی وجہ سے آپ یہاں اکٹھے ہیں؟"

جوئے فریک نے اس کا جواب دیا۔ "ہم سب جو یہاں موجود ہیں، ہم میں سے ہر ایک، ایک پرفیکٹ قتل کر چکا ہے۔"

یہ جواب ڈکنس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اس بار کوئی مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔

"اب ہمیں کھانے کی میز پر جانا چاہیے۔" جوئے فریک نے مشورہ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ سب اگلے کمرے میں موجود گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈکنس اس سوچ میں تھا کہ اگر یہ سب درست ہے تو آج کھانا وہ ایک قاتلوں کے گروپ کے ساتھ کھانے والا ہے۔ وہ پولیس کو مطلع کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن ایک مارشل آرٹ اور... چاقو میں مہارت رکھنے والے اشخاص کے درمیان بیٹھ کر یہ خیال صرف خیال ہی ہو سکتا تھا۔

ایک ویٹر نے آ کر سب کے گلاسوں میں مشروب انڈیلا۔

"یہ گونگا ہے۔" جوئے فریک نے ویٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ انگلش نہیں جانتا۔"

اس کے بعد جوئے نے مشروب سے بھرا گلاس اٹھایا اور بولا۔ "یہ جام ہے تھامس ڈی کوئنسی کے نام ___ جس نے ایک بہت پیارے قتل پر مضمون لکھا تھا اور جس میں بتایا تھا کہ قتل کرنا ایک بہت خاص قسم کا تجربہ ہے۔ خاص کر جب کسی کو معلوم ہی نہ ہو کہ اصل قاتل کون ہے۔"

"تھامس ڈی کوئنسی۔" سب نے مل کر کہا۔ صرف ڈکنس کی آواز قدرے آہستہ تھی۔

"تم یقیناً حیران ہو گے کہ ہم نے تمہیں کیوں

[illegible] تھا۔ "تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ ہم اپنے راز ایک دوسرے کے سامنے کیوں کھول رہے ہیں؟ ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ ہم اپنے راز یہاں بتا کر سکون محسوس کرتے ہیں مسٹر ڈکنس! جب ہم قتل کرتے ہیں اور پھر بہت سا وقت اس پریشانی میں گزرتا ہے کہ اچانک پولیس کا سائرن سنائی دے گا اور پولیس ہمارے دروازے پر ہو گی۔ پھر کچھ عرصے گزر جاتے ہیں اور آپ کا راز راز ہی رہتا ہے لیکن پھر آپ بور ہو جاتے ہیں۔ آپ کچھ اور کرنا چاہتے ہیں پھر کچھ سالوں میں یہ کلب آپ کو جوائن کر لیتا ہے اور آپ یہاں کھانے پر اکٹھا ہوتے ہیں۔"

ڈیوڈ ہو بیکر نے بھی بات میں حصہ ڈالا۔ "پھر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جو کیا، اس میں آپ اکیلے نہیں ہیں اور اس کی دنیا میں کتنی کوئی اہمیت بھی ہے۔ جہاں آپ کھل کر راز شیئر کر سکتے ہیں۔ بہت خوب ___ آخر کوئی تو جگہ ہے جہاں آپ اپنے کیے گئے قتل کو کھل کر بیان کر سکتے ہیں۔"

"آپ کیسے ایک دوسرے پر اتنا یقین کر سکتے ہیں؟" ڈکنس نے بلاتوقف پوچھا۔

"یہاں ہم سب کے مختلف راز ہیں۔ اگر کوئی ہم میں غداری کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی ساتھ ڈبو دے گا کیونکہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

جوئے فریک نے اور وضاحت کی۔ "یہی حفاظتی تدابیر ہیں جو سو سال سے چلی آ رہی ہیں۔ سب سے پہلے ممبر کا نام جیک تھا جو اس کلب کا کرتا دھرتا تھا۔ اگر وہ اور اس کی شناخت سو سال سے معاشرے سے چھپی رہی تو ہماری کیوں نہیں چھپ سکتی۔"

"یہ تو بہت ہی کمال کی بات ہے۔ ویسے جیک تھا کون؟"

"کوئی بھی اس کے بارے میں منہ نہیں کھول سکتا۔" مائیکل نے کہا۔

"کیا میں کچھ اور بھی پوچھ سکتا ہوں اس کے بارے میں؟"

"نہیں جب تک تم باقاعدہ اس کلب میں شمولیت نہیں اختیار کر لیتے۔" جوئے فریک نے کہا۔

ڈکنس اس حوالے سے کچھ پریشان تھا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کلب کو جوائن نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس نے کبھی کسی کو قتل ہی نہیں کیا تھا لیکن اس کے اندر ایک آواز اسے خاموش رہنے کا کہہ رہی تھی کیونکہ یہ سب ممبر اسے اپنے جیسا ہی سمجھ رہے تھے۔ شاید اس حوالے سے انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی تھی اور وہ سچ بتا کر کوئی بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

"ہمارے کچھ اصول ہیں ___" ویسے تو مشروب نے کہا۔

جوئے فریک نے بات آگے بڑھائی۔ "ہمیں یقین ہے کہ تم بھی اس کلب کو جوائن کرنا چاہو گے لیکن ہمیں اصولوں کو بھی دیکھنا ہے۔ تم کسی کو اس شام کے بارے میں نہیں بتاؤ گے اور اس کلب کے ہونے کا تو بالکل بھی ذکر نہیں کرو گے۔ یہ بہت احتیاط طلب ہوگا اگر کوئی ہمارا راز کھولے گا تو۔"

"اور وہ اصول کیا ہیں؟" ڈکنس نے پوچھا۔

"ایک تو یہی ہے کہ کسی ممبر کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے۔"

"میرے ہونٹ ہمیشہ بند رہیں گے۔" ڈکنس نے جواب دیا۔

کھانا لگ چکا تھا اور اب سب کھانے کے ساتھ ساتھ جرائم پر بھی باتیں کر رہے تھے۔ جیسا کہ "سائلنس آف لیمب" ___ پھر وہ اس کا انجام بھی زیر بحث لائے کہ جو اس کلب کے بارے میں کسی کو کچھ بتائے گا۔ ڈکنس کو اب کوئی شک نہیں تھا کہ تمام ممبرز ہی ایک قاتل تصور کر رہے ہیں۔

کھانے کے آخر میں بالآخر ڈکنس بولا۔ "یہ ایک خوبصورت شام تھی۔ کیا میں اس کلب کی شمولیت اختیار کر سکتا ہوں؟"

"تم شامل ہونا چاہو گے؟" جوئے فریک نے کہا۔ "یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔"

"یہ تمہارے لیے ایک کلب ممبر کی حیثیت سے بہت ہی اچھا رہے گا۔" ویلے نے کہا۔ "لیکن تمہیں ہمیں کوئی ثبوت دینا ہوگا کہ تم واقعی ہم میں سے ایک ہو ___ ایک قاتل۔"

ڈکنس نے بڑے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے؟ مجھے تو لگا کہ آپ کے پاس پہلے سے ہی کچھ ہے؟"

"دیکھو، ہمارے پاس کیا ہے اور تم ہمیں کیا دیتے ہو ___ اس میں فرق ہے۔"

"یہ آسان نہیں ہے۔" ڈکنس نے کہا۔

"لیکن یہ اصول ہے۔"

ڈکنس بولا۔ "کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ کیسے آپ نے مجھے قاتل سمجھا اور دعوت نامہ بھیجا؟"

"تجربہ ___" جوئے فریک بولا۔ "ہمارے پاس پولیس سے بڑھ کر تجربہ ہے۔"

مائیکل جو اب تک خاموش تھا بولا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ اس شام تم وہاں تھے اور وہاں تم سے بڑھ کر ایسا کوئی نہیں تھا جو یہ کام کرتا۔"

[illegible] نے کہا۔

"ہتھیار؟" مائیکل نے کہا۔

"ہتھیار میں نے پھینک دیا تھا۔" ڈکنس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا کیونکہ صورت حال بہت گمبھیر ہو چکی تھی۔ "آپ لوگوں کے پاس کچھ تو ہوگا؟"

"نہیں ___" مائیکل نے کہا۔ "ہم نے کہا نا کہ ہمارے پاس صرف تجربہ ہے۔"

"ٹھیک ہے بڑے میاں۔" ویلے نے کہا۔ "یہ اب تمہارے اوپر ہے کہ تم ہمیں کیسے ثبوت مہیا کرتے ہو۔"

"کتنا وقت ہے میرے پاس؟"

"اگلی ملاقات جولائی میں ہوگی۔ اس وقت ہم تمہیں مستقل ممبر بنا دیں گے۔"

پھر کچھ اور باتیں چلتی رہیں۔ آخر میں کافی کا دور چلا اور وہ شام اختتام کو پہنچی۔ ڈیوڈ نے کہا کہ کار باہر انتظار کر رہی ہے۔ واپسی پر ڈکنس بہت پریشان تھا لیکن وہ ڈیوڈ پر اپنی حالت ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"یہ ایک بہت اچھی شام تھی لیکن مجھے ایک مسئلہ در پیش ہے۔"

"کیا مسئلہ؟"

"مجھے یہ معلوم نہیں اور یاد کہ میرے کس قتل کے بارے میں آپ لوگ بات کر رہے تھے؟"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ایک اجرتی قاتل ہو؟"

ڈکنس نے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ کافی عرصہ ہو چکا ہے۔"

"ہم جیک وی ڈرنگ واٹر کے قتل کی بات کر رہے ہیں جو 1995ء کی سول سروس کانفرنس کے دوران ہوا تھا۔"

جیک وی ڈرنگ واٹر ___ ڈکنس کو یاد آیا کہ ہاں وہ اس انٹرنیشنل کانفرنس میں شریک تھا اور پھر اگلی صبح وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں مردہ پایا گیا تھا۔

"لیکن وہ تو ہارٹ اٹیک تھا۔"

"کاغذوں میں ___" ڈیوڈ نے کہا۔

"تو تم نے کیا سنا اس کے بارے میں؟"

"اس کی سیکریٹری نے اصل بات چھپائی تھی کیونکہ وہاں بہت بڑا ہنگامہ ہو سکتا تھا۔ تم نے یہ کیسے کیا؟ مجھے لگتا ہے تم نے زہر اس کے آفٹر شیو میں مکس کیا ہوگا۔"

"یہ میرا ایک راز ہے۔" ڈکنس نے چالاکی سے کہا۔

"یقیناً ___ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تم اس سے ناخوش تھے۔ کئی سال پہلے تم اس کے پیچھے کام بھی کر چکے تھے۔"

وارڈز جس نے اس کی نوکری کو نقصان بھی پہنچایا تھا لیکن جیک ڈرنک وارڈز کو وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ شاید دونوں کی مماثلت کی بنا پر کلب کے ممبران کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

"تم لوگوں نے کیسے جانا کہ میں اس کے آفس میں تھا؟"

"تم اسی فلور پر گئے تھے جہاں اس کا کمرا تھا اور پھر تم کسی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور زہر کسی چیز میں شامل کر دیا۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے زہر کہاں سے لیا؟"

ڈیوڈ نے قہقہہ لگایا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے گھر میں لارنل کے پودے ہیں۔ ان کی پتیوں میں زہر ہوتا ہے۔ تم نے انہیں خشک کیا اور پیس کر زہر بنایا۔"

"میں اپنا راز کھولنا نہیں چاہتا۔" ڈکسن نے کہا۔ "اگر مجھے کلب میں شمولیت اختیار کرنی ہے تو مجھے لازماً کوئی نہ کوئی ثبوت دینا ہوگا۔"

"اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ سب تمہیں پسند کرتے ہیں اور تمہیں اپنے ساتھ کلب میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔"

"اور اگر میں کلب میں شامل ہونا نہ چاہوں تو؟"

"کیوں؟"

"میری کچھ ذاتی وجوہات ہو سکتی ہیں۔"

ڈیوڈ نے اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ "ہم بہت سنجیدہ لوگ ہیں ڈکسن۔ ہم نے تمہیں دعوت دی کیونکہ تم ایک پرفیکشنسٹ ہو۔"

"لیکن تم لوگوں نے کوئی وضاحت نہیں دی مجھے۔"

"اس کو تم کلب کے نظریے سے دیکھو۔ اب تمہاری اہمیت پہلے والی نہیں رہی۔ ہم خطرناک لوگ ہیں ڈکسن۔ اب اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں کہ تمہیں ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔"

"لیکن اگر میں ثابت ہی نہ کر سکا کہ قتل میں نے کیا تھا تو پھر؟"

"تمہیں کرنا پڑے گا اور اگر نہ ثابت کر سکے تو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔"

اور پھر اس شام کا اختتام ہو گیا۔

اگلے تین ہفتوں تک اسے ٹھیک سے نیند بھی نہ آ سکی۔ جب بھی اس کی آنکھ لگتی تو خواب میں اسے کوئی اپنا گلا دباتا نظر آتا۔

اگر وہ ان کو بتاتا کہ جیک ڈرنک وارڈز کا قتل اس نے نہیں کیا ہے تو کلب والے اسے اپنی رازداری کے لیے ایک خطرہ محسوس کرتے اور اگر وہ جعلی ثبوت بناتا تو پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی کوئی عام لوگ نہیں تھے اور ویسے بھی جعلی ثبوت بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ سب نہایت زیرک انسان تھے۔

"تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا۔" ڈیوڈ ہوپکر کی بات اسے یاد آئی۔

وہ ہر کلب نیوز پیپر لائبریری میں گیا اور جیک ڈرنک وارڈز کے متعلق چھپنے والی تمام خبریں اور رپورٹس پڑھیں۔ اس نے سب پڑھ لیں مگر اس سے اس کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوا۔ انسداد دہشت گردی اسکواڈ اور ایم آئی فائیو... سب کی رپورٹس نے جیک کی موت کی وجہ ہارٹ اٹیک بیان کی تھی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیسے ثبوت تیار کرے۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ یہ تو ڈکسن پر واضح ہو چکا تھا کہ کلب ممبران کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کبھی اس کا دل کرتا کہ وہ کلب ممبران کو سچ بتا دے لیکن پھر وہ خوف کی وجہ سے کچھ اور سوچنے لگتا۔ کسی کی صبح اسے ایک بہت زبردست خیال آیا۔ یہ خیال اس کو ڈیوڈ ہوپکر کی اس بات پر آیا تھا جب اس نے کہا تھا۔ "کیا تم ایجرٹن قاتل ہو؟"

خیال یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ وہ جیک کے قتل کا کوئی ثبوت بنائے، کیوں نہ وہ کسی اور قتل کا ثبوت لے کر کلب کے سامنے پیش ہو جائے۔ آئے روز کوئی نہ کوئی غریب لندن میں خودکشی کرتا تھا۔ کیوں نہ ایسے ہی کسی خودکشی کرنے والی لاش سے کچھ ثبوت حاصل کر کے وہ کلب ممبران کے سامنے پیش کرے اور یہ باور کرائے کہ وہ ایک ایجرٹن قاتل ہے۔ جو اس طرح قتل کرتا ہے کہ قتل، قتل نہ لگے بلکہ خودکشی نظر آئے۔ جس کے بعد اسے کلب میں شامل کر لیا جائے گا۔ کچھ عرصے بعد وہ خود کو اس کلب سے آہستہ آہستہ الگ کرلے گا اور کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کیونکہ تب تک کلب ممبران کو اس بات کا یقین ہو چکا ہوگا کہ وہ ان کے کلب کی رازداری کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتا۔ سارا کھیل کچھ وقت گزارنے کا تھا۔

اب اسے انتظار تھا کہ شہر میں کوئی شخص خودکشی کرلے اور وہ وہاں پہنچ کر کوئی ثبوت حاصل کرلے۔ اب وہ سارا دن اخبارات پڑھتا کہ شہر میں کسی نے کوئی خودکشی کی ہو لیکن ابھی تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ جون کا مہینا ختم ہوا اور اسے دوسرا ایک دعوت نامہ پھر موصول ہوا جو پہلے ہی لفافے میں بند تھا۔

دیا تھا کہ ہم سب نہیں بلکہ بہت ہی احترام سے ڈکسن ڈرینچنڈ" کو شام کے کھانے کی دعوت دیتا ہے جو کہ جولائی انہیں کو سات بج کر تیس منٹ سے... آٹھ بجے کے درمیان ہوگی۔ رابطہ بعد میں کیا جائے گا۔"

اس بار دعوت نامے کے الفاظ اسے حواس زدہ کر گئے۔ وہ تھوڑا ڈرا ہوا تھا کیونکہ اگر وہ وقت پر ثبوت نہ پیش کر سکا تو وہ اسے قتل کر سکتے تھے۔ اب بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اگلے دو ہفتوں میں وہ خودکشی کر لیتا۔

اس دن اس نے ایک کے بجائے تین اخبار خریدے لیکن کوئی کامیابی نہیں ملی۔ پھر آخرکار خودکشی کی ایک خبر اس تک پہنچ گئی۔ لیکن یہ خبر اسے اخبار سے نہیں بلکہ فون کال سے موصول ہوئی جو اس کے ایک پرانے ساتھی ہیری پیچ نے کی تھی جو اس کے ساتھ سول سروس میں تھا۔ ان کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی بڑے دنوں بعد اس نے اس کی آواز سنی۔

"ایک بری خبر ہے۔" ہیری نے کہا۔ "تم جانتے ہو نا... ہلی لنڈر کو؟"

"کیوں نہیں۔ میں جانتا ہوں۔" ڈکسن نے کہا۔ "ہم نے بارہ سال ایک ساتھ کام کیا ہے۔"

"اس نے کل رات ہوٹل کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو ختم کر لیا۔"

"ہلی نے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"جب میں نے سنا تھا، مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے پریشان تھا۔ آفس میں تو وہ ہمیشہ سب کو ہنساتا تھا۔ کیا آدمی تھا وہ..."

"اس کی بیوی تو بہت پریشان ہوگی۔" ڈکسن نے کہا۔

"وہ اس وقت اپنی بہن کے ساتھ ہے۔ ہر کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے۔ تم بھی اس سے رابطہ کرو۔"

"ٹھیک ہے... تم نے کہا کہ یہ کل ہوا ہے؟"

"ہاں... کل شام ہی۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ کون سے ہوٹل میں؟"

"دی اسٹوریہ... کمرا نمبر 1313۔ لوگ کہتے ہیں کہ 13 کا عدد منحوس ہوتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں ہوتا۔"

یہ ایک بری خبر تھی لیکن ڈکسن کے لیے یہ ایک زبردست واقعہ تھا۔ ہلی اس کے ساتھ کام کر چکا تھا اور اب اس کی موت سے ڈکسن فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس نے کمرا سیل کر دیا ہوگا لیکن اب وہ اپنا منصوبہ بنا چکا تھا۔ وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے بس ہلی لنڈر کے اس کمرے سے کچھ چیزیں اٹھانی تھیں جنہیں کلب کے ممبران کے سامنے پیش کر کے وہ یہ ثابت کرتا کہ اس نے ہی اپنے پرانے کولیگ کو قتل کیا ہے۔

وہ پانچ بج کر تیس منٹ پر لندن شہر روانہ ہوا۔ دو گھنٹے میں وہ مین سٹی میں تھا پھر ایک ٹیکسی کے ذریعے وہ ہوٹل پہنچا۔ ہوٹل ایک اونچی عمارت تھی۔ ہر کمرے کے باہر لوہے کی بالکونیاں تھیں جو زیادہ فاصلے پر نہ تھیں۔ اس نے بغور عمارت کا جائزہ لیا۔

وہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا۔ کوئی بھی آتے جاتے اسے غور سے نہیں دیکھ رہا تھا جس سے وہ کچھ اور پراعتماد ہو گیا۔ اب اسے کمرا نمبر 1313 کی تلاش تھی اور وہ اسے جلد ہی مل گیا۔ کوئی پولیس والا وہاں موجود نہیں تھا اور کمرا ابھی سیل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ واپس آیا اور کاؤنٹر سے کمرا نمبر 1312 کی چابی مانگی۔ یہ کمرا اس کے ساتھ والا کمرا تھا اور خالی تھا۔ اس کی چابی اسے آسانی سے مل گئی۔ وہ دوبارہ تیرھویں فلور پر آیا اور کمرا نمبر 1312 میں داخل ہو گیا۔ وہ اس کمرے کی بالکونی سے ساتھ والے کمرے یعنی 1313 کی بالکونی پر جا کر اس کمرے کے اندر سے کوئی ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ بڑی آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے کمرے کی بتیاں نہیں جلائیں اور اندھیرے میں ہی بالکونی کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک اس کا پاؤں ایک سوٹ کیس سے ٹکرایا جو کسی بے فکرے مسافر نے دروازے کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔

تبھی اندھیرے میں ابھرنے والی ایک نسوانی آواز نے اسے منجمد کر دیا۔ "البرٹ! کیا یہ تم ہو؟"

وہ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔ یہ اس کے منصوبے کا حصہ نہیں تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کمرے میں موجود ہو کیونکہ وہ ابھی ابھی اس کمرے کی چابی کاؤنٹر سے لے کر آیا تھا۔

"جان! کیا تم وہ لے آئے ہو جس کے لیے تم باہر گئے تھے...؟" لڑکی کی آواز دوبارہ ابھری۔

ڈکسن بری طرح پھنس چکا تھا۔ اس بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

"تم روشنی کیوں نہیں جلاتے؟ میں بستر پر لیٹ چکی ہوں۔"

آواز اسے مسلسل پریشان کیے جا رہی تھی۔ وہ کیا کرے؟ اگر وہ کچھ بولتا تو لڑکی چیخ پڑتی۔ وہ اٹھ کر خود سے لائٹ جلا سکتی تھی اور اس کا منصوبہ ختم ہو جاتا۔

"البرٹ..." اب کی بار آواز میں کچھ شک بھی تھا۔

حال میں خود کو سنبھالنے کی خاص مہارت سکھائی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا کہ سب ٹھیک ہے۔ پھر تیزی سے ایک تکیہ اٹھایا اور آواز کی سمت لپکا اور تیزی سے بستر پر جھکی اس لڑکی کے چہرے کو دبا دیا۔ کچھ دبی آوازیں ابھریں۔ لڑکی پھڑپھڑائی۔ اس نے اور زور سے دبایا اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا مگر جلد ہی اسے ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ اس کے ہاتھ سے اب واقعی میں ایک قتل ہو چکا تھا۔ وہ کسی کو مار چکا تھا۔ یہ ایک نیا احساس تھا۔ وہ اپنے ذہن کو جھٹک رہا تھا اور مسلسل سوچ رہا تھا۔ اکبر کسی بھی وقت واپس آسکتا تھا۔ اسے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ بالکونی ہی اس وقت سب سے محفوظ راستہ تھا۔ اس نے شیشے کا دروازہ پار کیا اور بالکونی میں قدم رکھ دیا۔ اس بالکونی میں اور کمرا نمبر 1313 کی بالکونی میں ایک میٹر کا فرق تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن جیسے تیسے اس نے یہ فاصلہ طے کیا اور 1313 کی بالکونی میں اتر گیا۔ وہ جیسے ہی کمرا نمبر 1313 میں داخل ہوا، ایک دم کمرے کی روشنیاں جل اٹھیں۔ کمرا کچھ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ پولیس والے نہیں تھے اور نہ ہی ہوٹل اسٹاف ——— کچھ جانے پہچانے چہرے تھے اور وہ سب مسکرا رہے تھے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم پکڑے گئے ڈکسن میرے پیارے دوست ———“ یہ بلی شر تھا۔

”تم ———؟“ ڈکسن نے کہا۔

”مر چکا ہوں نا ——— نہیں میرے دوست نہیں۔“ بلی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو مشروب کا گلاس ——— پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا ہے۔“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا۔ سب چہرے جانے پہچانے تھے اور سب مسکرا رہے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہو دوست ———“ بلی نے کہا۔ ”تم ان سب سے مل چکے ہو۔ یہ سب اداکار ہیں۔ تھوڑے سے پیسوں کے عوض اداکاری کرتے ہیں لیکن تم انہیں ’پرفیکشنسٹ‘ کے طور پر جانتے ہو۔ اس شام وہ اداکار کمروں میں تھے۔“

ڈکسن ان سب کو پہچان چکا تھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ، وکٹر، شکلی شاندار آواز والا، جو نے ٹریک آف دی وے شرب زہر پینے والا، مارشل آرٹ کا ماہر۔ وہ سب جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس انتہائی خوش گوار موڈ میں تھے۔

”تمہیں اب یہ مان لینا چاہیے کہ ان کی اداکاری بہت کمال کی تھی۔“ بلی نے کہا۔ ”ریٹا کی موت کے بعد زندگی اپنی مہارت کو استعمال کیا اور یہ ڈراما تیار کیا اور تمہیں بھی اس کا حصہ بنایا۔“

”مجھے کیوں ———؟“

”کیونکہ میں پرانے دنوں کی طرح کچھ کرنا چاہتا تھا اور ہیری ——— کہاں ہو تم ہیری؟“

”میں یہاں ہوں۔“ پیچھے سے آواز آئی۔

”میں نے اور ہیری نے یہ منصوبہ بنایا۔ ہم نے کرائے پر کمرے حاصل کیے اور پھر ایک عمارت کرائے پر حاصل کی اور ان اداکاروں کے ذریعے اس شام کے ڈنر کا پروگرام پلان کیا۔ اور یاد ہے ——— وہ ہنگری کا ڈنر آدھے میں تھا۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں مردہ کیا، تمہیں پتا ہی نہ چلا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ایک سنجیدہ انسان ہو ڈکسن ——— تم اس ڈرامے میں پھنس جاؤ گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ تم کسی خودکشی والے ——— کسی کی تلاش میں ہو۔ سو میں نے اپنی خودکشی کی خبر تم تک پہنچائی۔“

اس نے تفصیل بیان کی اور قہقہہ لگایا۔

”تم جانتے تھے کہ میں یہاں آؤں گا؟“

”ہاں، ہمیں یقین تھا کیونکہ تم ثبوت کی تلاش میں تھے تاکہ تم اسے قتل ثابت کر کے کلب میں شمولیت حاصل کر کے اپنی جان بچا سکو اور جب تم نے ہیری سے یہ پوچھا کہ کس کمرے میں خودکشی ہوئی ہے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ تم ضرور آؤ گے۔“

”کیسے لوگ ———“ ڈکسن نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اور وہ ساتھ والے کمرے میں موجود جو لڑکی ہے وہ بھی اداکارہ ہے؟“

”کون سی لڑکی ———؟“

”اوہ بہت ہو چکا۔“ ڈکسن بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ یہ سب ڈراما تھا۔“

”ہاں تھا تو ڈراما ——— لیکن ہم سوچ رہے تھے کہ تم سامنے والے دروازے سے آؤ گے مگر تم بالکونی سے کیسے آگئے؟“ بلی نے کہا۔ ”اور یہ تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟“

اور پھر اکبر ساتھ والے کمرے کا دروازہ توڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ڈکسن کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیا۔

”اسے کیا ہوا؟“ بلی کہہ رہا تھا۔



سفر بخیر

منظر امام

اکثر مناظر انتہائی پرفریب ہوتے ہیں کہ آنکھیں اور دل دونوں دھوکا کھا جاتی ہیں… وہ جو نظر آرہی تھی وہ تھی نہیں اور جو وہ دیکھ رہا تھا محض ایک دھوکا تھا… کیونکہ گندگی کے ڈھیر سے جب کنول کھلتا ہے تو یقین ذرا بے یقینی کا شکار ہو ہی جاتا ہے۔

اپنی ذات اور حالات میں الجھے ایک مسافر کی بدگمانی

اکبر کی نگاہیں اس عورت پر جم کر رہ گئی تھیں۔

وہ ایک باوقار عورت تھی۔ اس کی عمر پچاس سے زیادہ ہی ہوگی لیکن اس میں بلا کا چارم تھا۔ اس کی چال اور اس کے انداز میں ایک خوداعتمادی تھی جو دولت ہی سے آیا کرتی ہے۔ اس نے خوبصورت ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اکبر کے اندازے کے مطابق اس ساڑی کی قیمت ہی پچیس ہزار ہوگی۔ وہ پارک میں واک کر رہی تھی۔ اس کے قدم بہت نپے تلے اور ایک وقار کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ اس کے

اس عورت نے اس ملازمہ سے کچھ کہا اور وہ اشارے میں جواب دیتی ہوئی ایک طرف جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ شاید اس نے کہا ہوگا کہ تم جا کر بنچ پر بیٹھ جاؤ اور وہ چلی گئی تھی۔

اکبر پہلی بار اس پارک میں آیا تھا۔ یہ شہر کے ایک پوش علاقے کا پارک تھا۔

یہاں آنے والے عام طور پر قریبی کوٹھیوں کے مکین ہوا کرتے تھے۔ جو واک کے لیے یا جاگنگ کے لیے آیا کرتے۔ خواتین کو اپنا موٹاپا دور کرنے کی فکر ہوتی تھی تو مردوں کو شوگر لیول کم کرنا ہوتا تھا۔

اکبر کو اس کے باس نے کسی کام سے اپنے گھر پر بلایا تھا۔ اسے اکبر کے ہاتھ کوئی پارسل کہیں بھجوانا تھا۔

باس کا گھر اسی علاقے میں تھا۔ یہاں شاندار کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ خود باس کا گھر بھی بہت زبردست تھا۔ اکبر ایسے گھروں کے صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ باس کے گھر جا کر جب اس کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔

موازنہ کرنے لگتا کہ خود اس کے گھر میں کیا تھا۔ در و دیوار سے غربت ہی ٹپکتی تھی۔ دو کمرے تھے۔ ایک کمرا اس نے اماں کو دے رکھا تھا اور دوسرا اس کے پاس تھا۔ ایک کچا آنگن۔ اتنے پیسے ہی نہیں ہوتے تھے کہ تیسرا کمرا بنوایا جائے۔ حالانکہ آنگن اچھا خاصا بڑا تھا۔

اس دن بھی باس نے اسے گھر ہی بلا لیا تھا، پارسل دینے کے لیے۔ اس دن باس کو دفتر نہیں آنا تھا۔ وہ پارسل وصول کر کے سامنے والے پارک میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اس شاندار عورت کو اسی پارک میں دیکھا تھا۔

وہ پوش ایریا اس کے علاقے سے بہت فاصلے پر تھا۔ اگر اس کے پاس بائیک نہیں ہوتی تو اس کا آنا جانا مشکل تھا۔ یہ بائیک بھی دفتر والوں ہی نے اسے دلائی تھی۔

وہ اس عورت کو دیکھتا رہا۔ وہ واک کرتی ہوئی اس کی بنچ کے سامنے سے گزرنے لگی۔ اکبر اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دولت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔

اس کی ماں بھی ایک عورت ہی تھی اور شاید اس کی عمر اس شاندار عورت کے برابر ہی ہوگی لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا۔

ماں ایک بیمار عورت تھی۔ جان لیوا کھانسی نے اس کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا جسم بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کو کسی طرح کی بیماریاں تھیں جن کے علاج کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔

وہ عورت واک کرتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ اکبر اس کی باوقار اور دلکش چال کو دیکھتا ہی رہا۔

ایک راؤنڈ لے کر وہ عورت ایک بار پھر اس کے سامنے سے گزری اور اس بار اس عورت نے بھی اکبر کی توجہ کا نوٹس لے لیا۔ وہ رک کر اکبر کی طرف دیکھنے لگی۔ اکبر گڑبڑا گیا۔ اکبر کو ڈر ہوا کہ وہ کہیں اس کی توجہ سے ناراض نہ ہو گئی ہو لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ اور پھر آگے بڑھ گئی۔

اکبر اس وقت کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ کیا کرے۔ خود اٹھ کر چلا جائے یا اس عورت کو دیکھتا رہے؟

وہ بیٹھا رہا۔ وہ عورت گھومتی ہوئی پھر اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔ اس بار بھی اس عورت نے اسے دیکھا اور رک گئی۔ وہ بہت غور سے اکبر کو دیکھ رہی تھی۔ اس بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔

پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔

اکبر اب وہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے ایک نظر اس عورت پر ڈالی اور بنچ سے اٹھ گیا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ عورت اب بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شام کو اکبر اپنے محلے کے ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

اس قسم کے محلوں میں اس قسم کے ہوٹل ہی تفریح کا ذریعہ ہوا کرتے ہیں۔ جہاں ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی جاتی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی حالات پر تبصرے ہوتے ہیں۔ دیگر معاملات بھی اسی قسم کے ہوٹلوں میں طے ہوتے ہیں۔ دوست بھی ایک دوسرے سے اسی ہوٹلوں میں ملا کرتے ہیں۔

کچھ دیر بعد اکبر کا دوست اسلم آیا تو اس نے اسے ساری صورت حال بتا دی۔ اس نے کہا۔ "تم شاید پاگل ہو گئے ہو۔ کن چکروں میں پڑ رہے ہو۔۔۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ اس قسم کی دولت مند عورتوں کے کھیل بہت اونچے ہوا کرتے ہیں۔"

"ہاں یار ایسا تو میں نے بھی سنا ہے۔" اکبر نے کہا۔

"بس تو پھر سن لے کہ کچھ ایسا ہی معاملہ تیرے ساتھ ہونے والا ہے۔ وہ عورت تجھے پھانس لینا چاہتی ہے۔

ہے۔ وہ جوان بھی ہے اور خوب صورت بھی۔"

"یار اس شہر میں مجھ جیسے تو بہت سے ہوں گے۔"

"ہاں تو لیکن تیرے جیسی معصومیت کسی کے چہرے پر نہیں لکھی ہوگی۔ تیرا چہرہ ہی بتا رہا ہے کہ تو ایک ضرورت مند انسان ہے۔ ایسی عورتیں تجھ جیسوں کی ہی تاک میں رہتی ہیں۔ تو اس کے لیے اچھا شکار ثابت ہوگا۔ اب تیری مرضی تو دوبارہ اس طرف جاتا ہے یا نہیں۔"

اکبر نے اپنے دوست سے تو کہہ دیا تھا کہ وہ دوبارہ اس طرف نہیں جائے گا لیکن اس کا دل کچھ اور کہہ رہا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی زندگی میں محرومیوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اگر اس بہانے اس عورت سے فائدہ ہو جائے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ عورت اسے شادی کی آفر کرے گی اور وہ اس سے شادی کر کے اپنی زندگی بنا لے گا۔ بہت ہو چکی مفلسی۔

ایک ہفتے بعد وہ پھر اسی پارک میں پہنچ گیا جو اس کے گھر سے بہت دور تھا۔ جس جگہ اس کا باس رہتا تھا۔۔۔ جس پارک میں اس نے اس شاندار عورت کو دیکھا تھا۔۔۔ جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

وہ ایک خالی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جاگنگ کرنے والے جاگنگ کر رہے تھے۔ عورتیں واک کر رہی تھیں۔ گپ شپ کرتی ہوئی اس کی بنچ کے برابر سے گزر رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس نے اس عورت کو دیکھ لیا۔

وہ پہلے کی طرح اپنی ملازمہ کے ساتھ تھی۔ ملازمہ نے اس کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ملازمہ پہلے کی طرح ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئی جبکہ وہ عورت تنہا واک کرتی رہی۔ واک کرتے ہوئے وہ اس بنچ کے سامنے سے گزرنے لگی جس پر اکبر بیٹھا تھا۔

اکبر کو دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مہربان سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کچھ سوچا پھر آگے بڑھ گئی۔ اکبر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ تیسرے چکر میں وہ اکبر کی بنچ کی طرف آ گئی۔ اکبر بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "کھڑے کیوں ہو گئے؟"

اکبر اسی طرح بوکھلا کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گئی۔ "کیا تم کہیں قریب میں رہتے ہو؟" اس عورت نے پوچھا۔

"نہیں میڈم! میں یہاں سے بہت فاصلے پر رہتا ہوں۔ اس طرف میرے باس کی کوٹھی ہے۔ میں ان کی طرف آتا ہوں۔۔۔ اور کچھ دیر کے لیے اس پارک میں آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" اس عورت نے پوچھا۔

"اکبر۔" اکبر نے بتایا۔

"مجھے تو تم اکبر اعظم لگتے ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

اکبر نے گردن جھکا لی۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر اس نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ "اور ــــ اور آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام صفیہ ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا میں آپ کو میڈم صفیہ کہہ سکتا ہوں؟" اکبر نے پوچھا۔

"چلو میڈم صفیہ کہہ لیا کرو۔"

اسی دوران میں اس کی ملازمہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ صفیہ کھڑی ہو گئی۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔ امید ہے تم دوبارہ اس طرف آؤ گے۔"

"ضرور میڈم۔" اکبر بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ کہہ دیتا کہ میں تو اسی پارک میں اپنا ڈیرا ڈال لوں گا۔

وہ عورت چلی گئی۔ اکبر پھر اس کی دلکش چال میں الجھ کر رہ گیا۔

زندگی میں پہلی بار اسے ایسی کامیابی ملی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک دولت مند عورت تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ یہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ اس کی ملازمہ۔۔۔ اس کا لباس۔۔۔ یہ سب کچھ اس بات کی علامت تھا۔ کہ وہ اس دنیا کی نہیں ہے جس دنیا سے اکبر کا تعلق تھا۔ اکبر کی دنیا میں سوائے مفلسی، محرومیوں اور پریشانیوں کے اور تھا ہی کیا۔ وہاں کے بچے فاقہ زدہ تھے۔ وہاں کی لڑکیوں کے چہروں پر مایوسی لکھی ہوئی تھی۔ وہاں کی عورتیں سارا دن ایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں۔ وہاں کے مرد فیکٹریوں میں کام کر کے اپنا خون پسینہ ایک کرتے تھے۔ تب جا کر دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ جبکہ وہ عورت جس طبقے کی تھی، وہاں محرومی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

شام کو ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے اپنے دوست اسلم کو بھی اس پروگریس کے بارے میں بتا دیا۔ اسلم بہت پرجوش ہو گیا تھا۔ "دیکھ لیا! میں نے کیا کہا تھا۔ اس نے اپنا جال تیری طرف پھینک دیا ہے۔"

"یار! کچھ بھی ہو۔ عورت ہے بہت زبردست اور بہت پیسے والی بھی ہے۔" اکبر نے کہا۔ "یار! میں تو سوچ رہا

"اس چکر میں مت پڑ جانا۔" اسلم نے سمجھایا۔ "ایک تو وہ تیرے اور میرے طبقے کی نہیں ہے۔ بہت فرق ہے۔ اس کی برادری کچھ اور ہے، تیری برادری کچھ اور ہے۔ ان لوگوں کے انداز کچھ اور ہوتے ہیں، ہم جیسوں کے کچھ اور..... اسی لیے شادی وادی کی بات بھی مت کرنا۔"

"تو پھر فائدہ کیسے اٹھاؤں؟" اکبر نے پوچھا۔

"یار! زندگی بھر کا فائدہ مت سوچ۔" اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ "بس جو کچھ ہو رہا ہے وہی کرتا رہ۔ اس سے پیسے سیٹ اور نکل لے۔ ورنہ مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

اکبر کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اسلم کہنا کیا چاہتا تھا۔

ایک صبح وہ پھر اسی پارک میں پہنچ گیا۔ اس بار بھی اسے باس نے اپنے گھر بلایا تھا۔ اکبر کے لیے یہ بہت سنہری موقع تھا۔ وہ اس کو لانا کر اسی پارک میں پہنچ گیا۔ وہ عورت جس نے اپنا نام عنبر بتایا تھا، وہیں موجود تھی۔ اس دن اس کی بائیک بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ اس میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔

اکبر کو دیکھ کر وہ خود ہی اس کے پاس آ گئی۔ اکبر نے سلام کیا۔

وہ اکبر کے ساتھ ہی بینچ پر بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے، تم دو چار دنوں سے اس طرف نہیں آئے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ باس کا کوئی کام نہیں تھا۔ اسی لیے آنا نہیں ہوا۔" اکبر نے بتایا۔

"تمہاری ایجوکیشن کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں گریجویٹ ہوں میڈم۔" اکبر نے بتایا۔

"مینجمنٹ کا کام تو کر سکتے ہو نا؟"

"کیوں نہیں میڈم۔ بہت محنت سے کر سکتا ہوں۔"

"تم نے گوگل انٹرپرائز کا نام سنا ہے؟"

"یس میڈم! وہ بہت بڑی فرم ہے۔" اکبر نے بتایا۔ "ایک بار وہاں بھی جاب کی ٹرائی کر چکا ہوں لیکن کامیاب نہیں ہوا۔"

وہ مسکرا دی۔ "کوئی بات نہیں، تم وہاں چلے جاؤ۔ تمہاری جاب ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ میری فرم ہے۔"

"آپ کی..... فرم ہے میڈم؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا میری فرم نہیں ہو سکتی؟"

"کیوں نہیں میڈم!" وہ جلدی سے بولا۔

"تمہاری عمر کتنی ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"اس مہینے کی سترہ تاریخ کو میں پورے پچیس سال کا ہو جاؤں گا۔" اکبر نے بتایا۔

"اب بھی..... یعنی سترہ تاریخ کو تمہاری سالگرہ ہوگی۔"

"ارے نہیں میڈم! کہاں کی سالگرہ اور کہاں کی برتھ ڈے۔ ہم غریبوں کی زندگی بس کسی طرح گزر ہی جائے تو بہت ہے۔ میں نے آج تک اپنی برتھ ڈے سیلیبریٹ نہیں کی۔" اکبر نے پہلا جال پھینک دیا تھا۔

"چلو اس بار تمہاری برتھ ڈے ہماری طرف سے ہو گی۔" اس نے کہا۔

"کیا؟" اکبر حیران رہ گیا تھا۔ "لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ ہم جس کو اپنا سمجھ لیتے ہیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر بھی سکتے ہیں۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

اکبر نے دل ہی دل میں خود کو مبارک باد دی۔ اس کا خیال تھا کہ ان مرحلوں میں بہت دن لگ جائیں گے لیکن اس عورت نے خود ہی پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔ اب کیا پریشانی تھی۔

جب یہ عورت اس کے ہاتھ میں آنے والی تھی تو اس کے ساتھ اس کی دولت کا کچھ حصہ تو اس کے پاس بھی آ جاتا۔ اس کے علاوہ اس نے اکبر کو ایک بڑی فرم میں جاب بھی آفر کر دی تھی۔ وہ ایسی فرم تھی جس میں ہر کوئی کام کرنے کی خواہش کرتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اس فرم میں کام کرنے والوں کے پاس دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی بھی آ جاتی ہے۔

"چلو میں تم کو اپنا گھر دکھا دوں۔" اس نے کہا۔ "سترہ تاریخ کو وہیں آنا ہے۔"

وہ اکبر کو پارک سے باہر لے آئی۔ چلتے ہوئے اس نے اکبر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اکبر کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ شاید اپنی طرف سے اسے کچھ کہنے یا کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے خود ہی پہل کر دی تھی۔ گیٹ سے باہر کالے رنگ کی ایک شاندار مرسیڈیز کھڑی تھی۔ جس کے پاس باوردی ڈرائیور بھی موجود تھا۔ ڈرائیور نے اس عورت کو دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس عورت نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

اکبر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ عورت نے پچھلی سیٹ سنبھال لی تھی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔ یہ عورت اس پارک سے پہلے بھی نہ جانے کتنوں کو اسی طور سے اپنے ساتھ لے جا چکی ہو۔

اسلم کی باتیں درست ہوتی جا رہی تھیں۔



راستے میں خاموشی رہی۔ اکبر بھی چپ ہی رہا۔ اس کے پاس بولنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر سفر کے بعد گاڑی ایک شاندار سے مکان کے گیٹ پر آ کر رک گئی۔ ہارن بجانے پر چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول دیا تھا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔

عورت نے اکبر سے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

اکبر کچھ دیر کے لیے دنگ رہ گیا تھا۔ وہ مکان اس کے باس کے مکان سے بھی زیادہ شاندار تھا اور اس کا ڈرائنگ روم بھی اسی مناسبت سے شاندار تھا۔ وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس عورت نے انٹرکام پر کسی کو آرڈر دیا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔" اس نے کہا۔

"کیا بتاؤں میڈم بس کسی طرح زندگی گزر رہی ہے۔"

"تم کل گوگل چلے جانا۔ تمہاری جاب ہو جائے گی۔ میں نے وہاں کہہ دیا ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ میڈم۔"

"ارے کس بات کا شکریہ۔ جو پیار کرے اس کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ اور ہاں....." اس نے صوفے پر رکھا ہوا بیگ اٹھا کر اس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اکبر کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لو یہ بیس ہزار ہیں۔" اس نے کہا۔ "اپنی برتھ ڈے پر تمہیں نئے سوٹ میں آنا ہے۔ تم ایک بدلے ہوئے انسان دکھائی دو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی..... جی ہاں۔" اکبر سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

"اب جاؤ۔ ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

اکبر ایک شاندار مرسیڈیز میں اپنے محلے میں واپس آیا تھا۔ اتفاق سے اسلم ہی نے اسے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لپک کر اکبر کے پاس آ گیا۔ "کیا ٹھاٹھ ہیں تیرے۔ یہ کس کی گاڑی ہے؟"

"چلو چل کر ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔"

ڈرائیور بہت ادب سے سلام کر کے واپس چلا گیا۔

اسلم حیران پریشان سا اس کے ساتھ چل پڑا۔ "یار اب تو تیرے ٹھاٹھ ہی الگ ہیں۔ کیا ہاتھ مارا ہے۔"

دونوں ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ اکبر نے نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھ..... اب جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو حالات یوں بدلتے ہیں۔"

"کیا اتنے روپے اسی نے دیے ہیں؟" اسلم نے پوچھا۔

"ہاں یار! اور جانتے ہو کس لیے؟ تاکہ میں اچھے

لو۔ اس مہینے میری برتھ ڈے اسی کی کوٹھی میں ہوگی۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" اکبر نے ملاقات کی ساری کہانی اسے سنادی۔

اسلم گہری سانسیں لے کر رہ گیا۔ "جا بھائی! تیرا تو کام ہوگیا۔"

"ہاں یار۔" اکبر ہنس پڑا۔ "ایک بات اور بتا دوں — اس نے میری جاب کا بندوبست اپنی ہی فرم میں کردیا ہے۔ ملک کی بہت بڑی فرم ہے۔ میں خود ایک بار وہاں انٹرویو دے چکا ہوں۔"

"ہاں۔ پھر کیا مسئلہ ہے۔ سیاں بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔"

اسلم سے باتیں کرنے کے بعد اکبر گھر آگیا۔ گھر جاتے ہوئے اس نے اپنی ماں کے لیے بہت سے پھل بھی لے لیے تھے۔

دوسرے دن اس نے دفتر سے چھٹی کرلی۔ اسے سوٹ خریدنے تھے۔ اس نے دو سوٹ، جوتے اور دو تین شرٹس لیں۔ ایک اچھا سا پرفیوم لیا۔ اس کے علاوہ اپنی ماں کے لیے ساڑی لی اور اس کی دوائیں لیں۔ اس کے پاس جتنے پیسے تھے، ان پیسوں میں وہ یہ سب کرسکتا تھا اور ابھی تو آغاز تھا۔ اگر اس عورت کی مہربانیاں جاری رہتیں تو وارے نیارے ہوجاتے۔ بات صرف اتنی تھی کہ اسے بہت احتیاط سے چلنا تھا۔ اپنے آپ کو چھچھورا ثابت نہیں کرنا تھا۔ اگر محبت کا اظہار بھی کرنا تھا تو بہت سلیقے کے ساتھ۔

دوسری صبح اس نے اس پارک تک جانے کے لیے کرائے کی گاڑی منگوالی۔ وہ اپنی بائیک پر نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس نے اس صبح کے لیے سرمئی رنگ کے سوٹ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ رنگ اس کی رنگت پر بہت سوٹ کرتا تھا۔ یہ سوٹ اس نے انہی پیسوں سے خریدا تھا جو پیسے اس عورت نے دیے تھے۔

وہ معمول کے مطابق واک کرنے کے لیے پارک میں موجود تھی۔ اکبر جب اس کے سامنے جاکر کھڑا ہوا تو وہ حیرت سے اکبر کو دیکھتی رہ گئی۔

"کیسا لگ رہا ہوں میں؟" اکبر نے مسکرا کر پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کے جذبات تھے۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

وہ اکبر کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی۔ اس نے اکبر کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک باکس تھا۔ "یہ دیکھو۔"

اس نے باکس کھول کر دکھایا۔ اس باکس میں ایک ایسی چیز تھی جو اکبر کے لیے انجانی نہیں تھی۔ وہ ایک امام ضامن تھا۔ اس کی ماں بھی اسے اسی وقت باندھا کرتی تھی جب اس کا باس اسے دفتر کے کام سے شہر سے باہر بھیجا کرتا تھا۔

اس عورت نے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ اس میں درد گھلا ہوا تھا۔ "میرے بیٹے کو اکثر کاروباری سلسلے میں بیرون ملک جانا ہوتا تھا۔"

"آپ کا بیٹا؟"

"ہاں۔" اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "وہ اکثر باہر جایا کرتا تھا۔ میں اسے امام ضامن باندھا کرتی تھی۔ میں اس کے لیے امام ضامن ہر وقت تیار رکھتی تھی۔ نہ جانے کس وقت اسے جانا پڑ جائے۔ بس یہ آخری امام ضامن اسے باندھ نہیں سکی کیونکہ اس سے پہلے ہی ایک سفر میں اس کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ مرگیا۔"

"کیا؟" اکبر کو جیسے شاک سا لگا تھا۔

"ہاں۔ وہ مرگیا اور یہ امام ضامن رکھا رہ گیا۔ اس دن جب میں نے تمہیں پارک میں دیکھا تو ایسا لگا کہ میرا بیٹا واپس آگیا ہو۔ بالکل ویسا ہی انداز — وہی قد وقامت اور وہی عمر۔ تم ہو بہو میرے بیٹے کی طرح ہو — تمہیں دیکھ کر میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی اس کا تم یا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ میں تمہیں دیکھتی رہی پھر خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ میری ممتا مجھے تمہارے پاس لے گئی۔"

وہ رونے لگی تھی۔ اکبر سناٹے میں تھا۔

"بیٹا! میں نے جو کچھ تمہارے لیے کیا ہے یا کروں گی، وہ کسی اور کے لیے نہیں اپنے بیٹے کے لیے کروں گی۔ بیٹا اب یہ امام ضامن تمہیں باندھ رہی ہوں کیونکہ تم بھی سفر کرتے رہتے ہو۔"

وہ رو رہی تھی۔ اکبر لرز رہا تھا۔ اس نے بھی رونا شروع کردیا۔ دل ہی دل میں اپنے خیالات پر خود کو ملامت کررہا تھا۔

ایک ماں نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو امام ضامن باندھ دیا تھا۔





نہیں کیا تو وہ ہم پر چھا جائیں گے۔

وہ لوگ ڈرے کہ ہم کس طرح مقابلہ کریں گے۔

"ہمارے پاس ہتھیار تو ہیں لیکن عمالیق وحشی قوم ہے اور ہم ان سے کیسے لڑسکتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم مصر کو واپس چلے

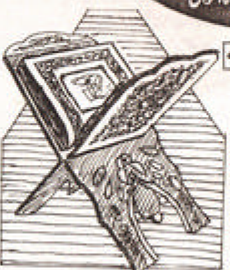
حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

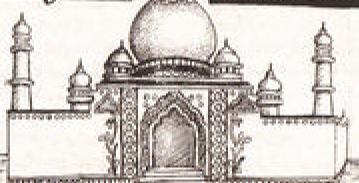
بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کی آمد کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بناکر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کردیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بناکر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی "اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔" سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

ساتواں حصہ







...اپنے شہروں میں آباد ہو جائیں گے۔ یہاں بیابانوں میں بھٹکتے رہے تو ہر قوم اسی طرح ہم پر حملہ آور ہوتی رہے گی۔ ہم کس کس سے لڑیں گے۔"

"اے میری قوم کے لوگو! خدا کی ذات سے مایوس کیوں ہوتے ہو۔ اس نے ہماری مدد ہمیشہ کی ہے۔ اس جنگ میں بھی فتح ہماری ہوگی۔"

"موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اس جنگ میں ہمارے ساتھ کیوں نہیں؟ انہوں نے تمہیں کیوں بھیجا ہے؟"

"وہ پہاڑ پر اپنے رب سے دعا کرنے گئے ہیں۔ جب تک ہم عمالقیوں پر غالب نہیں آ جاتے اس وقت تک وہ خدا کے دربار میں ہماری مدد کرتے رہیں گے۔"

"کہیں وہ ہمیں چھوڑ کر چلے تو نہیں گئے؟"

"تم عمالقیوں سے لڑتے ہوئے خود دیکھ لو گے کہ وہ موجود ہیں یا نہیں۔"

بنی اسرائیل تو یہی چاہتے تھے کہ باتوں میں اتنا وقت گزر جائے کہ جنگ ٹل جائے جبکہ یوشع بن نون کو جلدی تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح انہوں نے بنی اسرائیل کے تن مردہ میں جان ڈال دی اور انہیں آمادۂ جنگ کر کے آگے بڑھے تاکہ عمالقیوں کو آگے بڑھنے سے روک سکیں۔ وہ بوڑھوں کو پیچھے چھوڑ کر جوانوں کو آگے لے کر بڑھے۔ اس وقت تک بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ عمالقیوں کو روکے کھڑا تھا مگر پھر بھی ان کا بہت نقصان ہو چکا تھا۔ یہ تازہ کمک پہنچی تو عمالقیوں نے بھی نئے جوش کے ساتھ حملہ کیا۔

عمالیقی صحرائی جنگ لڑنے کے ماہر تھے۔ دوسری طرف بنی اسرائیل راستوں سے ناواقف، کمزور اور بے ہمت۔ سر پر آ پڑی تھی، بھاری دل سے لڑ رہے تھے لیکن پھر بھی عمالیقی غالب آنے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو اچانک عمالقیوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ بنی اسرائیل غالب آنے لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ نیچے کر لیا۔ عمالیقی پھر غالب آ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ پھر بلند کیا۔ اسرائیلی پھر غالب آنے لگے۔ اب حال یہ ہوا کہ جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہاتھ اٹھائے رہتے بنی اسرائیل غالب رہتے اور جب ہاتھ لٹکا دیتے تو عمالیقی غالب آ جاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کب تک ہاتھ اٹھائے رہتے۔ اوپر کے ان کا ہاتھ تھک گیا اور اوپر رکھنا ممکن نہ رہا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے جو ان کے ساتھ ہی پہاڑ کی چوٹی پر موجود تھے، ایک پتھر رکھ دیا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے پھر حضرت ہارون علیہ السلام ان کا ہاتھ سنبھالے رہے۔



میدان میں تلواریں چل رہی تھیں۔ کئی عمالیقی موت کی نیند سو گئے تھے۔ بنی اسرائیل انہیں برابر پیچھے دھکیلتے جا رہے تھے لیکن یہ جب تک تھا جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ بلند تھا۔ حضرت ہارون علیہ السلام ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور دعا کر رہے تھے کہ کہیں وہ بھی نہ تھک جائیں کیونکہ یہ ہاتھ لٹکا تو بنی اسرائیل کو شکست ہو جائے گی۔

غروب آفتاب تک وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بازو کو سنبھالے رہے۔ بالآخر بھاری جانی نقصان اٹھانے کے بعد عمالیقی شکست سے دوچار ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

بنی اسرائیل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی جنگ میں فتح یاب بھی ہو سکتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان کا ٹوٹا ہوا اعتماد پھر سے بحال ہو گیا۔

خدا کا حکم آیا کہ یوشع کو میرا عہد سنا دے کہ میں عمالیق کا نام و نشان دنیا سے بالکل ہی مٹا دوں گا۔ یہ میری قسم ہے کہ عمالقیوں سے نسل در نسل جنگ کرتا رہوں گا۔

خدا کا یہ عہد آئندہ زمانوں میں پورا ہوا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں یہاں تک گھٹا دیا کہ وہ نہ ہونے کے برابر رہ گئے اور بنی شمعون نے ان باقی عمالقیوں کو جو بچ رہے تھے قتل کیا۔

آثار قدیمہ نے ابھی تک ان کے متعلق کوئی شہادت پیش نہیں کی۔

اہل کتاب کے نزدیک یہ قصہ بھی مروی ہے کہ مدین شہر کے کاہن ... جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے (مسلمان علماء کی اکثریت نے ان کا نام حضرت شعیب بتایا ہے اور یہ کاہن نہیں نبی تھے) یہ سن کر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے مقابلے میں فتح حاصل ہوئی ہے تو وہ ان کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زوجہ اور دونوں بیٹے بھی تھے

جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیغام ... سے پہلے ان کے پاس بھیج دی تھی۔

اہل کتاب لکھتے ہیں: "اور موسیٰ کا خسر اس کے بیٹوں اور بیوی کو لے کر بیابان میں آیا اور موسیٰ سے کہا میں تیرا خسر تیری بیوی اور دونوں بیٹوں کو لے کر آیا ہوں .... تب موسیٰ اپنے خسر سے ملنے کو باہر نکلا اور کورنش بجا لا کر اسے چوما اور وہ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھتے ہوئے خیمے میں آئے اور موسیٰ نے اپنے خسر کو بتایا کہ خداوند نے اسرائیلیوں کی خاطر فرعون کے ساتھ کیا کیا اور ان لوگوں پر راستے میں کیا کیا مصیبتیں پڑیں اور خداوند ان کو کس کس طرح بچاتا آیا۔"

"اور موسیٰ کے خسر نے سوختنی قربانی اور ذبیحے چڑھائے اور ہارون اور اسرائیل کے سب بزرگ موسیٰ کے خسر کے ساتھ کھانا کھانے آئے۔"

اہل کتاب ہی کے مطابق جب ان کے خسر نے یہ دیکھا کہ جھگڑوں کے نمٹانے کے وقت بنی اسرائیل سب ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور تمام فیصلے انہی کو نمٹانے پڑتے ہیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشورہ دیا کہ آپ کچھ افراد جو امانت دار اور سچے ہوں ان کو منتخب کر لیں جو رشوت اور خیانت سے نفرت کرتے ہوں اور ان کو ہزار ہزار اور سو سو اور پچاس پچاس اور دس دس آدمیوں پر حاکم بنا دیں کہ وہ ہر وقت لوگوں کا انصاف کیا کریں۔ آپ کے پاس صرف بڑے مقدمے آیا کریں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا فیصلہ وہ خود ہی کر دیا کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مشورے کو پسند کیا اور ایسے اشخاص منتخب کر کے انہیں قاضی بنا دیا۔ یہ قاضی فیصلے کرنے لگے۔ کوئی مشکل مسئلہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ جاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی منزل سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے خسر رفیدیم سے رخصت ہو کر مدین چلے گئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ میرے پاس سینا کے میدان میں آ جا اور وہاں پہاڑ کے نیچے ڈیرے ڈال دے۔ اسے میدان "تیہ" بھی کہا جاتا ہے۔

انہوں نے قوم کو حکم دیا کہ چلنے کی تیاری کریں۔ اب ہم رفیدیم سے نکلیں گے۔ بنی اسرائیل ایک مرتبہ پھر پریشان ہوئے کہ اب نہ جانے کہاں جانا ہو۔ کیا ہمیں یونہی زندگی بھر بیابانوں میں گھومنا پڑے گا۔ وہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ انہیں یہیں رہنے دیا جائے۔ یہاں جس حال میں بھی ہیں۔ اب ہم کوئی فرمائش نہیں کریں گے۔

"تم اللہ کی محبوب امت ہو۔ یہ جگہ تمہارے لائق نہیں۔ آگے چلو اور بہت سی نعمتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

بنی اسرائیل خاموش تو ہو گئے لیکن دل میں ایک آرزو سی موجزن رہنے لگی کہ دیکھیں موسیٰ جن نعمتوں کا ذکر کر رہے ہیں وہ کیا ہوتی ہیں۔

چھ لاکھ سے زیادہ لوگوں پر مشتمل یہ قافلہ رفیدیم کے بیابان سے نکلا۔ حسرت سے ان چشموں کی طرف دیکھتا جاتا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے نکالے تھے۔ کیا اس نعمت سے بڑھ کر بھی کوئی نعمت ہے جو موسیٰ ہمیں دینے والا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مصر سے لے کر سینا تک اصنام پرستی کی جا رہی تھی۔ ان اسرائیلیوں نے جب راہ میں بت کدے دیکھے اور دیکھا کہ بت رکھے ہوئے ہیں اور پجاری ان بتوں پر جھکے پڑتے ہیں تو ان میں سے بہت سوں کو مصر یاد آ گیا۔

اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو باپ دادا سے ورثے میں ملے تھے تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بود و ماند کرتے اور ان کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے ان میں صنم پرستی کا جذبہ سرایت کر چکا تھا۔ اب جو صنم کدوں میں پجاریوں کو دیکھا تو یہ جذبہ ابھر کر سامنے آ گیا۔

بہت سے غیر بنی اسرائیل بھی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغام سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ چلے آئے تھے۔ انہوں نے اسرائیلیوں کے ایک گروہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔

"مصر چھوڑنے میں ایک برائی تو ہمارے ساتھ یہ ہوئی ہے کہ ہمارے بت ہم سے چھن گئے جن کے آگے ہم منتیں مانتے تھے اور ہماری مشکلیں پوری ہوتی تھیں۔ اس بیابان میں کوئی دیوتا ہمارے ساتھ نہیں۔ ہم تو بالکل اکیلے رہ گئے ہیں۔ موسیٰ کا خدا بھی عجیب ہے۔ نہ وہ نظر آتا ہے، نہ ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ دیوتا ہمارے سامنے ہوتے تھے تو ہمیں احساس تو رہتا تھا کہ ہمارے سامنے کوئی ہے۔"

ان غیر بنی اسرائیلیوں نے جب اس طرح کی باتیں کیں تو بنی اسرائیل میں سے بھی ایک بڑی تعداد کے دل میں بھی جذبہ صنم پرستی نے سر ابھارا۔

بنالیے اور ان کی پرستش شروع کردی تو ہم بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔ اگر ہم میں شامل مصریوں نے اپنے بہت
اپنے خدا کا بت بنا رکھا ہے۔ ہم دیکھیں تو سہی اس کا خدا کیسا ہے۔ ہم موسیٰ سے کہیں گے کہ وہ دیوتاؤں کے خلاف ہے تو
مصر میں صدیوں تک ایک بت پرست قوم کے درمیان رہنے کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ ایسا بے ہودہ مطالبہ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئے اور ان سے یہ مطالبہ کر ڈالا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی زبانی یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو ان کی اس واہیات پر سخت برہم ہوئے۔ جن آفتوں سے بچا کر وہ اپنی قوم کو یہاں تک لائے تھے، یہ آفتیں ان کے ساتھ ہی چلی آئی تھیں۔

"بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہو اور خدا کی نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے۔ تم ان باپ دادا کی اولاد میں سے ہو جو پیغمبروں میں سے تھے۔ جو خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے اور تم کہتے ہو میں تمہارے لیے معبودوں کے بت بنا دوں۔ تم یہ مطالبہ مجھ سے کر رہے ہو جس نے فرعون کے گھر میں رہتے ہوئے فرعون کو سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے تمہیں نجات کا راستہ دکھایا اور تم پھر اسی طرف جا رہے ہو۔ اس مطالبے سے باز آؤ اور خدا کے غضب کو دعوت مت دو۔ خدا جس سے ناراض ہوتا ہے، اسے ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔"

پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔ "اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔ موسیٰ نے کہا۔ تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقے کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔" پھر موسیٰ نے کہا۔ "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لیے تلاش کروں حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت دی اور وہ وقت یاد کرو (اللہ فرماتا ہے) جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔" (سورۃ اعراف)

مصر سے نکلے ہوئے انہیں تین مہینے ہوئے تھے جب وہ جبل سینا کے نیچے پہنچے اور وہاں ڈیرے ڈال لیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، اللہ کے حکم سے پہاڑ پر چڑھے اور اللہ سے ہم کلام ہوئے۔ اللہ نے انہیں پہاڑ پر سے پکارا اور کہا۔

"تو بنی اسرائیل سے میرے احسانات کا ذکر کر دے۔ انہیں بتا کہ میں نے مصریوں سے کیا کیا اور تمہیں گویا عقاب کے پروں پر بٹھا کر اپنے پاس لے آیا۔ اگر تم میری بات مانو اور میرے عہد پر چلو تو سب قوموں میں سے تم میری خاص ملکیت ٹھہرو گے کیونکہ ساری زمین میری ہے۔ تم میرے لیے کاہنوں کی ایک مملکت اور ایک مقدس قوم ہو گے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے اترے اور اپنی قوم کے بزرگوں کو جمع کر کے یہ خوش خبری سنادی کہ اللہ تمہیں ایک مقدس قوم بنانے والا ہے اگر تم اس کے احسانات کو مانو اور اس کے احکام پر چلنے کا وعدہ کرو۔

قوم کے لیے یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہ یہ سب باتیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے چلے آئے تھے۔ غرق فرعون کی بات تو ابھی کل کی بات تھی۔ انہوں نے اللہ کے احسانات کو تسلیم کیا اور عہد کیا کہ ہم اللہ کے حکم پر چلیں گے اور وہ سب کریں گے جو اس نے ہم سے کہا ہے تاکہ ہم مقدس قوم کہلائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ پھر جبل سینا پر گئے اور قوم کے جواب سے خدا کو آگاہ کر دیا۔

"میری قوم تیرے احکام پر چلنے کا وعدہ کرتی ہے۔ اگر یہ اپنے عہد پر عمل کرتی ہے تو اسے تو اپنے وعدے کے مطابق مقدس قوم بنا دے۔"

تب کالے بادلوں سے اللہ کی آواز آئی۔ "اب تو اپنے لوگوں کے پاس جا اور آج اور کل ان کو پاک کر اور انہیں حکم دے کہ اپنے کپڑے دھولیں اور پاکیزگی اختیار کریں اور تیسرے دن تیار رہیں کیونکہ خداوند تیسرے دن سب لوگوں کے دیکھتے دیکھتے کوہ سینا پر اترے گا اور تو چاروں طرف حد باندھ کر ان سے کہہ دینا کہ کوئی اس پہاڑ پر نہ چڑھے اور نہ اس کے کنارے کو چھوئے۔ جو کوئی اس پہاڑ کو چھوئے گا ضرور مار ڈالا جائے گا۔ کوئی جانور بھی اس کے قریب نہ آئے۔ آیا تو وہ بھی مارا جائے گا اور جب نرسنگا (سینگ کو بانسری کی طرح بجا کر) دیر تک پھونکا جائے تو وہ سب پہاڑ کے پاس آ جائیں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ پیغام بھی پہنچا دیا۔ بنی اسرائیل نے یہ سن کر فرماں برداری کی۔ غسل کیا، نئی پوشاکیں پہنیں۔ یہ پاکیزگی تین دن تک اختیار کیے رکھی۔

جب تیسرے دن کی صبح نمودار ہوئی تو آسمان پر گہرے بادل چھا گئے۔ یہ بادل بڑی زور سے گرجے اور بجلی چمکنے لگی۔ قرنا کی آواز گونجنے لگی۔ بنی اسرائیل اپنے ڈیروں میں تھے خوف سے کانپنے لگے۔ خیمہ گاہوں سے نکلے اور پہاڑ کی طرف لپکے لیکن پہاڑ سے کچھ دور آ کر رک گئے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے ایک حد مقرر کر دی تھی۔ گہرے بادلوں نے کوہ سینا کو اوپر سے نیچے تک اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر پہاڑ پر ایک زلزلہ سا طاری ہوا۔ پہاڑ ہلنے لگا۔ یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ بنی اسرائیل کھڑے کھڑے کانپ رہے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے اوپر چڑھے اور لوگوں کو تاکید کرتے گئے کہ وہ ہرگز پہاڑ کے قریب نہ آئیں ورنہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔ پہاڑ پر لرزہ طاری تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام قدم بہ قدم اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ اوپر پہنچنے کے بعد گہرے سیاہ بادلوں سے اللہ نے ان کو پکارا۔

اللہ عزوجل ان سے راز و نیاز فرما رہا تھا اور کلیم کے لقب کا مستحق قرار دیا تھا۔

اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور دس باتوں کی نصیحت فرمائی کہ جا اور قوم کو یہ باتیں پہنچا دے۔ اس وقت حضرت ہارون علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے جنہوں نے یہ باتیں سنیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب نیچے آئے تو پوری قوم پکار اٹھی۔

"ہمیں یقین ہو گیا کہ آپ پروردگار عزوجل کی طرف سے پیغمبر ہیں۔ بس ہم خوف کرتے ہیں کہ کہیں مر نہ جائیں۔"

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی کہی ہوئی وہ دس باتیں قوم کے سپرد کر دیں۔

"اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنا اور غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے سے بچنا۔ شنبہ (ہفتہ) کے دن کی حفاظت کرنا یعنی پورے ہفتے میں عبادت کے لیے یہ ایک دن خاص رکھنا اور اس میں کام کاج سے بچنا اور عبادت کرنا۔ اپنے والدین کا اکرام کرنا کہ تیری عمر زمین میں دراز ہو۔ تمہارے ہاں جو اولاد پیدا ہو اس کو قتل نہ کرنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا۔ اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا۔ اپنے پڑوسی کی طرف التفات مت کرنا اور نہ اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے کی طرف خواہش کرنا۔"

سب لوگ جو نہایت ادب سے سن رہے تھے، ان احکام پر عمل کرنے پر متفق ہوئے۔ سب نے یک زبان ہو کر اقرار کیا کہ وہ ان باتوں پر ہمیشہ عمل کرتے رہیں گے تاکہ ان کی زندگیاں پاکیزہ ہوں۔

"اے موسیٰ! تو ہی ہم سے باتیں کر لیا کر اور ہم سن لیا کریں گے۔ خدا ہم سے باتیں نہ کرے۔ اس کا جلال ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم خوف سے مر جائیں۔"

"دیکھو، خدا نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ کالے بادلوں میں میرے پاس آئے گا اور مجھ سے باتیں کرے گا۔ تم خوف مت کرو۔ وہ تمہارے امتحان کے لیے تمہارے پاس آئے گا اور تم سے باتیں کرے گا تاکہ تم کو اس کا خوف ہو اور تم گناہ نہ کرو۔"

ایک دن ایسا ہوا کہ کالا بادل سینا کے نزدیک طاری ہوا۔ سب لوگ مارے خوف کے بادل کے قریب گئے اور اپنے رب سے ہم کلام ہوئے۔ جب آپ واپس آئے تو بنی اسرائیل جوق در جوق آپ کے گرد جمع ہو گئے اور اصرار کرنے لگے کہ اللہ نے جو کچھ ہمارے بارے میں کہا ہے وہ بتائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ "تم نہ آتے تو میں تمہیں بلانے ہی والا تھا تاکہ جو کچھ مجھ سے کہا گیا ہے، وہ میں تم تک پہنچا دوں۔ خداوند نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے کہہ دوں کہ تم نے خود دیکھا کہ میں نے آسمان سے تمہارے ساتھ باتیں کیں۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور چاندی سونے کے دیوتا اپنے لیے نہ گھڑ لینا۔ مٹی کی ایک قربان گاہ میرے لیے بنایا کرنا اور اس پر اپنی بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کی سوختنی قربانیاں اور سلامتی کی قربانیاں چڑھانا اور جہاں جہاں میں اپنے نام کی یادگاری کرواؤں گا، وہاں میں تیرے پاس آ کر تجھے برکت دوں گا اور اگر تو میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو تراشے ہوئے پتھر سے نہ بنانا کیونکہ اگر تو اس پر اپنے اوزار لگائے تو تو اسے ناپاک کر دے گا۔ تو میری قربان گاہ پر سیڑھیوں سے ہرگز نہ چڑھنا۔"

"بات کوئی ہمیں نہیں ستاتا۔ ہمیں خدا سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کاش تم ڈرنے والے بن جاؤ۔"

بنی اسرائیل بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ خدا موسیٰ کو احکام دے اور وہ ہم تک پہنچائیں تاکہ ہم ان پر عمل کریں اور مقدس قوموں میں ہمارا شمار ہو۔

پھر ایک دن کالے بادلوں نے صحرا کے ایک حصے کو گھیر لیا۔ پہاڑ آگ سے دہکنے لگا اور دھواں اٹھتا دکھائی دینے لگا۔ بنی اسرائیل پہاڑ سے دور ہو گئے۔ جان لیا کہ احکام آ رہے ہیں جنہیں سننے کے لیے موسیٰ کو بلایا جا رہا ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے بادلوں کے دھوئیں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دھوئیں میں گم ہو گئے۔ یہ ایسا اقدس اور بے مثال تھا کہ لوگوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ یوشع بن نون، کالب بن یوفنا اور کئی دوسرے صالح نوجوان جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت قریب تھے سجدے میں گرے ہوئے تھے اور دعائیں کر رہے تھے۔

"اے رب العالمین تو ہمارے لیے وہ احکام جاری کرنا جو ہمارے لیے آسانی پیدا کریں۔ ہم سے وہ کام ہرگز نہ لینا جو ہماری طاقت سے باہر ہو۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو ایک بڑے اجتماع کے سامنے بنی اسرائیل جمع ہو چکے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں خدا کے احکام سے آگاہ کیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ باہر آئے اور قوم سے خطاب کیا۔

"لوگو! تم نے پہاڑ پر آگ جلتے دیکھی؟ گہرے بادلوں کا سائبان دیکھا؟ اللہ نے ان بادلوں میں سے مجھ سے کلام کیا۔ اگر تم ڈر نہ گئے ہوتے اور مجھ سے یہ نہ کہہ دیا ہوتا کہ تو ہی ہم سے باتیں کر لیا کر لیکن خدا ہم سے باتیں نہ کرے تو وہ آواز تم بھی سنتے جو میں نے سنی۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں آئین اور احکام سناؤں تاکہ تم ان پر عمل کرو اور خدا جو ملک تمہیں دینے والا ہے اس میں داخل ہو جاؤ۔ فی الحال ہمیں یہیں رہنا ہے۔ خدا تمہیں امتحان میں ڈالے گا کہ تم اس کے کہے پر عمل کرتے ہو یا اپنی عقلیں دوڑاتے ہو۔ فرماں برداری کرتے ہو یا سرکشی اختیار کرتے ہو۔ میں تمہیں احکام خداوندی دے رہا ہوں۔ تم ان پر عمل کرو اور دوسری قوموں کے لیے مثال بن جاؤ۔ یہ کچھ احکام ہیں انہیں غور سے سن لو۔ اس کے بعد دوسرے احکام بھی آتے رہیں گے۔

سب سے پہلے مجھے غلاموں کے بارے میں بتایا گیا۔

"اگر غلام عبرانی ہے تو اس کی مدت خدمت صرف چھ سال ہوگی۔ ساتویں برس مفت آزاد ہو کر چلا جائے گا۔ وہ اکیلا آیا تھا تو اکیلا ہی جائے گا لیکن اگر بیوی کے ساتھ آیا تھا تو بیوی کو بھی اس کے ساتھ جانے دینا۔ اگر اس کی شادی دوران غلامی میں اس کے مالک نے کرائی تھی تو وہ بیوی کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ اگر وہ بیوی کے بغیر جانا نہیں چاہتا تو آقا اس کا کان چھیدے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی مرضی سے زندگی بھر کے لیے غلامی اختیار کر لی۔"

تشدد آمیز سلوک کے بارے میں ان باتوں پر عمل کرنا۔

"اگر کوئی کسی آدمی کو ایسا مارے کہ وہ مر جائے تو قاتل کو بھی مارا جائے۔ اگر دو شخص جھگڑیں اور ایک دوسرے کو پتھر ماریں اور دوسرا مرے تو نہیں صرف زخمی ہو اور پھر اس کے زخم ٹھیک ہو جائیں اور وہ چلنے پھرنے لگے تو جس نے مارا تھا وہ بری ہو جائے گا۔ اس کی سزا یہ ہوگی کہ وہ اس کا ہرجانہ بھر دے اور اس کا علاج کرائے۔"

"اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو جان سے مار دے تو اسے ضرور سزا دی جائے لیکن اگر وہ ایک دو دن جیتا رہے تو آقا کو سزا نہ دی جائے۔ اس لیے کہ وہ غلام اس کا مال ہے۔"

"اگر کسی حاملہ کو ایسی چوٹ پہنچے کہ اسے اسقاط ہو جائے تو اس کا شوہر جتنا جرمانہ تجویز کرے بھر دیا جائے۔ اگر اسقاط کے ساتھ کوئی اور بھی نقصان ہوا ہو تو آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔"

"اگر کوئی اپنے غلام کی آنکھ پھوڑ دے تو آنکھ کے بدلے اسے آزاد کرنا ہوگا۔ اگر دانت توڑ دے تو دانت کے بدلے آزاد کرنا ہوگا۔"

"اگر بیل کسی کو سینگ مارے اور وہ مر جائے تو بیل سنگسار کیا جائے اور اس کا گوشت نہ کھایا جائے لیکن اگر بیل کو سینگ مارنے کی عادت تھی اس کے باوجود مالک نے اسے کھلا چھوڑ دیا تھا تو بیل کے ساتھ اس کے مالک کو بھی سنگسار کیا جائے یا فدیہ لیا جائے تو فدیہ دے کر اپنی جان بچا لے لیکن بیل سنگسار ہوگا۔"

"اگر کوئی آدمی گڑھا کھولے اور اس کا منہ بند نہ کرے اور کوئی بیل یا گدھا اس میں گر جائے تو گڑھے کا مالک اس کا نقصان بھرے۔"

"اگر کسی کا بیل دوسرے کے بیل کو ایسی چوٹ مارے کہ وہ مر جائے تو وہ جیتے بیل کو بیچیں اور اس کا دام آدھا آدھا آپس میں بانٹ لیں اور اگر معلوم ہو جائے کہ اس بیل کی پہلے سے سینگ مارنے کی عادت تھی اور اس کے مالک نے اسے باندھ کر نہیں رکھا تو اسے قطعی بیل کے بدلے بیل دینا ہوگا اور مرا ہوا جانور اس کا ہوگا۔"

"اگر کوئی آدمی بیل یا بھیڑ چرا لے اور اسے ذبح کرے یا بیچ دے تو وہ ایک بیل کے بدلے پانچ بیل اور ایک بھیڑ کے بدلے چار بھیڑیں دے۔"

"اگر کوئی اپنے ہمسائے کے پاس گدھا، بیل یا بھیڑ یا کوئی اور جانور امانت رکھے اور وہ بغیر کسی کے دیکھے مر جائے یا چوٹ کھائے تو ان دونوں کے درمیان خداوندی قسم ہو کہ اس نے اپنے ہمسائے کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا اور مالک اسے سچ مانے لیکن اگر جانور اس کے پاس سے چوری ہو جائے تو وہ اس کا معاوضہ دے۔ اگر کوئی شخص اپنے ہمسائے سے کوئی جانور مستعار لے اور وہ زخمی ہو جائے یا مر جائے تو وہ ضرور اس کا معاوضہ اس کے مالک کو دے۔"

خداوند نے مجھے ایک ملاقات میں اخلاقی اور مذہبی قوانین سے بھی آگاہ کیا ہے۔ وہ بھی سن لو اور اس پر عمل کرو۔

"مسافروں کو مت ستانا اور نہ ان پر ظلم کرنا۔ اس لیے کہ تم خود بھی ملک مصر میں مسافر تھے۔ ان سے نفرت نہ کرنا۔ کسی کو قرض دو تو اس سے سود نہ لینا۔ کسی ہمسائے کے کپڑے اگر گروی رکھو تو اسے سورج ڈوبنے تک واپس کر دینا۔ جو اپنے باپ یا ماں کو مارے یا ان پر لعنت بھیجے، قطعی مار ڈالا جائے۔

جھوٹی بات نہ پھیلانا اور گواہ ہونے کے لیے شریروں کا ساتھ نہ دینا۔

اگر دشمن کا بیل یا گدھا بھٹکتا ہوا ملے تو اسے ضرور پھیر کر لے آنا۔

کاہن کو ہر ناپاکی سے دور رہنا چاہیے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام خطاب کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل اسے بظاہر سن بھی رہے تھے لیکن مجمع کے ایک حصے میں بے چینی سی تھی۔ کچھ لوگ یہ کہتے سنائی دے رہے تھے کہ ہمیں کیا خبر یہ باتیں موسیٰ اپنی طرف سے کر رہے ہیں یا واقعی خدا نے یہ باتیں ان سے کہی ہیں۔ اگر خدا نے کہی ہوتیں تو وہ صرف ہمیں ڈراتا نہیں، ہمیں خوش خبریاں بھی دیتا۔ ہم اپنے گھر بار چھوڑ کر مصر سے یہاں آ گئے اور ہمارے لیے خوشی کا کوئی سامان ہی نہیں۔ ہمیں تو موسیٰ بتوں کی عبادت تک نہیں کرنے دیتا۔ یہ کیسے احکام ہیں کہ ہم صرف وہ کریں جو موسیٰ چاہے۔

یہاں کھڑے ہوئے وہی لوگ تھے جو اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں بت بنا کر دے تاکہ ہم ان کی عبادت کر سکیں جیسے کہ کنعانیوں کے بت کدوں میں ہم نے دیکھی ہے۔ ان لوگوں میں سے چند نے چیخ چیخ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنا شروع کیا۔

"اے موسیٰ (علیہ السلام) تم ہم پر کب تک بوجھ ڈالتے رہو گے۔ اپنے خدا سے کیوں نہیں کہتے، ہمارے لیے عید کیوں نہیں اتارتا کہ ہم ناچیں اور گائیں۔ دوسری قومیں کیسے کیسے سوانگ بھرتی ہیں اور ہمیں صحرا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کی طرف توجہ کی۔

"اے میری قوم کے نادان لوگو! تم نے کیسے سمجھ لیا کہ خدا تم سے غافل ہے۔ وہ یہ احکام اس لیے دے رہا ہے کہ تم پاکیزگی اختیار کرو اور دوسری قوموں کے لیے مثال ہو اور تمہارا حال یہ ہو رہا ہے کہ دوسری قوموں کی بے ہودہ باتوں کی نقالی کرتے ہو۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں خدا سے سوال کر کے دیکھوں گا۔ ابھی اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا۔"

اس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خیمے میں چلے گئے۔

شریر گروہ اپنی فتح مندی پر مسکرا رہا تھا۔

سے ہوا اور ٹھہرا کہ یہ میری باتیں تھیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام مسلسل تین دن تک اپنی قوم کے حق میں اپنے رب سے دعا کرتے رہے۔ آخر تیسرے دن ان پر وحی نازل ہوئی۔ آپ نے قوم سے پھر خطاب کیا۔

''میری قوم کے لوگو! خدا نے تمہارے لیے تین اہم عیدوں کا اعلان کیا ہے لیکن خبردار ان عیدوں پر سوانگ نہ بھرنا، مورتیوں کی پوجا نہ کرنا۔ یہ عیدیں شکرگزاری کی عیدیں ہیں۔ جو کچھ مجھ سے کہا گیا ہے وہ تم تک پہنچا رہا ہوں ۔۔۔۔ اور خبردار! اس بابت مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔

خدا فرماتا ہے۔ ''تو میرے لیے سال بھر میں تین عیدیں منانا۔ پہلی عید، عید فطیر ہوگی۔ اس میں میرے حکم کے مطابق ابیب مہینے کے مقررہ وقت پر سات دن تک فطیری روٹی کھانا کیونکہ اسی مہینے میں تو مصر سے نکلا تھا۔

(ابیب کا مہینا بہار کا مہینا تھا)

اور جب تیرے کھیت میں جسے تو نے محنت سے بویا پھل آئے تو فصل کاٹنے کی عید منانا۔ (یہ گرما کا مہینا تھا)

اور سال کے آخر میں جب تو اپنی محنت کا پھل کھیت سے جمع کرے تو جمع کرنے کی عید منانا۔ خیموں پر کھجور کی شاخیں لپیٹنا، مہندی کی ڈالیاں لگانا اور مصر سے نکلنے کا زمانہ یاد کرنا۔

اور یاد رکھنا تینوں مرتبہ تمہارے ہاں کے سب مرد خدا کے آگے حاضر ہوا کریں۔

اور خمیری روٹی کے ساتھ میرے ذبیحہ کا خون نہ چڑھانا اور میری عید کی چربی صبح تک باقی نہ رہنے دینا۔

اپنی زمین کے پہلے پھلوں کا پہلا حصہ خدا کے گھر لانا۔''

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک طویل خطاب کیا اور اپنی قوم کو نصیحت کی۔

''اے بنی اسرائیل! اب تک خدا کی معرفت جو احکام میں تمہیں دے چکا اگر تم نے احکام پر عمل نہ کیا اور دوسرے معبودوں کی عبادت اور پرستش کرنے لگے تو تم پر لعنتیں نازل ہوں گی۔ تمہاری اولاد، تمہاری زمین اور تمہارے جانور سب لعنتی ہوں گے۔ تمہاری بداعمالیوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم در بدر پھرو گے۔ بیماریوں میں مبتلا ہوگے۔ آسمان جو تیرے سر پر ہے، پیتل کا ہو جائے گا اور زمین جو تیرے نیچے ہے، لوہے کی ہو جائے گی۔ بارش کے بدلے تیری زمین پر خاک اور دھول برسے گی۔ تیرے دشمنوں کے آگے تجھے شکست ہوگی اور جیسے اندھا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے ویسے ہی تو دوپہر کو دن کے اجالے میں ٹٹولتا پھرے گا۔ تو اپنے کاموں میں ناکام رہے گا۔

اور اے لوگو! اگر تم نے نافرمانی کی تو تمہارے جانور تم سے چھین لیے جائیں گے۔ ہاں اگر تم نے فرماں برداری کی اور خدا کی باتوں پر عمل کیا تو تمہیں دنیا کی قوموں میں سرفراز کیا جائے گا اور برکتیں تم پر نازل ہوں گی اور جو دشمن ہوں گے ان پر تمہیں فتح دی جائے گی۔ جو ملک تمہیں اور باپ دادا کو دینے کی خدا نے قسم کھائی ہے وہ تمہیں مل کر رہیں گے۔ مگر یہ اسی وقت ہوگا جب تم خدا کی باتوں پر عمل کرو گے اور جو کچھ میں خدا کی طرف سے لاتا رہوں گا اس پر عمل کرو گے۔ یاد رکھو میں اپنی جانب سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ میں خدا کی باتیں تم تک پہنچاتا ہوں کیونکہ تم یہ چاہتے ہو کہ جو کچھ کہنا سننا ہو کرے تم ہی کہہ لیا کرو ورنہ یہ باتیں تم سے خدا کہتا۔''

اس کے بعد بھی جو پند و نصائح خدا کی طرف سے آتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم تک پہنچاتے رہے۔ ان کی قوم بھی بے دلی سے ہی سہی شوق سے ان پیغامات کو سنتی رہی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو قوم کو شریعت دی جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے۔ اپنی قوم تک انہوں نے پند و نصائح کی بہت سی باتیں پہنچا دی ہیں۔ اب اگر انہیں مکمل شریعت لکھی ہوئی مل جائے اور وہ ان باتوں کو قوم کو سکھا دیں تو یہ بگڑی ہوئی قوم راہ راست پر آ جائے۔ وہ کئی مرتبہ سوچ چکے تھے کہ ''طور'' پر جائیں اور خدا سے ہم کلام ہو کر قوم کے لیے شریعت حاصل کریں لیکن خدا کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے تھے۔ وہ عالم بے تابی میں کئی مرتبہ پہاڑ تک گئے لیکن الٹے قدموں دوڑ آئے۔ خشیت نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ اگر میں اجازت کے بغیر پہاڑ پر چلا گیا تو کہیں میرا شمار نافرمانوں میں نہ ہو جائے۔

راتیں اور دن اسی بے تابی میں گزر رہے تھے۔ بار بار خیال آتا تھا کہ کہیں کوئی خطا تو نہیں ہوگئی۔ میرا رب مجھ سے روٹھ تو نہیں گیا۔ دن رات کی فریادیں تھیں اور سجدہ گزاری تھی اور دل کا انتشار تھا۔ بنی اسرائیل کا شریر گروہ جان بوجھ کر آپ سے پوچھتا رہتا تھا۔ خدا نے کوئی نئی ہدایت جاری کی ہو تو ہمیں پہنچائیں۔ آپ کے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ خدا کسی کے کہنے میں نہیں۔ وہ جب مناسب سمجھے گا تمہیں مخاطب کرے گا۔

اس گروہ نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا تھا کہ موسیٰ ہمیں مصر سے نکال لائے ہیں، اس لیے موسیٰ کا خدا ان سے روٹھ گیا ہے۔ اب وہ ان سے بھی کلام نہیں کرے گا۔ اب بنی اسرائیل کے عام لوگ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ خدا نے اگر ہمیں چھوڑ دیا تو ان بیابانوں میں ہم کہاں تک بھٹکتے رہیں گے۔ ان میں سے بہت سوں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ وہ مصر واپس چلے جائیں گے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن انہیں کوئی ایسا مضبوط سردار نہیں مل رہا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام، یوشع بن نون، حضرت ہارون اور ان جیسے دوسرے مضبوط سرداروں سے مقابلہ کرے اور انہیں یہاں سے نکال کر مصر کی طرف لے جائے۔ یہ بدبخت قوم ایک مرتبہ پھر اسی منزل پر کھڑی ہوئی تھی جہاں وہ یہاں آنے سے پہلے مصر میں کھڑی تھی۔ جب وہ فرعون مصر کے خوف سے مصر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اب انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف تھا کہ وہ انہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ ان کے پاس کوئی ایسا سردار نہیں تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کر سکتا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کا مقابلہ کیا تھا۔

جب یہ لوگ اس طرف سے مایوس ہو گئے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اس مایوسی کو امید میں بدلنے کے لیے کہنا شروع کر دیا کہ بس کچھ دن کی بات ہے، موسیٰ خود تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے جہاں چاہو چلے جانا۔

کچھ دنوں تک تو قوم کو یقین نہ آیا کہ جو باتیں کی جا رہی ہیں ان میں کوئی حقیقت ہو سکتی ہے لیکن جب تواتر سے یہ باتیں ہونے لگیں اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام لوگوں کے سامنے آنے سے گریز کر رہے ہیں ۔۔۔۔ بہت دنوں سے انہوں نے خطاب بھی نہیں کیا تو انہیں یقین آنے لگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تک بھی یہ باتیں کسی نہ کسی طرح پہنچتی رہی تھیں۔ وہ وحی کے انتظار میں تھے اور بالآخر ایک دن وحی اتری۔ خدا ان سے کہہ رہا تھا۔

''میرے پاس پہاڑ پر آ اور وہیں ٹھہرا رہ اور میں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تاکہ تو ان کو سکھائے۔''

''میں اگر پہاڑ پر ٹھہرا رہا تو اس سرکش قوم کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''تو اپنے پیچھے ہارون کو چھوڑ کر آ اور پھر دیکھ جس قوم کے لیے تو مجھ سے اتنی دعائیں کرتا ہے وہ تیرے پیچھے کیا کرتی ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بلایا اور انہیں خدا کے حکم سے آگاہ کیا۔

''خدا نے حکم دیا ہے کہ میں کوہ طور پر آ کر عبادت میں مشغول ہو جاؤں۔ مجھے وہاں تیس راتیں اور تیس دن گزارنے ہوں گے۔ اس مدت میں آپ میرے خلیفہ اور نائب کے فرائض انجام دیں گے۔ رشد و ہدایت کا فریضہ آپ کو سونپا گیا ہے۔ تمام بنی اسرائیل کو میرے طریقہ کار پر عمل پیرا رکھنا۔ ان میں کسی طرح بھی انتشار پیدا نہ ہو۔''

''اگر قوم کے بزرگوں کو بلا کر یہ فیصلہ آپ اپنی زبان سے سنا دیں تو وہ آسانی سے میری بات سنیں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام خیمۂ اجتماع سے باہر آئے اور قوم سے خطاب کیا۔

''مجھے کوہ طور پر طلب کیا گیا ہے۔ وہاں مجھے تیس دن کا چلہ کاٹنا ہوگا تاکہ میں تمہارے لیے شریعت لے کر آؤں۔ میری عدم موجودگی میں حضرت ہارون تمہاری ہدایت کے لیے موجود ہوں گے۔ جس کسی کا کوئی مقدمہ ہو وہ ان کے پاس لائے اور ان کے حکم پر عمل پیرا ہو۔

میں تمہیں ایک مرتبہ پھر تنبیہ کرتا ہوں کہ تم کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت ہرگز نہ بنانا۔ کوئی بھی شبیہ وہ مرد کی ہو یا عورت کی یا زمین کے کسی حیوان کی یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرندے کی یا زمین میں رینگنے والے کسی کیڑے یا مچھلی کی ہو۔ جب آسمان کی طرف نظر کرو اور سورج، چاند اور تاروں کو دیکھو تو گمراہ ہو کر ان کو سجدہ مت کرنا۔ مجھے لوگ تمہارا

جنت میں جائے گا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ہی تعریف کرنے کے قابل ہیں۔''

بنی اسرائیل پر اس خطاب کا انتہائی اثر ہوا۔ یہ بات ان کے دلوں میں پختہ ہوگئی کہ یہ جو ہم سن رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے، یہ بات آج سچ ثابت ہوگئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اب کے گئے، کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے اور عبادت کے لیے اعتکاف میں بیٹھ گئے۔

جب مقررہ مدت کے دن گزر گئے تو آپ نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کر دی۔ چونکہ مکمل ایک ماہ روزے ہی میں بسر کیے تھے اسی لیے خیال آیا کہ مسلسل بھوکا رہنے سے منہ سے بو آنے لگی ہوگی۔ شرمندگی سی محسوس ہوئی کہ خدا سے ہم کلام ہوتے وقت یہ بو ظاہر ہو۔ اس بو کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبایا اور کھایا۔

وحیِ الٰہی نے فوراً ٹوکا۔

''موسیٰ علیہ السلام! تم نے گفتگو کرنے سے پہلے روزہ افطار کیوں کر لیا۔ ہمیں تو تمہارا روزے کی حالت میں رہنا نہایت پسند تھا اور تم نے اجازت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس سے پہلے تو تم ہر قدم ہماری اجازت کے بغیر نہیں اٹھاتے تھے۔''

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ ان سے خطا ہوگئی ہے۔ نادانستگی میں انہوں نے خدا کو ناراض کر دیا ہے۔ انہوں نے نہایت عاجزی سے روزہ افطار کر لینے کا جواز پیش کیا۔

''خدایا! مسلسل تیس روزوں کی وجہ سے میرے منہ سے بو آنے لگی تھی۔ مجھے گوارا نہیں ہوا کہ میں اس حالت میں آپ سے گفتگو کروں۔''

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔ موسیٰ! اس مدت کو بڑھا کر چالیس دن کر دو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شکر ادا کیا کہ خطا کی سزا صرف یہ ملی۔

قرآن کریم نے وجہ بیان نہیں کی صرف اتنا بتایا۔

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا اور اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی۔''

جب چلہ پورا ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی بخشا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عشقِ بے پایاں نے غایت کیف و انبساط میں ایک اور مطالبہ کر دیا۔

''جب تو نے مجھ کو لذت و کیف سماع سے نوازا ہے تو پھر لذت مشاہدہ و دیدار سے کیوں محروم رہوں۔ مجھ پر تجلی ذات آشکار کر۔''

ادھر سے جواب آیا۔ ''موسیٰ! تم تجلی ذات کا مشاہدہ نہیں کر سکو گے بلکہ تاب ہی نہ لاسکو گے۔''

عشق موسیٰ مسلسل اصرار کر رہا تھا اور دوسری طرف سے مسلسل انکار ہو رہا تھا۔ ناز دکھائے جا رہے تھے، ناز اٹھائے جا رہے تھے لیکن جو اللہ جانتا تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں جانتے تھے۔ بچہ جب ضد کرتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ وہ چیز اسے مل بھی سکتی ہے یا نہیں۔ اسے تو بس ضد سے مطلب ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔

یہ تو بڑوں کو معلوم ہوتا ہے اس ضد کو پورا کرنا بچے کے حق میں مفید بھی ہے یا نہیں۔

جب ضد بہت بڑھی تو اس طرف سے جواب آیا۔ ''اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے۔ اگر یہ اس تجلی کو برداشت کر لے تو پھر تم یہ سوال کرنا۔'' اس کے بعد ''طور'' پر حضرت حق کی تجلی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس نظارے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہوگئے۔

''اور جب موسیٰ (علیہ السلام) آیا تاکہ مقررہ وقت پر حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو پکار اٹھا 'پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نظر کر سکوں۔' حکم ہوا 'تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر یہ (تجلی حق کی تاب لے آیا اور) اپنی جگہ ٹکا رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا۔' پھر جب اس کے پروردگار نے تجلی کی تو اس تجلی نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ ...... غش کھا کر گر پڑا۔ جب موسیٰ ...... ہوش میں آیا تو بولا۔ خدایا! تیرے لیے ہر طرح کی پاکیزگی ہو۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں ہوں۔'' (سورۃ اعراف)

اس رازو نیاز کے بعد تورات عطا کی گئی اور حضرت حق نے ان کو حکم دیا کہ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنی قوم سے کہنا کہ وہ بھی ان احکام پر اس طرح عمل کریں کہ جو عمل نیک جس قدر زیادہ قرب الٰہی کا سبب ہے اس کو دوسرے اعمال پر ترجیح دے۔ میں نے اس کتاب میں تمہارے دینی و دنیوی فلاح کی تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں اور حلال و حرام محاسن و معائب غرض تمام اوامر و نواہی کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور یہی میری شریعت ہے۔

تو بنی اسرائیل سے کہنا کہ میرے لیے نذر لائیں اور تم ان ہی سے میری نذر لینا جو اپنے دل کی خوشی سے دیں۔ تم ان سے سونا، چاندی اور پیتل اور آسمانی اور ارغوانی اور سرخ رنگ کا کپڑا، بکری کی پشم اور مینڈھوں کی سرخ رنگی ہوئی کھالیں اور کیکر کی لکڑی اور چراغ کے لیے تیل لے لینا اور ان سے کہنا وہ میرے لیے ایک مقدس گھر بنائیں تاکہ میں ان کے درمیان سکونت کروں اور وہ کیکر کی لکڑی کا ایک صندوق بنائیں جس کی لمبائی ڈھائی ہاتھ اور چوڑائی ڈیڑھ ہاتھ اور اونچائی ڈیڑھ ہاتھ ہو اور تو اس کے اندر اور باہر خالص سونا منڈھنا اور اس کے اوپر گرداگرد ایک زریں تاج بنانا اور اس کے لیے سونے کے چار کڑے ڈھال کر اس کے چاروں پایوں میں لگانا۔ دو کڑے ایک طرف ہوں اور دو ہی دوسری طرف اور کیکر کی چوبیں بنا کر ان پر سونا منڈھنا اور ان چوبوں کو صندوق کے اطراف کے کڑوں میں ڈالنا کہ ان کے سہارے صندوق اٹھ جائے اور تو اس شہادت نامے کو جو میں تجھے دوں گا اسی صندوق میں رکھنا۔ وہاں میں تجھ سے ملا کروں گا اور ان سب احکام کے بارے میں جو میں بنی اسرائیل کے لیے تجھے دوں گا، تجھ سے بات چیت کیا کروں گا۔

اور تو دو ہاتھ لمبی اور ایک ہاتھ چوڑی اور ڈیڑھ ہاتھ اونچی کیکر کی لکڑی کی ایک میز بھی بنانا اور اس کو خالص سونے سے منڈھنا اور اس کے گرداگرد ایک زریں تاج بنانا اور اس کے چاروں طرف چار انگل چوڑی ایک پٹی لگانا اور اس پٹی کے گرداگرد ایک زریں تاج بنانا اور سونے کے چار کڑے اس کے لیے بنا کر ان کڑوں کو چاروں کونوں میں لگانا جو چاروں پایوں کے مقابل ہوں گے۔ کیکر کی لکڑی کی چوبیں بنا کر ان کو سونے سے منڈھنا تاکہ میز ان ہی سے اٹھائی جائے اور تو اس کے طباق اور چمچے اور آفتابے اور انڈیلنے کے بڑے بڑے کٹورے سب خالص سونے کے بنانا اور تو اس میز پر نذر کی روٹیاں ہمیشہ میرے روبرو رکھنا۔

تو خالص سونے کا ایک شمع دان بنانا۔ وہ شمع دان اور اس کا پایہ اور ڈنڈی سب گھڑ کر بنائے جائیں اور اس کی پیالیاں اور لٹو اور اس کے پھول سب ایک ہی ٹکڑے کے بنے ہوں اور تو اس کے لیے سات چراغ بنانا۔ یہی چراغ جلائے جائیں تاکہ شمع دان کے سامنے روشنی ہو۔

خداوند کی حضوری کا خیمہ (مسکن) بنانا۔ اس مسکن کے لیے دس پردے بنانا۔ یہ بٹے ہوئے باریک کتان اور آسمانی، ارغوانی اور سرخ رنگ کے کپڑوں کے ہوں۔ ہر پردے کی لمبائی اٹھائیس ہاتھ اور چوڑائی چار ہاتھ ہو اور سب پردے ایک ہی ناپ کے ہوں اور تو بکری کے بال کے پردے بنانا تاکہ مسکن کے اوپر خیمے کا کام دیں۔ ایسے پردے گیارہ ہوں۔

اور تو اس خیمے کے لیے مینڈھوں کی سرخ رنگی ہوئی کھالوں کا غلاف بنانا اور ایک پردہ خیمے کے دروازے کے لیے آسمانی، ارغوانی اور سرخ رنگ کے کپڑوں اور باریک بٹے ہوئے کتان کا بنانا اور اس پر بیل بوٹے کڑھے ہوئے ہوں اور اس پردے کے لیے کیکر کی لکڑی کے پانچ ستون بنانا اور ان کو سونے سے منڈھنا اور ان کے کنڈے سونے کے ہوں جن کے لیے پیتل کے پانچ خانے ڈھال کر بنانا۔

اور تو کیکر کی لکڑی کی قربان گاہ پانچ ہاتھ لمبی اور پانچ ہاتھ چوڑی بنانا۔ وہ قربان گاہ چوکھونٹی ہو اور اس کی اونچائی تین ہاتھ ہو اور تو اس کے لیے چاروں کونوں پر سینگ بنانا اور تو اس کی راکھ اٹھانے کے لیے دیگیں اور بیلچے اور کٹورے اور سیخیں اور انگیٹھیاں بنانا۔ اس کے سب ظروف پیتل کے بنانا۔

وہ ایسی ہی بنائیں جیسی تجھے پہاڑ پر دکھائی گئی ہے۔

اور تو بنی اسرائیل کو حکم دینا کہ وہ تیرے پاس زیتون کا خالص تیل روشنی کے لیے لائیں تاکہ چراغ ہمیشہ جلتا رہے۔ ہارون اور اس کے بیٹے شام سے صبح تک شمع دان کو خداوند کے روبرو آراستہ رکھیں۔ یہ دستور العمل بنی اسرائیل کے لیے نسل در نسل سدا قائم رہے گا۔

یہ ہدایات دینے کے بعد خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ''تو دھونے کے لیے پیتل کا ایک حوض اور پیتل ہی کی ایک کرسی بنانا اور اسے خیمۂ اجتماع اور قربان گاہ کے بیچ میں رکھ کر اس میں پانی بھر دینا۔

تو بنی اسرائیل سے یہ بھی کہہ دینا کہ تم میرے "سبتوں" کو ضرور ماننا۔ جو کوئی اس کی بے حرمتی کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔ چھ دن کام کاج کیا جائے لیکن ساتواں دن آرام کا "سبت" ہے جو خداوند کے لیے مقدس ہے۔ جو کوئی سبت کے دن کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔"

عہد کے اس صندوق کی شہادت قرآن سے بھی ملی ہے۔ فرمان الٰہی ہے۔

"اس کی سلطنت کی علامت یہ ہوگی کہ تمہارے پاس تابوت آئے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکینت اور موسیٰ و آل ہارون کا بقیہ متروکہ یعنی ان کی نشانیاں ہوں گی اور اس کو فرشتے اٹھائے ہوں گے۔ بے شک اس میں نشانی ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔" (سورۃ البقرہ)

یہ ان کے لیے کعبے کے مانند تھا۔ اس کی طرف نماز وغیرہ میں رخ کیا جاتا تھا اور اس کے قرب کو تبرک سمجھا جاتا تھا۔

جب بنی اسرائیل کوئی ایسا جھگڑا یا مسئلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لاتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس کا جواب نہ ہوتا تو آپ تابوت کے پاس دونوں خصموں کے درمیان کھڑے ہو جاتے۔ پھر ان کے پاس اس مسئلے کا فیصلہ نازل ہوتا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے چھ باتوں کا سوال کیا۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ متقی ہے؟

جواب۔ جو ذکر کرتا ہے اور بھولے نہ۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ سیدھی راہ چلنے والا ہے؟

جواب۔ جو ہدایت کی پیروی کرے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے؟

جواب۔ جو لوگوں کے لیے بھی وہی فیصلہ کرے جو فیصلہ اپنے لیے کرے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں کون سا بندہ سب سے زیادہ علم والا ہے؟

جواب۔ وہ عالم جو سیر نہ ہوتا ہو بلکہ لوگوں کے علم کو اپنے علم کے ساتھ جمع کرتا رہے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ عزت والا ہے؟

جواب۔ جب وہ قادر ہو جائے تو معاف کر دے۔

سوال۔ تیرے بندوں میں سے کون سا بندہ سب سے زیادہ مالدار ہے؟

جواب۔ وہ شخص جتنا بھی اس کو دیا جائے وہ اس پر راضی ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو قوم ہدایت پہنچنے کے باوجود بھی سمجھ سے کام نہیں لیتی اور گمراہی پر قائم رہتی ہے پھر ہم بھی اس کو گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اس حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

"جو لوگ ناحق خدا کی سرزمین میں سرکشی کرتے ہیں ہم اپنی نشانیوں سے ان کی نگاہیں پھیر دیں گے۔ وہ دنیا بھر کی نشانیاں دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں گے۔ اگر وہ دیکھیں ہدایت کی راہ سامنے ہے تو کبھی اس پر نہ چلیں۔ اگر دیکھیں کہ گمراہی کی ٹیڑھی راہ سامنے ہے تو فوراً اس پر چل پڑیں۔ ان کی ایسی حالت اس لیے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے ہیں اور ان کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور آخرت کے پیش آنے سے منکر رہے تو ان کے سارے کام اکارت گئے۔ وہ جو کچھ بدلہ پائیں گے وہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ان ہی کے کرتوت کا پھل ہوگا جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔" (سورۃ الاعراف)

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء ابن کثیر۔ توریت ۔۔۔۔ ارض القرآن۔ سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن۔ ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن جمیل احمد۔



پُراسرار محافظ

نادیہ نور

کبھی کبھی انسان کی دیرینہ خواہشیں پوری نہ ہو پائیں تو مرنے کے بعد بھی دنیا میں بھٹکتی روحوں کا روپ دھار کر اپنا ادھورا پن دور کرنے کی کوشش میں مصروف عمل رہتی ہیں جیسے کہ یہاں... اگرچہ اس کا اپنا کوئی وجود نہ تھا مگر وہ ایک جیتے جاگتے وجود کو موت کے منہ سے کھینچ لایا کیونکہ اس کی خواہش کا حاصل یہی تھا۔

ایک اسرار بھرے سفر کی بھیدوں بھری روداد

اپنے چھوٹے سے ٹورسٹ طیارے میں بیٹھ کر میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دسمبر کا سرد مہینہ چل رہا تھا۔ پائن کے اونچے اونچے درختوں پر برف کی سفیدی چھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں آس پاس کی ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ ہیڈ فون لگا کر اب میں کنٹرول ٹاور کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کنٹرول ٹاور کا اسٹاف میرے اڑان بھرنے کے ہی انتظار میں ہے۔

میرے اڑنے کے بعد ہی لوگ اپنے اپنے گھر جانے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ آج کرسمس کی رات تھی۔ مجھے بھی کرسمس منانے کے لیے اپنے گھر جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔ رات کے سوا دس بج رہے تھے۔ اچانک کنٹرول ٹاور کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ مجھے اڑان بھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں نے جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا۔

محسوس ہو رہی تھیں۔ چند لمحوں میں ہی رن وے پر دوڑتا ہوا میرا جہاز زمین سے اوپر اٹھ گیا۔ میری گود میں ایک نقشہ پڑا ہوا تھا جس کے بارے مجھے بتایا گیا تھا کہ مجھے کس سمت اور کس راستے سے جانا ہے لیکن مجھے نقشے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ راستہ پوری طرح سے میرے دھیان میں تھا۔ مجھے صرف چھ سو فٹ تک ایک گھنٹا اور چھ منٹ کے اندر اپنی مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا۔ جب جہاز کئی ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تو میں نے جہاز کے کمپاس کی سوئی پر نگاہ ڈالی۔ کمپاس کی سوئی دو سو چھپاس ڈگری کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ میرے اوپر تاروں سے بھرا ہوا آسمان تھا۔ میں دل ہی دل میں رات کو گھر پر ہونے والی پارٹی کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ مجھے لوکن جیتھ کے ہوائی اڈے پر لینڈ کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے لندن جانے کے لیے کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی اور لندن سے رات کے وقت کوئی لفٹ لے کر میں صبح ناشتے کے وقت تک اپنے گھر آسانی سے پہنچ سکتا ہوں۔ جہاں پر میری خوب صورت بیوی جیکولین، میری ماں اور میرے دو بچے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اپنی فیملی کی یاد آتے ہی میں کچھ جذباتی سا ہو گیا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ میری اڑان کو بیس منٹ ہو گئے تھے اور سب کچھ درست طریقے سے چل رہا تھا۔

پھر اچانک دس منٹ کے بعد ہی مشکلات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ذرا ہی دیر پہلے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے ہیڈ فون سے جو دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی، وہ بالکل ہی بند ہو گئی ہے۔ ہیڈ فون کی خرابی کا علم مجھے ذرا دیر بعد ہوا تھا کیونکہ میں اپنے گھر اور فیملی کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور پھر جب میں نے اپنے جہاز کے صحیح راستے اور سمت کا اندازہ لگانے کے لیے کمپاس کی طرف دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیونکہ اس کی سوئی دو سو چھپاس کی ڈگری پر ٹھہرنے کے بجائے مسلسل گھومے جا رہی تھی۔ اس سوئی کا اس طرح اچانک گھومتے رہنا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن میں نے اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر شاید کمپاس بے کار ہو چکا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر جہاز کا کمپاس بگڑ جائے تو ماہر سے ماہر پائلٹ بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ اب مجھے اڑان بھرے ہوئے پورے چوبیس منٹ ہو چکے تھے جب مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے لوکن جیتھ کے کنٹرول روم سے رابطہ قائم کرنا چاہیے اور انہیں بتانا ہوگا کہ میں بغیر

دبایا اور بولنا شروع کیا۔ ''ہیلو۔۔۔۔ ہیلو چارلی چارلی ڈیلٹا۔۔۔۔ کالنگ نارتھ ویلڈ کنٹرول۔'' میرا جہاز اس وقت سمندر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

میری آواز ٹرانسمیٹر میں ریسیو ہونے کے بجائے میرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آرہی تھی۔ ٹرانسمیٹر بھی خراب ہو گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ ایک جیٹ جیٹ فائٹر ایک چھوٹے سے کیبن کی طرح ہوتا ہے جس میں اپنی تنہائی یا بوریت کو دور کرنے کے لیے ایک شخص دنیا کے کسی الگ الگ کنٹرول ٹاور سے رابطہ کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف سے آنے والی آوازوں کو سن کر کسی حد تک تنہائی اور بوریت کو دور کیا جاسکتا ہے لیکن جب جہاز کا ریڈیو ٹرانسمیٹر ہی خراب ہو گیا ہو تو یہ تنہائی کتنی خوف ناک اور اذیت ناک ہو جاتی ہے۔ میں نے چینل ب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی کیونکہ چینل ب ہی ہنگامی ایمرجنسی چینل تھا لیکن وہاں سے بھی رابطہ نہیں ہو پایا اور جب مجھے حالات کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہیڈ فون، کمپاس اور یہ دس چینل والا ریڈیو ٹرانسمیٹر کیسے ناکارہ ہو گئے ہیں۔

رائل ایئر فورس میں دو برس تک ٹریننگ دی جاتی ہے اور خاص طور پر اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ کسی آفت یا جہاز میں خرابی کی صورت میں کس طرح جہاز کے پائلٹ کو اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھ کر جہاز کو سنبھالنا چاہیے تاکہ جہاز کے ساتھ ساتھ اپنی اور مسافروں کی جان بھی بچائی جاسکے اور آج مجھ پر بھی وہ وقت آن پڑا تھا۔ کمپاس اور ریڈیو ٹرانسمیٹر بغیر کسی وجہ کے خراب نہیں ہوتے کیونکہ یہ دونوں چیزیں کاک پٹ کے الیکٹرک سرکٹ کے ذریعے کام کرتی ہیں۔ جس جگہ میرے پاؤں تھے وہاں تاروں کا جال تھا۔ تاروں کے اس جال میں کہیں سے کوئی فیوز اڑ گیا تھا جس کی وجہ سے کمپاس اور ٹرانسمیٹر ریڈیو بے کار ہو گئے تھے۔

فورس میں تربیت کے دوران ہمارے سر سارجنٹ مارش کی ہدایتیں میرے ذہن میں گونجیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے حالات میں سب سے پہلے جہاز کا ایندھن بچانے کا کام کرنا چاہیے۔ جہاز کی رفتار کم کر دی جائے پھر غور اور دھیان سے جہاز کی مشینری اور دیگر آلات کا جائزہ لیا جائے۔ میں نے تمام آلات کا اچھے سے جائزہ لیا۔ کمپاس اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سوا سارے آلات درست کام کر رہے تھے۔ ان حالات میں جہاز کو نیچے زمین پر اتار لینا

رفتہ رفتہ میں نے جہاز کو بلندی سے نیچے لانے کی کوشش کی۔ میری گھڑی بتا رہی تھی کہ میرے سفر کے پچاس منٹ گزر چکے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق سمندر کا کنارہ صرف پانچ میل دور ہونا چاہیے تھا۔ چاند کی روشنی تھی۔ مجھے راستہ صاف نظر آرہا تھا لیکن جیسے جیسے جہاز نیچے جا رہا تھا ویسے ویسے میرے اندر عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ سمندر کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی مجھے اپنے اندر سمیٹنے کے لیے بے قرار ہے۔

اچانک جہاز نے ایک زوردار غوطہ لگایا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ نگاہ کرتے ہی جسم میں کپکپاہٹ سی دوڑنے لگی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے جہاز کو ایک دائرے میں گھمانا چاہیے۔ جہاز کو چکر لگاتے دیکھ کر شاید ریڈار اسٹیشن کو خبر ہو جائے اور وہ میری مدد کرسکے۔ زندگی بچانے کے لیے یہ اب میری آخری امید تھی کہ شاید حفاظتی جہاز آجائے اور مجھے راستہ دکھا کر صحیح سلامت زمین پر اترنے میں میری مدد کرے۔ مجھے اب اس جہاز کا ہی آسرا تھا۔ میں نے ایندھن چیک کیا تو میٹر بتا رہا تھا کہ میرے پاس ایندھن ابھی سلامت ہے۔ ابھی میں لوکن جیتھ سے بہت دور تھا۔ میں نے جہاز کو پھر بلندی پر لے گیا اور چکر لگانا شروع کر دیے۔ دس منٹ اور گزر گئے۔ کمپاس کی سوئی اب بھی بلاوجہ ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ بجلی سے چلنے والے تمام آلات دھیرے دھیرے سست پڑتے جا رہے تھے اور ایندھن صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ تک اور اڑ سکتا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ اب کسی بھی لمحے میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی یا میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں گا۔ میری جھنجلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ بے جان پڑے ہوئے ہینڈل کو مٹھی سے ٹکرا کر بے تحاشا گالیاں بکنے لگا۔ ''آخر تم لوگ میری آواز کیوں نہیں سن رہے ہو؟'' میں غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''کیا تم لوگ بہرے ہو گئے ہو؟'' اس چیخنے چلانے میں پانچ منٹ اور گزر گئے۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ بس میری زندگی کے یہ آخری لمحات ہیں لیکن مجھے اس اچانک آنے والی موت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا البتہ دل پر اس بات کا بوجھ ضرور محسوس ہوا کہ زندگی کے آخری لمحات میں میری فیملی میرے پاس یا میرے سامنے نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی مجھے مر جانا تھا۔ میں سمندر میں ڈوب کر

لایا جائے گا تو میری لاش ہی ناقابل شناخت ہو چکی ہوگی۔ میں ذہنی طور پر موت کے لیے تیار ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے جہاز کے ذرا نیچے ایک بڑا سا سایہ دکھائی دیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ کوئی جہاز تھا جو مجھ سے ذرا نیچے میرے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا۔ میں حیران تو ہوا لیکن میری سمجھ میں آگیا کہ وہ جہاز میری جانب ہیڈ ول کر کے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ میرے برابر آکر میری طرف بڑھنے لگا۔ وہ میرے نزدیک سے نزدیک تر آتا جارہا تھا۔ کچھ دیر میں دونوں جہازوں کا فاصلہ کم ہو کر صرف سو فٹ رہ گیا۔ ذرا دھیان سے جہاز کے ڈھانچے کا جائزہ لینے پر میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت پرانا اور ماسکوٹو انٹرا کا بمبار جہاز ہے جس کا دوسری جنگ عظیم میں بہت استعمال کیا گیا تھا۔ اس جہاز کا پائلٹ اپنے جہاز کو میرے قریب لاکر میرے تجسس کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ وہ عجیب انداز میں سر ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز تو سنائی نہیں دے رہی تھی مگر اس کے سر ہلانے کے اشارے سے میں یہ سمجھا کہ وہ اپنے جہاز کو غوطہ لگانے والا ہے۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں اپنے جہاز کو غوطہ لگا دیا جس کے نتیجے میں جہاز دو ہزار فٹ نیچے آگیا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے ویسا ہی اشارہ کیا۔ ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ اس جہاز کے پچھلے حصے پر بڑے بڑے کالے حروف میں صرف دو لفظ لکھے ہوئے تھے ۔۔۔۔۔ بی اور کے۔ میرا جہاز ان دو غوطوں کے بعد کافی نیچے آگیا تھا اور جب میری نظر ایندھن کے میٹر پر پڑی۔ ایندھن کی سوئی بالکل خالی ہو چکی تھی کیونکہ میٹر پر زیرو ہونے کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔ خوف کی وجہ سے میری زبان خشک ہو گئی۔ مدد ملنے کے باوجود بھی اب میری موت یقینی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

پائلٹ نے ایک مرتبہ پھر غوطہ لگانے کا اشارہ کیا۔ اس کا جہاز بڑی تیزی سے نیچے کی طرف جارہا تھا۔ اس بار تو میرا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔ میں نے دیکھا کہ مجھے راستہ دکھانے والا محافظ بغیر روشنی کے ہی جہاز اڑا رہا ہے۔ اس نے اپنے جہاز کو میرے جہاز کے بے حد قریب لاکر مجھے اشاروں سے یہ سمجھایا کہ زمین آگئی ہے اور تم جہاز کو فوراً نیچے اتار لو اور پھر میرا جہاز نیچے آگیا۔ اس کے پہیے زمین کو چھونے لگے۔ میں نے اپنے حواس یکجا کیے اور پوری قوت سے کنٹرول کو پکڑ لیا۔

میں بچ گیا۔ مجھے یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔ میرا محافظ مجھے حفاظت سے زمین پر اتارنے کے بعد اب اپنے جہاز کے ساتھ اوپر کی طرف جا رہا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ جہاز بادلوں کے جھنڈ میں کھو گیا۔ کچھ وقت تک میں تشکر آمیز نگاہوں سے سر اٹھائے اسی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اسی وقت عہد کیا کہ رائل ائرفورس کے ہیڈ کوارٹر سے فون کر کے اس جہاز کے پائلٹ کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔ میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے شدید سردی محسوس ہوئی۔ یہ ٹھنڈ اتنی سخت تھی کہ میرا جسم کپکپانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر سردی سے بچنے کی کوشش کی۔ آس پاس کا جائزہ لیا تو میں دنگ رہ گیا۔ میرا جہاز رن وے پر ضرور کھڑا تھا مگر کوئی ائرپورٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رن وے پر لال بتی روشنی والے بلب روشن تھے اور نہ ہی آس پاس کہیں روشنی نظر آ رہی تھی۔ خود کو تنہا کسی ویرانے میں پا کر میرے تن بدن میں ایک بار پھر کپکپاہٹ سی ہونے لگی مگر اسی وقت مجھے دور سے آتی کسی کار کی ہیڈ لائٹس نظر آ گئیں۔ وہ شاید کوئی کار یا جیپ تھی جو میری طرف ہی آ رہی تھی ذرا دیر میں وہ قریب آ کر مجھ سے دس فٹ کی دوری پر رک گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک بھاری آواز سنی۔

"ہیلو" آواز سن کر میں پھرتی سے باہر نکل آیا۔ رائل ائرفورس کی وردی میں ملبوس ایک شخص اپنی جیپ کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ "اس جیپ میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ائرفورس کے میس میں لے چلوں گا۔" شاید میرے جہاز کو دیکھ کر وہ بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے میں بھی کچھ کہے بغیر خاموشی سے آگے بڑھا اور چپ چاپ اس کی جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے موڑنے کے بعد سیدھا چل پڑا۔ راستے میں اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تم خوش قسمت ہو جو بچ گئے۔"

"بالکل..... مجھے واقعی یقین نہیں ہو رہا کہ میں بچ گیا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور اسے ساری تفصیل بتا دی اور اپنے محافظ کے بارے میں بھی بتا دیا۔

وہ غور سے میری بات سنتا رہا اور درمیان میں "ہوں ہاں" کر کے کچھ پوچھ بھی لیتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے کچھ پی رکھی ہے۔ ایک جگہ اس نے جیپ روک دی اور بولا۔ "اس ہوائی اڈے کا نام آر اے ایف منسٹن ہے لیکن اب یہ جہازوں کے آنے جانے کے قابل نہیں رہا ہے۔"

میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ایک چوڑے کنٹرول ٹاور کے پاس وہ رک گیا۔

"یہاں سے آر اے ایف کا نزدیک ترین آپریشنل اسٹیشن کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

میرا سوال سن کر وہ ایک منٹ تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرے خیال میں میریں سنٹ جارج نزدیک ترین آپریشنل اسٹیشن ہو سکتا ہے۔" اس کا جواب سن کر مجھے معلوم ہوا کہ اس نامعلوم محافظ کی مہربانی سے میری جان تو بچ گئی ہے لیکن اب میں شاید ایک ایسی جگہ پھنس گیا ہوں جہاں سے مجھے کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔ یہاں نہ تو کوئی جہاز تھا اور نہ ہی کوئی آپریشن سسٹم۔ میں اس وقت ایک ویران ائرفیلڈ میں تھا۔ ہم لوگ میس کے ہال نما کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ہال خاصا بڑا تھا مگر اس میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف ایک دہشت ناک سی بے ترتیبی نظر آ رہی تھی۔ فرش پر دھول مٹی کی موٹی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی اور دیواروں کی سفیدی سیاہی میں بدل چکی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ بہت عرصے سے کسی نے صفائی کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ میرے میزبان نے اپنا نام [illegible] لیفٹیننٹ [illegible] بتایا اور اس نے یہ بھی کہا تھا۔

"یہاں اس وقت میرے علاوہ صرف ایک [illegible] ہے۔ یہاں کا پرانا خدمت گار فریک گریٹ..... باقی کے تمام لوگ کرسمس کی چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ میں یہاں کا انچارج ہوں۔ یہاں کل تین افراد کام کرتے ہیں۔" میں دھیان سے اس کی بات سنتا رہا۔ مجھے سخت سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے سردی سے کانپتا دیکھ کر مورگن نے اونچی آواز میں فریک کو پکارا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "مجھے بہت افسوس ہے اور ہم دوست کہ میں ایک اچھا میزبان ثابت نہیں ہو سکا کیونکہ اس وقت یہاں جو کچھ موجود ہے اسی میں سے ہی تمہارے کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ جانے لگا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا مجھے فون استعمال کرنے کی اجازت ہے؟" مورگن نے اثبات میں سر ہلایا اور فریک کو تلاش کرنے کے لیے ہال روم سے باہر چلا گیا۔

ایک چھوٹی سی میز پر فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ اب کرسمس منانے کا خواب بس خواب ہی رہ گیا تھا لیکن میں نے شکر کیا کہ میری زندگی بچ گئی تھی۔ اگر زندگی ہی نہ رہتی تو [illegible]

میں نے نزدیکی ائرفیلڈ میں میریں سنٹ جارج کا نمبر تلاش کر کے فون ملایا۔ دوسری جانب سے ریسیور اٹھایا گیا تو میں نے ڈیوٹی کنٹرولر سے بات کرنے کو کہا لیکن مجھے جواب دیا گیا۔ "اب یہاں سے کوئی جہاز اڑنے والا نہیں ہے اسی لیے کنٹرولر یہاں موجود نہیں ہیں لیکن جونیئر آفیسر موجود ہیں..... کیا انہیں فون دوں؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور جونیئر کنٹرولر کو اپنی مشکلات اور مصیبت سے آگاہ کر دیا۔ میری پوری بات سن لینے کے بعد جونیئر کنٹرولر بولا۔

"ہمیں آپ کی مشکلات جان کر بہت دکھ ہوا ہے لیکن کرسمس کی وجہ سے آپریشنل سسٹم شام پانچ بجے سے بند ہے جس کی وجہ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا اس لیے فوری طور پر ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" اس نے مجھے آر اے ایف میرم یا آر اے ایف لوکن ہیتھ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے غصے سے ریسیور پٹخ دیا۔ آر اے ایف میرم ہارکوں سے تقریباً اسی میل دور تھا اور وہاں تک جانے کے لیے سڑک کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا جبکہ لوکن ہیتھ تو میرم سے بھی زیادہ سو میل آگے تھا۔ میرے جہاز کا ایندھن ختم ہو گیا تھا اور اس ویران ائرفیلڈ سے تو ایندھن ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل میں ایک بار پھر مایوسی اور ناامیدی کے گہرے بادل چھا گئے۔

مجھے اپنے اس نامعلوم محافظ کی یاد بھی آ رہی تھی جس نے عین وقت پر میری راہنمائی کی اور میری جان بچائی۔ اگر وہ مدد نہ آتا تو میری موت یقینی تھی۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے کنٹرولر کے ہیڈ آفس فون کیا۔ میں اس پائلٹ کے نام کے بارے میں نہیں جانتا تھا اسی لیے میں نے اس جہاز کا حوالہ دیا اور پوچھا۔ "مجھے اس ماسکوڈا جہاز کے پائلٹ سے بات کرنی ہے جو آج رات اڑان پر تھا۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔ اس پائلٹ نے اچانک کہیں سے نمودار ہو کر میری درست راہنمائی کر کے میری جان بچائی ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ماسکوڈا جہاز ہی تھا؟" دوسری جانب سے حیرت زدہ آواز میں پوچھا گیا۔

"بالکل..... وہ ماسکوڈا ہی تھا۔" میں نے یقین سے کہا۔ "میں نے اسے دو بار بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس پر کالے حروف میں [illegible] کے لکھا ہوا تھا۔"

"اچھا..... لیکن پھر بھی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور جہاز ہوگا۔"

"ہرگز نہیں۔" میں جھٹ سے بولا۔ "مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔"

"مگر ماسکوڈا جہاز تو اب کسی کمپنی کے استعمال میں نہیں ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "شاید یہ اب دنیا کے کسی بھی ملک کے پاس نہیں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد چند دنوں کے لیے ان سے کام لیا جاتا رہا لیکن پھر انہیں ناکارہ قرار دے دیا گیا تھا۔" میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

دوسری جانب سے "ہیلو ہیلو....." کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے خود کو سنبھالا اور جلدی سے پوچھا۔ "آپ لوگوں کے اسکواڈ میں ماسکوڈا کے کتنے جہاز تھے؟"

"تقریباً پچاس جہاز تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا مگر جنگ کے بعد انہیں ناقص قرار دے کر توڑ کر ملبے کے گودام میں ڈال دیا گیا۔"

سنہری باتیں

☆ جو شخص اپنے راز کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ اپنی سلامتی کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

☆ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تلاش رزق میں بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے خدا مجھے رزق دے۔ کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ آسمان سے سونا اور چاندی نہیں برستا۔

☆ ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت نیک عورت ہے۔

☆ جو عیب سے واقف کرے، وہ دوست ہے۔

☆ ظالموں کو معاف نہ کرو کیونکہ یہ غریب پر ظلم ہوگا۔

☆ نیکی کے بدلے نیکی ادا کرنا حق ہے اور بدی کے بدلے نیکی کرنا احسان میں داخل ہوتا ہے۔

☆ دوستی تین باتوں سے مستحکم ہوتی ہے۔ دوست کو اچھے نام سے پکارو۔ کوشش کرو کہ سلام میں پہل تم کرو۔ اس کو بٹھاؤ پھر خود بیٹھو۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

میں موجود ہوں۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی نے ان چھ جہازوں میں سے کسی ایک جہاز کو حکومت سے اپنے لیے خرید لیا ہو۔" میں نے نکتہ اٹھایا۔

"ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اس بارے میں تم کہیں اور سے معلومات حاصل کرسکتے ہو لیکن اگر فرض کرلیا جائے کہ ماسکوا جہاز کسی نے خریدا ہوگا تو پھر بھی اس کا اب تک قابل استعمال رہنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے خراب ہوجانے والے تمام پرزے اب دستیاب ہی نہیں ہیں اسی لیے میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کا وجود باقی نہیں رہا۔"

"اچھا۔۔۔ پھر۔۔۔" میری بات ابھی ہو ہی رہی تھی کہ دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ہیپی کرسمس۔۔۔" اور سلسلہ منقطع کردیا گیا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے پی رکھی ہے اور جان بوجھ کر الٹی سیدھی باتیں کررہا ہوں۔ میں نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میرا سر بھاری ہورہا تھا۔ کیسی عجیب باتیں ایک ساتھ ہی اور ایک ہی وقت میں ہوگئیں۔ جہاز کا ہیڈ فون خراب ہوگیا پھر ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد جہاز کا پیٹرول ختم ہوگیا اور بوکھلا کر میں راستہ بھی بھول گیا تب ایک نامعلوم شخص نے میری مدد کی اور میری زندگی بچالی لیکن اب تک اس انجان محافظ کا مجھے کچھ پتا نہیں لگ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھا؟

میں یہ باتیں ہی سوچ رہا تھا کہ بوڑھے فریک نے آکر مجھے بتایا کہ میرے سونے کا انتظام کردیا گیا ہے اور مجھے روم نمبر گیارہ میں جانا ہے۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ گیارہ نمبر کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن میرے لیے آتش دان سلگا دیا گیا تھا میں سخت سردی محسوس کررہا تھا اسی لیے فوراً ہی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ فریک واپس پلٹ گیا اور میرے لیے کھانا لے آیا۔ اب مجھے خود بھی بھوک محسوس ہورہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے خود کو بہتر محسوس کیا۔ میرے اندر اب خوف کچھ کم ہوگیا تھا۔ اب میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی سے بات چیت کروں۔ لیکن لیفٹیننٹ مورگن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنے روم میں جاکر سوچکا تھا۔ اب یہاں میرے سامنے بوڑھا خادم مسٹر فریک ہی تھا اس لیے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "مسٹر فریک! آپ تو یہاں کافی

"جی ہاں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چھبیس برس ہوگئے ہیں۔" فریک مسکراتے ہوئے بولا۔ "جب میں یہاں آیا تھا تو یہاں کی رونق ہی الگ تھی۔ اس وقت یہ اسٹیشن نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ یہاں کے تمام روم افسروں اور پائلٹوں سے بھرے رہتے تھے۔ ہر وقت ہنسی مذاق کا دور چلتا رہتا تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے۔" فریک دلچسپی سے مجھے پرانی باتیں سنا رہا تھا اور میں سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ میرے دائیں جانب والی دیوار پر زنگ آلود ٹین کا بڑا سا فریم لٹک رہا تھا جس میں ایک بڑی سی بلیک اینڈ وائٹ تصویر لگی ہوئی تھی۔ فریم کی طرح وہ تصویر بھی بہت پرانی تھی جس کے شیشے پر دھول کی ایک موٹی سی تہ جمی تھی اس لیے تصویر کافی دھندلا رہی تھی۔ یہ ایک نوجوان کی تصویر تھی جو پائلٹ کی وردی میں ملبوس تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ وردی آج سے چھبیس سال پہلے کی سرکاری وردی تھی۔ تصویر میں وہ نوجوان پائلٹ اپنا ایک ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی اور اس کے پیچھے ایک ہوائی جہاز کھڑا تھا۔ میں تصویر کے اور نزدیک ہوگیا۔ یہ ماسکوا جہاز تھا۔ یہ ہوبہو وہی ہوائی جہاز تھا جس نے آج میری رہنمائی کرکے میری جان بچائی تھی۔ اس نوجوان کا چہرہ بھی اب مجھے کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ ابھی میں اس تصویر کو غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ کمرے کی کھڑکی تیز ہوا کے جھونکے سے کھل گئی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے اور ٹھنڈی ہوا کا سرد جھونکا کمرے میں گھس آیا۔ فریک نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی بند کردی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کتنی تیز ہوا ہے۔" میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور تجسس سے پوچھا۔

"مسٹر فریک اس تصویر میں یہ پائلٹ کون ہے؟"

فریک نے گردن اٹھا کر اس تصویر کو دیکھا پھر کہا۔ "یہ تو مسٹر جیک گیلکرز کی تصویر ہے۔ جنگ کے دوران میں یہ یہاں آیا تھا وہ آفیسر تھا۔ بہت ہی نیک دل اور عمدہ شخص تھا اور اسی کمرے میں رہتا تھا۔" فریک کی آنکھیں اس تصویر پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"یہ جیک گیلکرز کون سے اسکواڈ میں تھا۔۔۔ تمہیں معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" فریک نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ فضائی مددگار اسکواڈ میں تھا اور ماسکوا جہاز اڑاتا تھا۔" میں نے ایک طرف جھک کر غور سے دیکھا۔ تصویر والے جہاز کے پچھلے حصے پر کالے رنگ میں دو لفظ لکھے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔۔۔ جے اور کے۔ یہ دونوں الفاظ بالکل اسی جہاز پر لکھے ہوئے لفظ جیسے ہی تھے جس نے آج مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچایا تھا۔ اب میرے ذہن میں آرہا تھا کہ "جے کے" کا مطلب جیک گیلکرز ہی ہوسکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میری الجھن دور ہوگئی۔

میں سوچ رہا تھا کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد شاید جیک گیلکرز ریٹائر ہوگیا ہوگا مگر جہاز اڑانے کے شوق کی خاطر پرائیویٹ طور پر فضا میں بھٹک جانے والے جہازوں کو راستہ دکھاتا ہوگا۔ اس نے اپنا ماسکوا جہاز سرکار سے خرید لیا ہوگا اور آج کہیں سے واپس آتے وقت اس نے میرے جہاز کو آسمان پر چکر لگاتے دیکھ لیا اور میری مدد کو پہنچ گیا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے، میں مسٹر جیک گیلکرز کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا اور اس کا شکریہ ادا کروں گا۔

فریک ابھی تک اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "وہ سچ میں ایک بہت ہی نفیس اور عمدہ انسان تھا اور ساتھ ساتھ وہ بہترین پائلٹ بھی تھا۔ اس کے ساتھی اور دوست اکثر اس کی جہازرانی کی باتیں کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ اس کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ وہ گھپ اندھیرے میں بھی سب کچھ صاف دیکھ لیتا تھا۔ وہ بہت ہی عجیب آدمی تھا۔ اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد بھی اپنا جہاز اڑا کر بھولے بھٹکے ہوئے جہازوں کی مدد کرنے کے لیے نکل پڑتا تھا۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر کتنے ہی مصیبت اور آفت میں پھنس جانے والے لوگوں کی اس نے بروقت مدد کی اور بے شمار لوگوں کی جان بچائی۔"

میں اس تصویر کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ اس آدمی کی جوانی کی تصویر ہے جس نے اچانک آکر میری مدد کی۔ یہ انسان اگر اپنی بھرپور جوانی میں اتنا رحم دل، دوسروں کا خیرخواہ اور ہمدرد ہوسکتا ہے تو اب بڑھتی ہوئی عمر میں اس کے نیک جذبات کا کیا عالم ہوگا۔ نیکی اور مدد کے جذبات تو اس کے اندر ہزاروں گنا بڑھ گئے ہوں گے۔ میں نے تصویر سے نگاہ ہٹائی اور بوڑھے فریک کی جانب دیکھا جو اب بھی سنجیدہ انداز میں اس کی بات کررہا تھا۔ "ایک بار میں نے مسٹر جیک سے کہا تھا کہ آپ بار بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دوسرے لوگوں کی مدد کے لیے کیوں اندھے کنویں میں کود پڑتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ اگر دوران پرواز کوئی کسی مشکل یا مصیبت میں پھنس جائے اور اسے مدد کی ضرورت ہو تو میں خراب سے خراب تر موسمی حالات میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کی مدد کو پہنچ جاؤں گا اور اسے خیریت سے زمین پر لے آؤں گا۔"

"اوہ۔" میں بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ ابھی تک اسی جوش و جذبے کے ساتھ بھولے بھٹکے لوگوں کی مدد کررہا ہے۔"

میری بات سن کر فریک کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ افسردگی سے بولا۔ "نہیں۔۔۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید اب تک ایسا ہی ہورہا ہوتا مگر وہ تو جنگ کے سال بھر بعد کرسمس کی رات کو اپنے جہاز پر اڑے تو پھر واپس زمین پر ہی نہیں آئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فضا میں ان کے جہاز میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی اور وہ شمالی سمندر میں گر کر غرق ہوگئے۔ ان کی لاش کو بہت تلاش کیا گیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔" فریک کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے لیکن اس کے لہجے میں بہت عقیدت تھی۔

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔ میں نے فریک کو دیکھا۔ "تو وہ کون تھا؟"

"کون۔۔۔ کس کی بات کررہے ہو؟" فریک نے حیرت سے پوچھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں گھبرا کر بولا۔ "وہ جیک گیلکرز تھا جس نے آج میری جان بچائی ہے۔ میرے جہاز کا ایندھن ختم ہوگیا تھا اور ٹرانسمیٹر بھی خراب ہوگیا۔ میں راستہ بھی بھول گیا تھا بس چند لمحوں میں ہی میری موت یقینی تھی کہ کہیں سے یہی ماسکوا جہاز جس پر "جے کے" والے حروف لکھے، میں نے صاف دیکھے تھے وہ میری مدد کو آگیا اور میرے آگے آگے چل کر مجھے راستہ دکھاتا رہا۔ تبھی تو میں یہاں زندہ سلامت اتر پایا ہوں۔ میرے جہاز میں پیٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے اسی لیے میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ جیک گیلکرز زندہ ہے۔"

"نہیں۔" فریک نے ایک بوجھل سی سانس لی اور بولا۔ "وہ 1920ء کی کرسمس کی رات تھی جب وہ اپنے جہاز پر اڑا تھا اور آج بھی کرسمس کی رات ہے۔ اب تم آرام کرو میں بھی چلتا ہوں۔" اتنا کہہ کر فریک اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جاتے ہوئے بولا۔ "ہیپی کرسمس اینڈ گڈ نائٹ۔"

سنگین خاتمہ

نشور ہادی

سب سے خوب صورت تحفہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور کا دیا جس کی بدولت وہ غلط اور صحیح میں فرق کرپاتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ جب اس انتخاب کا وقت آتا ہے تو انسانی فطرت اسے اکثر لالچ اور مفاد کے نام پر انتہائی پستی میں گرا دیتی ہے۔ اسے بھی اپنی ذات پر اتنا ہی گھمنڈ تھا کہ ہر پسندیدہ چیز اور شخصیت پر اپنا استحقاق قائم رکھنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتا تھا مگر... بڑے کروفر سے مستقبل بنانے والا... ماضی کی کوتاہیوں میں ایسا الجھا کہ اپنے حال کو بھی فراموش کر بیٹھا جبکہ دوسری جانب دوستوں کے روپ میں ملنے والے دشمن اسے بڑے پیار سے تباہی کی طرف دھکیلتے رہے اور جب خود الجھنوں میں مبتلا ہوئے تو احساس ہوا کہ ناحق کسی کو گناہ کی طرف راغب کرکے خود انہوں نے کتنی بڑی عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیا...

ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی عمارت استوار کرنے والے ضمیر فروش لوگوں کی عبرت اثر داستان





موسیقی کی لہریں بہت دھیرے دھیرے بکھرنے لگی تھیں۔ اسے دیکھنے کی خواہش فیصل کی تھی جو نوشابہ اور زید کا اکلوتا بیٹا تھا جس کی عمر کچھ ہی دن بعد چھ سال کی ہو جاتی لیکن ذہنی طور پر وہ آٹھ نو سال کے لڑکوں سے کم نہ تھا۔ اس نے انگریزی فلموں میں بڑے ہوٹلوں وغیرہ کی رقص گاہوں میں عورتوں اور مردوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی لیے اس نے ایسی کوئی رقص گاہ دیکھنے کی ضد کی تھی۔

زید نے اپنی مصروفیت کے باعث اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ پیرس سے اپنے وطن کی واپسی سے ایک دن پہلے اس کی خواہش پوری کردی جائے گی۔ وہی خواہش پوری کرنے کے لیے فیصل اپنے والدین کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

نوشابہ اور زید کی شادی کو سات سال ہونے والے تھے۔ وہ دونوں ہی جرنلزم سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے وطن کے ایک سب سے بڑے اخبار میں ملازم تھے۔ وہیں ان کا رومان پروان چڑھا تھا اور انہوں نے شادی کرلی تھی۔ فیصل کی پیدائش کے بعد نوشابہ نے ملازمت چھوڑ دی تھی تاکہ اپنے نوزائیدہ بیٹے کی بھرپور تربیت کرسکے۔

زید بہ دستور ملازم رہا تھا اور اس نے ترقی بھی بے مثال کی تھی۔ پچھلے ہی سال میں اس نے ایسی غیر معمولی رپورٹیں دی تھیں کہ اسے اخبار میں باضابطہ طور پر انویسٹی گیٹنگ رپورٹر کا درجہ مل گیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس کی رپورٹیں تہلکہ مچاتی رہیں اور اس کی تنخواہ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ لوگ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ اس کی رپورٹس کی وجہ سے اخبار کی سرکولیشن میں چالیس فیصد اضافہ ہوا تھا۔

فرانس میں ہونے والے ایک اسکینڈل کی تفتیش کرنے اور رپورٹ تیار کرنے کے لیے اخبار ہی نے اسے فرانس بھیجا تھا۔ اسکینڈل کا تعلق کیونکہ پیرس سے تھا اس لیے وہ یہیں آیا تھا اور ساتھ میں اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی لے آیا تھا۔

نوشابہ نے جرنلزم ایک مغربی ملک میں پڑھا تھا لیکن وہ زید کی طرح بہت کامیاب اور مقبول جرنلسٹ نہیں بن سکی تھی۔

رقص گاہ کے فرش پر چاروں طرف میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ درمیانی جگہ رقص ہی کے لیے مخصوص تھی۔ جو لوگ میز کرسیوں پر بیٹھے تھے، کسی نہ کسی چیز سے شغل کررہے تھے۔ زیادہ تر شراب ہی پی رہے تھے۔ خود زید بھی پی رہا تھا۔ نوشابہ اور فیصل کے سامنے کافی کی پیالیاں تھیں۔

''آپ پانی ہی پیتے رہیں گے ڈیڈی۔'' فیصل بولا۔

[illegible] پانی ہی کی طرح سفید ہی تو [illegible] فیصل پانی ہی سمجھ رہا تھا۔

نوشابہ جانتی تھی کہ زید وہسکی پسند کرتا تھا لیکن وہ بہت پہلے زید سے کہہ چکی تھی کہ وہ فیصل کی موجودگی میں شراب نہ پیا کرے اور اگر پیے تو صرف جن پیے تاکہ فیصل اسے پانی ہی سمجھے۔

نوشابہ اور فیصل کافی پی چکے تھے جب یہ دونوں ہی نہیں، زید بھی چونک گیا۔

''ہیلو لوشی!'' لہجہ غیر ملکی تھا اور چہرے مہرے سے بھی وہ کسی مغربی ملک کا باشندہ معلوم ہورہا تھا۔

''ہیلو ہیری! اتنے برس بعد تمہیں یہاں اچانک دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' نوشابہ نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ''بیٹھو!''

ہیری بیٹھتے ہی سوالیہ نظروں سے زید کی طرف دیکھنے لگا۔

نوشابہ نے اس سے زید اور فیصل کا تعارف کرایا، پھر زید سے کہا۔ ''ہم ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ میرا مطلب ہے، میں اور ہیری۔ ویسے اس کا نام ہیری گلبن ہے۔ ہیری گلبن اسکاٹ۔ ہم بے تکلف دوست رہے ہیں۔''

''خوشی ہوئی لوشی کے شوہر سے مل کر۔'' ہیری گلبن نے زید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''لوشی کے شوہر سے مل کر۔'' زید کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔ ''مجھے مل کر خوشی نہیں ہوئی۔''

ہیری گلبن ہنسا۔ ''میں نے مذاق کیا تھا۔''

زید نے اس سے مصافحہ تو کیا لیکن سرد مہری سے۔ اسی وقت رقص کے لیے موسیقی شروع ہوگئی۔

''لوشی!'' ہیری گلبن بولا۔ ''آج کی اچانک ملاقات کی خوشی میں ایک ڈانس کیوں نہ ہوجائے؟'' اس کا اشارہ رقص کے ڈانس کی طرف تھا۔

''تم جانتے ہو مجھے رقص کے اسٹیپس نہیں آتے۔ یہ موسیقی بھی میرے لیے اجنبی ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ۔۔۔ بس تم مجھے چلاتی رہنا۔''

''لوگ ہنسیں گے۔''

''یہاں کوئی کسی پر نہیں ہنستا۔ بس مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ آؤ پلیز۔'' ہیری گلبن نے کھڑے ہوتے ہوئے نوشابہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نوشابہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کچھ تذبذب سے کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ بھی ڈانس کریں گی ممی!'' فیصل خوش نظر آیا۔

زید کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ ایسے معاملوں میں دخل اندازی کو مغرب میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

بیشتر لوگ اپنی میزوں سے اٹھ کر رقص کے فرش پر جاچکے تھے۔ جو دو ایک اب جارہے تھے، ان میں ہیری گلبن اور نوشابہ بھی تھے۔

نوشابہ نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا کہ زید کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔ چند پل کے لیے نوشابہ کے دماغ میں کچھ خیالات چکرائے جنہیں اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔

رقص کے بعد وہ دونوں ہی میز کی طرف لوٹے۔

''میں نے بل پے کردیا ہے۔'' زید گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ کل ہماری فلائٹ بھی ہے، جلدی سوجانا چاہیے۔''

''چلیں۔'' نوشابہ نے بھی اتنے ہی گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''کل تم لوگ جارہے ہو؟'' ہیری گلبن نے پوچھا۔

''ہاں۔'' نوشابہ نے جواب دیا۔ ''زید کو یہاں کچھ کام تھا، وہ ہو بھی چکا ہے۔ ہم یہاں آئے بھی بس دس دن کے لیے تھے۔ زید کو آنا ہی تھا لیکن فیصل پیرس دیکھنے کے لیے مچل گیا۔ اسی کی وجہ سے میں بھی آگئی۔ ہماری کل کی سیٹیں بک ہیں۔''

ہیری گلبن نے پیار سے فیصل کا گال تھپتھپایا۔

نوشابہ بولی۔ ''آج بھی ہم آرام ہی کرتے لیکن فیصل کو کیسینو دیکھنے کا شوق تھا۔ اسی کی وجہ سے آگئے۔ ہمارے ملک میں کیسینو ہے نہیں۔ فیصل انگریزی فلمیں بہت دیکھتا ہے۔ آج سے پہلے انہی فلموں میں دیکھے تھے کیسینو اس نے۔''

''میں تمہیں یہاں کا بہت شاندار کیسینو دکھا سکتا ہوں۔'' ہیری گلبن نے فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مجھے وہیں جانا ہے۔ پچھلے ہفتے ہی کھلا ہے وہ کیسینو۔ بڑی دھوم ہے اس کی پیرس میں۔''

''دکھائیں۔'' فیصل نے پرشوق انداز میں کہا۔

''نہیں۔'' زید نے سختی سے کہا۔ ''اب جاکے آرام بھی کرنا ہے۔ تم بھول رہے ہو کل ہماری فلائٹ ہے۔''

نوشابہ بولی۔ ''جب تمہیں وہاں جانا تھا تو یہاں کیوں آئے تھے؟''

''یہاں سے ایک دوست کو ساتھ لینا تھا لیکن وہ ملا ہی نہیں۔ شاید اکیلا ہی چلا گیا ہوگا۔'' پھر وہ ہنسا۔ ''اس بہانے تم سے ملاقات ہوگئی۔ اب اگر کل تم لوگ واپس نہ جارہے ہوتے تو میں اصرار کرکے تم لوگوں کو اپنے ساتھ وہاں لے جاتا۔ دراصل کل میرا برتھ ڈے ہے، لیکن منا رہے ہیں آج ہی میرے کچھ دوست۔ انہوں نے اس کیسینو میں میرے اعزاز میں پارٹی رکھی ہے۔ بارہ بجے میں وہیں کیک کاٹوں گا۔''

''شاندار۔'' نوشابہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہماری ملاقات پہلے ہوجاتی اور مجھے تمہاری سالگرہ کا علم ہوتا تو میں تمہارے لیے کوئی گفٹ خرید لیتی۔ ایک دن پہلے ہی دے دیتی۔''

''یہی میرے لیے گفٹ ہے کہ تم سے غیر متوقع طور پر ملاقات ہوگئی۔'' ہیری گلبن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ خبر میرے لیے بہرحال اچھی نہیں ہے کہ تم کل ہی جارہی ہو۔ دو ایک دن اور رکتیں تو میں تمہیں پیرس کے خاص خاص مقامات کی سیر کراتا۔''

''ہم رک جاتے لیکن کل کی سیٹیں بھی بک ہیں اور زید نے اپنے دفتر اطلاع بھی دے دی ہے کہ ہم کل پہنچ رہے ہیں۔ میں وہاں سے تمہارے لیے گفٹ ضرور بھیجوں گی۔''

''خوشی ہوگی مجھے۔'' ہیری گلبن نے کہا۔ ''اچھا اپنا وہاں کا ایڈریس اور نمبر تو دو۔ کبھی کبھی ہیلو ہائے ہوجایا کرے گی۔''

نوشابہ کے پرس میں ملازمت کے زمانے کے چند وزیٹنگ کارڈز پڑے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک کارڈ اس نے ہیری گلبن کو دے دیا۔

''اب اٹھو بھی۔'' زید نے بڑبڑانے والے انداز میں نوشابہ سے کہا اور کھڑا بھی ہوگیا۔ اس کے ساتھ باقی تینوں افراد کو بھی اٹھنا پڑا۔

''میرا کارڈ بھی رکھ لو۔'' ہیری گلبن نے اٹھتے وقت نوشابہ کو اپنا کارڈ دیا اور ہنس کر بولا۔ ''گفٹ بھیجنے کے لیے تمہیں میرا پتا تو درکار ہوگا۔''

''یقیناً۔ بائی دی وے ۔۔۔ شادی تو کرلی ہوگی تم نے؟''

''دو بار۔''

''کیا مطلب؟ یہاں تو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہیں۔''

''دوسری شادی پہلی کو طلاق دینے کے بعد کی تھی لیکن نباہ اس سے بھی نہیں ہوسکا۔ پہلی طلاق شادی کے آٹھ ماہ بعد ہوئی تھی۔ دوسری سے چھ مہینے بعد ہی نوبت آگئی طلاق کی۔ دونوں ہی کو مجھ سے کچھ اختلافات ہوگئے تھے

لیکن ہم نے جھگڑا نہیں کیا۔ دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اب اکیلا ہی رہتا ہوں۔"

"تیسری شادی کا ارادہ کب ہے؟" زید کا انداز کچھ طنزیہ تھا۔

ہیر گلشن نے وہ طنز محسوس کیا یا نہیں لیکن جواب ہنس کر دیا۔ "اب فی الحال دو ایک سال اکیلا ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"کافی ترقی کر لی ہے تم نے۔" نوشابہ نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ہیر گلشن کا کارڈ اب دیکھا۔ "ڈائریکٹرز میں سے ہو اس کمپنی کے اور کمپنی بھی یہاں کی چند بڑی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔"

"دیکھوں۔" زید نے کارڈ لینے کے لیے نوشابہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نوشابہ نے کارڈ اسے دے دیا۔

ہیر گلشن بولا۔ "اب دوبارہ فرانس آؤ تو مجھے بھولنا نہیں۔"

"یقیناً۔" نوشابہ نے جواب دیا۔ "مجھے علم ہی نہیں تھا کہ تم پیرس میں ہو۔" زید نے ہیر گلشن کا کارڈ نوشابہ کو واپس کر دیا۔

باتیں کرتے ہوئے وہ چاروں کلب سے باہر آ گئے تھے۔ پھر الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے وہ اپنی اپنی کار میں جا بیٹھے۔ زید نے کرائے پر کار لی تھی جو دوسرے دن ائیرپورٹ پہنچنے کے وقت تک اس کے پاس رہتی۔

راستے میں فیصل، ہیر گلشن اور نوشابہ کی دوستی اور اس کی تعلیم کے زمانے کی باتیں کرتا رہا جس کا سبب صرف تجسس تھا۔

زید نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد بھی وہ کسی خیال میں کھویا رہا۔ نوشابہ کو اس بارے میں کچھ اندازہ تھا لیکن اس نے خود کوئی بات چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

بارہ بجے تھے جب نوشابہ کو نیند آئی لیکن وہ کوئی ناخوشگوار خواب تھا کہ ڈیڑھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ زید کمرے میں نہیں تھا۔

نوشابہ کو خیال آیا کہ وہ دوسرے کمرے میں جا کر اپنی تیار کردہ رپورٹ کو فنشنگ ٹچ دے رہا ہوگا۔ اس نے کروٹ لے کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ تک وہ ناخوشگوار خواب اس کے ذہن میں چکراتا رہا پھر اسے نیند آ گئی۔ اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ دوسرے کمرے میں جا کر زید سے کہے کہ دوسری صبح روانگی ہے اس لیے اب اسے سو جانا چاہیے۔

☆☆☆

تیرہ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ دوسرے دن جب وہ اپنے وطن پہنچے تو وہاں بھی دن ہی تھا۔ دفتر سے ایک کار انہیں لینے آ گئی تھی۔ اس نے انہیں گھر پہنچایا اور پھر چلی گئی۔

"تم چلو، میں دفتر جا رہا ہوں۔" زید نے کہا۔

ان کا بنگلا ایک پوش علاقے میں تھا۔ زید نے گیراج سے کار نکالی اور دفتر روانہ ہو گیا۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر فیصل بولا۔ "میں نہاؤں گا ممی!"

"جاؤ، نہا لو!" نوشابہ نے کہا۔ "میں اتنی دیر ذرا لیٹ جاتی ہوں پھر شاپنگ کے لیے نکلیں گے۔"

"کیا لینا ہے ممی؟" فیصل نے پوچھا۔

"کچھ خریدنا ہے۔ تم نہانے جاؤ۔"

فیصل چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد نوشابہ نے اپارٹمنٹس کے چوکیداروں میں سے ایک چوکیدار بار جا کر ٹیکسی منگوائی اور فیصل کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئی۔ وہ ہیر گلشن کو اس کا برتھ ڈے گفٹ جلد از جلد بھیج دینا چاہتی تھی۔ کہنے کو ہو جاتا کہ اس نے گفٹ بھیجنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی تھی۔ ہیر گلشن سے ملنا اس کے لیے خوشی کا سبب بنا تھا۔ وہ اس کے مغربی دوستوں میں سب سے اچھا شخص تھا۔

ایک شاپنگ سینٹر سے اس نے تاج محل کا ایک بڑا ماڈل خریدا۔ وہ جانتی تھی کہ ہیر گلشن کو مشرق کی قدیم چیزیں بہت پسند تھیں۔

بڑا ماڈل تھا اس لیے اس کی پیکنگ میں دیر تو لگنی تھی لیکن اسے ہوائی جہاز سے جانا بھی بیرون ملک تھا اس لیے خصوصی پیکنگ میں خاصا وقت لگا۔

دوسرا کام نوشابہ نے یہ کیا کہ وہ گفٹ پیک فوری طور پر پوسٹ بھی کر دیا۔ اس دوران میں فیصل اس سے سوالات کرتا رہا تھا۔ نوشابہ نے اسے بتا دیا کہ وہ ہیر گلشن کو اس کا برتھ ڈے گفٹ بھیج رہی ہے۔

"مجھے انکل ہیر گلشن بہت اچھے لگے تھے ممی!" فیصل نے کہا۔ "جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو ان سے ملنے پیرس ضرور جاؤں گا۔"

نوشابہ "ہوں ہاں" کرتے ہوئے اس کی زیادہ تر باتیں ٹالتی رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کچھ خیالات چکرا رہے تھے۔ ان خیالات کا تعلق زید سے تھا جس نے کیسینو سے ہوٹل پہنچنے کے بعد اور پھر سفر کے دوران میں بھی اس سے بہت کم ہی باتیں کی تھیں۔ وہ چپ چپ اور کھویا کھویا سا رہا تھا۔ نوشابہ کچھ اندازہ بھی لگا چکی تھی کہ اس کا سبب کیا تھا۔

شاپنگ سے واپسی پر نوشابہ نے فیصل سے کہا۔ "کل تمہیں اسکول جانا ہے۔ جا کر تیاری کرو۔"

"تیاری تھوڑی کرنا ہے۔ بس کتابیں اٹھانا ہیں۔"

فیصل نے معصومیت سے جواب دیا۔

نوشابہ کچھ نہیں بولی اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ وہ زید کے موڈ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پہلے بھی ایسا کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ وہ جب زیر تعلیم تھی تو کئی لڑکیوں اور لڑکوں سے اس کے تعلقات بہت اچھے رہے تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو مقامی طالب علم نہیں تھے، مختلف ملکوں سے آئے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے کسی کا فون آ جاتا تو بھی زید کا موڈ کچھ خراب ہو جاتا مگر پھر وہ چار گھنٹوں میں ٹھیک بھی ہو جاتا تھا لیکن اس مرتبہ صورت حال کچھ زیادہ خراب محسوس ہو رہی تھی اور کسی وقت اس سے زیادہ خراب بھی ہو سکتی ہے، نوشابہ سوچ رہی تھی۔

زید مقررہ وقت پر اپنے دفتر سے واپس آیا۔

"چائے بناؤں؟" نوشابہ نے پوچھا۔

زید اثبات میں سر ہلا کر کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ نوشابہ ایک طویل سانس لے کر کچن کی طرف چلی گئی۔ چائے پیتے ہوئے فیصل بھی ان کے ساتھ تھا پھر وہ قریب کے پارک میں اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے چلا گیا۔

زید بھی کچھ کہے بغیر اٹھا تھا کہ نوشابہ بول پڑی۔

"سنو زید! مجھے کچھ بات کرنا ہے۔"

زید نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بیٹھ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"پیرس میں ——" نوشابہ بولی۔ "ہماری واپسی سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ ہم شاپنگ کرنے گئے تھے تو وہاں میرا اسی زمانے کا ایک دوست ملا تھا جو اطالوی ہے۔ وہ بہت سرسری سی ملاقات تھی۔ اس نے بس ہوٹل کا نام پوچھا تھا۔ اسی شام اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے چائے پر بلا لیا تھا۔ ہم ہوٹل کے ہال ہی میں ملے تھے۔ میں نے تم سے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا لیکن تم ٹال گئے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے ہماری پرائیویٹ باتیں سننے کی۔"

"ہوں۔"

"مجھے تمہارا وہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ مجھ سے صرف اپنی شادی کے سلسلے میں مشورہ کرنے آیا تھا۔ اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہونے والی ہے جو ہمارے ساتھ ہی زیر تعلیم رہی تھی۔ یہ میں نے اس لیے بتایا کہ میں بھی اس سے واقف ہوں۔"

"ظاہر ہے۔" زید نے کہا۔ "ساتھ پڑھا ہے تو جانتی ہی ہو گی۔"

"بس وہ مجھ سے کچھ مشورہ کرنا اس لیے چاہ رہا تھا کہ وہ ہمارے ہی ملک کی ہے۔ اب بھی یہیں رہتی ہے۔ تعلیم ہے اس کا۔ کئی بار گھر بھی آ چکی ہے۔ دیکھا ہے تم نے اسے۔"

"یہ کیا باتیں سنانے بیٹھیں تم؟" زید نے الجھ کر کہا۔

"بہت ضروری باتیں ہیں۔" نوشابہ نے سنجیدگی سے کہا پھر بولی۔ "خیر —— اس سے پہلے کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ میرے غیر ملکی دوستوں کے فون —— یاد ہے نا؟"

"ہاں! تو پھر؟"

"ہر بار تمہارا موڈ خراب ہوا تھا۔"

"غلط خیال ہے تمہارا۔ مجھے کچھ پریشانی ہو گی۔"

یہ سراسر جھوٹ تھا۔ نوشابہ جانتی تھی لیکن اس نے بحث نہیں کی۔

"پھر اس رات۔" نوشابہ بولی۔ "ہیر گلشن کے ساتھ میرا رقص تمہیں اتنا برا لگا کہ تمہارا موڈ اب تک خراب ہے۔"

"ہاں۔" زید نے کچھ توقف سے کہا۔ "مجھے یہ اچھا نہیں لگا تھا کہ میری بیوی کی کمر پر کسی اور کا ہاتھ ہو۔"

"میں اس کی ——" نوشابہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ بات زیادہ آگے نہ بڑھے۔ رک کر اس نے کہا۔ "میں نے خاصا وقت مغرب میں گزارا ہے۔ وہاں کی کچھ باتیں میرے مزاج کا حصہ بن چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے شادی کے بعد بھی ایسا کچھ ہوا ہو اور تمہارا موڈ خراب ہوا ہو لیکن میں نے اس وقت اس پر توجہ نہیں دی لیکن ہیر گلشن کے معاملے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کسی وقت بات اس سے بھی زیادہ بڑھ سکتی ہے۔"

"تو پھر —— تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"معاملہ بڑھ سکتا ہے جس کا کوئی حتمی نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔"

"تم صاف صاف بات نہیں کر رہی ہو۔"

"صاف بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ کسی شعر کا ایک مصرع یاد آ رہا ہے —— بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم۔" نوشابہ نے نظریں جھکا لیں۔

زید کا چہرہ تمتما گیا۔ "تمہارا مطلب ہے —— طلاق؟"

نوشابہ نے سر کو آہستگی سے اثبات میں جنبش دی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ "مجھے ہیر گلشن کی ایک بات بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی دو شادیاں ہوئیں اور دونوں بار طلاق بھی ہوئی لیکن بہت خوش گوار انداز میں ہوا۔ ہمارے معاملات بھی اس حد تک کیوں نہ جائیں کہ یہ اقدام خوش گوار انداز میں کیا جائے۔"

"تم نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے؟"

"کل سے اب تک اسی بارے میں سوچتی رہی ہوں۔"

زید ایک دم اٹھا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کا رخ اس پارک کی طرف تھا جہاں بچے کھیل رہے تھے۔

نوشابہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ آخر وہ بولی۔ "میری بات کا جواب دینے کے بجائے تم وہاں جا کر کھڑے ہو گئے ہو۔"

"ہاں۔" زید سنجیدگی سے مڑا۔ "میں فیصل کو دیکھ رہا تھا۔"

"میری بات کا فیصل سے کیا تعلق؟"

"گہرا تعلق ہے۔ اس کے ذہن پر اس کا بہت خراب اثر پڑے گا۔"

"کچھ دن میں بھول جائے گا۔"

"بچپن کی باتیں ذہن سے چپک کر رہ جاتی ہیں۔"

"میں اس کی تربیت ایسے انداز میں کروں گی کہ...."

"تم اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہو گی۔ یعنی طلاق کے بعد؟"

"ہاں۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اس کے ذہن سے یہ بات ہرگز نہیں نکل سکے گی اور وہ اس کا ذمے دار مجھے سمجھے گا۔ اشتعال میں وہ مجھے قتل بھی کر سکتا ہے۔"

نوشابہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "قتل کی بات تمہارے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔"

"ہو جاتا ہے ایسا!"

"بے تکی باتیں کرنے لگے ہو تم۔"

زید جواب میں کچھ کہے بغیر اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ نوشابہ اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ پھر اس نے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ زید نے جھٹکے سے بڑی زور سے دروازہ بند کیا تھا۔

کسی خیال سے نوشابہ اٹھ کر گیلری میں پہنچی۔ ایک منٹ بعد ہی اسے زید نظر آیا جو کار میں تھا۔ کار پھاٹک کی طرف بڑھ رہی تھی۔

نوشابہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خواب گاہ میں آ کر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات چکرا رہے تھے۔ ان میں زید کی بعض نہایت غیر معمولی باتیں بھی تھیں۔ ان باتوں کی وجہ سے نوشابہ کو شبہ ہوا تھا کہ کسی واقعے کی وجہ سے زید کے دماغ میں کوئی نفسیاتی گرہ پڑ گئی ہے۔ اس وقت بھی اس نے یہ غیر معمولی بات کہی تھی کہ زید طیش میں آکر اسے قتل کر دے گا۔

نوشابہ کچھ افسردہ ہو گئی۔ اب شاید ضروری ہو گیا تھا کہ زید کا نفسیاتی علاج کرایا جائے لیکن اس کا اب وقت اس لیے نہیں رہا تھا کہ وہ زید سے طلاق کا قطعی فیصلہ کر چکی تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ اگر موقع ملا تو وہ انصار کو اس بارے میں بتائے گی جو زید کا دفتری ساتھی ہی نہیں، بچپن کا دوست بھی تھا۔

شام سے رات ہوئی لیکن زید واپس نہیں آیا۔ جب کھانے کا وقت بھی گزرنے لگا تو اس نے فیصل کو کھانا کھلایا۔ خود اسے بالکل بھوک نہیں تھی۔ فیصل کے استفسار پر اس نے کہا۔ "جب تمہارے ڈیڈی آئیں گے تو انہی کے ساتھ کھاؤں گی۔"

"ڈیڈی اب تک کیوں نہیں آئے ممی؟" فیصل نے پوچھا۔

"دفتر کا کوئی ضروری کام ہے۔ تم کھانا کھاؤ، پھر جا کر ایک گھنٹے پڑھو اور سو جاؤ۔ جب دیر سے سوتے ہو تو دوسرے دن اسکول جانے میں دیر ہو جاتی ہے۔"

فیصل کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نوشابہ کا ذہن منتشر ہو رہا تھا۔ اس نے دھیان بٹانے کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ بار بار چینل بھی بدلتی رہی۔ پھر ایک انگریزی نیوز چینل لگایا جہاں سے خبریں ختم ہونے والی تھیں۔ ان میں سے ایک خبر نے اسے نہ صرف چونکایا بلکہ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔

وہ خبر ہیر کٹنگ کے بارے میں تھی۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی اور ہیر کٹنگ ہو گا لیکن اسکرین پر ہیر کٹنگ کی تصویر بھی آئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ وہ فلاں کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ یہ خبر غالباً پہلے بھی آ چکی تھی۔ اس وقت اس کا فالو اپ دیا جا رہا تھا۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ اس کا قتل اس رات ہوا تھا جب اس نے اپنا برتھ ڈے منایا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق قتل رات کے ڈیڑھ اور ڈھائی بجے کے درمیان ہوا تھا۔

خبریں ختم ہو گئیں لیکن نوشابہ سکتے کی سی کیفیت میں ٹی وی کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے یہ خیال آیا تھا کہ جب اس رات وہ ڈیڑھ بجے کے قریب اچانک جاگی تھی تو زید کمرے میں نہیں تھا۔

"نہیں نہیں...." وہ بڑبڑائی۔ "زید نے تو ایسا ہرگز نہیں کیا ہوگا۔"

☆☆☆

انصار کے دفتر میں ریما، انصار سے کہہ رہی تھی۔ "کل تو زید بولی سے آتے ہی اپنی رپورٹ سمٹ کرانے آ گیا تھا جبکہ کل اسے آرام کرنا چاہیے تھا لیکن آج غائب ہے۔"

"فون آیا تھا اس کا۔" انصار نے جواب دیا۔ "کچھ طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

"ارے!" ریما کے منہ سے نکلا۔ پھر اس نے کہا۔ "وہ جس دن نہیں آتا، اس دن دفتر میں ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔"

"کل تک انتظار کرو۔" انصار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کمی دور ہو جائے گی۔ ویسے تم اس کے معاملے میں کچھ جذباتی بھی ہو۔"

"جذباتی تو ہے یہ اس کے معاملے میں۔" نیلم انصار کی میز کے قریب آ گئی تھی۔

معمول تھا کہ دوپہر کو دفتر کی کینٹین میں وہ چاروں ساتھ ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔

"بکواس مت کرو۔" ریما نے نیلم کو گھورتے ہوئے کہا۔

وہ چاروں ہی ایک دوسرے سے کچھ کم یا کچھ زیادہ بے تکلف تھے۔

"بکواس نہیں ہے یہ۔" نیلم نے کہا۔ "لیکن یہ تمہاری ٹریجڈی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ نوشابہ نے اسے تم سے پہلے چھاپ لیا تھا۔"

"بس کر نیلم کی بچی! ایسا اول فول بکو گی میں تیرے!"

"یہ جذباتی ہے دیہاتی لڑکیوں کی طرح۔" نیلم ہنسی۔

"ختم کرو یار یہ جھگڑا۔" انصار بول پڑا۔ "کھانے کا سوچو دیکھو.... چوہے دوڑنے لگے ہیں پیٹ میں۔"

"ابھی ایک بھی نہیں بجا۔" ریما نے کہا۔ "کیا آج ناشتے کے بغیر آ گئے تھے دفتر؟"

"یہی سمجھ لو!"

نیلم ہنسنے لگی۔ پھر ان کی یہ گپ شپ کھانے کے بعد بھی جاری رہی۔

"دفتر کا وقت ختم ہو گا تو اسے دیکھنے چلیں گے۔" ریما نے کہا۔

"احمقانہ بات ہے۔" انصار نے کہا۔ "موسم ایسا ہو گیا ہے کہ بخار وغیرہ ہو گیا ہوگا۔ ایسے میں کوئی دیکھنے کے لیے آئے تو بیمار کے ذہن پر دباؤ اور بڑھ جاتا ہے۔ ایسی کوئی سیریس بات نہیں ہو گی کہ دیکھنے کے لیے جانا اخلاقی ذمے داری ہو۔"

"غیر اخلاقی سہی!"

"تو تم چلی جانا۔" انصار نے کہا اور اٹھ کر واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔

اس طرح یہ موضوع ختم ہو گیا لیکن اگر وہ زید کے گھر جاتے تو اسے بھلا چنگا ہی دیکھتے.... اس نے فون پر غلط اطلاع دی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بس اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے شاید رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔

جس وقت نیلم، ریما اور انصار دفتر کی کینٹین میں اس کے بارے میں بات کر رہے تھے، وہ اپنے گھر پر نوشابہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔

فیصل اسکول گیا ہوا تھا۔

"آج تم دفتر نہیں گئے۔" نوشابہ بولی۔

"رات کو نیند نہیں آئی تھی۔ طبیعت ڈھیلی ہو گئی ہے۔"

"تم نے میری کل کی بات کا جواب بھی نہیں دیا۔"

"جواب ہی سوچنے کے باعث نیند نہیں آئی۔"

"تو...." نوشابہ رک کر تیکھی سی بولی۔ "سوچا کیا کچھ؟"

"نوشابہ!" زید نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے کہ طلاق ہو جائے؟"

"میں نہیں چاہتی کہ وہ نوبت آئے جب یہ معاملہ ناخوشگوار ماحول میں اپنے انجام کو پہنچے۔"

"مگر میرا خیال کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر چند سال بعد طلاق ہوئی تو تمہارا جسم ڈھلک چکا ہوگا۔ چہرہ بھی شاید مرجھا جائے جبکہ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ تم چھ سال کے بچے کی ماں ہو۔ تم خوب صورت ہو ابھی۔ جسم بھی کسا ہوا ہے۔ تمہیں کوئی بھی بیوی کی حیثیت سے قبول کر لے گا۔"

غصے سے نوشابہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تم غالباً چاہتے ہو کہ ہماری علیحدگی ناخوشگوار ماحول میں ہو۔"

"میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس خیال آیا تھا ذہن میں کہ تم دوسری شادی کرنا چاہتی ہو۔"

نوشابہ نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس نے کہا۔ "میرا ارادہ یہ ہے کہ میں اب بھی شادی نہیں کروں گی۔ میری باقی زندگی صرف فیصل کے لیے وقف ہو گی۔"

"میں اس پر کیوں یقین کر لوں؟"

"نہ کرو۔" نوشابہ نے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔

اس نے ٹھیک طور پر ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔

زید نے اسے روکا بھی نہیں۔ نوشابہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر لیٹ کر وہ اپنے بکھرے ہوئے جذبات پر



قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ذرا دیر بعد زید بھی کمرے میں آ گیا۔ نوشابہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے محسوس کیا کہ زید بھی بستر پر لیٹ گیا تھا۔ نوشابہ نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔ وہ ڈر رہی تھی کہ زید پھر کوئی کڑوی کسیلی بات نہ کہہ دے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ طلاق ناخوشگوار ماحول میں ہو۔ لیکن زید خاموش ہی لیٹا رہا۔

کچھ وقت اسی طرح گزرا، پھر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ نوشابہ جلدی سے اٹھی۔

"میرے دفتر سے کوئی نہ آ گیا ہو۔" زید بڑبڑایا۔ "آج میں فون بھی نہیں کر سکا کہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دوں۔"

لیکن زید کا یہ گمان غلط نکلا۔ دفتر سے کوئی نہیں آیا تھا بلکہ فیصل اسکول سے آ گیا تھا۔

نوشابہ نے فیصل کو کھانا کھلاتے ہوئے کہا۔ "کھانا کھا کے اسکول کی یونیفارم اتار کر کپڑے اچھے سے پہننا، پھر چلنا ہے۔"

"کہاں ممی؟"

"تمہارے نانا کا فون آیا تھا۔ وہ چاہ رہے ہیں کہ کچھ دن تم ان کے ساتھ رہو۔ اپنے کپڑے اور کتابیں وغیرہ سیٹ کر لینا۔ میں سوٹ کیس میں وہ سب خود رکھوں گی۔"

"دن بھی تو بہت ہو گئے تھے نا ممی!" فیصل خوش ہو کر بولا۔ "نانا جان مجھ سے محبت بھی تو بہت کرتے ہیں۔"

"ہوں۔" نوشابہ اس وقت زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"ڈیڈی تو دفتر گئے ہوں گے۔ انہیں بتا دیا تھا؟"

"ہوں۔"

فیصل کھانا کھا کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نوشابہ اپنے کمرے میں لوٹی اور اپنے ملبوسات نکال کر ایک سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔ اپنا دیگر ضروری سامان وہ صبح اٹھتے ہی ایک اٹیچی کیس میں رکھ چکی تھی۔ زید اس وقت سویا تو نہیں تھا لیکن دوسری طرف کروٹ لیے لیٹا ہوا تھا۔

ایک سوٹ کیس میں جتنے کپڑے آ سکتے تھے، وہ رکھ کر اس نے سوٹ کیس بند کیا۔ زید خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب نوشابہ سوٹ کیس بند کر چکی تو وہ بولا۔

"کہیں لمبے سفر پر جا رہی ہو کیا؟" جملہ کچھ طنزیہ تھا جو سپاٹ لہجے میں ادا کیا گیا تھا۔

"ابو کے گھر جا رہی ہوں۔" نوشابہ نے کہا۔ "وہیں انتظار کروں گی طلاق نامے کا۔ خواہش ہے کہ تم مجھے زیادہ انتظار نہ کراؤ گے۔" نوشابہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور سوٹ کیس کے اسٹریپ کسنے لگی۔

زید نے کچھ رک کر پوچھا۔ "فیصل کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں۔" نوشابہ نے اب بھی زید کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جواب دیا۔

"وہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں دفتر چلا گیا ہوں گا۔"

"ہاں۔"

"کیا مجھ سے نہیں ملاؤ گی اب اسے؟"

"ابھی مجھے جلدی ہے۔" نوشابہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ جتنی تیاری کر سکتی تھی، کر چکی تھی۔ وہ فیصل کے کمرے میں پہنچی۔

"میرے موزے ۔۔۔ ممی! میرے موزے نہیں مل رہے ہیں۔"

"تمہیں اپنی ہی چیزوں کا پتا نہیں ہوتا۔ میں دیکھتی ہوں۔ تم ذرا جا کر باہر سے کہہ دو کہ وہ ایک ٹیکسی لا دے۔ سامان اٹھانے کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کو بھی بھیج دے۔ اسے یہ بھی بتا دے کہ کہاں جانا ہے۔ تمہیں اپنے نانا کے گھر کا پتا تو معلوم ہی ہے۔"

"جی اچھا ممی!" فیصل دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔

باہر جہاں بنگلے کے چوکیدار کا کام تھا، سامنے ہی کی سڑک سے ٹیکسی مل جاتی۔ نوشابہ کو فیصل کے موزے ہی نہیں، کچھ اور چیزیں بھی ڈھونڈنی پڑیں۔ فیصل جلد ہی واپس آ گیا۔

"کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں رکھتے۔" نوشابہ بولی۔ "تمہارے لیے جوگرز کا ڈبا نہیں مل رہا ہے۔ خیر میں دیکھ لیتی ہوں، تم اپنے ڈیڈی سے مل آؤ۔"

"ڈیڈی آ گئے دفتر سے؟"

"ہاں۔"

فیصل دوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ نوشابہ نے جوگرز کا ڈبا تلاش کیا۔ وہ رکھ کر اس نے سوٹ کیس بند کیا۔ پھر وہ سوٹ کیس اور ایک اٹیچی کیس اٹھا کر کمرے سے نکلی اور بیرونی دروازے پر گئی۔ سامان وہیں رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور کو اندر بلایا جائے۔

پھر وہ اپنے کمرے کی طرف لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ کال بیل کی آواز آئی۔ باہر ٹیکسی کی آمد کا بتایا۔

"اچھا، ایک منٹ رکو۔"

اب نوشابہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں

ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تو جاؤ کہ تم مجھے قتل کب کرو گے؟"

"کیوں یہ فضول باتیں کر رہے ہیں بچے سے!" نوشابہ نے کہتے ہوئے فیصل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"چلو!" اس نے فیصل سے کہا۔

"چابی لے لو گاڑی کی۔" زید نے نوشابہ کی طرف چابی بڑھائی۔ "کیسے جاؤ گی؟"

"میں نے ٹیکسی منگوائی ہے۔" نوشابہ نے فیصل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

گاڑی کی چابی زید کے ہاتھ میں ہی رہ گئی اور اس نے بستر پر گر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک منٹ بعد ہی اس نے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ آواز کمرے تک نہیں آئی تھی لیکن دروازہ کافی زور سے بند کیا گیا تھا۔ اس طرح نوشابہ نے زید کو اطلاع دی تھی کہ وہ اپارٹمنٹ سے باہر جا چکی ہے۔

زید بستر پر پڑا چھت کو تکتا رہا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ پھر نہ جانے کیا کیا سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تو وہ تھا ہی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بخار محسوس کیا۔ اٹھ کر اس نے روم فریج کھولا۔ فریج میں دوپہر کے کھانے کا سامان بھی تھا جو وہ مائیکروویو اوون میں گرم کر کے کھا سکتا تھا۔

"جب مجھے چھوڑ ہی رہی ہے تو آخر وقت میں اتنا خیال رکھنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟" اس نے دل ہی دل میں کہا اور پانی کی بوتل نکال کر فریج بند کر دیا۔

پانی پینے سے پہلے اس نے تھرمامیٹر نکال کر اپنا ٹمپریچر لیا جو سو کے قریب تھا۔ اب اس نے پلنگ کا رخ کیا۔ ٹمپریچر کی وجہ سے اس نے ٹھنڈا پانی پینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس نے سادہ پانی لیا اور ایک گھونٹ پی کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ دراز کھول کر ایک ٹیبلیٹ نکال کر پانی سے نگلی تو اسے خفیف سی تکلیف ہوئی۔

"حلق کی خراش بھی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

پانی کا گلاس رکھ کر اس نے روم فریج سے ایک سینڈوچ نکال کر کھایا۔ اسے بعد میں خیال آیا تھا کہ اسے خالی پیٹ ٹیبلیٹ نہیں کھانی چاہیے تھی۔ سینڈوچ بھی اس سے بمشکل کھایا گیا۔ اس کے بعد وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ موسم سرد نہیں تھا لیکن ٹمپریچر کی وجہ سے اس نے چادر اوڑھ لی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پسینا آنے سے بخار اتر جائے گا۔

بخار کچھ زیادہ محسوس ہونے لگا۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس سے بمشکل اٹھا جا سکا۔ اب اسے ہلکی سی سردی بھی لگ رہی تھی۔ اس نے الماری سے سوئیٹر نکال کر پہنا اور شال بھی اوڑھ لی۔ پھر بخار کی دو گولیاں کھا کر لیٹ گیا۔

لیٹا ہی تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔

"اوہ ـــــ" اس نے سوچا۔ آج اس نے دفتر فون بھی نہیں کیا تھا۔ وہاں سے کوئی آ سکتا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور دروازے پر پہنچا۔

"کون ہے؟" اس نے دروازے کے بالکل قریب پہنچنے سے پہلے ہی پوچھا تھا۔

"میں ہوں زید ـــــ ریما۔" باہر سے آواز آئی۔

زید نے آٹومیٹک لاک ہو جانے والا دروازہ کھولا۔

"ارے!" ریما پریشانی سے بولی۔ "کیا زیادہ طبیعت خراب ہو گئی؟"

زید سوئیٹر پر شال اوڑھے ہوئے تھا۔ بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر نقاہت بھی تھی اس لیے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی۔

"ہوں۔" زید اتنا ہی بولا۔ "آؤ، دروازہ کھلا چھوڑ دو۔"

"نوشابہ کہاں ہے؟" ریما نے اندر آتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

وہ اور اس کے دوسرے ساتھی بھی نوشابہ کو جانتے تھے۔

"امی ابا کے گھر گئی ہوئی ہے۔" زید نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ریما نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بھی وہ چلی گئی؟"

"آج صبح طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد خراب ہوئی ہے۔"

"تو اسے فون کر کے بلا لیا ہوتا۔" ریما اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

"اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ٹیبلیٹ کھا لی تھی میں نے۔ خیال تھا کہ طبیعت سنبھل جائے گی۔" زید نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو!" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

ریما نے کرسی بستر کے قریب گھسیٹ لی اور بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بخار تیز معلوم ہوتا ہے۔ کتنا بخار ہے؟"

"ابھی اٹھا ہوں تو ٹمپریچر نہیں لیا۔"

ریما نے سرہانے رکھا ہوا تھرمامیٹر دیکھا تو اٹھا لیا۔



معلوم ہوا کہ اس وقت زید کا ٹمپریچر ایک سو دو سے بھی قدرے زیادہ تھا۔

"ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔" ریما کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ہمت نہیں ہو رہی ہے جانے کی!"

"نوشابہ کو فون کرو۔ وہ کسی ڈاکٹر کو لے کر آ جائے گی۔"

"ارے نہیں، کیوں ڈسٹرب کروں اسے۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"بیکار کی بات ہے۔" ریما نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ "میں بلاتی ہوں ڈاکٹر کو۔" وہ نمبر ملانے لگی۔ "جاننے والے ہیں وہ میرے۔ شام کو کلینک پر نہیں بیٹھتے۔ اگر وہ کہیں مصروف نہ ہوئے تو ابھی آ ـــــ" وہ ایک دم چپ ہو کر ماؤتھ پیس میں بولی۔ "میں ریما بول رہی ہوں ڈاکٹر صاحب! آپ بزی تو نہیں ہیں اس وقت ـــــ تو پھر میں آپ کو زحمت دینا چاہوں گی۔ میرے ایک دوست کی طبیعت خاصی خراب ہے۔ اگر آپ اسے دیکھنے آ جائیں تو شکر گزار ہوں گی ـــــ جی ـــــ جی ہاں۔ پتا آپ کو بتا دیتی ہوں۔ آپ بہت آسانی سے پہنچ جائیں گے۔" وہ پتا بتانے لگی۔

زید آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ ڈاکٹر آدھے گھنٹے میں ہی آ گیا۔ اس نے زید کا معائنہ کیا، پھر بولا۔ "کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے۔ آپ کسی ذہنی دباؤ کا شکار تو نہیں؟" اس نے زید سے پوچھا۔

"مجھے تو احساس نہیں۔" زید نے جھوٹ بولا۔

"اچھا میں دوا دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنا میڈیکل باکس کھولتے ہوئے کہا۔ "انجکشن بھی لگاؤں گا۔ اگر دو گھنٹے کے اندر اندر آپ کا بخار نہ اترا تو دو ایک ٹیسٹ کروانے ہوں گے۔"

"کسی بات کا شبہ تو نہیں ہے آپ کو ڈاکٹر؟" ریما نے تشویش سے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو تشویش کی کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات لاشعوری ذہنی دباؤ بھی ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اس نے زید کو ایک انجکشن لگایا اور ایک ٹیبلیٹ بھی دی۔ پھر کچھ ٹیبلٹس ریما کو دیتے ہوئے بولا۔ "ان کو ابھی نیند آ جانا چاہیے۔ اگر نہ آئے تو یہ دو ٹیبلٹس اور دے دیجیے گا اور مجھے فون پر بتا دیجیے گا۔"

"بہتر ہے۔"

ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد ریما نے زید سے پوچھا۔ "نوشابہ سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"ارے نہیں، اس سے کیا جھگڑا ہو گا۔"

"اچھا آنکھیں بند کر کے خاموش لیٹے رہو۔ نیند آ جانی چاہیے۔"

"تم کب تک بیٹھو گی؟ نیند آ جائے تو چلی جانا۔"

"ٹھیک ہے۔"

پندرہ منٹ میں ہی زید کو نیند آ گئی۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ریما کے ساتھ نیلم اور ابصار کو بھی دیکھا۔

"اب کیوں تکلیف کر لی تم نے!" وہ فوراً ریما سے بولا۔

"اب تم خود کو کافی بہتر محسوس کر رہے ہو گے۔" ابصار نے کہا۔ "ریما تمہاری نبض دیکھتی رہی ہے۔ پانچ منٹ پہلے اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تمہارا بخار اتر چکا ہے۔ خود میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ تمہارا جسم اب گرم نہیں ہے۔"

"نوشابہ کو فون کرنا چاہیے تھا تمہیں۔" نیلم بولی۔

"ہمیں اگر وہاں کا نمبر معلوم ہوتا تو فون کر چکے ہوتے۔"

اس دوران میں ہی ریما ٹمپریچر لینے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ ٹمپریچر لے کر تصدیق ہو گئی کہ اب اسے ذرا بھی بخار نہیں تھا۔

"فائن۔" نیلم بولی۔

"اوہ!" زید نے گھڑی دیکھی۔ "میں پانچ گھنٹے سویا ہوں۔ تم لوگ کب سے ہو؟"

"ریما نے فون کیا تھا کہ تم ابھی ابھی سوئے ہو۔" ابصار نے جواب دیا۔

"جب سے ہو تم لوگ یہاں؟"

"ہاں۔" ابصار نے ہی جواب دیا۔ "ریما کو اکیلا چھوڑ کر کیسے چلے جاتے؟ بہت پریشان تھی یہ۔ تم نے آج کچھ کھایا بھی ہے؟"

"صبح بس ناشتا کیا تھا۔"

"میں نے فریج میں کھانا دیکھا ہے۔" ریما بول پڑی۔ "ابھی گرم کرتی ہوں۔"

"نہیں ریما! کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"تو دودھ اور ڈبل روٹی لے لو۔ کچھ تو کھانا چاہیے۔ کمزوری تمہارے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔"

ریما فریج میں رکھا ہوا دودھ گرم کر لائی۔ ڈبل روٹی بھی موجود تھی لیکن زید سے بس ایک سلائس ہی کھایا جا سکا البتہ دودھ کا گلاس اس نے پی لیا۔

"اب تم لوگوں کو جانا چاہیے۔ دس بج چکے ہیں۔" زید نے کہا۔ پھر ریما سے بولا۔ "تمہارے گھر والے تو پریشان

"میں نے فون کر دیا تھا گھر۔" زیبا نے جواب دیا۔ "کہہ دیا تھا کہ آج دفتر میں کام بہت زیادہ ہے۔ دیر سے آؤں گی۔"

نیلم اور ابصار کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ نیلم کے والدین کا گھر قریب کے ایک شہر میں تھا۔ وہ دس پندرہ دن میں وہاں کا چکر لگا لیتی تھی۔ ابصار اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے والدین اور چھوٹا بھائی کینیڈا میں جا بسے تھے۔ انہیں وہاں کی شہریت مل گئی تھی۔ ابصار کو اپنے وطن سے پیار تھا اس لیے وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

"تمہیں اب تین چار دن آرام کرنا چاہیے۔" ابصار بولا۔ "تین دن تو یقیناً۔ نیلم! تم چھٹی کی درخواست ٹائپ کرو۔" اس نے ایک گوشے میں رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔

نیلم اٹھ کر کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھی جس کے قریب ہی پرنٹر بھی رکھا ہوا تھا۔

"شاید میڈیکل سرٹیفکیٹ کی بھی ضرورت پڑے۔" نیلم نے ٹائپ کرنے کے لیے کی بورڈ سنبھالا۔

"اس کی ضرورت پڑنا تو نہیں چاہیے۔" زیبا نے کہا۔ "زید کا ریکارڈ بہت اچھا ہے اور اگر ضرورت پڑی تو اس کا بندوبست کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ابھی ڈاکٹر صاحب سے سرٹیفکیٹ لے لیا جائے گا جن کو میں نے بلایا تھا۔"

"وہ تو خیر ہو جائے گا۔" ابصار نے کہا۔ "لیکن تم نوشابہ کو تو اطلاع دے دو۔"

"دے دوں گا۔" زید نے سر ہلایا۔

"ابھی ہمارے سامنے فون کرو۔"

"آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

"سچ بتاؤ زید! نوشابہ سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جھگڑے کا۔"

ابصار نے اس معاملے میں بحث نہیں کی لیکن اس کے چہرے پر سوچ بچار کا تاثر آ گیا تھا۔

نیلم نے درخواست ٹائپ کر کے اس کا پرنٹ نکالا اور زید کو دیا۔ زید نے اس پر دستخط کر دیے۔ ابصار نے درخواست لے کر جیب میں رکھ لی۔ اس کے بعد وہ تینوں رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

نوشابہ، فیصل اور سامان کو دیکھ کر اس کے والدین

"یہ— یہ سب— یہ سب کیا ہے نوشابہ!" اس کی ماں گھبرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "اس وقت— رات کے گیارہ بج رہے ہیں— اور— یہ— کیا ہے—"

"وہ— تو— تو امّاں!" نوشابہ ماں سے لپٹ کر جگر بھرتے ہوئے بھی زبردستی ہنسی۔ "کچھ ویسا نہیں ہے جیسا آپ لوگوں نے سمجھا ہے۔ بس تھوڑا سا جھگڑا، تھوڑی سی تو تو میں میں ہو گئی تھی زید سے۔ میں جلدی آ جاتی لیکن میں اپنی ایک دوست کے گھر چلی گئی تھی کہ آپ لوگ فیصل اور سامان کو میرے ساتھ دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھنے لگیں گے۔"

"بیٹھو— بیٹھ جاؤ— بیٹھ جاؤ۔" نوشابہ کے باپ نے کہا۔ "تمہارا جواب بالکل الجھا ہوا ہے۔ بیٹھ کر اطمینان سے بتاؤ— کیا ماجرا ہے۔"

"دراصل۔" ماں باپ کو مطمئن کرنے کے لیے نوشابہ ایک کہانی سوچ چکی تھی۔ "ہوا یہ کہ ہم ابھی تو آئے ہیں فرانس سے۔ کل آپ سے بات تو ہوئی تھی فون پر امّاں— میں نے بتایا تھا امّاں کہ ہم لوگ آ گئے ہیں۔ وہ ایک دن میں آئیں گے آپ سے ملنے!"

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس وقت—"

"وہ بھی بتاتی ہوں۔" نوشابہ نے ماں کی بات کاٹی۔ "یہ اخبار کے مالکان اور ایڈیٹر وغیرہ سب بہت ظالم ہوتے ہیں۔ کسی کی گھریلو زندگی سے انہیں کوئی سروکار ہی نہیں۔ آج ہی انہوں نے ایک اور اسائنمنٹ دے دیا زید کو۔ برما میں مسلمانوں کے جو حالات ہیں، اسی کی رپورٹنگ کے لیے انہوں نے فوراً زید کو وہاں جانے کا حکم بھی دے دیا۔ آج زید کی روانگی کا بندوبست بھی کر دیا۔ انہیں کل ہی اس بارے میں بتا دیا تھا لیکن وہ الجھتے رہے کہ مجھے بتائیں یا نہ بتائیں لیکن آج آخر بتانا ہی پڑا۔ ان کی فلائٹ جو تھی آج۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ لعنت بھیجیں اس اخبار کی ملازمت پر۔ کوئی دوسرا اخبار انہیں فوراً لینے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ اس پر ہم میں کچھ تلخ باتیں بھی ہو گئیں۔ ایک تو مجھے برما کے حالات سے ڈر لگ رہا تھا، دوسرے میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ مجھے تنہائی میں ڈر لگے گا۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔ شام کی فلائٹ سے وہ جا بھی چکے ہیں۔" نوشابہ نے یہ کہانی بہت سوچ سمجھ کر گھڑی تھی۔

فیصل اس وقت نانا کی گود میں بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔

"تو جب تمہیں ہمارے پاس آنا ہی تھا تو اسی وقت



"میں گھر سے تو اسی وقت نکل پڑی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو یہاں کا پتا بھی بتا دیا تھا لیکن پھر وہی خیال آیا جو ابھی بتا چکی ہوں۔ آپ لوگ مجھے اس طرح دیکھ کر پریشان ہو جاتے۔ بس اسی لیے میں اپنی ایک دوست کے گھر چلی گئی تھی۔ پھر رات کے کھانے کے بعد اس نے مجھے سمجھایا کہ میں شوق سے اس وقت تک اس کے گھر میں رہوں جب تک چاہوں لیکن یہ بات سمجھ کی تو نہیں۔ کسی دن آپ لوگ اچانک میرے گھر پہنچیں گے تو انہیں گھر مقفل ملے گا۔ کال کا جواب بھی نہیں ملے گا تو وہ موبائل پر تم سے رابطہ کریں گے یا انہیں پڑوس میں ہی کسی سے حقیقت کا علم ہو جائے گا۔ وہ صورت حال ان کے لیے زیادہ پریشان کن ہوگی۔"

"ٹھیک تو سمجھایا اس نے تمہیں!" باپ نے کہا۔

"جی۔" نوشابہ نے کہا۔ "بس اسی لیے میں اس وقت چلی آئی۔"

"کم از کم فون تو کر دیتیں کہ آ رہی ہو۔"

"زید پر اتنا غصہ تھا کہ فون کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔"

"اب تم ان لوگوں کے سونے کا بندوبست کرو۔" نوشابہ کے والد نے اس کی ماں سے کہا۔ "فیصل تو میری گود میں ہی سو گیا ہے۔"

"انتظام کیا کرنا ہے۔" نوشابہ کی والدہ نے کہا۔ "نرگس کا کمرا ہے تو سہی— جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی ویسا ہی ہے۔"

نرگس نوشابہ کی چھوٹی بہن تھی جس کی کچھ ہی عرصے پہلے شادی ہوئی تھی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" نوشابہ کے والد نے کہا۔ "فیصل کے لیے بچھونا کر اگلے دن میں ٹھیک کر دینا۔"

اس طرح نوشابہ اپنی چھوٹی بہن کے کمرے میں پہنچ گئی۔ فیصل کو اس نے بستر پر لٹا دیا اور اٹیچی کیس سے اپنا اور فیصل کا ضروری سامان نکالنے لگی۔ اس نے اپنے چہرے پر جو نقاب ڈال لیا تھا، وہ کمرے میں آتے ہی اتر گیا۔ اتنی دیر تک ضبط کرتے کرتے اس کے اعصاب ٹوٹنے لگے تھے اس لیے اب اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبانے لگیں۔ اگرچہ جو کچھ ہوا تھا اس کی ذمے دار وہ خود تھی لیکن اس کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

اس نے فیصل کی کتابیں، اسکول کا یونیفارم اور اپنی ضرورت کا کچھ سامان نکالا اور اٹیچی کیس سے نکالا ہوا فریم ہاتھ میں لے کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔

فریم میں زید کی مسکراتے ہوئے چہرے کی تصویر تھی جس سے اسے پیار تھا، اتنی ہی محبت تھی کہ اس سے الگ ہو کر اس کے لیے ایک جگہ رہنا مشکل تھا لیکن اب اس کے لیے صورت حال ہی ایسی ہو گئی تھی کہ وہ یہ اقدام اٹھائے۔

زید کی عجیب و غریب نفسیاتی کیفیت اس کے لیے دو ڈھائی سال سے اذیت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ عجیب عجیب حرکتیں ہوتی رہتی تھیں اس سے۔ عجیب عجیب الفاظ نکلتے رہتے تھے اس کے منہ سے اور جب اسے بعد میں یاد دلاؤ تو وہ کہتا تھا کہ اسے تو ایسا کچھ یاد ہی نہیں۔

اس کی یہ کیفیت دفتر میں کبھی نہیں ہوئی تھی ورنہ نوشابہ اس سے محبت ہو جانے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے میں ہزار بار سوچتی۔

اس کی انہی کیفیات میں سے ایک کیفیت کی شدت اس وقت آئی تھی جب نوشابہ حاملہ ہوئی تھی۔

"یہ بچہ دنیا میں آئے گا تو نہ جانے کب مجھے قتل کر بیٹھے۔"

پھر جب فیصل چار سال کا ہو چکا تھا تو زید نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا تھا کہ "تم مجھے کب قتل کرو گے بیٹا؟"

اور اب طلاق کی بات ہوئی تھی تو بھی اس کی زبان پر یہی جملہ آیا تھا۔

کسی وقت زید کا موڈ کچھ زیادہ خوش گوار ہوتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی کہ اسے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن اس بات پر زید کا موڈ یکلخت خراب ہو جاتا تھا اس لیے کچھ دن بعد نوشابہ نے اس سے یہ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

"صبر کرو نوشابہ!" اس نے اپنے دل میں کہا تھا۔

پھر فرانس جانے سے کچھ دن پہلے تو ایک خوف ناک واقعہ پیش آیا۔ اس دن شام کو نوشابہ کے موبائل پر ایک کال آئی۔ کال کرنے والا اس کے کالج کے زمانے کا ایک لڑکا واجد تھا۔ وہ اس وقت نشے میں تھا یا نہیں، یہ تو نوشابہ نہیں سمجھ سکی تھی لیکن اس کی بے ہودہ باتوں پر اسے غصہ آ گیا تھا۔ اس نے ڈانٹ پھٹکار بھی کر ڈالی تھی پھر فون بند کر دیا تھا۔ زید اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ اس نے نوشابہ کی ڈانٹ پھٹکار سن لی تھی۔ اس نے اس بارے میں سوال کیا تو نوشابہ نے اسے بتا بھی دیا تھا کہ کالج کے ایک شہدے لڑکے نے جانے کیسے اس کا موبائل نمبر معلوم کر لیا تھا اور اب اس سے بے ہودہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ باتیں ایسی تھیں جو نوشابہ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی لیکن زید کے بہت زیادہ کریدنے پر اس نے وہ ساری باتیں بتا دی تھیں اور وہ سب کچھ سن کر زید کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

کمرے میں ... ہوں۔ ... ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے اور تم فون کر رہی ہو... اتنی جلدی تمہیں فون کر رہی ہو... یہ بھی خیال نہیں رہا کہ اس طرح تمہاری نیند خراب ہوگی۔''

''نہیں، میں جلدی اٹھ گیا تھا۔''

''اچھا میں فوراً آ رہی ہوں۔ تمہیں ناشتا کرا کے پھر دفتر جاؤں گی۔''

''نہیں رہنے دو۔'' زید نے جلدی سے کہا۔ ''ضرورت نہیں ہے اس کی۔ میں ابھی کچن ہی میں تھا۔ ناشتا تیار ہی سمجھو۔ تم آنا تو بعد میں کسی وقت آ جانا۔ دفتر تو میں آؤں گا نہیں۔ چھٹی کی درخواست دے ہی چکا ہوں۔ چائے کے لیے پانی رکھ کر آیا ہوں۔ جل جائے گا سارا پانی۔ میں اب بند کرتا ہوں فون۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ناشتا کرو۔'' ریحانہ نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ناشتا کرنے کے بعد زید بستر پر لیٹا نوشابہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے وہ دن بھی یاد آیا جب نوشابہ کے کالج کے ایک آوارہ لڑکے واجد نے اسے فون کیا تھا اور بے ہودہ باتیں کی تھیں۔

واجد نے ایسے واہیات جملے کہے تھے جو نوشابہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی لیکن زید کے شدید ترین اصرار پر اس نے ساری باتیں بتا دی تھیں۔

ان باتوں نے زید کا خون کھولا دیا تھا۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ کوئی اس کی بیوی کے جسمانی خطوط پر ایسے بے ہودہ تبصرے کرے۔

دوسرے دن جب وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اور نوشابہ کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی تو زید نے الماری سے شراب کی ایک بوتل نکال کر جلدی سے لے جا کر اپنی کار کی سیٹ کے نیچے رکھ دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ واجد جیسے لوگ تو کبھی شراب کیا زہر بھی پی جاتے ہوں گے۔

دفتر جا کر وہ وہاں ایک گھنٹے رکا، پھر دفتر ہی کے ایک کام کے بہانے وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ نوشابہ کے کالج کے کئی مہذب دوستوں کو جانتا تھا جن میں سے کوئی ملازمت کر رہا تھا تو کسی نے کوئی کاروبار شروع کر دیا تھا۔ زید کا خیال تھا کہ ان میں سے کسی کو تو واجد کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔

زید کسی طرح بھی واجد کا گھر معلوم کرنا چاہتا تھا، اس سے ملنا چاہتا تھا۔

نوشابہ کے وہ دوست اسے بھی جانتے تھے۔ انداز میں

کہا تھا۔ ''شہروں کی یہ حرکتیں اب عام بات ہے۔''

زید نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا اور نوشابہ گھر کے کسی کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

دوسرے دن زید رات کو دیر سے آیا۔ ان دنوں اس کے پاس کوئی اسائنمنٹ نہیں تھا، عموماً پانچ بجے تک وہ بھی ہو جاتی تھی لیکن جب سات بج گئے اور وہ نہیں آیا تو نوشابہ نے اس کے دفتر فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ پانچ بجے آیا تو تھا لیکن اپنے کسی ذاتی کام سے چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے نوشابہ اس کے موبائل سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ زید کا موبائل بند مل رہا تھا۔ دفتر سے یہ اطلاع ملنے کے بعد اس کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ فیصل کو اس نے کچھ کھلا پلا کر سلا دیا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ وہ بے چینی سے وقت گزار رہی تھی۔ وہ بھی اسی طرح کہ کبھی خواب گاہ میں ہوتی، کبھی لاؤنج میں چلی جاتی اور وہاں ٹہلتی رہتی۔ دو مرتبہ زید سے موبائل پر بھی رابطہ کرنا چاہا تھا لیکن اب بھی دونوں مرتبہ موبائل بند ملا تھا۔ اس طرح اس کی تشویش بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔

شاید گیارہ بجے یا اس کے بعد کا وقت تھا کہ اس نے کار کے انجن کی آواز سن کر اطمینان کی سانس لی۔ وہ زید کی کار کے انجن کی آواز پہچانتی تھی۔ اسے سن کر وہ اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ اسے غصہ آنے لگا تھا کہ زید نے اسے اتنا پریشان کیا۔ کم از کم موبائل پر تو رابطہ کر لیتا۔

پھر کچھ وقت گزر گیا۔ اتنی دیر میں زید کو خواب گاہ میں آ جانا چاہیے تھا۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے اٹھی اور پھر اسے کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ سے نکل آئی اور ایک طرف بڑھنے لگی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ آواز کس طرف سے آ رہی تھی۔ یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ آواز بنگلے کے باہر سے آ رہی تھی۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی جو زیر استعمال نہیں تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آواز لان کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ اس وقت آواز آنا بند ہو چکی تھی لیکن نوشابہ نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کی ٹانگیں بے جان ہونے لگی ہیں۔ اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ بہ مشکل اپنی خواب گاہ تک لوٹی۔ اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔ ذہن پر غبار سا چھانے لگا تھا۔

اسے اندازہ نہیں ... زید کو ... خواب کا ... اس نے تعجب کا اظہار کیا کہ نوشابہ اب تک سوئی نہیں تھی۔ وہ اتنی دیر تک جاگنے کی عادی نہیں تھی۔

زید کے استفسار پر وہ چیخ پڑی۔ ''یہ تم نے کیا کیا زید... یہ تم نے کیا کیا؟'' وہ زید کا گریبان پکڑ کر جنونی انداز میں چیختی ہی چلی گئی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور پھر نوشابہ کے والد کمرے میں داخل ہوئے۔

''کیا ہوا نوشابہ؟ کیا ہوا؟''

اس وقت نوشابہ چونکی۔ وہ زید کی تصویر دیکھتے دیکھتے سو گئی تھی۔ پھر اس نے خواب میں وہی سب کچھ دیکھا تھا۔ زید کے آنے پر وہ اس کا گریبان پکڑ کر چیخنے لگی تھی۔

باپ کی آواز سن کر وہ چونکی اور اسے احساس ہوا کہ خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی لیکن وہ چیختی رہی تھی۔ اس کی وہی چیختی ہوئی آوازیں سن کر اس کے والد دوڑے چلے آئے تھے۔

فیصل کی آنکھ بھی کھل چکی تھی اور وہ نوشابہ سے لپٹا ہوا روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''کیا ہوا مما! کیا ہو گیا آپ کو...''

''کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے بیٹی؟'' اس کے والد اس کے قریب بیٹھ گئے۔

''جی... جی...'' نوشابہ کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ اسی وقت اس کی والدہ بھی کمرے میں آ گئیں۔

''کوئی خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔'' والد نے اس کی والدہ کو بتایا۔ ''پانی پلاؤ اسے۔''

پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس نے فیصل کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

اسے پانی پلایا گیا۔ جب اس کی حالت سنبھل گئی تو والد اور والدہ اسے سونے کی تاکید کر کے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

دوسرے دن زید کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ آنکھ بھی جلدی کھل گئی تھی۔ کچن میں جا کر اس نے سلائس سینکنے کے لیے ٹوسٹر میں ڈالے اور چائے کے لیے پانی چولہے پر رکھا۔ اسی وقت اسے اپنے کمرے کی طرف سے موبائل کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ موبائل ساتھ نہیں لے کر کچن میں آیا تھا۔ وہ کمرے میں لوٹا۔ کال ریحانہ کی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اس نے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

لوگوں سے تو واقف تھے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ تیسرے دوست سے ملنے پر زید کی امید بر آئی۔
"وہ آپ کو کیسے یاد آ گیا زید صاحب!" دوست نے مسکرا کر پوچھا۔ "وہ ایسا تو نہیں جس سے کوئی شریف آدمی تعلقات رکھنا چاہے۔"
"مجھے اس سے تعلقات نہیں رکھنا ہیں۔"
"تو پھر اس کے بارے میں چھان بین کیوں کر رہے ہیں؟ میرے علم کے مطابق تو آپ ایک مشہور صحافی ہیں، پولیس یا اس جیسے کسی ادارے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔"
"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ میں کسی اور وجہ سے چھان بین کر رہا ہوں۔"
"تیسرے درجے کا بدمعاش ہے وہ!" بتایا گیا۔ "میں اسے... کچھ زیادہ اس لیے جانتا ہوں کہ میں جس کالونی میں رہتا ہوں، اس کے قریب ہی غریبوں کی ایک بستی بھی ہے۔ واجد وہیں کہیں رہتا ہے۔ اسی طرف ایک سبزی مارکیٹ بھی ہے۔ میں اس طرف جاتا رہتا ہوں۔ ایک دو بار وہ مجھے وہیں ملا تھا۔ ہم ایک ہی کالج میں پڑھے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ وہ بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے ایسی باتیں کی تھیں جیسے بے تکلف ہونا چاہتا ہو لیکن میں ٹال گیا۔ وہ مجھے جس دکان پر ملا تھا اسی دکان دار نے مجھ سے پوچھا کہ میں واجد کو کیسے جانتا ہوں۔ وہ مجھے ایک شریف انسان کی حیثیت سے جانتا ہے اس لیے اسے واجد سے میرے تعلقات پر حیرت ہوئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ اسی کالج میں پڑھتا ہے جہاں میں پڑھتا تھا لیکن اس سے میں نے تعلقات نہیں رکھے۔ اب وہ یہاں نظر آیا تو اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔ پھر دکان دار نے ہی مجھے بتایا کہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ گھر سے نکلنے کے بعد وہ بہت لوفر قسم کے لوگوں سے مل گیا۔ کوئی واردات بھی کر بیٹھا تھا۔ چھ مہینے کے لیے جیل بھی جا چکا ہے۔"
"اس کا گھر بھی دیکھا آپ نے؟"
"اس دکان دار کو معلوم ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔"
"اس دکان کی نشاندہی کر دیں۔ میں اس سے معلوم کر لوں گا۔"
"ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ آخر اس کے بارے میں..."

...تھی۔ میں شہر کے اس قسم کے لوگوں کی نفسیات سمجھنا چاہتا ہوں۔ اس بارے میں اپنے اخبار کے لیے ایک رپورٹ تیار کرنا ہے۔"
"اوہ اچھا، اب بات سمجھ میں آئی۔ تو آپ اس دکان دار سے مل لیں۔ اس کو واجد کے گھر کا پتا ضرور معلوم ہوگا۔ اس نے مجھے اتنا تو بتایا تھا کہ وہ اسی بستی کے ایک مکان میں اکیلا رہتا ہے۔ میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ اس کا ٹھیک ٹھیک پتا پوچھوں۔"
معلومات حاصل کرنے کے بعد اور نوشابہ کے اس کالج فیلو کے اصرار پر چائے پینے کے بعد زید وہاں سے رخصت ہوا۔ اس وقت ایک بجنے والا تھا۔
زید نے کار کی رفتار کم کی اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنی کار میں واجد کی بستی کا رخ کرتا تو لوگ اس کی طرف ضرور متوجہ ہوتے۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر اس کے ذہن میں آ ہی گئی۔ اس نے کار ایک ایسی جگہ روکی جہاں قریب ہی پرانے ملبوسات کی دکانیں تھیں۔ وہاں ٹھیلے بھی کھڑے ہوتے تھے۔ وہ متوسط طبقے کے لیے شہر کا سب سے بڑا بازار تھا۔ وہاں سے زید نے معمولی سی شلوار قمیص اور سرخ رنگ کا ایک بڑا رومال خریدا۔ وہاں سے لوٹ کر وہ سامان اپنی کار میں ڈالا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔
ڈھائی بجنے والے تھے جب اس نے کار اس کالونی کی ایک گلی میں روکی جہاں نوشابہ کا وہ کالج فیلو رہتا تھا جس سے زید نے واجد کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اس نے کئی گلیوں میں گھوم کر اس گلی کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہاں سناٹا تھا۔
انجن بند کر کے اس نے اپنے کپڑے اتارے اور وہ کپڑے پہن لیے جو اس نے خریدے تھے۔ شلوار قمیص پہننے کے بعد اس نے سرخ رومال مفلر کی طرح اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اب اس کی وضع قطع ایک معمولی شخص کی سی تھی۔ مفلر کی طرح کا سرخ رومال بھی وہاں لوگ اسی طرح گردن میں ڈالے رہتے۔
اب وہ کار سے اترا۔ دروازہ مقفل کیا اور اس بستی کی طرف چل پڑا جہاں واجد رہتا تھا۔
وہ دکان تلاش کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی جس سے واجد کا پتا معلوم کیا جا سکتا تھا۔ وہاں سے اس نے بلاوجہ تھوڑا سا سامان خریدا اور جو چیزیں خریدی تھیں ان کی تعریف بھی کی۔

دکان دار بولا۔ "میں دو نمبر مال نہیں رکھتا۔"
"یہ ایک تو دو نمبر ہے یار!" زید نے لوفرانہ انداز میں آنکھ مارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "ادھر ہی کہیں اپنا ایک دو نمبری دوست بھی رہتا ہے۔ اسی کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ بہت دن ہوئے جب ایک بار آیا تھا۔ بھول گیا ہوں۔ تم کو تو پتا ہوگا اس علاقے کے ہر گھر کا کہ ادھر کون رہتا ہے۔"
"کس کو ڈھونڈ رہے ہو تم؟" دکان دار نے پوچھا۔
زید کے حلیے کی وجہ سے دکان دار نے اسے واجد ہی کے قبیل کا شخص سمجھا ہوگا۔
"واجد نام ہے اس کا۔" زید نے بتایا۔
دکان دار واجد کے گھر سے واقف تھا۔ اس نے زید کو بتا دیا۔ زید اپنی اس کامیابی سے مطمئن ہوا اور اس طرف چل پڑا جدھر دکان دار کے بیان کے مطابق واجد کا گھر تھا۔
وہ اس گھر تک پہنچ بھی گیا۔ یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔
"اے بھائی صاب!" اس نے ایک شخص کو روک کر پوچھا۔ "یہ واجد ہی کا گھر ہے نا؟"
"ہاں جی، اسی کا ہے۔" جواب ملا۔ جواب دینے والے نے گھر کے دروازے پر بھی نظر ڈالی تھی۔ "دن میں تو وہ گھر پر بہت کم رہتا ہے۔ رات کو آتا ہے۔ کبھی نہیں بھی آتا۔" یہ کہہ کر جواب دینے والا آگے بڑھ گیا۔
پانچ چھ گھنٹے کا انتظار... زید نے سوچا۔
اس کے سر پر ایک دھن سوار تھی جس کے لیے وہ دس گھنٹے بھی انتظار کر سکتا تھا۔ وہ بستی میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ ایک جگہ اسے نکڑ والا معمولی ہوٹل دکھائی دیا۔ اس نے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ یہاں اچھا کھانا ملنے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی لیکن پیٹ کا جہنم تو پر کرنا ہی تھا۔
زید نے جیسے تیسے کچھ کھایا، پھر وہاں سے نکل کر ایک چائے خانے کی طرف چل پڑا۔ بستی میں گھومتے ہوئے وہاں اس کی نظر پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ چائے خانے میں فلمی گانوں کے ریکارڈ بج رہے تھے اور اسی بستی کے یا وہاں کے رہنے والوں جیسے لوگ چائے پی رہے تھے۔
زید اس چائے خانے میں جا بیٹھا۔ وہاں لوگوں کی چائے کی پیالیاں دیکھ کر اسے اس خیال سے متلی سی ہوئی کہ ان پیالیوں میں چائے کیسے پیے گا۔
پھر اس وقت اس نے اطمینان کی سانس لی جب ایک شخص کے سامنے اسے ٹھنڈے مشروب کی بوتل نظر آئی۔ اس نے اپنے لیے بوتل ہی منگوا لی۔

وہ گھنٹے وہاں گزارنے کے لیے اس نے دو بوتلیں پیں، پھر وہاں سے نکل کر اور واجد کے گھر کا ایک چکر لگانے کے بعد ایک اور چائے خانے میں جا بیٹھا۔ کسی طرح وقت تو گزارنا ہی تھا۔
رات تک کا وقت اس نے اسی طرح ادھر ادھر گھومتے ہوئے گزارا۔ اندھیرا پھیلنے کے آدھے گھنٹے بعد اس نے واجد کے گھر کا تیسرا چکر لگایا۔ ذہن میں آنے والے اس خیال سے وہ پریشان تھا کہ شاید آج رات واجد گھر نہ لوٹے۔
لیکن اس وقت اس نے سکون کی سانس لی جب ایک شخص کو اس گھر کا قفل کھولتے ہوئے دیکھا۔ اس کے خیال میں اس طرح قفل کھولنے والا واجد ہی ہو سکتا تھا۔
"اے بھائی!" زید نے بے تکلفانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ادھر کوئی واجد نام کا آدمی رہتا ہے؟"
وہ تالا کھولتے کھولتے رک کر مڑا تو گھٹیا قسم کی شراب کا ایک بھبکا زید کے چہرے سے ٹکرایا۔
"میں ہی ہوں واجد!" وہ زید کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم کون ہو، کیا کام ہے مجھ سے؟"
"مجھے کسی نے بھیجا ہے تمہارے پاس!"
"کس نے؟"
"ایک بڑا آدمی ہے۔ اسے مجھ جیسے اور تم جیسے دو آدمیوں کی ضرورت ہے کسی کام کے لیے۔ مجھے تو جانتا ہے وہ پہلے سے۔ تمہارا نام بھی اس نے کسی سے سنا ہوگا۔ اس نے بتایا تھا تمہارا نام۔ گھر تو بڑی مشکل سے ملا۔"
"مشکل سے کیوں؟ بستی میں سب جانتے ہیں واجد بادشاہ کو۔" وہ سینہ پھلا کر بولا۔ وہ خاصے نشے میں تھا۔
"تو پھر بولو۔" زید نے کہا۔ "کام کے چالیس ہزار دے رہا ہے وہ۔ بیس ہزار میرے ہوں گے اور بیس ہزار تمہارے۔"
"بھیجنے والا آدمی ہے؟"
"ہاں۔"
"تو پھر ایک ہی کام ہوگا۔ کسی لونڈیا کو اٹھوانا ہوگا۔"
"بالکل یہی بات ہے۔"
"کسی چھوٹی موٹی جگہ سے اٹھانا ہے تو چالیس ہزار ٹھیک ہیں۔" واجد نے کہا۔ "کوئی بڑا چکر ہوا تو چالیس ہزار سے بات نہیں بنے گی۔"
"اس نے تو مجھے یہی بتایا ہے کہ ہم اسے اس کے گھر سے بھی اٹھا سکتے ہیں۔ کسی بڑے گھر کی لڑکی کو تو اس کے گھر سے اٹھانا مشکل ہے۔"
"کہاں سے اٹھانا ہے اور وہ کرنا کس طرح ہے کام؟"

"۔۔۔وہ بتائے گا لڑکی کا کام پتہ، تصویر بھی دے گا۔"

"رکشا کرنا پڑے گا؟"

"نہیں۔ اس نے تمہیں تلاش کرنے کے لیے مجھے کار دی ہے۔ کالونی میں کھڑی ہے۔"

"اپنی کار دے دی؟" واجد حیرت سے بولا۔

"اس کے پاس کوئی ایک کار تھوڑی ہے۔"

"کار دے دی۔" واجد بڑبڑایا۔ اس کے چہرے سے اس کے شبہے کا اظہار ہونے لگا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ پولیس نے اسے پھانسنے کے لیے کوئی چال چلی ہے۔

"دیر نہیں کرتے ہیں یار۔۔۔ وہ نقد روپیہ لیے بیٹھا ہے۔ کام بھی ہمیں آج دو تین گھنٹے میں کرنا ہے۔"

"چل پھر اٹھ۔" واجد بولا۔

"چل کر بات کرلو۔ وہ تجھے پیسے بھی دے سکتا ہے۔ میں تو اس لیے راضی ہو گیا کہ پھر بھی اسے بڑے کام کے لیے بھی ہمارا ہی خیال آنے لگے گا۔ زیادہ پیسا بھی ملے گا۔ اگر تمہارا دل نہیں مان رہا ہے تو چھوڑ دو۔ میں واپس جا کر اسے بتا دیتا ہوں۔"

"چل یار!" واجد نے زید کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "جانا کتنی دور ہے؟"

"کار سے آدھے پونے گھنٹے کی بات ہے۔ تمہیں بوریت بھی نہیں ہوگی، پیتے ہوئے چلیں گے۔"

"ہے تمہارے پاس؟" واجد نے جلدی سے پوچھا۔

"بہت مہنگی۔ اسی نے دی تھی کہ لو مزے کرو۔"

"بلیک لیبل؟" واجد نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بلیک لیبل کیا بیچتی ہے اس کے آگے۔" زید نے مزے لیتے ہوئے کہا۔ "کام نہیں ہے، بارہ بجے سے پہلے کرنا ہے۔ لڑکی کا باپ کسی کلینک میں ہے۔ بارہ بجے گھر آجاتا ہے۔ ابھی تو وہ اکیلی ہوگی۔"

واجد اس کے ساتھ چلنے لگا۔ "خوب صورت ہے؟"

"ہاں، لیکن ہوگی ایسی کہ سیٹھ اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔" زید نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ "یہ بھی کہا ہے اس نے کہ دو دن اپنے پاس رکھ کر ہمیں دے دے گا۔ کوئی جگہ ہے تیرے پاس؟"

"اپنا گھر جو ہے۔ تو وہ ہمیں دے دے گا۔ لڑکی کا باپ رپورٹ تو کرائے گا؟"

"اس کے علاقے کے تھانے کا انچارج سیٹھ کا دوست ہے۔ وہ معاملہ دبا دے گا۔ اسی تھانے کے ساتھ وہ بھی ملے ہوئے ہیں۔"

کار تک پہنچتے پہنچتے زید نے واجد کا شوق اور بھڑکا دیا۔ سب سے زیادہ اطمینان تو واجد کے لیے یہ تھا کہ پولیس کی طرف سے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

زید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ واجد کو اپنے برابر میں بٹھایا اور سیٹ کے پیچھے سے بوتل نکال کر واجد کی طرف بڑھا دی۔ "شروع کر۔"

"ٹھیک ہے۔" واجد نے بوتل ہاتھ میں لے کر دیکھی تھی۔

"ہاں ایک گھونٹ لے کر مجھے دے۔ ایک گھونٹ میں بھی لوں گا۔" زید نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اتنی بھی نہیں پی کر کام کرنا مشکل ہو جائے۔ بوتل تو بعد میں بھی ہمارے پاس رہے گی۔" واجد نے بوتل کھول کر ایک بڑا گھونٹ لیا۔ زید چاہتا بھی یہی تھا۔

"گولی!" واجد بولا۔ "گولی لگی ہے پینے میں۔ پر ہے زوردار چیز۔" وہ اپنا سینہ سہلانے لگا۔ بوتل اس نے زید کی طرف بڑھا دی۔

"نہیں۔" زید نے کہا۔ "میں ذرا رک کر لوں گا۔ ٹریفک میں ہیں ابھی۔ اس سے نکل جائیں۔ ایک سنسان راستہ پکڑنا پڑے گا۔"

"چل ٹھیک ہے۔" واجد کی آواز بھرا گئی۔ اس نے کچھ زیادہ ہی بڑا گھونٹ لے ڈالا تھا۔ جب آدمی پہلے ہی پیے ہوئے ہو تو ہوس اور بڑھ جاتی ہے۔

"چڑھ بھی تو نہیں؟" زید نے اسے اکسایا۔

"نہیں پیارے! اتنی سی کیا چڑھے گی؟ ایک گھونٹ اور لے لوں؟ ابھی اتنا نشہ نہیں ہوگا کہ کام نہ کر سکوں۔"

"پی لے۔"

واجد نے ایک گھونٹ اور لیا۔

کار اب زیادہ ٹریفک سے نکل کر ایک ایسی سڑک پر تھی جہاں بہت کم ٹریفک تھا۔ دو میل آگے جا کر ایک ایسی سڑک پر مڑا جا سکتا تھا جو اس وقت بالکل سنسان ملتی۔ پھر آٹھ دس میل تک کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ زید کو ادھر ہی جانا تھا۔

"مزہ آ گیا۔" واجد نے بوتل پر اس طرح ہاتھ پھیرا جیسے اسے اس پر پیار آ رہا ہو۔ اس کی آواز میں لکنت آ گئی تھی۔ دو گھونٹ میں اس نے دو پیگ سے زیادہ پی لی تھی اور جب گھر لوٹا تھا تو بھی پیے ہوئے تھا۔

"ایک گھونٹ اور لے لے۔" زید نے کہا۔ "پھر مجھے دے۔"



"نشہ۔۔۔ نشہ تو نہیں ہو جائے گا؟" واجد بولا۔

"تو خاصا دھاکڑ پینے والا لگتا ہے۔" زید ہنسا۔

واجد نے ایک گھونٹ اور لیا۔

"لے۔" اس نے بوتل زید کو دی۔

زید نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر بوتل رانوں کے بیچ میں دبالی۔

"تو۔۔۔ تو نہیں۔۔۔ پیے گا؟" واجد بولا۔

"آگے ایک پولیس چوکی ہے۔ اس سے آگے نکل کر پیوں گا۔" زید نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ "بعض پولیس والے تو تجھے پہچانتے ہی ہوں گے۔ یہاں بہت کم لائٹ ہے لیکن نظر پڑ سکتی ہے۔" زید نے کار روک دی۔ "چل جلدی سے پیچھے جا۔" وہ خود بھی کار سے اترا۔

واجد نے دروازہ تو کھول لیا تھا لیکن اترنے میں وقت محسوس کر رہا تھا۔ زید نے اسے سہارا دے کر اتارا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیلا۔

"لیٹ جا سیٹ پر!" زید نے کہا۔ اس دوران میں وہ آگے پیچھے نظریں دوڑا رہا تھا اور اسے تسلی ہو گئی کہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

واجد کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اسے سیٹ پر لیٹنے میں بھی دقت ہوئی۔ زید نے اسے پھر سہارا دیا۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ لیٹ جاؤں گا یارا" واجد نے کہا۔

لیکن زید نے اسے سہارا دیا۔ اسے عجلت تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ سے ہی ہاتھ بڑھا کر اگلی سیٹ سے بوتل اٹھائی۔

"تھوڑی سی اور پی لے، پھر بند کروں۔" زید نے بوتل اس کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

واجد فوری طور پر اور نہیں پینا چاہتا تھا لیکن زید نے زبردستی اس کے حلق میں ایک گھونٹ اور الٹ دیا۔

"ہا۔۔۔" واجد نے ایک طویل سانس لی۔

"بس اب خاموش پڑا رہ۔" زید نے بوتل بند کر کے کہا اور باہر آ کر دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ کار فوراً حرکت میں آ گئی۔ اب اس نے یوٹرن لیا۔ یوٹرن لینے کے بعد اس نے اندرونی لائٹ جلائی اور اس کا زاویہ بدل کر پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے واجد کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

دس منٹ بعد وہ اس سڑک کے قریب پہنچ جاتا جہاں کچھ ٹریفک رواں ملتا۔

زید نے کار اس سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی پھر روک دی۔ اس مرتبہ اس نے انجن بھی بند کیا تھا۔ بوتل لے کر وہ پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر گیا جہاں واجد آنکھیں بند کیے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ زید نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

"سونے۔۔۔ دے یار!" واجد کی آواز منمناتی ہوئی سی تھی۔

"سیٹھ کا گھر آ گیا ہے۔" زید نے کہا۔

"کون۔۔۔ کون سیٹھ؟" اب وہ اپنا ہوش بڑی حد تک کھو چکا تھا۔

"تو پھر گہری نیند سو جا۔ ایک گھونٹ اور لے لے۔"

زید نے بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ خود واجد نے بھی منہ کھول دیا تھا۔ زید نے اس بار بھی چاہا کہ ایک بڑا گھونٹ واجد کے حلق میں انڈیل دے لیکن پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔ واجد نے بوتل سے منہ ہٹا لیا تھا۔ کچھ شراب اس کے ہونٹوں سے بہہ کر اس کے کپڑوں پر پھیل گئی تھی۔

"اتنا ہی کافی ہے۔" زید زیر لب بڑبڑایا۔

بوتل بند کر کے اس نے اگلی سیٹ پر ڈالی اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ وقت دیکھنے کے بعد اس نے سڑک کا جائزہ لیا۔ اس بار بھی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کسی جانب نظر نہ آئیں۔

زید نے پچھلی سیٹ کے دونوں دروازے کھول دیے تاکہ واجد کو زیادہ سے زیادہ ہوا لگ سکے اور شراب کی اثر پذیری بڑھ سکے۔

پندرہ منٹ بعد اس نے دروازے بند کر کے واجد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس مرتبہ واجد کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ پوری طرح مدہوش ہو چکا تھا۔

"اب تم ہمیشہ کے لیے سو جاؤ۔" زید نے واجد کو نفرت سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھ دیے۔ "اب تو شانی کو ہمیشہ اپنے خوابوں میں لاتے رہنا۔"

واجد نے فون پر تو شانی سے یہ جملہ بھی کہا تھا۔

زید نے یکلخت واجد کی گردن پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھا دیا۔ واجد مچلا لیکن اب اس میں مزاحمت کی زیادہ طاقت نہیں تھی۔ شراب کے باعث بڑی حد تک سلب ہو چکی تھی۔ زید اپنے ہاتھوں کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ جلد ہی واجد کی مزاحمت نے بالکل دم توڑ دیا۔ اب وہ بالکل بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ اس کی زبان باہر نکل پڑی تھی اور آنکھیں اتنی ابل آئی تھیں جیسے کسی بھی لمحے اپنے حلقوں سے ابل کر باہر آ جائیں گی۔

زید نے اس کی گردن سے اپنے ہاتھوں کی گرفت ختم کی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس نے اپنی ساری ہی

صرف قربت کے جذبے نے زید کی ساری طاقت صرف کروا ڈالی تھی۔

زید نے جاوید کی نبض دیکھی، پھر اس کے سینے سے کان لگا کر دل کی دھڑکن کا حال جاننا چاہا اور مطمئن ہو گیا۔ نہ نبض چل رہی تھی، نہ دل دھڑکنے کا احساس ہوا تھا۔ واجد یقینی طور پر مر چکا تھا۔

زید نے اس کا بے جان جسم نشست کے نیچے پائیدان میں دھکیل دیا اور پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کر کے وہ کار حرکت میں لے آیا۔ رفتار بھی بڑھانا شروع کی۔ جلد ہی وہ اس سڑک پر پہنچ گیا جہاں تھوڑا بہت ٹریفک تھا۔ زید مطمئن رہا۔ بہت قریب سے گزرنے والی کسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس کی کار کی پچھلی نشست کے پائیدان میں پڑا ہوا جسم نہیں دیکھ سکتے تھے۔

کار تیز رفتاری سے چلاتا ہوا وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ ہارن کی آواز سن کر چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ زید کار اس حد تک آگے نکال لے گیا کہ سرونٹ کوارٹر چند فٹ پیچھے رہ جائے پھر وہ کار سے اترا۔ چوکیدار پھاٹک بند کر کے لوٹ رہا تھا۔

''گل زادگل سے نہیں آیا۔'' زید نے اسے ہزار ہزار کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے اس کا ایک پڑوسی مل گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ گل زادگل کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ تم ابھی ٹیکسی پکڑ کر اس کے گھر جاؤ۔ اسے دو ہزار روپے دے دینا۔''

گل زاد گھر میں مالی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس طرح زید چوکیدار کو ٹالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے خود پھاٹک بند کیا اور کار میں بیٹھ کر اسے آگے بڑھایا۔ کار گیراج یا پورچ میں لے جانے کے بجائے وہ اسے عقبی لان کی طرف لایا۔ وہاں اس نے کار روکی، انجن بند کیا اور اتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔

واجد کی لاش وہ لان میں ہی دفن کرنا چاہتا تھا۔ زمین کھودنے کے لیے وہ مالی کی کدال استعمال کرتا۔

اس کا خیال تھا کہ زمین کھودنے کی آواز اس کی خواب گاہ تک نہیں پہنچ سکے گی اور اگر پہنچی بھی تو بہت مدھم ہوگی۔ سوتی ہوئی نوشابہ وہ آواز نہیں سن سکے گی۔

اس کام میں اسے ایک گھنٹا لگا۔ اس کے بعد اس نے لان میں لگے ہوئے نل سے ہی اپنے ہاتھ دھوئے، بکھرے

... کار کی طرف گیا۔

کار گیراج میں کھڑی کر کے وہ گھر میں داخل ہوا۔ اس کی عدم موجودگی میں گھر کا بیرونی دروازہ بند نہیں ہوتا تھا۔ چوکیدار اور مالی اس کے بھروسے کے آدمی تھے۔

اپنی خواب گاہ کا دروازہ اس نے بہت آہستگی سے کھولا تاکہ نوشابہ کی آنکھ نہ کھلے لیکن اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی نوشابہ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی میں وحشت بھی تھی۔

''تم ابھی سوئی نہیں؟'' زید نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''زید!'' نوشابہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ''لان میں تم نے کسے دفن کیا ہے؟''

زید دم بخود رہ گیا۔ اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ نوشابہ نے وہ سب کچھ دیکھ لیا ہوگا۔

زید چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر نوشابہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ''کسی کو قتل کیا ہے تم نے زید!'' نوشابہ کا انداز ہذیانی تھا۔

''کول ڈاؤن ـــ کول ڈاؤن۔'' زید اسے بستر کی طرف لے گیا۔ ''بھول جاؤ اسے جو تم نے دیکھ لیا ہے۔''

''کسے قتل کیا ہے تم نے زید؟'' نوشابہ اس مرتبہ روہانسی ہو گئی۔

''واجد کو۔'' زید نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسے لوگوں کو معاف نہیں کر سکتا جو میری بیوی سے ایسی باتیں کریں۔ انہیں خواب میں دیکھیں اور ـــ'' زید چپ ہو گیا۔ آگے کی بات ایسی نہیں تھی جو وہ اپنی زبان پر لا سکتا۔ وہ نوشابہ سے بھی یہ بات بہ مشکل اگلوا سکا تھا۔

''سکون سے لیٹ جاؤ۔'' زید نے اسے بہ آہستگی لٹا دیا اور خود بھی اس کے برابر میں لیٹ گیا۔ اس نے فوری طور پر کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے۔ ''بس اپنی زبان بند رکھنا بیبی... تم یقیناً مجھے پھانسی کے تختے پر دیکھنا نہیں چاہو گی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، اس سے اندازہ لگا لو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں واجد جیسے لوگوں کا وجود زمین پر برداشت نہیں کر سکتا۔''

نوشابہ اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ ''اگر پولیس کو معلوم ہو گیا تو؟'' وہ سسکتی ہوئی بولی۔

''نہیں معلوم ہوگا۔ بہت سوچ سمجھ کر طریقے سے ختم کیا ہے اسے۔ بس تمہاری زبان بند رہنا چاہیے۔ اس

بارے میں اب بات بھی نہ کرنا۔''

وہ بہ مشکل تمام نوشابہ کو پُرسکون کر سکا لیکن مکمل پُرسکون وہ کئی دن میں ہو سکی تھی۔ کئی دن تک وہ باتیں کرتے کرتے گم صم ہو جاتی تھی۔ بتدریج وہ خود کو سنبھال سکی۔ اس کی وجہ سے زید بھی پریشان رہا۔ آخر جب اسے یقین ہو گیا کہ نوشابہ اب بالکل ٹھیک ہو گئی ہے اور معمول کی زندگی گزارنے لگی ہے، تبھی وہ مطمئن ہو سکا۔

☆☆☆

حقیقت یہ تھی کہ نوشابہ نے صرف ظاہری طور پر خود کو پُرسکون کیا تھا۔ واجد کا قتل کسی نہ کسی وقت اس کے دل میں ہلچل مچا ہی دیتا تھا۔ زید کے ساتھ قربت بھی اس لیے کم کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دھیان بٹ سکے۔

وہاں کیسینو میں ہیرٹمن کے ساتھ رقص بھی تہذیب کے عالم میں کیا گیا تھا۔ اسے خیال آیا تھا کہ زید کو کہیں یہ بات بھی بُری نہ لگے۔ وہ یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہاں کی تہذیب سے نا آشنا ہے۔ ہیرٹمن نے اس سے باتیں بھی بڑے شائستہ انداز میں کی تھیں۔ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جسے پست یا گھٹیا کہا جا سکتا۔

لیکن جب واپس آنے پر اس نے ٹی وی کی خبروں میں ہیرٹمن کے قتل کے بارے میں سنا تھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ اس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ زید پیرس میں کسی کو قتل کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے اسے یہ بات بُری بہرحال لگی تھی جس کا اس نے اظہار بھی کیا تھا۔

اس رات اگرچہ وہ رات کو خواب گاہ سے غائب تھا لیکن نوشابہ نے خود کو یقین دلایا تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں اپنی رپورٹ پر کام کر رہا ہوگا۔

ہاں، اس بات کا یقین نوشابہ کو بہرحال تھا کہ زندگی کے کسی خاص واقعے کے سبب زید کے دماغ میں کوئی ذہنی گرہ ضرور پڑ گئی تھی۔

کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی آتا کہ اسے اپنے بیٹے ہی سے یہ خطرہ تھا کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ اس خطرے کو سمجھتے ہوئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے فیصل ہی کو مار ڈالتا۔

ازدواجی تعلقات کی بڑھتی ہوئی خرابی کے باعث بھی اسے یہ ڈر رہنے لگا تھا کہ تلخیاں اتنی نہ بڑھ جائیں کہ طلاق کی نوبت آ جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کی علیحدگی خراب حالات کی وجہ سے ہو اور وہ پھر کبھی زید سے ملنا تو درکنار دیکھ بھی نہ سکے۔ وہ زید سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ زید سے الگ رہنے لگے۔ طلاق کا مطالبہ کرتے وقت اسے یقین تھا کہ زید اسے طلاق نہیں دے گا۔ وہ بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن اس مطالبے کو جواز بنا کر وہ زید سے علیحدگی ضرور اختیار کر سکتی تھی اور یہ اس نے کر لیا تھا۔

علیحدگی اختیار کرنے کا ایک سبب یہ خطرہ بھی تھا کہ زید کہیں فیصل کو قتل نہ کر بیٹھے۔ عورت اپنے شوہر سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتی ہو وہ اولاد کی محبت سے زیادہ نہیں ہوتی۔

زید سے محبت ہی کے باعث وہ اس کی ایک تصویر بھی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ طلاق کی بات کرتے وقت اس نے زید کا یہ مطالبہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ضرور ملتا رہے۔ اس بہانے نوشابہ کو اسے دیکھنے کا، اس سے دو ایک باتیں کرنے کا موقع مل جاتا۔

والدین کو اس نے ایک جھوٹی کہانی سنا دی تھی تاکہ فوری طور پر کوئی ہنگامی صورت حال پیدا نہ ہو۔ آگے چل کر تو بات کھلنی ہی تھی۔ جھوٹی کہانی زیادہ عرصے تک نہیں چلتی۔

ایک دن بعد وہ ٹیکسی کر کے فیصل کو اسکول چھوڑنے گئی۔ پرنسپل کو اس نے بتایا کہ وہ فیصل کو اسکول چھوڑنے خود آیا کرے گی البتہ اسکول کی گاڑی نہ بھیجی جائے۔

یہ فیصلہ اس نے اس لیے کیا تھا کہ فیصل اسکول کے علاوہ ہر وقت اس کی نظر میں رہا کرے۔ وہ ہر قسم کی احتیاط برتنا چاہتی تھی۔ اس نے پرنسپل سے یہ بھی کہا کہ اگر زید فیصل سے ملنے آئے تو اسے فیصل کو اسکول سے باہر لے جانے نہ دیا جائے اور اگر زید کوئی معقول سبب بتا کر لے جانا چاہے تو اس کی تصدیق وہ فون پر خود کرے گی۔

پرنسپل کو اس قسم کی باتیں عجیب سی لگی تھیں لیکن اسے کوئی سوال کرنے کا حق نہیں تھا تاہم اس نے سوچا ضرور ہوگا کہ شاید میاں بیوی کے درمیان کسی قسم کی کشیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ خیال نوشابہ کو بھی تھا کہ پرنسپل یہ بات سوچ سکتی ہے لیکن نوشابہ کو اس کی پروا نہیں تھی کہ پرنسپل کیا سوچ سکتی ہے یا کیا سوچے گی۔

جب وہ اسکول سے لوٹی تو اس کی ماں نے کہا۔ ''تم کار کیوں نہیں لائی ہو؟''

''کل بتایا تو تھا میں نے۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی اس لیے میں نے غصے میں کار کی چابی نہیں لی۔ ٹیکسی کر کے آ گئی۔''

''یہ بھی اچھا نہیں لگے گا کہ تم فیصل کو اسکول چھوڑنے یا واپس لانے کے لیے ٹیکسی میں جاؤ اور ٹیکسی سے واپس آؤ۔''



"تمہارے والد آجاتے ہیں دفتر سے۔ ان سے بات کروں گی۔ وہ کوئی مناسب بندوبست کریں اور ہاں اسکول کی گاڑی یہاں بھی تو آسکتی ہے۔"

نوشابہ کو خیال تھا کہ اس قسم کی بات ہو سکتی ہے لہٰذا اس نے اس کا جواب بھی سوچ لیا تھا۔ "وجہ ہے مما!" اس نے کہا۔ "زید کے نہ ہونے سے میرا ذہن کچھ منتشر رہے گا۔ فیصل کے معاملے میں یہ ذمے داری اپنے سر لینے سے میرا کچھ وقت اس ذمے داری کی طرف بھی لگا رہے گا۔"

"تو بھی ٹیکسی مناسب نہیں۔ تمہارے والد اتنے دن کے لیے کوئی کار خرید لیں جتنے دن زید پر ماس رہتا ہے بلکہ گاڑی خرید ہی لیں۔ مجھے بھی کسی وقت کہیں جانا ہوتا ہے تو انہیں دفتر فون کر کے ان کی گاڑی منگواتی ہوں۔ شوفر لے کر آتا ہے۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" نوشابہ نے بات ختم کی۔

اسی دن شام کو اس کے موبائل کی گھنٹی بجی اور اس نے اسکرین پر زید کا نمبر دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور دھیمی آواز میں بولی۔

"امید ہے آپ نے طلاق نامہ تیار..."

"سنو!" زید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ابھی تک تمہارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا ہے؟"

"میں نے ایسی کوئی بات تو نہیں کی تھی جسے تم میرا غصہ کہہ رہے ہو۔"

"تم یہاں سے گئی اسی طرح تھیں۔ تم طلاق کے مسئلے کو خوش اسلوبی سے طے کرنا چاہتی ہو تو مجھ سے کہہ سکتی تھیں کہ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ ٹیکسی کی کیا ضرورت تھی؟"

"اسے تم میری جھنجلاہٹ سمجھ لو۔ میں غصے میں نہیں تھی۔"

"تمہاری کل طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ تمہیں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کے لیے کافی وقت مل گیا ہے۔"

"کیا طبیعت خراب ہوئی تھی؟" نوشابہ نے جلدی سے پوچھا۔

زید ہنسا۔ "بے چین ہوگئی تھیں؟ محبت کرتی ہو تم مجھ سے؟"

"میں نے کب کہا کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ محبت تو مجھے تم سے ہمیشہ رہے گی۔ طلاق تو حالات کی وجہ سے وقت کا تقاضا ہے۔ میں اس کے لیے کسی خوش گوار وقت کا انتظار کیوں کروں۔"

"یعنی تمہارا مطالبہ بدستور قائم ہے؟"

"ہاں۔"

"...طرح طلاق کروں گا؟"

"یہ بات طے کی جاسکتی ہے۔ میں کب چاہتی ہوں کہ تم فیصل سے نہ ملو۔ یہ تمہارا حق ہے۔"

"ایک دن اور سوچ لو۔"

"دس دن بعد بھی میرے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔"

"اچھا تو سنو!" زید کے لہجے میں سختی آگئی۔ "میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا اور تنہا زندگی بھی نہیں گزاروں گا۔ دوسری شادی کرلوں گا۔"

از خود طلاق کا مطالبہ کرنے کے باوجود اس خیال سے نوشابہ کے دل کو جھٹکا لگا کہ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی لے لے گی۔

زید کہتا رہا۔ "تم مقدمہ کرنا چاہو تو کردینا۔ دیکھ لوں گا میں سب۔"

"میں کوئی مقدمہ نہیں کروں گی۔" نوشابہ کی آواز کچھ بھرا گئی۔ "تم شوق سے دوسری شادی کرلینا۔ میں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں کہ تمہیں تنہائی کی زندگی گزارنے کی اذیت پہنچاؤں۔ میں خلع لینے کے لیے بھی عدالت کا رخ نہیں کروں گی لیکن اب ہم ساتھ بھی نہیں رہیں گے۔"



"میں ضرور دوسری شادی کرلوں گا تم میرے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ یا نہ اٹھاؤ۔" زید نے کچھ غصے سے کہا اور کوئی جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

نوشابہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ اب اس کی زندگی کی باقی راتیں اس تکلیف کے ساتھ گزرتیں کہ اس کے بجائے کوئی اور لڑکی زید کے ساتھ ہے۔

☆☆☆

چھٹیوں کے دن زید نے گھر میں ہی گزارے تھے اور نہ جانے کیا سوچتا رہا تھا۔ ریما اور انصار اس سے ملنے آتے رہے تھے البتہ نیلم پہلے دن کے بعد پھر نہیں آئی تھی۔ ریما کا معاملہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ دو مرتبہ رات کو دوبارہ بھی اس سے ملنے آئی تھی اور دونوں مرتبہ اس کے لیے تازہ کھانا بنا کر لائی تھی جبکہ ڈیپ فریزر میں نوشابہ کئی ڈشز رکھ کر گئی تھی۔ دس دن تک بھی زید کو کھانے کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

"میں تو ڈیپ فریزر کا کھانا ایک دن بعد بھی نہیں کھا سکتی۔" ریما نے کہا تھا۔ "اچھا ہی نہیں لگتا۔ تمہارے لیے بھی اسی خیال سے لاتی رہی ہوں کہ شاید تمہیں بھی اچھا نہیں لگتا ہو۔"

نین زید بھی کیا تھا کہ ریما نے بار بار اس کے پاس آنے کے لیے بہانہ تراشا تھا۔ خاصے عرصے پہلے ہی زید نے ریما میں تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ اپنی طرف اس کا جھکاؤ محسوس کر لیا تھا وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

وہ چاروں کیونکہ بے تکلف تھے اس لیے ابصار ایک مرتبہ ریما کو چھیڑ بھی چکا تھا۔ "تم اپنی شادی کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہی ہو۔۔۔۔ اچھی خاصی عمر ہو گئی ہے تمہاری۔"

ابصار کا انداز چھیڑنے کا تھا لیکن ریما نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ "امکان نہیں ہے کہ میری شادی ہو سکے۔"

"کیوں بھئی!" ابصار ہنسا تھا۔

"جس سے میں شادی کرنا چاہتی ہوں، وہ پہلے ہی شادی کر چکا ہے۔"

"تو پھر وہ زید ہی ہوگا۔" نیلم بول پڑی تھی۔

"یہ بکواس ضرور کرو گی تم!" ریما نے چیخ کر کہا تھا۔ زید کی بات آنے پر وہ نیلم سے اسی قسم کے جملے کہا کرتی تھی۔

ان باتوں کے وقت زید موجود نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اسے بعد میں ابصار سے معلوم ہوا تھا۔

نوشابہ سے اپنے تعلق کے بارے میں زید نے بھی انہیں بتا دیا تھا۔ یہ بات ایسی بھی نہیں جو زیادہ عرصے چھپائی جا سکتی تھی۔ گھر میں نوشابہ کی عدم موجودگی کے بارے میں وہ کب تک جھوٹ بول سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ اس کے قریبی دوست تھے۔

ابصار اور ریما نے اس پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ ابصار نے تو پیشکش بھی کی تھی کہ وہ نوشابہ کے گھر جا کر اسے سمجھانے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن زید نے اسے روک دیا تھا۔

"وہ کسی کی نہیں سنے گی۔" زید نے کہا تھا۔ "اگر اسے رام کر سکتا ہوں تو میں ہی کر سکتا ہوں۔"

"تو کوشش کی تم نے؟"

"آج ہی فون کیا تھا۔"

"کیا کہا نوشابہ نے؟"

"وہ اپنے مطالبے پر اڑی ہوئی ہے۔ میں نے اسے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ میں دوسری شادی کر لوں گا اور اسے طلاق بھی نہیں دوں گا۔"

زید نے ان دونوں کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو فون پر نوشابہ سے ہو چکی تھیں۔ اس موضوع پر خاصی دیر تک بات ہوئی لیکن زید نے ابصار کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ جا کر نوشابہ کو سمجھائے۔

اس کے بعد ریما نے بھی وہی کوشش کی جو ابصار کر چکا تھا لیکن زید نے اس کی بھی نہیں سنی تھی۔

"نیلم نہیں آئی پچھلے دن کے بعد۔" زید نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"بتا رہی تھی کہ کچھ مصروفیت ہو گئی ہے لیکن تمہارے بارے میں روزانہ ہی پوچھتی رہتی ہے۔" ریما نے بتایا۔

"دفتر کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟" زید نے ایک اور سوال داغا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ دوبارہ نوشابہ کے بارے میں بات نہ ہو۔

پھر جس دن زید کی چھٹی ختم ہو رہی تھی، ابصار دوپہر کو ہی آ گیا۔

"دفتر نہیں گئے آج؟ خیریت؟" زید نے پوچھا۔

"رات کو گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب تھی۔ تین بجے سو سکا تھا۔ اس لیے جاگا بھی گیارہ بجے کے بعد تو سوچا کہ اب چھٹی ہی کر لی جائے۔ ناشتا کر کے تمہاری طرف نکل آیا۔" ابصار نے جواب دیا۔

"کل سے تو میں بھی دفتر آ رہا ہوں۔"

"میرا تمہارے گھر آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔۔۔۔ دفتر میں تو زیادہ بات نہیں ہو سکتی۔"

"کیا کوئی لمبی چوڑی بات ہے؟"

"نہیں، کچھ ایسی لمبی چوڑی بھی نہیں ہے۔ ایک بار پھر نوشابہ کے گھر جانے کے لیے تم سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔"

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اگر وہ کسی کی بات سن سکتی ہے تو صرف میری۔۔۔۔ اور آج مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری بھی نہیں مانے گی۔ آج میں نے اسے دوسری بار فون کیا تھا۔ اب تو مجھے غصہ بھی آ گیا ہے۔ پہلے تو میں نے اسے دوسری شادی کی صرف دھمکی دی تھی لیکن آج فیصلہ کر لیا ہے کہ میں واقعی دوسری شادی کر لوں گا۔"

ابصار کے چہرے پر تشویش کے آثار گہرے ہو گئے۔

"فیصل سے میں ملتا ہی رہوں گا۔" زید نے بات جاری رکھی۔ "یہ طے کر لیا ہے نوشابہ سے چھٹی کے دن میں اس کے گھر چلا جایا کروں گا ایک آدھ گھنٹے کے لیے۔"

"نوشابہ کے والدین۔۔۔۔"

"وہ رہنا چاہتے ہیں انہیں۔" زید نے بات کاٹ دی۔

"یہ اس کی جذباتی بات بھی ہو سکتی ہے کہ وہ تم پر مقدمہ نہیں کرے گی اور خلع کے لیے بھی عدالت کا رخ نہیں کرے گی۔"



"دوسری صورت میں تو میں اسے کوئی ایسی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں تم سے کہ آج مجھے غصہ آ گیا ہے۔"

"دوسری شادی کے بارے میں تمہارا فیصلہ قطعی ہے؟"

"سو فیصد۔"

ابصار قدرے رک کر بولا۔ "ریما کے بارے میں تمہارے خیالات کیا ہیں؟"

زید مسکرا دیا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس کے جذبات سے بے خبر ہوں؟ بہت عرصے سے جانتا ہوں میرے دوست کہ میری طرف اس کا جھکاؤ بہت ہے۔"

"تمہیں بھی پسند ہے وہ؟"

"دوسری شادی کا فیصلہ کرنے کے بعد سے میرے ذہن میں ریما ہی ہے۔"

"ہوں۔" ابصار نے سر ہلایا۔ "ریما اچھی لڑکی ہے۔ کب بات کرنے کا ارادہ ہے اس سے؟"

"کسی وقت بھی کر لوں گا۔ اب تو وہ رات کو میرے لیے کھانا لے کر بھی آتی ہے۔"

"تیار تو وہ ہو جائے گی۔"

کچھ دیر بعد ابصار چلا گیا۔ وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ نوشابہ سے بات کرنے کے لیے ایک بار پھر زید سے اجازت لینے کی کوشش کرے لیکن اب معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔

زید کو نوشابہ سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس دن بہت ڈسٹرب تھا۔ معمولاً وہ دوپہر کا کھانا ڈیپ فریزر سے نکال کر گرم کر کے کھا لیا کرتا تھا لیکن اس دن وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی بھوک مر گئی ہو۔ اس نے شراب کی بوتل نکال لی۔ معمولاً وہ رات کے کھانے سے پہلے ہی پیا کرتا تھا لیکن اس دن اس نے ابھی وقت سے پینی شروع کر دی۔

دفتر کا وقت ختم ہونے پر معمول کے مطابق ریما اور ابصار کو آنا چاہیے تھا لیکن ابصار نہیں آیا۔

"آج وہ دفتر بھی نہیں آیا۔" ریما نے بتایا۔

"بتایا تھا اس نے مجھے۔"

"کب؟" ریما چونکی۔

"وہ دوپہر کو آیا تھا۔"

"آج تم نے دن میں پینی شروع کر دی؟"

شراب کی بوتل اور آدھا پیگ اس کے سرہانے ہی رکھا تھا۔

"ہاں۔" زید نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ذہن بہت منتشر تھا۔"

"کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا آج؟"

"نوشابہ کو آج بھی فون کیا تھا۔ وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔۔۔۔ غصہ آ گیا تھا مجھے۔"

"ابصار کو تم نے روک دیا تھا۔ مجھے اجازت دے دو۔ میں ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں۔"

زید نے اسے کچھ تعجب سے دیکھا، پھر گلاس اٹھا کر آدھا پیگ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

"میں نے سنا ہے کہ اتنی تیزی سے نہیں پینی چاہیے۔"

"مجھے ذہنی جھٹکا لگا تھا تمہاری بات پر۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں کی میں نے زید!"

"نوشابہ کو سمجھانے کی بات کی تھی تم نے؟"

"تو اس سے ذہنی جھٹکا کیوں لگا؟"

زید خفیف سا مسکرایا۔ "تمہارے لیے میدان صاف ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو ریما!۔۔۔۔ دفتر میں بہت عرصہ ہم ساتھ گزار چکے ہیں۔ میرے بارے میں تمہارے خیالات جب نیلم اور ابصار سے چھپے نہیں رہ سکے تو مجھ سے کیسے چھپ سکتے ہیں۔"

ریما کی نظریں جھک گئیں۔

"تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟" زید بولا۔

اب جو ریما نے نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھیں کچھ بھیگی ہوئی سی تھیں۔

"لیکن میں خود غرض نہیں ہوں زید!" اس کی آواز بھی بھرا گئی۔ "میں یہ کیسے چاہ سکتی ہوں کہ تمہاری ازدواجی زندگی برباد ہو جائے۔ تم ایک بچے کے باپ بھی بن چکے ہو۔ جس سے محبت ہو کیا اس کی زندگی منتشر ہوتے ہوئے دیکھی جا سکتی ہے؟"

"خوب!" زید دھیرے سے ہنسا۔ "تمہارا یہ روپ میرے سامنے پہلی بار آیا ہے۔"

"کیسا روپ؟"

"تم فلسفیانہ انداز میں بھی بات کر سکتی ہو۔"

"یہ فلسفہ تو نہیں زید! جس سے محبت ہو اسے ٹوٹتے پھوٹتے ہوئے دیکھنا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

"لیکن اب تو میں ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔"

"میں جب تنہا ہوتی ہوں تو تمہاری اس کیفیت کے خیال سے مجھے بڑی اذیت پہنچتی رہتی ہے۔"

"غیر معمولی خیالات ہیں تمہارے۔"

"میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ محبت اگر سچی ہو تو یہی اگر اس

میں کوئی طاقت نہ ہو تو ان میں کی خیالات کا ساتھ دوں نہیں سکتا۔"

زید نے اسے مستحسن نظروں سے دیکھا اور گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔

"میں آج بہت دل شکستہ ہوں۔ تمہیں مجھ سے محبت ہو تو مجھے پینے سے نہ روکو۔"

"گلاس بھی تم نے پورا بھر لیا ہے۔ پانی نہیں ملاتا کیا؟"

"اب تک پانی ملا کر ہی پی ہے لیکن اب ایسے ہی پی لینا چاہتا ہوں۔ میں جس کرب میں ہوں، اس سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"میرے بارے میں تمہارے کیا احساسات ہیں؟"

"اگر میں تمہارے اس خیال کو غلط نہیں سمجھا ہوں تو میرا جواب یہ ہے کہ تمہاری محبت نے میرے دل میں بھی تمہارے لیے محبت پیدا کر دی ہے اور ابھی تم نوشابہ کی نسبت سے جو باتیں کر چکی ہو، انہوں نے تو مجھے گرویدہ ہی کر دیا ہے تمہارا۔ تم ابصار سے پوچھ لینا۔ دوسری شادی کے سلسلے میں صرف تم ہی میرے ذہن میں آئی تھیں۔" زید نے گلاس رکھ کر اپنا موبائل اٹھایا۔ "میں تمہیں ابصار کی آواز سنانا چاہتا ہوں، یہاں ذرا قریب آ جاؤ۔" اس نے ایک طرف سرکتے ہوئے کہا۔ وہ نیم دراز حالت میں شراب پی رہا تھا۔

ریما قدرے تذبذب کے ساتھ اٹھی۔ "کیا سنانا چاہتے ہو؟"

"بیٹھو تو!" ریما بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

ابصار کے فون سے رابطہ ہو گیا تھا۔ زید نے اس سے کہا۔ "آج جب تم سے دوسری شادی کی بات ہو رہی تھی تو میں نے کس لڑکی کا نام لیا تھا؟"

پھر اس نے جواب سے بغیر موبائل ریما کے کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف سے آتی ہوئی مدھم آواز زید نے بھی سنی۔

"ریما کی بات کی تھی تم نے!"

زید نے فوراً موبائل ریما کے کان سے ہٹا کر اپنے کان سے لگا لیا۔

"لیکن تمہیں مجھ سے یہ پوچھنے کا خیال کیوں آ گیا؟" ابصار نے پوچھا تھا۔

"پھر کسی وقت بتاؤں گا۔" زید نے کہا۔

"تمہاری بھاری آواز سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے دن میں ہی پینی شروع کر دی ہے۔"

اس وقت ریما نے بستر سے اٹھنا چاہا لیکن زید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"ہاں، آج بہت منتشر ہوں۔" زید نے کہا۔ "تم نہیں آئے آج؟"

"دوپہر کو آ تو چکا ہوں۔ نیلم سے کچھ بات کرنی ہے۔ اس کی طرف آ رہا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل دفتر آؤں گا تو ملاقات ہو گی۔" زید نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ریما کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"سن لیا تم نے؟" زید نے اس سے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی زید...... میں تمہیں جھوٹا کیوں سمجھتی۔"

"میں تمہارا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔" زید نے اس کا ہاتھ قریب کرتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی بہت دلچسپی مجھے پامسٹری سے بھی ہے۔"

"تو بتاؤ مجھے کچھ!" ریما نے اشتیاق سے پوچھا۔

"دیکھنے تو دو اچھی طرح۔"

ریما مستفسرانہ نظروں سے زید کی طرف دیکھتی رہی، کبھی اپنے ہاتھ پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔

"شادی کے تقریباً ایک سال بعد تمہاری زندگی میں کوئی خاص موڑ آئے گا۔"

"کیسا موڑ؟" ریما نے پوچھا۔

"اتنی زیادہ پامسٹری نہیں جانتا۔" زید نے اس کے ہاتھ پر نظریں جمائے جمائے پیگ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔

"اچھا اور کوئی بات؟" ریما نے پوچھا۔ "میری زندگی کتنی ہے؟"

"زندگی تو بہت ہے تمہاری۔ میرے بعد بھی زندہ رہو گی۔"

"یہ...... یہ تو...... نہیں ہونا چاہیے۔" ریما کی آواز کانپ گئی۔

"ہو سکتا ہے میں سمجھنے میں غلطی کر رہا ہوں۔"

زید نے بستر پر آڑا ہو کر اپنا سر ریما کی گود میں رکھ دیا۔ ریما کچھ کسمسائی لیکن کچھ بولی نہیں۔ اس کا ہاتھ اب بھی زید کے ہاتھ میں تھا۔

"اور کوئی بات؟" ریما نے پوچھا۔

"نہیں۔ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اب بس اس لکیر پر غور کر رہا ہوں جو یہ بتا رہی ہے کہ شادی کے بعد تمہاری زندگی میں ایک موڑ آئے گا۔"

(بقیہ حصہ اگلے ماہ)